دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کراچی
مارچ 2014
پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
راج رسول
www.paksociety.com

6 چینی نکتہ چینی — مدیر اعلیٰ
قارئین کی کرم فرمائیاں، کج ادائیاں، نامے پیام، محبتیں، عنایتیں، شکایتیں

14 نغمہ مرگ — امجد رئیس
عالمی بساط پر فتنہ گری کرنے والی قوتوں کی ہولناک پنجہ آزمائی کی چشم کشا داستان

58 سیاہ ماما — ایس... انور
حیوانی جبلت اور انسانی فطرت کی قدر مشترک... مختصر پیرائے میں تیکھا انداز

59 عقلِ سلیم — بابر نعیم
ایک بد دماغ پولیس افسر کی لڑکی سے محبت کرنے کا شاخسانہ

67 برخود غلط — کاشف زبیر
جنون و دیوانگی کی حدوں میں داخل ہو جانے والے ذہن کی ایذا پسندی کا مشغلہ...

81 دل فگار — بشریٰ امجد
محبوب کی دل داری سے دل فگاری تک کے مراحل عبور کرتی کہانی...

84 جواری — احمد اقبال
زندگی کی بساط پر اندھا جوا کھیلنے والے کھلاڑی کی ہوش ربا داستان

131 دھندا — تنویر ریاض
سنسنی و تجسس کے ساتھ انسان کی دوستی اور دشمنی کا پل پل بدلتا رنگ...

141 تفتیش — جمال دستی
تاریخی داستانوں سے متاثر ایک بدمعاش کی جوابی خوشہ چینی...

151 قرض — میمونہ عزیز
ایک منہ زور شخص کا قصہ جو قانون کے شکنجے سے نکل رہا تھا

158 گرداب — اسما قادری
زندگی کی بساط پر اندھا جوا کھیلنے والے کھلاڑی کی ہوش ربا داستان

195 بوجھ — مریم کے خان
قانون کے محافظ کا ناقابل یقین کارنامہ... وہ اس کے لیے یادگار لمحہ تھا

209 محبت کی خاطر — سیریناراض
محبت... رقابت... اور حاسدانہ جذبات کی رسا کشی کا فسانہ

219 تصادم — سکندر علیم
معمول کی سرگرمی میں غیر معمولی سنگینی کا ڈرامائی ڈراپ سین

222 بدھو — حمیرا اقبال
ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ... کی عملی تفسیر، مغرب کی ایک اور جادوگری

225 دغاباز — احمد اقبال
دشت وفا سے دشت جفا کے سفر کی پُرانتقام روداد... سرورق کی تیز رفتار تحریر

257 دہری دھار — سمیرا یعقوب
انتقام کے بھڑکتے شعلے اور سرفروشوں کی حکمت عملی کا جیتا جاگتا مظہر...

000 تراش خراش — ادارہ و قارئین
اقتباسات، گدگدیاں، مسکراہٹیں اور قہقہے سب کچھ آپ کی تفریح طبع اور ذوق کے لیے

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

جلد 44 • شمارہ 03 • مارچ 2014 • زرِ سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس: 35802551 (021) Email:jdpgroup@hotmail.com
پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

مدیر اعلیٰ

چیں بہ چیں

عزیزانِ من۔۔۔ السلام علیکم!

مارچ کا شمارہ حاضر ہے۔ یہ مہینا ہمیں ہمیشہ خود احتسابی کی دعوت دیتا ہے۔ آیئے! دیکھتے ہیں کہ ہم اور ہمارے حکمراں کہاں کھڑے ہیں۔ دل فریب انتخابی وعدوں کے ساتھ ہم پر حکم چلانے والے اقتدار میں آتے ہیں تو اپنے وعدوں میں اگر مگر، چوں کہ اور چنانچہ کے طرّے لگا کر پسپائی اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کی مجبوریوں پر ہم دانت پیس کر اور دل مسوس کر رہ جاتے ہیں۔ ان مسندوں پر پارٹی کوئی بھی ہو، کہانی ایک ہی رہتی ہے۔ بس کردار بدل جاتے ہیں۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ اس ملک پر اصل حکمرانی بیوروکریسی یا نوکر شاہی کی ہے۔ ایک مرتبہ اس صف میں گھس جانے کے بعد یہ لوگ 65 برس کی عمر ہی میں جاتے ہیں، جن کی پی آر اچھی ہو، وہ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی کنٹریکٹ پر ہمارے سروں پر مسلط رہتے ہیں۔ یہ کمانے والا طبقہ آنے والوں کو نت نئی راہیں سجھاتا ہے۔ مال بنانے کے جدید ترین فارمولے سکھاتا ہے اور ہوشیاری کے ساتھ انہیں اپنے من پسند راستوں پر دھکیل دیتا ہے۔ یہ جانتے ہیں کہ جو آنے والا پانچ برس گزار کر چلا جائے گا پھر نیا دانہ اور نیا پانی ہوگا۔ یہ طبقہ صرف اپنی مراعات اور تنخواہوں کے جوڑ توڑ یا پھر اپنے عارضی آقاؤں کی چاپلوسی میں لگا رہتا ہے، جن کی شرمناک سرگرمیوں کا پردہ ان کے گھر کے ایک بھیدی نے چاک کیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا غضب ہے کہ کچھ بے ہوش اور بدکردار لوگ ہمارے ووٹوں سے منتخب ہو کر مقننہ میں بدمست سانڈ بنے ہوئے ہیں۔ ایسے مدہوشوں سے بھلائی کی توقع بے سود ہے۔ یہ عوام کو جواب دہ ہیں، نہ عوام کی بہبود کے بارے میں کچھ سوچتے ہیں۔ پانچ برس کے لیے اپنے وزیروں اور مشیروں کی خوشنودی کے مشن میں تن، من، دھن سے مصروفِ کار رہتے ہیں۔ آخری تجزیہ یہ ہے کہ جب تک نوکر شاہی کو لگام دے کر عوام کو جواب دہ نہیں بنایا جائے گا اور رائے دہی کے موقع پر امیدواروں کے کردار و گفتار کے حوالے سے آئینی شقوں کو بے رحمی سے نافذ نہیں کیا جائے گا، عام آدمی کو اپنے معاشی، معاشرتی اور ذاتی مسائل سے نجات نہیں مل سکے گی۔ کسی انتظامی یا عدالتی اختیار کے ذریعے ان دو طبقات کے سدھار کا کوئی ٹھوس بندوبست ہو سکے تو یقین کریں کہ ہمارے اور آپ کے بیشتر سنگین مسائل دنوں اور ہفتوں میں حل ہو جائیں گے اور یہی 23 مارچ کا پیغام بھی تھا۔ برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن کا قیام جہاں وہ پوری آزادی اور مساوات کے ساتھ اپنی زندگی گزارنے کا آزادانہ حق رکھتے ہوں ذرا سوچیے کہ اس میزان پر ہم آج کہاں ہیں۔ آزادی ہے تو بس اتنی کہ ہم سب مل کر اس محفل میں اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے ہیں جو اگلی سطور میں سجی ہے۔

محمد احسن زمان وزیر آباد سے "فروری کا شمارہ اتنا لیٹ ملے گا مجھے بالکل اندازہ نہ تھا لگتا ہے کراچی سے یہاں آتے آتے اسے بھی سورج کی طرح دھند کے پیچھے چھپنے کی عادت ہو گئی۔ بہرحال شمارہ چھپتا اور قریبی گراؤنڈ میں جا بیٹھا۔ سرورق پر حسینہ جس کی آنکھوں میں آنسو اٹکا ہوا تھا نہ جانے کس کو دیکھ کے مسکرا رہی تھی۔ چیں بہ چیں میں آپ کا تجزیہ درست ہے کہ معاشی بہتری تب معلوم ہو گی جب اس کے اثرات نچلے طبقے پر منتقل ہوں گے اور ہم بے چارے عوام دو + دو کے چکر سے باہر نکلیں گے۔ انتظار صاحب پہلے ہی اونچی جگہ کے باسی ہیں اور اس بار انہوں نے جاسوسی میں بھی اونچی جگہ ہی لی۔ واقعی قریبی آبادی سے مظفر آباد شہر آنا اور ناکام بھی لوٹ جانا دل گردے بلکہ پورا کلیجی کا کام ہے۔ اسلام آباد سے شکیل صاحب کے خط کا اپنا ہی مزہ ہے اتنے سارے تبصروں کے بیچ ان کا انداز ہی منفرد ہے۔ ابرار وارث، تیمور عاطف صاحب نے میری ڈرپوکی کو ہدف بنایا چلیں میں نے سچ تو بول دیا ورنہ اصل حقیقت تو ہر بندہ خود جانتا ہے۔ صفدر معاویہ کو شادی اور جاسوسی کو نئی قاریہ مبارک ہو۔ تبصرے پڑھ کر ذہنی دباؤ اور غبار چھٹ جاتا ہے ایسے جیسے بارش کے بعد درخت خوشگوار ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالرب صاحب کی خوں ریز ایسی کہانی ثابت ہوئی کہ آغاز سے انجام تک نظر نہ ہٹا سکا۔ اصل میں غنڈا گردی بڑھنے کی وجہ ہی ہمارا جرائم پیشہ افراد سے دہشت زدہ ہو کر صرف نظر کرنا ہے۔ ہر کوئی یہ کہتا ہے مجھے دوسروں کی کیا پڑی تو اپنی نبیڑ اور غنڈے مضبوط سے مضبوط تر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ رنگ باز میں ایک بات واضح تھی کہ پوری قوم پیسے کی دیوانی ہو چکی ہے اور منہ کو لگی یہ کافر چھٹتی نہیں کے مصداق ہر شخص بس مال بنانے میں لگا ہے چاہے کوئی مرے یا جیے انسپکٹر شہزاد جیسے کردار اب ناولوں اور کہانیوں میں زندہ ہیں۔ یوں لگا جیسے کہانی میں محض نام دیسی رکھے گئے باقی سب کچھ تو ولایتی سا تھا۔ تنویر ریاض کی بند مکان ہمارے لیے بندی ثابت ہوئی۔ کیوشی کی تیز نگاہوں نے قاتل کو لیے ہی لیا بالآخر۔ جمال دستی کی چور اور مور اچھی کہانی تھی۔ چور پاہی کی ازلی چشمک جو بلی چوہے کا کھیل ثابت ہوتا ہے جس میں کبھی بلی اور کبھی چوہا جیت جاتا ہے۔ لیجیے جی اب آئی باری جواری کی، ہوئی ہوا جس کی توقع تھی کہ انور قبر میں لڑھک گیا تھا ورنہ وہاں کون سا چھو منتر تھا جو وہ یک دم غائب ہو جاتا اور اب تو سلیمانی ٹوپی بھی ناپید ہے۔ لیکن قبر کی آڑ میں کھودی گئی سرنگ خاور میاں کو کہاں لے گئی یہ تو ہمارے دماغ کے کسی کونے کھدرے میں بھی نہ تھا۔ اچھے بھلے سکون ماحول تے میٹھے چول (چاول) والا معاملہ تھا جو کہ الٹ سلٹ ہو گیا اور خاور میاں پیر صاحب کے آستانے میں جاوارد ہوئے۔ بابر نعیم کی پسِ پردہ کا نام پس لباس ہوتا تو زیادہ مناسب رہتا کیونکہ فورسٹر کی شرافت، نفاست، خوش لباسی کا لبادہ جو اتر گیا تھا۔ اس کے قتل کے بعد ہی کہی ویسے کہانی کے دوران مجھے علم ہو گیا تھا کہ قاتلہ کی مدد ہولی فاولر نے کی ہوگی۔ (ہمیں اندازہ ہو گیا ہے کہ آپ واقعی عقل مند ہیں) جب ہی تو سینڈی اسلحے سمیت اندر آ گئی۔ عمدہ رہی یم زاد میمونہ عزیز کی کاوش تھی اور کیا خوب تھی لیکن انجام، بے اختیار ابکائی آ گئی۔ اب بھلا ایسا ہوتا ہے کہ کسی کا مغز کھانے سے دماغ ترقی کرے۔ بہرحال کہانیوں کی حد تک ممکن ہے یا شاید یہ کوئی نئی تحقیق ہے؟ آصف ملک صاحب مرد ناداں لے کر آئے تھے۔ ہر لمحہ قلابازیاں کھاتی اس کہانی نے حیران کر دیا۔ بے حد مزہ آیا۔ کم ایسی کہانیاں ہوتی ہیں جن میں جھول کم ہوتا ہے، جھول اور کمی تو ہر کہانی میں ہوتی ہے کیونکہ کہانیاں جو ہوتی ہیں۔ شاہانہ اور کریم کی جوڑی کو بھاگ لگے اور ہارون دستی کی

جیل میں ہمیشہ کے لیے سڑے گا۔ گرداب کی اب کچھ کچھ سمجھ آہی گئی ہے اس بار چند الفاظ اس کے بارے میں بھی۔ را کے تفتیشی مرکز میں مقابلہ عمدہ رہا اور باوجود بھاگ کر ٹھکانا ہونے کے، سلوا شہریار کامران ٹھہرے لیکن عبدالرحمٰن نے عبدل کی جان لے لی اور یہاں ائربیس حملہ کیس بھی بیچ میں گھسیٹ لائے محبت تو ٹھیک ہی تھی اور عکاسی یوں کی جیسے سارا منصوبہ ان ہی ذہن کی پیداوار ہو۔ واہ جی واہ کیا کہنے۔ تین متوازی کہانیاں مسلسل ساتھ ساتھ ہیں اور آخری لڑائی سمندر میں جاری ہے۔ انجام کیا ہوگا ملیں گے مارچ کے ہیبلے بیتے میں۔ سکندر عظیم کی رسیا بھی عجیب ہی کہانی تھی۔ جاوید مغل صاحب کی استادی واقعی ایک دلچسپ اور شگفتہ داستان تھی۔ حسنات کا کردار تو ساری کہانی کی جان تھا لیکن اس کی اپنی جان جاسوسی سکھانے میں اٹکی ہوئی تھی۔ بہر حال پوری الف لیلہ کہ لیس یا ابنِ صفی کی عمران سیریز کا جاسوسی ناول، بہت خوب حافی + کامی کی داستان محبت موبائل میسج سے شروع ہوکر بالآخر اپنے انجام کو پہنچی۔ شہباز احمد کی محافظ میں تو بس ریمنڈ ڈیوس اور سوری ریمنڈ مارٹن اپنی ہی حفاظت کر پائے، چھپسی ہی کہانی لگی۔ انسپکٹر قاسم کا کردار اشارہ میں خوب رہا۔ غم گسار سے سلیم انور لائے اس کا انجام آغاز سے مختلف ٹھہرا، لگتا تھا کہ عام کے ساتھ بری ہوگی لیکن یہ تو سوچا نہ تھا کہ کیتھی ہی کیتھی جلا ڈالے گی۔ واقعی کچھ لوگ اپنی دی ہوئی تکلیف کو نظر انداز کر دیتے ہیں یہ دیکھے بنا کہ خود وہ کتنا تکلیف دہ ہو چکے ہیں اور ہمارے معاشرے میں تو یہ چلن اب عام ہے۔ سرورق کا پہلا رنگ تاریک سورج ٹھہرا۔ حالانکہ تاریکی میں کچھ بھی سجھائی نہیں دیتا لیکن کیا کیجیے سرور صاحب کی اس ساری کہانی کا مرکزی خیال ہمارے پہاڑی علاقوں میں پنپنے والی ایک داستان سے ہے جس سے اب ساری قوم واقف ہے اور متاثر بھی۔ میرا اس داستان سے اختلاف کیوں ہے یہ صفحات اس بحث کی اجازت نہیں دیتے۔ بہرحال سوات کے حالات کے تناظر میں لکھی ہوئی کہانی عمدہ تھی کاشف زبیر صاحب کی مہنگی بھول بہت عمدہ رہی خاص طور پر شاکر رضی کی جدوجہد نے بے حد متاثر کیا۔ اس بیٹی کے لیے جس نے قطع تعلق کر لیا تھا، باپ کی تنگ ودو بے حد جاں گسل تھی لیکن رشتوں کے ہونے کا احساس بھی تو ایسا ہی کچھ ہوتا ہے سر پر سایہ نہ ہونے کی وجہ سے بیمار ضمی الٹے رستوں پر چل پڑی جرم کی دنیا میں جانے کا رستہ تو ہوتا ہے لیکن نکلنے کا رستہ صرف اور صرف موت ہے جس کا اندازہ آخر میں ہو ہی گیا۔ لیکن خالموا صائقہ کو شاکر سے دور کیوں کر دیا۔ چلیں آپ کی مرضی اوہ سوری شیر کی مرضی انڈا دے یا بچہ۔ اپنا اور آپ کا دماغ کافی کھا چکا ہوں لہٰذا اجازت دیں۔"

راولپنڈی سے ساحر مراد صامت کی تنقید "فروری کا شمارہ تو جیسے 29 فروری کا چاند ہی ہوگیا اور 12 فروری کو موصول ہوا۔ میٹھی محفل میں داخل ہوئے کو ڈرائنگ روم میں 23 افراد کو براجمان پایا جبکہ آٹھ لوگ باہر انتظارگاہ (بلیک لسٹ) میں موجود پائے۔ سب کی محبت جاسوسی سے مسلّم تھی کہ سوائے عبدالغفور ساغری اٹک کے علاوہ کسی نے صفحہ 130 سے 163 تک کے اغیاب اور ادھوری کہانی کا ذکر کیا ہو جیسے ماں اپنے پیارے بچوں کے عیب پر پردہ ڈال دیتی ہے اور ساحر صاحب کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز ٹھہری جس کا جواب دینا بھی غیر ضروری سمجھا گیا یا پھر یہ غلطی صرف پنڈی اور مضافات میں آنے والے پرچوں میں تھی۔ (محترم ہمارے لیے سب قارئین بے حد قابل احترام ہوتے ہیں۔ بائنڈنگ کی غلطی کی وجہ سے صفحات میں تبدیلی آئی۔۔۔ قریبی اسٹال سے پرچہ تبدیل کیا جاسکتا ہے) افتخار حسین اعوان آپ کا جاسوسی کو پانے کے لیے گرنا پڑنا کام آیا اور کرسی صدارت نصیب ٹھہری، آرام سے بیٹھیں ایک ماہ چوٹوں کو سہلاتے رہیں مبارک ہو۔ پہلی کہانی ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی خوں ریز واقعی ہمارے ماحول میں موجود خونخوار کالی جونکوں کی چشم کشا تحریر تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے معاشرے کی نبض پر ہاتھ رکھا ہوا ہے۔ امجد رئیس کی رنگ باز بہترین کاوش تھی۔ فریدی صاحب کی حاضر دماغی، ذہانت اور زبردست قوت مشاہدہ سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا کیونکہ ہمارا کام بھی اس سے ملتا جلتا ہے۔ ساتھ ہی اگلے صفحات پر ایک چھوٹے سراغ رساں کیوشی، سراغ رسانی کرتے نظر آئے۔ قابل تعریف تھی۔ باقی چھوٹی کہانیاں چور اور مور، پس پردہ، مردِ ناداں، محافظ، اشارہ اور غم گسار نے ثابت کیا کہ بد کا انجام برا۔ اچھی تحریریں تھیں جبکہ رسیا اور ہم زادیوں لگا جیسے جاسوسی کے صفحات پورے کرنے کے لیے شامل کی گئی ہوں۔ ان کے بجائے یہ چھ صفحات بھی گرداب یا جواری۔۔۔۔۔۔ میں اضافہ کر دیا جاتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔ طاہر جاوید مغل میرے پسندیدہ رائٹرز میں شامل ہیں۔ استادی بلاشبہ ایک معیاری داستان محبت تھی۔ کہانی شروع سے آخر تک مکمل گرفت میں لیے رہی زبردست۔ تاریک سورج شمالی علاقہ جات کی ابتر صورت حال پر ایک سیر حاصل تحریر تھی۔ سرور اکرام صاحب کو بھی تحریر میں درجہ کمال حاصل ہے۔ اسلام کی روح کے عین مطابق تعلیم کا پرچار ہی اس کا بنیادی حل ہے۔ تعلیم اور شعور کے اجالوں سے ہی یہ اندھیرے چھٹیں گے۔ ویل ڈن سرور اکرام صاحب ویل ڈن۔ دوسرا رنگ ایکشن، سسپنس اور تھرل سے رنگی ہوئی تھی۔ اچھی کاوش تھی کاشف زبیر صاحب کی پڑھ کر یہ یقین اور مستحکم ہوا کہ لالچ میں اٹھایا گیا ہر قدم نقصان کا باعث بنتا ہے۔ اب ذرا ذکر ہو جائے مقبول سلسلے گرداب کا۔ اسما قادری واقعی فن تحریر پر قادر ہیں۔ ان کی تحریر کا سحر دل و دماغ کو جکڑ لیتا ہے۔ شہریار اور سلو کے ہاتھوں ہلاک ہوکر جہنم رسید ہونے کی خواہش تشنہ رہی لیکن لگتا ہے اپنے زعم میں یہ درندہ ان کو گھیرنے کی خواہش دل میں لیے کھلے سمندر میں فرعون کی طرح غرقاب ہوگا۔ وطن کے جیالوں کی سرفروشی کی یہ داستان رگوں میں موجود ابال کو مزید بڑھاوا دیتی ہے۔ ائربیس پر حملے میں ملوث اپنی ہی صفوں میں موجود میر جعفر اور میر صادق جیسے کردار باعث عبرت ہیں گوکہ ماہ بانو کو چھڑانے میں مشاہرم خان کوئی کردار ادا نہ کرسکا مگر اس کی امریکا موجودگی بے سبب نہیں ہے۔ لگتا ہے ماہ بانو کی واپسی کے سفر میں یہ دبنگ خان ایکشن میں نظر آئے گا۔ اب چانگا بھی اس جنگ میں کود پڑا ہے۔ سچ کہتے ہیں چھی یاری، سب پہ بھاری۔ چائنیز ایک زندہ قوم ہیں اور امید ہے کہ ہم بھی بہت جلد من حیث القوم جلد ہی بیدار ہو جائیں گے۔ انشاء اللہ۔ جواری دوسرا مقبول سلسلہ حسب سابق سست روی کا شکار رہا اور کہانی چودھری کی حویلی کے اندر گھومتی رہی۔ بھلا ہو پیر اظہر علی کا جس نے فریدالدین کو بندوق کی نوک پر حویلی سے زبردستی نکال باہر کیا۔ اب لگتا ہے کہ احمد اقبال صاحب نے کہانی کو تیزی سے آگے بڑھانے کا تہیہ کر لیا ہے۔ یادداشت کی گمشدگی کے ساتھ نورین کی واپسی کے آثار بھی نظر آرہے ہیں۔ اس مرتبہ بھی ایک نشست میں ڈائجسٹ مکمل پڑھ لیا اور اب پھر وہی حال ہے کہ "ساتوں شہر والے پل تے بلا کے تے جاسوسی ماہی کتھے رہ گیا"۔ غنیمت ہے کہ اس ماہ کے تین دن کم ہیں، یوں 72 گھنٹے انتظار کے کم ہو جائیں گے۔"

تختِ شاہی لاہور سے زویا اعجاز کی سواری "ہر ماہ تین تاریخ کے طلوعِ آفتاب کے ساتھ ہی ہمیں مرضِ انتظار لاحق ہو جاتا ہے پھر تو کیفیت پوچھیے

ہی مت۔ ڈاکٹری نسخے کی طرح صبح دوپہر شام بک اسٹالز پر اپنی میڈیسن کے حصول کے لیے سب کے چکر لگواتے ہیں۔ اس ماہ تو طبیعت زیادہ ہی بگڑتی جا رہی تھی۔ برستی بارش اور خنک شام میں فروری کا شمارہ ملا تو قدرے افاقہ ہوا۔ ٹائٹل پر کشت و خون کی اطلاع دیتی محبت کی ازلی نحوست نظر آئی۔ اداریہ گہرے تجزیے کا عکاس تھا۔ صدارت کا عہدہ ملنے پر برادر محترم افتخار اعوان کو مبارک باد۔ جناب نے تو جاسوسی سے اپنی داستانِ عشق سنا ڈالی مگر آپ کیا جانیں جاسوستان کا ہر فرد اسی عشق کا روگی ہے۔ وزیر اعظم جناب اردو دان مظہر سلیم صاحب! اتنی شاندار تشبیہات کے استعمال پر ہماری طرف سے داد وصول کیجیے۔ نوک جھونک تو اس محفل کا لازمی جزو ہے، حساب ہم کسی کا نہیں رکھتے خود پر۔ سو وا پسی خوب اہتمام سے کرتے ہیں۔ عبادت کاظمی صاحب! آپ میں و ٹامنز بصارت اور بصیرت دونوں کی کمی ہے۔ نہ تو ہم خان ہیں نہ کسی شام ڈک اور ہیری کے بچے۔ ایسی لوٹا گیری والی سیاست آپ ہی کا کام ہے۔ محی الدین اشفاق میں بھی انہی وٹامنز کی کمی ہے، خودشناسی کو محترم نے انوکھا رنگ دے ڈالا۔ کمال کرتے ہو پانڈے جی۔ وڈے شاہ جی! لٹریچر کی طالبہ ہونے کی وجہ سے ماہدولت شیکسپیئر کے کافی بڑے مداح ہیں۔ بی بی طاہرہ گلزار! سارے جہان کا درد کیوں آپ کے دل میں ہے؟ عائشہ اسلم، بلقیس خان، ابرار وارث اور صفدر معاویہ کا شکریہ۔ کہانیوں کا آغاز اس مرتبہ عاشقانِ مغل نے ہماری طرح استادی سے ہی کیا ہوگا۔ بھئی واہ۔ آؤٹ کلاس اسٹوری رہی۔ مغل ملاحظہ کروں کے ڈائیلاگ نے ہر دفعہ مسکراہٹ بکھیر دی۔ گرداب بھی انتہائی زبردست رہی۔ ائربیس پر حملے کے منہ توڑ جواب نے دل خوش کر دیا۔ جواری کا جادو بالکل نہیں چل رہا ہے۔ خوں ریز بہت کمال کی کہانی تھی۔ روشنیوں کے شہر کو گھن کی طرح کھا جانے والے عناصر کی بربریت نے آبدیدہ کر دیا۔ ملالہ یوسف زئی کے پس منظر میں لکھی گئی تاریک سورج بھی بہت پسند آئی۔ یہ وطن دشمن عناصر کسی صورت مسلمان کہلانے کے حق دار نہیں۔ اسلام کا تو پہلا درس ہی اقرا تھا۔ اس کہانی میں بھی ایک جھول تھا۔ زرین کے والد کو پہلے عاصم اور آخر میں یوسف لکھا گیا۔ (اس سہو کے لیے معذرت چاہتے ہیں) مہنگی بھول نے سرورق کے رنگ ہونے کا عمدہ حق ادا کیا۔ ہم زاد پڑھ کر تو بے اختیار ابکائی آگئی۔ مردِ ناداں میں شاہانہ کا آخری فیصلہ اور کریم کی اعلیٰ ظرفی پسند آئی۔ بند مکان میں کردار و مقامات کے نام بے حد اوکھے تھے۔ چور اور مور، پس پردہ، اشارہ اور رسیا کو بھی پاس ہونے کی سند دیتے ہیں۔ کترنوں میں محمد شاہان سعید کا انتخاب بہترین تھا۔"

صفدر آباد سے نیہا کائنات کی خواہش "میں چوتھی جماعت کی طالبہ ہوں۔ (اوہو ابھی تو تم بہت چھوٹی ہو) صفدر آباد سے مہک صابر کا خط پڑھ کر مجھے بھی خط لکھنے کا شوق ہوا تو میرے ابو نے بتایا کہ میں عرصہ 35 سال سے ان کا قاری ہوں۔ ایک دفعہ خط لکھا تو ویٹنگ لسٹ میں آگیا۔ اس کے بعد میں نے کسی رسالے میں خط نہیں لکھا۔ اب تم لکھ کر دیکھو شائع نہیں ہوگا۔ (ابو نے یہ تو درست نہیں بتایا تم کو) ابو جب رسالے لاتے ہیں تو میں بھی لطیفے شوق سے پڑھتی ہوں۔ کہانیاں بھی پڑھ لیتی ہوں مگر مطلب ابو سے سمجھنا پڑتا ہے۔ امید ہے آپ میرے ابو کی طرح میرا خط ڈسٹ بن میں نہیں پھینکیں گے۔" (نیہا! گڑیا ہم آپ کا خط شائع کر رہے ہیں۔ ابو کو بھی پڑھوا دینا۔ ہمیں آپ کی رائٹنگ میں خط دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔۔۔ ابو سے کہنا آئندہ وہ تمام کہانیاں پڑھ کر فوراً تبصرہ لکھیں)۔

سید اکبر شاہ، اوگی مانسہرہ سے لکھتے ہیں "مسلسل بے قراری اور بے چینی کے بعد جاسوسی کا ملنا جاں آفریں تھا۔ جانِ عالم نے رم جھم برستی برسات میں حسبِ معمول آٹھ کو دیدار کروایا۔ حسینہ سرورق، قتل حور، چشم مخمور پر نگاہ پڑی تو پڑی رہی۔ اس کے نیچے کبیر عباسی کو نظر انداز کرتے ہوئے محفل کی جانب دوڑ پڑے۔ (ویسے آج کل آپ کہاں غائب ہیں؟) افتخار اعوان انعام کے حق دار قرار پائے۔ مبارک باد کے ساتھ اکیس توپوں کی سلامی۔ آپ کی سرگزشت کافی دلچسپ تھی۔ مظہر سلیم! آج کل تبصرے کافی غور و فکر سے لکھتے ہیں۔ زویا اعجاز آپی کا تبصرہ حسبِ روایت جاندار اور منفرد تھا۔ شکیل بھائی، بک اسٹال کی بجھ حقیقت کا روپ دھارتی نظر آرہی ہے کیونکہ آپ نے جلد شادی کرنے کی امید ظاہر کی ہے۔ انکر پرسن بشریٰ افضل کی رپورٹ قابلِ تعریف تھی۔ بلقیس خان! آپ کی تمیج روانی پسند آئی ہمیں۔ اپنی طاؤس شرقی خرام یعنی طاہرہ گلزار کی آمد بھی خوش گوار رہی۔ ابرار وارث خوب طبل زن تھے۔ عائشہ اسلم! آپ کی طبیعت کچھ اتھل پتھل محسوس ہوتی ہے۔ اس بار جواری بس گزارے لائق تھی، سوائے پسِ زنداں کا عذاب جھیلنا اور نورین کو فاطمہ کے روپ میں دیکھنا۔ اگلی قسط میں خاور کو نورین کے ملنے کی امید ہے۔ گزشتہ کئی اقساط کی طرح گرداب کی یہ قسط بھی بے حد مزہ دے گئی۔ رنگ باز میں انسپکٹر شہزاد فریدی کی ذہانت قابلِ ستائش تھی۔ تنویر ریاض کی بند مکان میں کیوشی نے ناقابلِ تسخیر کیس کو حل کر کے ذہانت کا ثبوت دیا۔ ابتدائی صفحات کی زینت ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی خوں ریز دلچسپ تحریر تھی۔ بدترین کردار آصف کریکر کو چھری کا غسل دینا اچھا لگا۔ تورینا کا کردار بیسٹ تھا۔ چور اور مور میں محض خوشبو کی پسندیدگی کی بات نے کام دکھایا۔ ہم زاد سے مماثلت رکھنے والی کئی کہانیاں پڑھی ہیں۔ مغل صاحب کی استادی ایک نایاب تحریر تھی۔ جملہ جملہ لبوں پر تبسم بکھیرتا رہا۔ محافظ متاثر کرنے میں ناکام رہی۔ اشارہ کچھ ولایتی تحریر لگی۔ رنگ سرورق پر پڑاؤ ڈالا۔ سرور اکرام کی تاریک سوچ بہترین اور متاثر کن تحریر تھی۔ علم کے متعلق دل کی گہرائیوں سے لکھی، دل پر ثبت ہوئی۔ زرین جیسے کردار آج بھی موجود ہیں لیکن حوصلہ افزائی کے لیے کوئی نہیں۔ کاشف زبیر کی مہنگی بھول بھی اچھی تھی۔ شاکر کی محنت رنگ لائی اور اسے بیٹی کے ساتھ صائقہ بھی ملی۔ فروری کا جاسوسی سرورق سے تا آخر شیرازن جیم جیلی تک دلچسپ اور انمول رہا۔" (تمام غائب ہو جانے والے ساتھیوں کو خبردار کیا جاتا ہے کہ آئندہ ماہ اپنے تبصروں کے ساتھ حاضر ہو جائیں۔۔۔ ورنہ)

گلگت سے شبیر حسن شاہ کو شکوہ ہے کہ "ہمیں ڈائجسٹ اتنی تاخیر سے ملتا ہے کہ وہ اپنے شاہی تبصرے سے ادارے کو فیض یاب نہیں کر پاتے۔ (ریلوے اور ڈاک کے نظام میں گڑبڑ کی وجہ سے بعض مقامات پر پرچے کی ترسیل میں تاخیر ہوتی ہے۔ بہرحال ہر ماہ کی 24 تاریخ تک ملنے والے خطوط شاملِ اشاعت کر لیے جاتے ہیں)۔ احمد اقبال کی قسط کچھ ڈھیلی چل رہی ہے۔ یہی حال گرداب کا ہے۔ شاید اسما جی اب کہانی لپیٹنے کے چکر میں ہیں۔ غم گسار، رسیا اور مردِ ناداں اس مہینے کی بہترین کہانیاں تھیں جن کی وجہ سے قسطوں کی کمزوری پر پردہ پڑ گیا۔ استادی بس ٹھیک تھی۔ جھنڈ والی بہن، مری والا شہزادہ اور ام عمامہ۔۔۔ سوری ثمامہ اور قیدی بھائی کافی دنوں سے غائب ہیں، ان کو میرا سلام پہنچے۔"

شیخوپورہ سے محمد شاہان کی تصیح "باادب، باملاحظہ ہوشیار شہنشاہِ جاسوسی، وزیر اعظم عمران، سپہ سالارِ اعظم کرنل آفریدی اور اسیرانِ جنگ شرلاک

ہو مزا اور ڈاکٹر و انسن کے ساتھ بک اسٹال پر تشریف لا رہے ہیں۔ ان سب سے معذرت کے ساتھ جب جاسوسی کا شمارہ تھاما تو بغاوت کے ڈر سے وزرا کو اکیلا چھوڑ کر کمرے میں اکیلے رسالہ پڑھنے بیٹھ گئے۔ سب سے پہلے سرورق پر نظر پڑی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی اسکرین کے پردے میں سے دوربین کے ذریعے جاسوسی کر رہا ہے۔ وہ تو بھلا ہو سرورق کی دوسری کہانی کا جس میں ہمارے مفروضے کو غلط قرار دیا گیا۔ محفلِ خطوط میں قدم رنجہ فرماتے ہی اپنے خط کی تلاش شروع کر دی۔ بالآخر ہمارا خط مل گیا۔ مگر یہ کیا؟ شہنشاہِ اعظم کے نام کو بُری طرح بگاڑ دیا گیا۔ ارے بھئی میرا نام شاہان ہے۔ (تو نام صاف لکھا کریں... شاہان کو شایان ہی پڑھا جا رہا تھا) سب دوستوں کے تبصرے شاندار اور جاندار تھے۔ خوں ریز اپنی دھاک بٹھانے میں ناکام رہی۔ کہانی میں کسی قسم کا سسپنس نہ تھا۔ ہم زاد نہایت مختصر مگر دل کو آگ لگ گئی۔ مغلِ اعظم کی استادی نے تو دماغ کا فیوز ہی اڑا دیا۔ نہایت شاندار تحریر تھی مگر آغاز زیادہ اچھا نہ تھا۔ بند مکان کی بھول بھلیوں نے بھی چودہ طبق روشن کر دیے۔ تاریک سورج میں ہمارے معاشرے کا خطرناک ترین پہلو اجاگر کیا گیا۔ سرورق کی دوسری کہانی میں سسپنس پیدا کرنے کی کوشش کی گئی جس میں کوئی فائدہ نہ ہوا۔ جواری میں بالآخر نورین بھابی ہیروئن صاحبہ مل گئیں۔ مگر اب بے چاری کی یادداشت واپس آنے میں دو سال لگ جائیں گے، اللہ نہ کرے۔ گرداب میں آخرکار ہمارے قابلِ فخر مجاہدین چائنا کی مدد سے نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں جو بلاشبہ ہمارا عظیم دوست ہے۔ ہمارے جانباز بھی کسی سے کم نہیں۔ اگر آپ خفیہ ایجنسیز (خصوصاً پاکستانی) کے کیسز کا ذکر کریں تو نہایت شاندار ہوگا اور یقیناً آپ کے رسالے کو مزید چار چاند لگ جائیں گے۔'' (بس فی الحال اتنے ہی چاند کافی ہیں)

ڈیرہ اسماعیل خان سے سید عبادت کاظمی کی یلغار ''خلافِ توقع جاسوسی اس مرتبہ 13 تاریخ کو ملا۔ سب سے پہلے ہم نے سرورق کا ایکسرے کیا۔ حسینہ کی صحرائی گردن اور سرخ ہونٹوں نے متوجہ کیا۔ لگتا ہے حسینہ بھی ہمیں سالگرہ کی مبارک باد دے رہی تھی۔ اوپر صاحب برادر ہمیں ڈرانے کی کوشش کر رہے تھے کہ بس بہت ہو گیا اور نیچے والے غالباً ہمایوں صاحب تھے جو بے موقع ہنس رہے تھے۔ سرورق کے ایکسرے سے فارغ ہو کر دوستوں کی محفل میں انٹری دی۔ (ویسے محفل سے دور کیوں ہیں؟) سید شکیل! ابھی پہلے ہم نئے تھے تب ڈرتے تھے اب ہم آپ کی گرم جوشی کا جواب ڈبل دیں گے۔ افتخار حسین اعوان! کرسیٔ صدارت کی مبارک ہو۔ سید محی الدین! یار تم نے تو نو لفٹ کا بورڈ لگا رکھا ہے کیوں؟ زویا تم ہمارے کنگ بھائی کو پاگل بناتے بناتے کہیں خود پاگل نہ ہو جانا کیونکہ تفسیر عباس نے تو ماہا ایمان کو بھی محفل چھوڑنے پر مجبور کیا تھا (کیوں بھئی آپ کو یہ شدید غلط فہمی کیوں؟) محمد شاہان احمد اینڈ عائشہ آپ کے نخشش پر شکریہ۔ میں سالگرہ مناتا نہیں بس دوست وش کرتے ہیں۔ زندگی کے غموں میں خوش رہنے کا ایک بہانہ ہے۔ طاہرہ گلزار شکریہ بھئی میں اب فرسٹ ایئر کے پیپر دوں گا۔ آپ اندازہ لگاؤ کیا عمر ہے میری... باقی تمام دوستوں کا شکریہ جنہوں نے سالگرہ کی مبارک باد دی۔ کہانیوں میں حسبِ معمول گرداب پہلے پڑھی۔ سلوبالآخر شہریار کو نکال کر لے گیا۔ بے چاری ماہ بانو کی زندگی گرداب میں پھنس چکی ہے۔ جاوید اور عالیہ کا ملاپ بہت اچھا لگا۔ جواری نے اس مرتبہ خوشگوار حیرت میں مبتلا کیا۔ نورین کا مل جانا لیکن یادداشت کا نہ ہونا۔ خیر، اب کہانی میں مزہ آئے گا و یلڈن۔ ابتدائی صفحات پر خوں ریز اچھی اور سبق آموز کہانی تھی۔ سیاست کے الجھاؤ اور رشتوں کی دراڑ بھری اس کہانی نے متاثر کیا۔ پہلا رنگ تاریک سورج روایتی وڈیروں کی تعلیم کے خلاف اقدامات سے بھری تھی۔ کاشف زبیر کی ہمیشہ کی طرح کہانی چیٹ گئی۔ سیما کی خود غرضی ایک آنکھ نہیں بھائی لیکن کہانی کے اینڈ نے تھوڑا بور کیا۔ سیما کو مرنا چاہیے تھا۔ چھوٹی کہانیوں میں طاہر جاوید مغل کی استادی اور بشریٰ امجد کی اشارہ اچھی لگی۔ باقی رسالہ زیرِ مطالعہ ہے۔''

خانیوال سے محمد صفدر معاویہ کی کتھا ''اس دفعہ جاسوسی نے اتنا انتظار کروایا کہ ہم کو شک ہونے لگا کہ کہیں پیارا ڈائجسٹ پاکستان کی حکومت اور طالبان کے مذاکرات کی نذر تو نہیں ہو گیا۔ 5 تاریخ کو ملنے والا 10 تاریخ کو جا کر ملا۔ (بس جناب ہم بھی مجبور ہیں... دیر کرتے نہیں، دیر ہو جاتی ہے...) پھر بھی اتنی خوشی ہوئی کہ جتنی مجھے شادی کی نہ ہوئی تھی (کس کی؟) اس دفعہ تو انکل نے سرورق کی حسینہ کو کیا خوب رنگ دیا۔ خوب صورت ہونٹ، ستواں ناک، دلکش آنکھیں، حسین سی تھوڑی یعنی کہ ونڈرفل اینڈ بیوٹی فل گرل۔ ساتھ ہی شان کی شکل سے مشابہ شخص پستول تانے اور نیچے شہزادہ گوہسار منہ کھولے پتا نہیں کیوں ہنس رہا ہے؟ بہرحال، بہترین سرورق۔ چیچی تکہ چیچی میں آئے۔ آپ کا اداریہ پڑھا اور دعا گو ہوئے کہ آپ کی بات بات کو اللہ تبارک و تعالیٰ سچ ثابت کرے آمین۔ افتخار حسین اعوان صاحب کرسیٔ صدارت کی مبارک باد، بھائی نے تبصرہ بھی زبردست کیا ہے۔ کھٹی میٹھی باتیں کرتے بالکل چلبلی پانڈے لگے۔ وزیرِاعظم کی سیٹ پر میرے عزیز دوست مظہر سلیم صاحب تبصرے میں محفل والوں کی کلاس لے کر حساب برابر کرتے نظر آئے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے گرداب پڑھی۔ قسط شاندار تھی۔ کہانی آہستہ آہستہ اختتام کی طرف بڑھتی نظر آ رہی ہے۔ خوں ریز بھی ہمارے معاشرے کے پس منظر دکھاتی ایک اچھی کہانی تھی کہ ہمارے ملک میں یہ کچھ ہو رہا ہے۔ جواری میں بھی اب کوئی دلچسپی نظر آئی ہے۔ رنگوں میں تاریک سورج نہایت حساس موضوع پر لکھی گئی کہانی تھی۔ جنگی بھول بس گزارے لائق تھی۔ طاہر جاوید مغل کی استادی دلچسپ اور مزاح سے بھرپور کہانی تھی۔ رسالہ میں باقی سب چھوٹی کہانیاں بھی اس دفعہ بہت اچھی تھیں۔ کلرکہار میں سردی بہت ہے۔ رات کے 12 بج چکے ہیں، سونے کی تیاری کریں جی۔ پریشان نہ ہوں، خانیوال سے یہاں کہاں۔ یہاں میں نوکری کرتا ہوں۔''

بڈھے والا ضلع سرگودھا سے راجہ اسلم حیات کا انتخاب ''جیسے جیسے جاسوسی کے لیے ہماری دیوانگی میں اضافہ ہو رہا ہے، اس نے کسی بے رحم محبوبہ کی طرح انتظار کی سولی پر لٹکانا شروع کر دیا ہے۔ فروری کا شمارہ 8 تاریخ کو ملا۔ سرورق کسی ٹوتھ پیسٹ کمپنی کا اشتہار لگ رہا تھا۔ تین چہرے اور تینوں ہی دانتوں کی خوب نمائش کر رہے تھے۔ پسٹل دیکھ کر بھی پتا چل رہا تھا کہ مصر کے عجائب گھر سے چرائی گئی ہے لیکن مجموعی طور پر ٹائٹل جاسوسی کے معیار کے عین مطابق ہی تھا۔ (چلو جی شکر ہے اتنی مین میخ کے بعد پسند تو آیا) فہرست کی سب سے خاص بات مغل انکل کی موجودگی جبکہ اداریہ حسبِ سابق تفکرات میں گھرا ہوا تھا۔ محفل میں افتخار حسین اعوان کی آپ بیتی اور زیادہ تر باتوں کا بتنگڑ بنانا کافی محظوظ کر گیا۔ اعوان صاحب آپ شکیل کاظمی کے فرسٹ آنے کی خواہش پوری ہونے کے بعد

اس دفعہ خود بھی کرسیٔ صدارت کے حق دار قرار پائے۔ مبارکاں جی۔ نمی مہک صابر موسٹ موسٹ ویلکم۔ اس کے علاوہ ساحل ایمان، عروج ناز، طاہرہ گلزار، صفدر معاویہ اور مظہر سلیم کے تبصرے پسند آئے جبکہ ماہا ایمان، تفسیر عباس، ہمایوں سعید اور کوہسار بھیا کی کمی بے حد محسوس ہوئی۔ (لگتا ہے ہمیں بھی ان کی تلاش میں گھوڑے دوڑانے ہوں گے... کہاں ہو بھئی آپ سب؟) گرداب میں مصنف صاحب بڑے زبردست انداز میں کہانی کو سمیٹ رہے ہیں اور پچھلی دفعہ جو ایک پوائنٹ ذہن میں کھٹک رہا تھا کہ جب باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تو سلو اندر کیسے آ گیا اس کی بھی وضاحت ہو گئی۔ یہی تو بات ہے اسما صاحبہ کی کہ وہ ہر سین بڑی خوب صورتی سے بیان کرتی ہیں۔ جواری جس سے اب کچھ بہتری کی امید پیدا ہوئی تھی، اس نے تو اس بار انتہائی مایوس کیا۔ کہانی کچھوے سے بھی کم رفتار میں آگے بڑھ رہی ہے۔ ہیرو کا بار بار بلاضرورت خیالات میں الجھا ذہن اور مصنف کا اندازِ بیاں نہایت بورنگ رہا۔ پہلا رنگ تاریک سورج میں گو کہ مصنف نے بہترین موضوع کا انتخاب کیا تھا لیکن وہ اسے صحیح طریقے سے بیان نہیں کر سکے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ مصنف کو خود سمجھ نہیں آ رہی کہ مختلف کرداروں کو کس انداز میں سامنے لایا جائے۔ سرورق کا دوسرا رنگ کاشف زبیر صاحب کا جنگی بھول بہت زبردست رہا لیکن یہاں بھی وہ انداز جو کاشف صاحب کا خاصہ ہے، اس کی کمی محسوس ہوئی۔ خوں ریز ابتدائی صفحات پر اپنا رنگ جمانے میں کامیاب رہی جس میں گینگ وار، خون کا کھیل اور طاقتور کی کمزور کو دبا دینے کا غرور سب کچھ شامل موضوع رہا۔ تاریخ میں بڑے بڑے برج اپنی سب سے بڑی کمزوری یعنی عورت کی وجہ سے الٹ گئے۔ اسی طرح آصف کریکر بھی ایک عورت کے ہاتھوں مارکھا گیا۔ مختصر کہانیوں میں آصف ملک کی مردِ ناداں اچھی رہی۔ کہانی پڑھنے کے دوران ذہن یہی سوچ رہا تھا کہ شاہانہ کو اس خوشگوار زندگی اور اپنے شوہر کریم کی محبت کو ہمیشہ کے لیے اپنا لینا چاہیے اور اینڈ پر مصنف نے ہمیں مایوس نہ کیا۔ مغل صاحب کی استادی ہمیں سب سے زیادہ پسند آئی جس میں مزاح کا بہت خوب صورت انداز تھا۔ حسنات کا کردار بہت دلچسپ رہا۔ رنگ باز، ہم زاد اور دریا بھی زبردست رہیں۔''

ضلع لیہ سے سید محی الدین اشفاق کی تیز طراری ''مہینے کی ابتدائی تاریخوں میں جاسوسی کا پتا کرنے جانا ایک رومانس سا لگتا ہے۔ 8 تاریخ کو جاسوسی ملا۔ ٹائٹل پر سید عبادت کاظمی ریوالور لیے اور نیچے سید شکیل حسین کاظمی زخمی چہرے کے ساتھ بھی مسکرا رہے تھے۔ کیونکہ ڈاکٹر انکل نے ٹائٹل حسینہ کے ساتھ اسے جگہ جو دے دی تھی۔ افتخار حسین اعوان اونگ سیٹ مبارک ہو۔ زویا اعجاز پتا نہیں کون سے ریکارڈ بتا رہی تھیں؟ بشریٰ افضل صاحبہ! یہ تکلیف ڈاکٹر انکل کی وجہ سے ہے ورنہ صنفِ وجاہت کو صنفِ کرخت نہ کہتیں آپ۔ طاہرہ گلزار! آپ خود بھی بے مروت ہو میرے خیال میں۔ محسن کمال، اسلم کے لیے اداس ہو رہے تھے ایک اچھے تبصرے کے ساتھ۔ اس مرتبہ کی نمبرون کہانی استادی، طاہر جاوید مغل صاحب کی تحریر تھی۔ کامران اور عاقبہ کے پیغام سے شروع ہونے والی کہانی میں حسنات کے کردار نے مزہ کرایا۔ مزاح کا انداز طاہر جاوید مغل نے کمال کر دیا۔ جواری اپنی چالبازیاں جاری رکھے ہوئے ہے۔ انور بھی لگتا ہے پنچ کا عالم چودھری بنتے جا رہا ہے۔ گورکن کا قاتل کون ہے؟ پیر صاحب نے خاور کو اغوا کیا اور پھر موقع ملتے پر خاور آزاد تھا مگر جبکہ وہ نورین کے قریب پہنچ چکا تھا، کام خراب ہو گیا۔ گرداب نے اپنا ٹیمپو تیز کر لیا ہے۔ شہریار اور سلو ڈاکٹر فرحان کو لے کر نکلنے والے ہیں۔ مگر عین آخری وقت جبکہ ان کے خیال میں خطرہ جا چکا تھا تو سمندری طوفان اور تین بڑی لانچوں کا ان کی طرف رخ بھرپور ایکشن کے ہونے کا اشارہ دے رہا ہے۔ باقی رسالہ زیرِ مطالعہ ہے۔''

پتوکی سے ایف ایم کی افسردگی ''پچھلے دنوں ہم پر ایک سانحہ گزرا جس نے تمام احساسات کو منجمد کر کے رکھ دیا۔ 2014ء نے آتے ہی ہمارے زندگی کے ہم جان دکھوں سے بھرے ہوئے کشکول میں ایک اور دکھ کا سکہ اچھال کر اسے بے جان کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اب یقین آ گیا ہے کہ جس طرح مٹھی میں سے ریت کو پھسلنے سے روکنا ناممکن ہے اسی طرح جانے والوں کو روکنا بھی ناممکنات میں سے ایک ہے۔ ایسے دل گرفتگی کے عالم میں خط لکھنا تو درکنار دل ہر بات سے انکاری تھا مگر پھر بھی ایک سوچ کے زیرِ اثر وقت کی نگاہ سے کچھ پل چرائے ہیں۔ وہ یہ کہ آپ سب قاری لوگوں سے درخواست ہے ہماری عزیز ہستی کے لیے دعائے مغفرت ضرور کریں اور ساتھ ہی ہمارے حوصلے کے لیے بھی۔ (اللہ تعالیٰ ان غمناک گھڑیوں میں آپ کو بے حد حوصلہ عطا فرمائے۔ ہستی کا رشتہ نہیں بتایا) میں بہت زیادہ لمبا چوڑا تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں کیونکہ اب تو آپ لوگ میری مجبوری سمجھ گئے ہوں گے۔ دوسری وجہ جاسوسی کا ابھی تک نہ ملنا ہے۔ (اس کے لیے بے حد معذرت... لیکن آپ دیر سے خط پوسٹ کرتے ہیں کہ ہمیں 24 تک مل جائیں) اسی لیے سرورق کی تعریف میں کسی بھی بحث کے بغیر محفل میدانِ جنگ میں جن لوگوں نے خوش آمدید کہا تھا شکریہ۔ خدا آپ کا ذوقِ نظر اسی طرح قائم رکھے۔ شادی کرنے والوں کو مبارک باد۔ خدا پاک آپ کی خوشیوں کی عمر لمبی کرے آمین۔ تبصرہ کروں گی تو صرف سلسلے وار کہانیوں پر جس میں سب سے پہلے احمد اقبال کی جواری آتی ہے۔ اس میں بدلتے ناموں والے ہیرو نے شکر ہے سوچنا کم کیا ہے۔ جب سے اس نے سوچنا ترک کر کے عمل کرنا شروع کیا ہے، کہانی میں جان پڑنی شروع ہوئی ہے۔ گرداب میں اسما صاحبہ تو نہ جانے کیا سوچے بیٹھی ہیں۔ ہماری دعاؤں کو قبولیت کا شرف بخشتے ہوئے انہوں نے اسلم کو مار دیا ہے جو کہ بہت خوش آئند بات ہے کیونکہ ماہ بانو شہریار کی تھی۔ اب بھی ہے مگر ایک بات جو مجھے ہضم نہیں ہوئی۔ شہریار کا شکل بدل لینا۔ ایک اور شکل کے ساتھ ابھی تک میں اسے قبول نہیں کر پائی ہوں تو ماہ بانو کس طرح کرے گی۔ ظاہری سی بات ہے جس محبوب شکل کو انسان دیکھنے کے لیے برسوں ترستا رہے اس کی جگہ کوئی اور شکل دیکھنے کو ملے تو دھچکا تو لازمی ہے نا؟ جو کہ یقیناً اسے بھی لگے گا۔ (ہمیں تو معلوم نہیں، دیکھتے ہیں ماہ بانو کا ردِعمل کیا ہوگا) کاشف زبیر صاحب! آپ سے سوال ہے کہ کہیں شاہی اور تیمور کو کسی جرم کی سزا میں ان کے دادا حضور نے ان کے اصل دیس جنوبستان میں تو نہیں بھیج دیا جو دت ہوئی شکلیں دکھانے سے بھی گئے۔ اب اس دعا کے ساتھ اجازت چاہوں گی کہ خدا پاک اس ملک اور اس کے رہنے والوں پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے، آمین۔''

محمد اقبال کی خوشی کورنگی سے ''اس ماہ کے جاسوسی سے محظوظ ہونے کے لیے بک اسٹال کا رخ کیا 4 تاریخ کو اور بامراد لوٹے۔ ڈاکٹر انکل کی مہربانیاں صنفِ وجاہت پر حیران کر رہی ہیں۔ دو صنفِ وجاہت کے ساتھ ایک صنفِ نازک وہ بھی مسکراہٹ لیے ان کا استقبال کر رہی ہے۔ حیرانی تو ہو رہی ہے دیکھتے ہیں صنفِ نازک اس پر کیا تبصرہ کرتی ہیں۔ ٹائٹل سے نکل کر آگے فہرست میں جہاں ہمارے پسندیدہ رائٹر طاہر جاوید مغل کا نام بھی جگمگا رہا

تھا۔ ادارے کو شاید ہمارے احساسات اور گزارشات پر رحم آیا اور مغل صاحب کی اس شمارے میں انٹری کروا دی گئی، شکریہ ادارے کا۔ مغل صاحب کا نام دیکھ کر کسی اور کہانی سے شروعات کریں ایسا میرے لیے بہت مشکل ہے۔ ایک زمانے میں اس سے کہیں زیادہ پسندیدگی انجم علیم صاحب اور علیم الحق حقی صاحب کے نام سے وابستہ تھی۔ ان کے قلم سے لکھی گئی تحریروں سے ہی شروعات کرتا تھا، خیر مغل صاحب سے شروعات کرنے سے پہلے اداریہ کے تفکرات سے مستفید ہوتے ہوئے۔ دعا گو ہیں اللہ تعالیٰ سے کہ ہمارے حکمرانوں کو اقتدار پر قابض رہنے کا جو جنون ہے اسی جنون سے ملک کے مسائل اور عوام کی خدمت کا جذبہ بھی عطا فرمائے آمین۔ چٹکی نکتہ چینی میں حاضر ہوتے ہی افتخار حسین صاحب کو کرسی صدارت پر قدم رنجا پایا، مبارک ہو۔ آپ کا تبصرہ عمدہ تھا۔ باقی ساتھیوں کے خطوط بھی اچھے تھے۔ مغل صاحب کی استادی ایک نایاب تحریر تھی۔ پڑھتے رہے اور مسکراہٹ بکھیرتی رہی۔ حسنات کا کردار بہت دلچسپ رہا۔ اس کے بعد ابتدائی صفحات پر خوں ریز اچھی اور سبق آموز کہانی تھی۔ اس کے بعد اسما قادری کی گرداب میں ایسے گھرے کہ کہانی ختم ہونے پر وا بھی ایسا لگا کہ گرداب سے نکل آئے ہیں۔ شہریار اور سلو کی واپسی ڈاکٹر صاحب کے ساتھ چانگا کے توسط سے ہوئی اور دیکھنا یہ ہے کہ ماہ بانو اور خان صاحب کو اسما قادری کب اور کیسے ہنگاموں کے بعد واپس پاکستان لاتی ہیں اور شہریار سے کس انداز میں سامنا کرواتی ہیں۔ انتظار رہے گا۔ جواری کی اس قسط کو بھی پڑھ کر وہ توقعات پوری نہیں ہو رہی ہیں جو اقبال صاحب سے وابستہ کر لی تھیں۔ جواری پڑھنے کے بعد پاکستانی ٹیم کے کپتان مصباح الحق کی یاد آئی جو اپنی اچھی کارکردگی کے باوجود تنقید کا نشانہ بنتے رہے ہیں لیکن اپنی کپتانی قائم رکھے ہوئے ہیں۔ اسی طرح دعا ہے کہ احمد اقبال اپنے قلم کی حشر سامانیوں کے ساتھ جواری کے ٹیمپو کو اچھا اور دلچسپ بناتے ہوئے اپنے قارئین کو راغب کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ چھوٹی کہانیوں میں بشریٰ امجد کی اشارہ اچھی لگی۔ باقی زیر مطالعہ ہیں۔“

چشمہ بیراج سے ساگر کلوکر کا احتجاج ”پنجابی فلموں کی طرح جاسوسی کا ٹائٹل بھی یکسانیت کا شکار ہوتا جا رہا ہے۔ وہی بھیانک چہرے پستول مار دھاڑ۔ کچھ تبدیلی لائیں۔ کبھی کبھی پھول ہی دکھا دیا کریں۔ (پھر آپ کہیں گے جاسوسی کا شمارہ اور پھول... غلطی تو نہیں ہو گئی) چٹکی نکتہ چینی میں افتخار حسین اعوان چھپی بانٹ رہے تھے۔ کرسی صدارت مبارک ہو۔ کشمیری بھائیوں کو محفل میں دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کیونکہ کشمیر ہماری شہ رگ ہے۔ اپنے پڑوسی ضلع کے قاری کاظمی کو سالگرہ مبارک۔ بشریٰ افضل، عروج ناز اور بلقیس خان کے خطوط زبردست تھے۔ سب سے پہلے گرداب پڑھی۔ شہریار اور سلو ایکشن میں نظر آئے۔ اسما قادری صاحبہ سرورق کے لیے جلدی لکھیں ورنہ احتجاجاً پڑھنا چھوڑ دوں گا۔ تاریک سورج میں یوسف ملالہ زئی کی جھلک نظر آئی۔ مہنگی بھول کچھ خاص نہیں تھی۔ جواری اچھی جا رہی ہے۔ رنگ باز ہماری بے حسی کو اجاگر کر رہی تھی۔ باقی ڈائجسٹ بھی زیر مطالعہ ہے۔“

رانا منشی حماد فرہاد قیدی سزائے موت کا خط سینٹرل جیل ساہیوال سے ”جاسوسی فروری کی 8 تاریخ کو وصول ہوا۔ خلاف توقع۔ سرورق کی حسینہ کو دیکھ کر پی ٹی وی کا ایک ڈراما یاد آ گیا۔ بھلا سا نام تھا ذہن سے نکل گیا۔ دوسری طرف ایک آدمی غلط فہمی کا شکار ہو کر مجھ پر پستول تانے ہوئے تھا۔ اسے کہیں مجھے ڈرائے نہ بلکہ سمجھائے اور ڈاکر انکل تو جیسے ابھی ابھی خون پینے سے فارغ ہوئے تھے۔ پچھلے ماہ کے جاسوسی میں نجمہ مودی کی کہانی خواب پڑھی تو خیال ابھرا آپ سے سوال کروں کیا ہم بھی اپنے محبوب مصنفین کو خط لکھ سکتے ہیں؟ آیا آپ کے پاس بھی کوئی ایسا انتظام ہے کہ مصنف کو لکھا گیا خط اس کو مل سکے؟ (جی... آپ کا لکھا ہوا خط ان تک پہنچ سکتا ہے... جاسوسی کے پتے پر) پہلے تو میں اکیلا اپنی کوٹھری میں جاسوسی اور سسپنس کا رسیا تھا مگر پچھلے چند مہینوں سے میرے کوٹھری کے تین چار دوسرے دوست بھی اس مرض لاعلاج کا شکار ہو چکے ہیں اور ان کی تمنا ہے کہ آپ کو ان کے نام بھی بتاؤں۔ رشید، بخاری اور موٹا طارق۔ دراصل یہ وہ ان پڑھ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ پہلے میں خود پڑھوں پھر پوری تفصیل اور مزے سے بھرپور لوازمات کے ساتھ ان کے گوش گزار کروں۔ رسالہ ملتے ہی محفلِ یاراں کا رخ کیا۔ سب سے پہلے خوں ریز کا تعاقب کیا۔ خوں ریز کو چھیڑ تو لیا مگر بور بہت ہوا۔ اس طویل اسٹوری کو پڑھتا جاتا اور خود کو کوستا جاتا کہ کیوں اسے پڑھ رہا ہوں مگر میں خود کی م ہی ستا ہوں۔ یہ پوری کہانی ختم کی اور خدا کے حضور سر بسجود ہوا شکر بجا لایا۔ تب تک دماغ پلپلا ہو گیا تھا بلکہ دماغ کی دہی ہو گئی تھی۔ آصف کریکر کا کردار ڈرامائی سا تھا۔ خوف زدہ کرنے کی کوشش زیادہ کی گئی تھی جو کہانی کو حقیقت سے دور لے گئی۔ طاہر جاوید مغل کی کہانی استادی پڑھی اور پورے ادب و احترام کے ساتھ پڑھی۔ کیونکہ مغل صاحب کی تحریروں کی پسندیدگی مجھے میرے والد صاحب سے ورثے میں ملی ہے۔ کہانی کے شروع میں تو یونہی محسوس ہوا جیسے میں اپنی زندگی کی کہانی پڑھ رہا ہوں جس نے مجھے قفسِ اسیری تک پہنچانے میں اہم اور کلیدی کردار ادا کیا تھا مگر جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ کامی کے حالات بعد میں کافی مختلف ثابت ہو جائیں گے، کہانی نے کافی محظوظ کیا۔ شہباز احمد کی محافظ پڑھی جو ادھوری رہ گئی۔ جمال دتی کی چور اور مور میں ڈورس کی ذہانت سامنتھا کی ذہانت سے مات کھا گئی۔“

پشاور سے طاہرہ گلزار کا اظہارِ تشکر ”شکر ہے کہ اتنے عرصے بعد ناچیز کا خط شائع ہوا۔ (خط صاف اور کھلا کھلا لکھیں تو ہر ماہ شائع ہو) جب جاسوسی کے دوست مظہر سلیم آف رحیم یار خان نے میسج کر کے یہ خوش خبری دی۔ جمال دتی کی ایک مختصر تحریر چور اور مور دونوں بہنوں نے بڑی چالاکی دکھائی لیکن آخر سراغ رساں بھی ایک عورت تھی آخر جیولری چھپانے کی جگہ کا سراغ لگا ہی دیا۔ احمد اقبال نے جواری کو گول، گول گھمانے کے بعد آخر تورین کی جھلک دکھا دی اور فاطمہ نام کا سسپنس چھوڑ دیا۔ جانیں تھیلے میں سے بلی کب نکلے گی۔ انور اور ملک سلیم کی ایک دوسرے پر برتری حاصل کرنے کی ایک ناکام کوشش کا نام شاید جواری ہے۔ مغربی مختصر تحریر محافظ رائٹر شہباز احمد واقعی قتل کرنے کا منصوبہ تو زبردست تھا لیکن باڈی گارڈ بچ گیا جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ بشریٰ امجد کی مختصر تحریر اشارہ بہت ہی دلچسپ تحریر، کاش انسپکٹر قاسم جیسے ہمارے ملک کے پولیس اور سراغ رساں بھی ہو جائیں تو کیا کہنا۔ سلیم انور کی مختصر تحریر غم گسار یہ مغربی طرز کی کہانی جس میں ایک بیوی نے کتنے انوکھے طریقے سے قتل کر دیا۔ سکندر علیم کی مختصر تحریر رسیا میں پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ مس پارکر انسانوں کا شکار کرتی ہے۔ اپنے پالتو جانور کے لیے ہیں مگر مچھ سمجھی تھی۔ واہ جہاں طاہر جاوید مغل کا نام آئے تو پھر یہ تو ہو نہیں سکتا کہ جاسوسی کو اس وقت تک ہاتھ سے نیچے رکھوں جبکہ کہانی پوری نہ کروں۔ ان کی ہر تحریر کی طرح یہ تحریر استادی بھی ہنسی مذاق اور جاسوسی سے پر تھی۔ جس جس کے آنکھوں سے آنسو نکل

آئے۔ سرورق کی پہلی کہانی تاریک سورج سرور اکرام کی بہت شاندار تحریر علم اور علم کے دشمنوں پر۔ سرورق کی دوسری کہانی کاشف زبیر کی ایک اور اچھوتی تحریر ویلڈن کاشف زبیر۔ اب باقی جاسوسی بھی جلد پڑھ لوں گی لیکن پلیز کوشش کریں کہ ہر ڈائجسٹ بروقت دستیاب ہو...“

اسلام آباد سے انور یوسف زئی کی عجلت اور شکایت ”جاسوسی اس ماہ یہاں اسلام آباد میں بے حد تاخیر سے 10 فروری کو ملا اور عجلت میں پڑھنا پڑا تاکہ تبصرہ وقت پر ارسال ہو سکے۔ سرورق اس ماہ بھی پُرکشش تھا اور حسینہ اور مرد حضرات ویسے ہی لگتے تھے۔ خطوط کی محفل کے سردار اس بار افتخار اعوان صاحب ٹھہرے جس کے وہ واقعی حق دار تھے۔ مبارک باد۔ خطوط اس ماہ صنفِ نازک کے بڑھ کر 7 ہو گئے جو کہ ایک اچھا شگون تھا۔ البتہ بی بی ماہا ایمان کی غیر حاضری اچھی نہ لگی کہ چٹکیاں لینے میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ کہانیوں میں جواری کی قسط معنی خیز رہی کہ خاور کو آخر کار تورین مل ہی گئی۔ یادداشت بھی واپس آ ہی جائے گی اور شہر سے علاج کے بعد واپسی ہو ہی جائے گی۔ دوسری قسط وار گرداب اب شاید اختتام کے قریب ہے کہ شہریار اپنے مشن کو پورا کر کے اپنے ملک کو واپس روانہ ہو گیا ہے۔ شمارے کی اولین طویل کہانی خوں ریز کراچی کے موجودہ حالات کی صحیح عکاسی کرتی ہے اور ایک پُراثر کہانی ہے۔ سرورق کی دوسری کہانی کاشف زبیر کی مہنگی بھول، تاریک سورج سے بدرجہ بہتر تھی۔ اس ماہ کی بہترین تحریر طاہر جاوید مغل صاحب کی استادی رہی کہ ملک کے موجودہ حالات میں مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ بدیسی کہانیوں میں غم گسار اور پس پردہ اچھا انتخاب رہا۔ رسالے کی جلد بندی اس ماہ نقائص سے پاک رہی ورنہ گزشتہ ماہ تو جاسوسی اور سرگزشت کے اوراق اول بدل گئے تھے جس سے پڑھنے میں کافی دشواری ہوئی۔ امید ہے آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔“ (یقیناً)

ادریس احمد خان کی کراچی سے تعریف و توصیف ”جاسوسی اپنے وقتِ مقررہ سے دو تین روز تاخیر سے ملا اور یہ سلسلہ تین چار ماہ سے چل رہا ہے اگر وقت پر پرچہ ملے تو بے تابی ہوتی ہے۔ خیر سب سے پہلے سرورق کو بغور دیکھا جو ڈاکر صاحب کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ اداریے سے مستفید ہوتے۔ نکتہ چینی میں افتخار حسین سر فہرست تھے، مبارک باد۔ محفل میں نئے اور پرانے دوست بھی جلوہ گر تھے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی خوں ریز کہانی آج کل کے حالات کے مطابق تھی۔ باطل کو شکست ہوئی، حق جیت گیا۔ رنگ باز بھی جرم و سزا پر مبنی اچھی کہانی تھی۔ اس کے بعد سلسلے وار کہانی جواری پڑھی کہانی میں ٹھہراؤ آ گیا ہے مگر دلچسپی ہے۔ اس کے بعد دوسری کہانی گرداب پڑھی جو کامیابی سے جاری و ساری ہے اور اپنی طرف توجہ مبذول رکھے ہوئے ہے۔ بند مکان میں ایک چھوٹے سے لڑکے نے قتل کی سازش کو غلط الزام کر دیا۔ اپنی ذہنی مہارت سے ایک الجھے ہوئے کیس کی گتھی کو سلجھا دیا۔ چور اور مور میں ہیروں کی چوری کا معما دونوں سراغ رسانوں نے حل کر دیا جو انتہائی سمجھداری اور منظم طریقے سے منصوبہ بنایا گیا تھا۔ پس پردہ بھی اچھی لگی۔ ہمزاد بھی بہتر تھی۔ آصف ملک کی سردِ ناداں بہت اچھی لگی۔ رسیا بھی بہتر تھی جہاں ایک عورت اپنے شاطر دماغ کی مدد سے انسانوں کو مار کر اپنے تیندوے کے لیے خوراک کا بندوبست کرتی تھی۔ اپنی مکاری اور عیاری کے سبب قانون کے چنگل میں بھی نہیں آئی۔ استادی طاہر جاوید مغل کی تحریر مہارت کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ یہی منجھے ہوئے لکھاری کی پہچان ہے تحریر اس کی پہچان ہوتی ہے۔ کچھ مزاح کا عنصر بھی غالب رہا جس نے خوب مزہ دیا۔ محافظ میں ریمنڈ مارٹن اپنی حاضر دماغی سے موت سے ہمکنار ہونے سے بال بال بچ گیا۔ اشارہ میں محض ایک ذرا سے اشارے سے ایک فرض شناس انسپکٹر نے ذہانت سے کام لے کر ایک مجرم کے گرد پولیس کا گھیرا تنگ کر دیا۔ غم گسار میں ایک پڑوسی نے دوسرے پڑوسی کے حقوق کا خیال نہیں کیا اور ایسے بے حس انسان کو اس کی اپنی ہی بیوی نے سزا دے دی، ویلڈن۔ اس کے بعد سرورق کی دونوں کہانیوں میں مہنگی بھول اور تاریک سورج دونوں ہی کہانیاں بہترین کہانیاں تھیں۔ سچ میں کترنوں نے بھی خوب لطف اندوز کیا۔“

نوشہرہ سے محمد جاوید مرزا کی تجزیہ نگاری ”جاسوسی اور سسپنس کا پرانا قاری ہوں۔ ماہ فروری کا جاسوسی ملا۔ میری پہلی ترجیح سلسلے وار کہانیاں ہوتی ہیں جن میں سب سے پہلے نمبر پر جواری ہے۔ احمد اقبال صاحب کو مبارک ہو۔ کہانی مکمل طور پر قاری کو گرفت میں لے چکی ہے۔ احمد اقبال کی منظر نگاری کمال کی ہے۔ کہانی کا تسلسل و نشیب و فراز بہتی ندی کی طرح ہے۔ کرداروں پر مکمل کنٹرول ہے کہ پڑھنے والا کرداروں میں گم ہو کر خود کو بھول جاتا ہے۔ اسما قادری کی گرداب مجموعی طور پر کہانی ٹھیک جا رہی ہے۔ شہریار اور سلو ایک خوں ریز معرکے کے بعد وطن واپس پہنچتے ہوئے پھر گھیر لیے گئے، دیکھیے اب کیا بنتا ہے۔ ماہ بانو پر بھی بہت بری گزری۔ اب تو شہریار سے ایک بھرپور ملاقات ہو جانی چاہیے۔ سلسلے وار کہانیوں کے بعد شمارہ شروع سے پڑھنا شروع کیا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی خوں ریز خوب تھی پسند آئی۔ لیکن نویرا کے کردار سے ڈاکٹر صاحب نے زیادتی کر دی۔ کہانی کا انجام دوسروں کے ہاتھ میں دے دیا جس کی وجہ سے سارا مزہ کرکرا ہو گیا۔ امجد رئیس کے رنگ باز نے متاثر کیا۔ انجام خوب صورت تھا۔ تنویر ریاض کی درآمدہ کہانی بند مکان کی خاص بات چھوٹے بچے کا کیس کو خوب صورت طریقے سے حل کر دینا، ایک نیا خیال تھا۔ ترجمہ کہانی جمال دتی صاحب کی چور اور مور کا انجام حسب معمول چونکا دینے والا تھا۔ بابر نعیم کی کاوش پس پردہ میں کرداروں کی بھرمار نے کہانی کو سمجھنے میں دماغ کو تھکا دیا جبکہ ہمارا مقصد تفریح ہوتا ہے۔ بابر صاحب کہانی کا انتخاب کرتے وقت پڑھنے والے کا بھی خیال کر لیا کریں۔ میمونہ عزیز کی مختصر کہانی کا انجام حیران کن تھا جبکہ جس کا حقیقی زندگی سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ آصف ملک کی کہانی سردِ ناداں خوب صورت انجام پر مبنی اچھی تحریر تھی جس نے متاثر کیا۔ سکندر علیم کی رسیا بھی خوب تحریر تھی۔ فلیشیا کی حقیقت نے لرزا کر رکھ دیا۔ طاہر جاوید مغل کی ہلکی پھلکی تحریر حسب توقع مزہ دے گئی۔ تحریر خوش انجام تھی جبکہ ان کا یہ مزاج نہیں۔ شہباز احمد کی محافظ حسب معمول مجرم انجام کی اچھی تحریر تھی۔ بشریٰ امجد کی اشارہ نے بالکل متاثر نہیں کیا۔ سلیم انور کی غم گسار کہانی کی حد تک ٹھیک ہی تھی۔ کتے کے بدلے بندہ مارنا گوروں کا ہی کچھ ہو سکتا ہے۔ سرورق کی پہلی کہانی سرور اکرام کی زبانی، متاثر نہیں کر سکی۔ کرداروں میں کافی جھول تھا۔ کاشف زبیر کی مہنگی بھول، تجسس و سسپنس سے بھرپور تحریر تھی۔ اگرچہ کہانی کی ہیروئن شیما کا کردار بہت بودا تھا۔ شاکر نے باپ ہونے کا حق ادا کیا اور مرکزی کردار بھی شاکر کا ہی تھا۔“

سید فصیح اقبال، سابق صدر APNS، سابق صدر CPNE اور سابق سینیٹر مورخہ 20 فروری 2014ء کو علالت کے بعد خالقِ حقیقی سے جا ملے انا للہ وانا الیہ راجعون ادارہ مرحوم کے پس ماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے اور ان کی مغفرت کے لیے دعا گو ہے۔

نغمۂ مرگ

امجد رئیس

بڑی طاقتیں اپنے گھناؤنے منصوبے کامیاب بنانے کے لیے خود میدانِ عمل میں نہیں آتیں بلکہ اپنے زرخرید گرگوں کو اس بساط پر آگے بڑھاتی ہیں۔ درجہ بہ درجہ یہ عمل نیچے تک چلا جاتا ہے اور سازشوں کی صورت گری مقامی ڈان، سرغنوں اور چور اچکوں کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے جن کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا کہ انہیں کسی بڑی عالمی سازش کا ایندھن بنایا جارہا ہے۔ باضمیر لوگ بھی اس صورتِ حال سے نفرت کرتے ہیں اور کھل کر اس کے بارے میں صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔ زیرِ نظر ناول میں ولبراسمتھ نامی شہرۂ آفاق مصنف نے افریقا کے زرخیز اور مردم خیز خطے میں کارگزار قوتوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے... جو ہوسِ زر اور نشۂ اقتدار میں چھوٹی قوموں کا لہو چوسنے کے درپے ہیں... پس ماندہ افریقا اور اس کے وسائل ان کا نشانہ ہیں۔ یہ ہوش ربا اور خیال انگیز کہانی دعوت دیتی ہے کہ ہم بھی اپنے گردوپیش سے غافل نہ رہیں۔ کہیں چھوٹے موٹے جرائم یا تخریب کاری کی آڑ میں ہمیں تو کسی بڑی آگ کے شعلوں میں نہیں دھکیلا جارہا۔ جانی اینزاہو کے سفاکانہ قتل سے شروع ہونے والی، پل پل رنگ بدلتی یہ کہانی آخرکار ایسے خون آشام موڑ پر ختم ہوتی ہے جو عبرت آمیز بھی ہے اور حوصلہ افزا بھی کہ کبھی کبھی ایک فرد بھی حریفوں کے لشکر کو پامال کر سکتا ہے... شرط صرف عزم اور حوصلے کی ہوتی ہے...

عالمی بساط پر فتنہ گری کرنے والی قوتوں کی
ہولناک پنجہ آزمائی کی چشم کشا داستان

غم و غصے نے اس کی حالت مزید خراب کر دی تھی... وہ تو مر ہی رہا تھا... اس کے بیوی بچے بھی ہلاک کر دیے گئے تھے... وہ جانتا تھا کہ اس کے پاس بہت قلیل وقت ہے، اسے چند منٹ درکار تھے... مرنے سے محض چند منٹ... وہ اپنے ہی لہو میں لت پت پڑا تھا... مہلک ہتھیار کی گولی نے اس کے پیٹ میں جان لیوا زخم لگایا تھا۔ جس سے خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ بہتے لہو کے ساتھ زندگی بھی جسم کے لباس سے پھسل رہی تھی۔ اس کا ذہن صاف تھا، چند منٹ... وہ دل ہی دل میں گڑگڑایا۔ آخری امید... مرنے سے قبل وہ ایک پیغام چھوڑنا چاہتا تھا۔ زمین پر بکھرے کاغذات میں سے قریب ترین کاغذ کی طرف اس نے رینگنا شروع کیا...

وہ کاغذ کو ہاتھ میں لینے ہی والا تھا کہ کمرے کی مدھم روشنی معاً مدھم پڑ گئی۔ کوئی داخلی دروازے میں آن کھڑا ہوا تھا، اس نے سر گھما کر دیکھا۔

وہ شخص چلاتا ہوا باہر نکل گیا ”وہ زندہ ہے، وہ ابھی تک زندہ ہے۔“ اس کے دروازے سے ہٹتے ہی اندرونی روشنی میں اضافہ ہوگیا۔

”جلدی کرو...“ اس نے خود سے سرگوشی کی۔ اس کی نظر دھندلانے لگی تھی... زخمی نے کروٹ لی اور کاغذ کو زمین پر پھیلا دیا۔

اپنے ہی خون میں انگلی ڈبو کر کاغذ پر اس نے انگریزی کا حرف بنایا... پھر دوسرا حرف بنایا... پھر تیسرا اس کا سر گھومنے لگا... باہر سے چیخ و پکار کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ اس کا لہو رنگ سر زمین پر ٹِک گیا۔ اب آخری حرف... باہر بھاگتے قدموں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ اس نے سر اٹھائے بغیر اندازے سے خون میں ڈوبی انگلی کاغذ پر گھمائی تاہم قوس مکمل نہ ہو سکی... کوئی لمحہ جاتا تھا کہ حملہ آور اندر داخل ہو جاتے۔ اب وقت نہیں رہا تھا۔

اس کی انگلی نے ارادے کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا۔ اس نے بچی کچھی ہمت جمع کر کے کاغذ مٹھی میں بند کیا... اور مٹھی پیٹ کے لہولہو زخم میں گھسا دی۔ اس کے حلق سے دردناک کراہ خارج ہوئی اور آنکھوں کے آگے سیاہ پردہ تن گیا۔ اس نے ڈوبتے ذہن کے ساتھ بیوی بچوں کو یاد کیا اور کسی نہ کسی طرح خود کو پیٹ کے بل الٹا دیا۔ اس کی سانس اکھڑنے لگی... وہ آنے والوں کو نہ دیکھ سکا۔ آخری احساس رائفل کی سرد نال کا تھا جو اس کے سر سے آن لگی تھی۔ اس نے کوئی خوف محسوس نہیں کیا۔ نہ گولی کا دھما کا سنا۔ مرتے مرتے شاید وہ ایک اہم اشارہ کرنے میں کامیاب رہا تھا... یا شاید... نہیں...

☆☆☆

ڈاکٹر ڈینیل آرم اسٹرانگ نے وسیع گودام کے نیم تاریک ماحول میں جھانکا اور سیٹی بجا کر رہ گیا۔ ”لگتا ہے میری طویل غیر حاضری کے دوران میں تم بہت مصروف رہے ہو؟“ ڈینیل نے تبصرہ کیا۔ ہاتھی دانت کا ذخیرہ چھت تک صفائی کے ساتھ چُنا ہوا تھا۔ بین الاقوامی مارکیٹ میں اس کی قیمت کسی طرح لاکھوں ڈالرز سے کم نہیں ہوگی۔

جانی ایزاہو نے اچٹتی ہوئی نگاہ اپنے پرانے دوست کے چہرے پر ڈالی۔ ڈاکٹر اس کا پرانا دوست تھا لیکن جانی اس کی موجودگی میں ہمیشہ ایک پُراسراری بے چینی کا شکار ہو جاتا تھا۔

وہ دونوں اس وقت جس چوبی گودام کے سامنے موجود تھے یا تھا، وہ ڈینیل نے کئی برس قبل اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا جب اس نے ڈاکٹریٹ بھی نہیں کی تھی۔ ان دنوں وہ جونیئر گیم رینجر کے طور پر نیشنل پارکس ایڈمنسٹریشن میں ہوا کرتا تھا۔ جانی چیف وارڈن تھا وہ ہر وقت رائفل سے مسلح رہتا تھا اور راہنمائی کا فریضہ بھی وہی انجام دیتا تھا۔ انہی دنوں ڈینیل نے اسے انگریزی لکھنی پڑھنی اور بولنی سکھائی تھی اور ان کے درمیان دوستی کا پُرخلوص رشتہ بھی پروان چڑھا تھا۔

ڈینیل اپنے علم و فضل اور وسیع مطالعے کی وجہ سے افریقا کا نامور ماہرِ حیاتیات سمجھا جاتا تھا۔ اس کی شخصیت، کردار اور پُرکشش اندازِ گفتگو نے اسے ٹی وی اسکرین کا بھی ایک مقبول کردار بنا دیا تھا۔ ٹی وی پر وہ زیادہ تر اپنی ہی افریقی پروڈکشنز میں نظر آتا... اسے افریقا سے عشق تھا۔

ڈاکٹر کے باپ نے دوسری جنگِ عظیم میں شمالی افریقا میں خدمات انجام دی تھیں۔ بعد ازاں وہ رہوڈیشیا منتقل ہو گیا۔ ڈینیل کی جائے پیدائش افریقا تھی۔ تعلیم کے لیے اسے ابتدا ہی میں انگلینڈ بھیج دیا گیا تھا جہاں اس نے کافی عرصہ تعلیم و تحقیق میں گزارا پھر واپس آ کر رہوڈیشیا میں نیشنل پارک کی سروس جوائن کر لی...

ڈینیل نے جانی اور اپنے کیمرے مین جاکو کو اشارہ کیا اور گودام میں داخل ہو گیا۔ ایک کونے میں بکھرے ہوئے ہاتھی دانت کے ڈھیر میں سے ایک وزنی دانت ڈینیل نے اٹھایا۔ جاکو نے ڈینی کے اشارے پر اپنا کام شروع کر دیا۔

”ہاتھی دانت“ ڈینیل نے اپنے مخصوص لہجے میں کیمرے کو دیکھتے ہوئے بولنا شروع کیا۔ ”فراعنہ مصر کے وقت سے لے کر تا حال اس کا شمار بیش قیمت اور خوبصورت ترین قدرتی چیزوں میں ہوتا ہے، افریقی ہاتھی کی شان... لیکن یہی شان اس کی جان کو بھی مصیبت میں ڈال دیتی ہے۔“

ڈاکٹر ڈینیل نے قطار اندر قطار قرینے سے سجے ہوئے ہاتھی دانتوں کے تنگ راہداریوں میں دھیرے دھیرے چلتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

”دو ہزار سال سے انسان اس عظیم الجثہ حیوان کی جان کا دشمن رہا ہے... صرف اس وہائٹ گولڈ کے حصول کے لیے... پھر بھی گزشتہ دہائی میں افریقی براعظم میں ہاتھیوں کی تعداد دو ملین سے اوپر تھی۔ اس آبادی کو قابو کرنے اور تحفظ دینے کی ضرورت تھی۔ یہ ایک اثاثہ ہے۔ مگر اچانک حالات بہت غلط رخ اختیار کرنے لگے... یہ ایک المیے سے کم نہیں کہ گزشتہ دس برس میں تقریباً ایک ملین ہاتھیوں کا صفایا کر دیا گیا ہے۔ اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ایسا کرنے کی اجازت دی گئی ہوگی۔“

”آج میں ایک بار پھر افریقا میں موجود ہوں۔ مجھے اور میرے ساتھیوں کو اس خرابی کو ڈھونڈنا ہے اور یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ ہم اس معدوم ہوتے ہوئے اثاثے کو کیونکر محفوظ بنا سکتے ہیں؟“

ڈینیل نے جانی کی طرف دیکھا۔ ”آج میرے ساتھ مسٹر جانی ایزاہو ہیں جو کہ چی واؤ نیشنل پارک کے چیف وارڈن ہیں، اتفاق سے ”شونا“ زبان میں جانی کا مطلب ہے ”ہاتھی“۔“ یہ کہہ کر وہ جانی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”مسٹر جانی، ہم جاننا چاہیں گے کہ گودام میں کتنے ہاتھی دانت ہیں؟“

”تقریباً پانچ سو۔ ہر دانت کا اوسط وزن سات کلو ہے۔“

”اس وقت بین الاقوامی مارکیٹ میں ریٹ تین سو ڈالر فی کلو ہے۔“ ڈینیل نے مداخلت کی۔ ”اس کا مطلب ہے اس ذخیرے کی مجموعی مالیت کئی ملین ڈالرز سے متجاوز ہے۔ یہ سب کہاں سے آیا؟“

”کچھ ہاتھی دانت قدرتی موت مرنے والے ہاتھیوں کی باقیات سے جمع کیے گئے ہیں، بیشتر دانت غیر قانونی ہیں جو ہمارے رینجرز نے چوروں کے خلاف کارروائی کر کے حاصل کیے ہیں...“

”چی واؤ میں غیر قانونی شکار کی کیا صورتِ حال ہے؟“

”صورتِ حال بدتر ہے“ جانی نے افسردگی سے سر ہلایا۔ ”کینیا، زمبیا اور تنزانیہ سے ہاتھیوں کا صفایا کر دیا گیا ہے اور پیشہ ور شکاریوں نے اب ہماری جانب رخ کر لیا ہے۔ یہ چور دریا پار کر کے آتے ہیں۔ یہ لوگ نہ صرف منظم ہیں بلکہ ان کے ہتھیار بھی ہم سے بہتر ہیں... یہ لوگ ہاتھی، گینڈے کے علاوہ ناپسندیدہ افراد کو بھی دیکھتے ہی گولی کا نشانہ بنا دیتے ہیں۔“

”سب تباہ کاری اس کے لیے؟“ ڈینیل نے ہاتھی دانت کے ڈھیر کی طرف اشارہ کیا اور جاکو کی طرف دیکھا جو مستعدی سے اپنا کام کر رہا تھا۔ ڈینیل کو وہ درد یاد آیا جو اس نے پہلی بار اس وقت محسوس کیا تھا جب اس نے قدیم افریقا اور اس کے جانوروں کی سلطنت کے بارے میں لکھا تھا۔

”اس شاندار حیوان کا اس تیزی سے صفایا ہو رہا ہے۔“ اس کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی اور پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ ”ہاتھی مر رہے ہیں، کیا افریقا مر رہا ہے؟“ اس کے ٹھوس لہجے میں درد اور خلوص کی آمیزش جیسے چیخ رہی تھی۔ کیمرا دیانتداری سے ریکارڈنگ میں مصروف تھا۔ افریقا میں داخل ہوتے ہی اس کے اندر ان دیکھی تبدیلیاں در آتی تھیں اور وہ بعض ایسے کام بھی کر جاتا تھا جو اس کی ذمے داری تھی نہ اس کا معاوضہ ملتا تھا۔ وہ نڈر اور فولادی اعصاب کا مالک تھا۔ اس کی پیشہ ورانہ مہارت اور دلیری افریقا کے عشق کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر غیر معمولی پروڈکشنز کی صورت میں دنیا کے سامنے آتی تھی اور اس کے ٹی وی پروگرام دنیا میں غیر معمولی مقبولیت... حاصل کرتے تھے۔

”جانی ڈیئر تم نے کچھ دیر قبل بتایا تھا کہ اس قیمتی ذخیرے میں ان ہاتھیوں کی قربانی بھی شامل ہے۔“ ڈینیل نے گھوم کر ہاتھ سے اشارہ کیا ”جنہیں تم لوگوں نے خود مارا ہے۔ کیا تم اس مجبوری کی وضاحت کرو گے؟“

جاکو نے کیمرا جانی پر مرکوز کر دیا۔

”محکمے کی مجبوری ہے جو ہمیں ایسے آپریشن کرنے پڑتے ہیں۔“

”کیا مجبوری ہے؟“

”زمبابوے میں ہاتھیوں کی تعداد کا تخمینہ باون ہزار ہے اور چی واؤ نیشنل پارک میں یہ تعداد اٹھارہ ہزار ہے۔“ جانی نے اعداد و شمار گنوائے۔ ”اس حساب سے جنگلی حیات میں ہاتھی تیسرے نمبر پر ہے۔“

”اس کا مطلب ہوا کہ اتنی بری حالت میں بھی یہ حقائق حوصلہ افزا ہیں۔“ ڈینیل نے بھویں اچکائیں۔

”برعکس اس کے ڈاکٹر“ جانی نے فکرمندی سے کہنا شروع کیا۔ ”یہ اعداد ہمارے لیے ایک زاویے سے دردِ سر بھی ہیں۔ ہم اتنے ہاتھیوں کو سپورٹ نہیں کر سکتے۔ ہم نے تخمینہ لگایا ہے کہ تیس ہزار کی تعداد زمبابوے کی حد تک ایک مثالی پاپولیشن ہوگی۔ اس وقت بھی ایک بہت بڑا ہاتھیوں کا گروہ تیزی سے اپنا حجم پھیلا رہا ہے...

”ایک ہاتھی کو ہر روز ایک ٹن نباتات کی ضرورت پڑتی ہے اور وہ اپنی پیٹ پوجا کے لیے ایسے درخت بھی گرا دیتا ہے جو اپنی بڑھوتری کے لیے کئی سو سال لے چکے ہوتے ہیں...

”اگر ہم ان کو کھلی چھوٹ دے دیں تو بہت قلیل مدت میں یہ ہزاروں ہاتھی نیشنل پارک کو مٹی کے ایک بڑے پیالے میں تبدیل کر دیں گے... اور جب ایسا ہوگا تو ہاتھیوں کی آبادی بھوکی مر جائے گی۔ ہمارے پاس نہ درخت بچیں گے، نہ پارک اور نہ ہاتھی۔“

ڈاکٹر ڈینیل نے پُرسوچ انداز میں سر کو جنبش دی۔

☆☆☆

یہ پچاس ہاتھیوں کا غول تھا جس میں نر، مادہ اور بچے بھی شامل تھے۔ جانی اور ڈینیل دونوں کے چہروں پر گہری سنجیدگی تھی۔ جو کچھ ہونے جا رہا تھا، وہ دونوں ہی کے لیے نفرت انگیز تھا۔

ڈینیل نے اس ”آپریشن“ کو فلمانے کا فیصلہ سنا دیا تھا۔ دس رینجرز اور پانچ لینڈ رووَرز تھیں۔ فضا میں ایک چھوٹا ہوائی جہاز تھا۔ جانی ریڈیو کے ذریعے پائلٹ سیرا مائنگ سے رابطے میں تھا، وہ لوگ معمول کے مطابق ہاتھیوں کو گھیر رہے تھے۔ جانی نے مائیکروفون ہاتھ میں لیا اور ریڈیو پر پائلٹ سے رپورٹ مانگی۔

"ہاتھی تم لوگوں سے دو میل دور ہیں اور لانگ ویلی کی جانب بڑھ رہے ہیں۔" لانگ ویلی کھلا ہوا گھاس کا میدان تھا جو دریا کے ساتھ ساتھ دور تک چلا گیا تھا۔ رینجرز نے ایک مناسب جگہ اپنی گاڑیاں قطار میں کھڑی کردی تھیں۔ سب گاڑیوں سے اتر آئے تھے۔ جانی نے آخری بار "K" یونٹ کو ہدایات دیں اور رائفل اٹھا کر گاڑی سے کود گیا۔ رینجرز کے پاس پوائنٹ 375 میگنم رائفلز تھیں۔

"چلو" جانی نے سگنل دیا۔ اگرچہ وہ لوگ ایسے آپریشن پہلے بھی کر چکے تھے لیکن ہمیشہ کی طرح اس بار بھی خوش نہیں تھے۔ ہتھیار ان کے ہاتھ میں تھے اور ایمونیشن کی بیلٹس کمر کے ساتھ لپٹی ہوئی تھیں۔ ڈینیل اور جاکو قدرے پیچھے رہ گئے تھے...

رینجرز پچاس پچاس گز کا فاصلہ دے کر ایک قطار میں رک گئے۔ ہلکے زرد رنگ کی خشک گھاس کمر تک بلند تھی۔ سیر امائیک کا جہاز فضا میں چکرا رہا تھا، ہلکی ہوا رینجرز کے چہروں سے ٹکرا رہی تھی اور اس بات کا امکان نہیں تھا کہ ہاتھی ان کی بو پالیں گے۔ جنگل کے آخری سرے کے قریب گرد اڑتی نظر آرہی تھی۔ آگے گھاس کا میدان شروع ہوتا تھا۔ رینجرز کی قاتل لکیر اپنی جگہ پر منجمد تھی۔

بڑے ہاتھیوں کے دیوہیکل ہیولے پہلے درختوں سے باہر آئے۔ ہاتھی کی نگاہ کمزور ہوتی ہے۔ جب تک انہوں نے رینجرز کی موجودگی کا نوٹس لیا، اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ سیدھے نشانے پر آگئے تھے۔ جہاز فضا میں ان کے سروں پر چکرا رہا تھا۔

چھوٹے ہاتھی تھک گئے تھے اور ان کی مائیں درخت کے تنوں کے ساتھ ان کو آگے دھکیل رہی تھیں۔ رینجرز نے لیڈرز کو پہلے نشانہ بنانا تھا۔ زمین ان کے بھاری قدموں تلے لرز رہی تھی...

اگلے ہاتھی سیاہ بادلوں کے مانند جھومتے چلے آرہے تھے۔ جانی پہلی مرتبہ متحرک ہوا... رائفل سر سے اوپر لہرائی اور چلایا۔ دو ہاتھی سیدھے جانی کی جانب آتے آتے رخ بدلنے لگے۔ جانی کی حرکت اور نعرے نے ان کی غلط فہمی دور کردی۔ ان کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ یہ کوئی بوسیدہ درخت کا تنا نہیں بلکہ کوئی جیتا جاگتا دشمن ہے۔

دونوں نے پھر رخ پھیرا اور دل ہلا دینے والی چنگھاڑ کے ساتھ جانی پر جھپٹے۔ ان کے پنکھوں جیسے کان پلٹ کر پیچھے کی جانب چپک گئے۔ یہ حیوانی غضب کی پکی علامت تھی۔ دونوں ہاتھی عمر رسیدہ تھے۔

اس بھیانک لمحے نے ڈینیل کو بھی لرزا دیا۔ قریب ترین سایہ پچاس گز دور رہ گیا تھا اور چالیس میل فی گھنٹا کی رفتار سے سیدھا یلغار کر رہا تھا۔ پورا غول گھاس کے میدان میں داخل ہو چکا تھا... لگتا تھا مہیب چٹانیں لڑھکتی چلی آرہی ہیں۔

تیس گز کی دوری سے جانی نے رائفل کندھے سے لگائی اور ری کوائل کا دھکا جذب کرنے کے لیے آگے کی جانب جھک گیا۔ بیرل پر کوئی ٹیلی اسکوپ نہیں تھی۔ اس قسم کے قریبی تصادم میں جانی کھلے منظر کو استعمال کر رہا تھا۔ اس نے چھوٹی چھوٹی دونوں بوڑھی آنکھوں کے درمیان پیشانی کا نشانہ لیا... نتیجہ فوری اور تیز تھا۔ پرندے کے پَر کے برابر جھریوں بھری بھوری موٹی کھال پر عین اس جگہ غبار اڑا جہاں جانی نے نشانہ لیا تھا... ہاتھی کے اگلے قدم اندر کی طرف مڑے، اور ڈینیل کو لگا زمین اس کے قدموں تلے اچھل گئی ہو۔ دھماکے سے گرد کا بادل اڑا اور مردہ ہاتھی اس میں اوجھل ہو گیا۔

جانی ذرا سا گھوما، پھرتی سے رائفل ری لوڈ کی اور پورے اعتماد سے دوسرا فائر کیا۔ ایک بار پھر یکساں نتیجہ سامنے آیا۔

عقب میں باقی ہاتھیوں میں افراتفری پھیل گئی تھی۔ تجربہ کار رینجرز اطمینان سے تاک تاک کر گولیاں برسا رہے تھے۔ جانی کے پہلے فائر کے بعد چھ منٹ کے اندر لانگ ویلی کی شکارگاہ میں سناٹا چھا چکا تھا۔ طوفانی گڑگڑاہٹ اور گولیوں کے دھماکوں کے بعد یہ سناٹا اور بھی ہولناک محسوس ہو رہا تھا... کوئی چوپایہ اپنے قدموں پر نہیں تھا۔

رینجرز ابھی تک الگ الگ کھڑے تھے... افسردہ اور بے جان سے۔ پھر جانی کے جسم نے حرکت کی۔ وہ بوجھل قدموں سے دو سو ٹن وزنی بے روح لاشوں کی جانب بڑھ رہا تھا۔ وہ ان کو چھو رہا تھا... اس کے چہرے پر اداسی کی پرچھائیاں تھیں۔ جاکو کی فلم بندی جا رہی تھی۔ جانی دیوقامت لاشوں کو چھو چھو کر بڑبڑا رہا تھا... ڈینیل نے سننے کی کوشش کی۔ بمشکل اس کی سمجھ میں چند الفاظ آئے۔

"دوستو ہمیں معاف کر دینا۔"

ڈینیل نے اس کے پیچھے جانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ جانتا تھا کہ جانی کو تنہائی کی ضرورت ہے۔

وہاں کوئی نعرۂ ہائے تحسین نہیں تھا۔ کوئی مبارکباد نہیں تھی... بس ایک سوگواری خاموشی تھی۔

☆☆☆

صبح جانی ناشتا پر ڈینیل کا منتظر تھا۔ مکان کے وسیع دالان میں ڈینیل، جانی کے پاس پہنچ گیا۔ برسوں پہلے یہ مکان اس کا ہوا کرتا تھا۔ پچھلے چند روز میں ڈینیل نے دوستی، محبت اور خیالات کے ضمن میں جانی کو نئے سرے سے دریافت کیا تھا۔

وہ اب تک جانی سے مختلف موضوعات پر کافی باتیں کر چکا تھا جن میں سے بعض کا تعلق محض اس کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے تھا۔ تاہم مرکزی موضوع ہاتھی تھا... اسی مقصد سے وہ یہاں آیا تھا۔ وہ پچھلے کئی مہینوں سے افریقا میں اس پروجیکٹ پر کام کر رہا تھا۔

ہاتھیوں کا قاتلانہ آپریشن اس کے لیے نیا تجربہ تھا... تاہم وہ جانی اور متعلقہ اتھارٹی کی مجبوری سمجھ گیا تھا۔ اس نے اس ضمن میں چند متبادل تجاویز کے بارے میں استفسار کیا اور جانی نے مدلل جوابات کے ذریعے ان کو ناقابلِ عمل قرار دیا۔

جانی کی بیوی ماویس نے ناشتے میں خالص روایتی انتظام کیا تھا۔ بعدازاں وہ دونوں گودام کی طرف نکل گئے۔ ابھی وہ نصف پہاڑی اترے تھے کہ ڈینیل نے ہتھیلی سے آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا بنایا۔ وہ وزیٹرز کیمپ کی جانب متوجہ تھا۔

"میرے خیال میں تم نے بتایا تھا کہ پارک اجنبیوں یا مہمانوں کے لیے بند ہے؟" ڈینیل نے کہا "انجیر کے جنگلی درختوں کے نیچے ایک کاٹیج کھلا ہے اور باہر ایک کار موجود ہے۔"

"وہ ایک خاص مہمان ہے، ہمارے ایک دوست ملک کا سفیر" جانی نے وضاحت کی۔ "وہ بہت زیادہ دلچسپی رکھتا ہے جنگلی حیات میں... خصوصاً ہاتھیوں میں اور اس نے ماحولیات کے ضمن میں ملک میں بہت کام کیا ہے۔ ہم نے اسے خصوصی مراعات دی ہوئی ہیں۔ وہ دوسرے سیاحوں کے بغیر یہاں آنا چاہتا تھا، ہم نے اس کے لیے کیمپ کھلا رکھا ہے۔ اب وہی یہاں موجود ہے۔"

☆☆☆

وہ تین آدمی تھے۔ ڈینیل نے قریب پہنچنے پر اندازے سے سفیر کو پہچان لیا۔ وہ چالیس سے کچھ ہی اوپر ہوگا۔ دراز قامت اور چھریرا بدن، سیدھے سیاہ بال جن میں تیل لگا ہوا تھا اور نفاست سے پیچھے کی جانب بنائے گئے تھے۔ پیشانی ذہانت کی علامت تھی۔ سفیر ایک اچھی شخصیت کا مالک تھا۔ اس کے چہرے کے نقوش اور رنگت بتاتی تھی کہ اس کے آباؤ اجداد خالص چینی نہیں رہے ہوں گے۔

یورپین خون کی آمیزش تھی اور ڈینیل کو اپنے تجزیے پر کوئی شک نہیں تھا۔ وہ خود ایک انٹرنیشنل شخصیت تھا... اس کی فطرت اسے ایک جگہ ٹکنے نہیں دیتی تھی...

"صبح بخیر، یور ایکسی لینسی۔" جانی نے عزت کے ساتھ اسے خوش آمدید کہا۔

سفیر دونوں سیاہ فام رینجرز کو چھوڑ کر آگے بڑھا۔ "گڈ مارننگ، وارڈن" اس نے کھلے گلے اور آدھی آستین کی نیلی قمیص اور پتلون پہن رکھی تھی۔

"میں آپ کو ڈاکٹر ڈینیل آرم اسٹرانگ سے ملواتا ہوں۔" جانی، ڈینیل کی طرف متوجہ ہوا۔ "ڈینیل! یہ سفیر ہیں۔ ہز ایکسی لینسی، ہنگ چنگ گانگ۔"

"تعارف کی ضرورت نہیں ہے۔ ڈاکٹر ڈینیل ایک مشہور شخصیت ہیں۔" چنگ دلکش انداز میں مسکرایا اور ڈینیل سے مصافحہ کیا۔ "میں نے آپ کی کتابیں اور شوز دیکھے ہیں... کافی دلچسپی کے ساتھ" اس کی انگریزی رواں تھی۔

"جانی نے بتایا ہے کہ اس ملک میں آپ نے ماحولیاتی تحفظ کے لیے کافی کام کیا ہے۔" ڈینیل نے کہا۔

چنگ نے انکساری سے سر ہلایا۔ "میری خواہش تھی کہ میں مزید کچھ کر پاتا۔" وہ پُرسوچ انداز میں ڈینیل کو تک رہا تھا۔ "معاف کیجیے گا ڈاکٹر ڈینیل مجھے توقع نہیں تھی کہ سال کے اس موقع پر چی واؤ پارک میں کسی وزیٹر سے میری ملاقات ہوگی... مجھے یقین دلایا گیا تھا کہ پارک بند ہے؟"

ڈینیل نے محسوس کیا کہ سوال کچھ غیر موزوں تھا۔

"آپ مطمئن رہیں یور ایکسی لینسی۔ میں اور میرا کیمرامین آج دوپہر کو روانہ ہو جائیں گے، پھر سارا چی واؤ آپ کا ہے۔"

"مجھے افسوس ہے کہ آپ اتنی جلدی روانہ ہو رہے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ ہمارے درمیان کافی مفید گفتگو رہتی۔"

ڈینیل کو پھر محسوس ہوا کہ بظاہر اس شائستہ جملے کی گہرائی میں کہیں اطمینان کا احساس ہلکورے لے رہا ہے۔ سفیر کے تاثرات ابھی تک دوستانہ تھے لیکن ڈینیل اس کے شہری لباس کی گہرائیوں میں جھانک رہا تھا اور ناقابلِ فہم بے چینی محسوس کر رہا تھا۔

سفیر ان دونوں کے درمیان چل رہا تھا۔ اس کا رخ گودام کی جانب تھا۔ اس دوران میں وہ پُرسکون انداز میں اِدھر اُدھر کی گفتگو کر رہا تھا۔

حالیہ آپریشن کے بعد حاصل ہونے والے ہاتھی دانت

ریفریجریٹر ٹرکس سے اتارے جارہے تھے اور سفیر ایک جانب کھڑا ہو کر سیاہ فام افریقیوں کو کام کرتے دیکھ رہا تھا۔

ہر دانت کا پہلے وزن کیا جاتا پھر گودام کے داخلی دروازے کے قریب رکھ دیا جاتا۔ جانی ایک ٹیبل کرسی اور چمڑے میں لپٹے ہوئے لیجر کے ساتھ موجود تھا۔ وہ لیجر میں دانت کا وزن لکھتا، اس کے ساتھ رجسٹریشن نمبر لکھتا اور رینجر اس نمبر پر مخصوص مہر دانت پر لگا دیتا۔

رجسٹرڈ اور مہر شدہ ہاتھی دانت قانونی حیثیت اختیار کر جاتے۔ اس طرح وہ ملک سے باہر ایکسپورٹ کیے جا سکتے تھے۔

ہاتھی دانت کی ایک جوڑی انتہائی بے عیب اور خوبصورتی کی مثال تھی۔ ان کی میچنگ، قوسین، ٹیکسچر، لمبائی اور وزن دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔

چنگ قدم بڑھا کر اس خوبصورت جوڑی تک پہنچا۔ کسی عاشق کی طرح اس نے ان پر ہاتھ پھیرا۔ جیسے یہ ہاتھی دانت نہیں بلکہ کسی نازک اندام حسینہ کی ریشمی جلد ہو۔

''خوب صورت'' وہ مسحور کن انداز میں انہیں سہلا رہا تھا۔ ''قدرتی حسن کا شاہکار۔''

ڈینیل بمشکل اس حریصانہ انداز کو برداشت کر پایا جو تائیوانی سفیر کے چہرے پر نمایاں تر تھا۔

چنگ نے یک لخت اپنا انداز بدلا اور بولنا شروع کیا۔ ''ہاتھی دانت ہمیشہ ہی میرے لیے ایک قدرتی مسحور کن شے رہی ہے۔ شاید آپ لوگوں کو پتا ہو کہ مشرقِ بعید میں بہت کم گھر ایسے ہیں جہاں ہاتھی دانت سے بنی کوئی نہ کوئی چیز موجود نہ ہو۔ یہ خوش قسمتی کی علامت سمجھا جاتا ہے تاہم میرے خاندان میں اس کی دلچسپی مزید گہری ہے۔ میرے والد نے اپنے کیریئر کا آغاز ہاتھی دانت پر نقش و نگار بنانے سے کیا تھا۔ ان کا فن بے مثال تھا۔

''میری پیدائش کے وقت تک وہ پہلے ہی تائے پی، ہانگ کانگ، ٹوکیو اور بنکاک میں اپنی دکانیں چلا رہے تھے۔ جب میں لڑکا تھا تو میں نے بھی کچھ سیکھا اور میرے اندر اس چیز کی محبت اور سمجھ پیدا ہوئی بالکل اپنے والد کی طرح۔ ان کے پاس ہاتھی دانت کا بڑا ہی نادر اور منفرد ذخیرہ ہے...'' اچانک وہ بولتے بولتے رک گیا۔

''معاف کیجیے گا میں اپنے جنونی شوق میں بہہ چلا۔ لیکن دانتوں کی یہ جوڑی اپنی خوبیوں کے باعث بے مثال ہے۔ ایسے نادر نمونے میرے والد کو مدہوش کر دیتے ہیں۔''

وہ بڑی چاہت سے رینجرز کو ہاتھی دانت پیک کرتے اور گودام میں رکھتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

''دلچسپ کردار ہے۔'' ڈینیل بڑبڑایا۔

کام مکمل کر کے گودام کو لاک کر دیا گیا اور وہ لنچ کے لیے مکان تک جانے کے لیے پہاڑی کی جانب واپس ہو لیے۔

''ہاتھی دانت پر نقش و نگار بنانے والے کا بیٹا اور سفیر؟''

جانی نے دانت نکالے۔ ''رنگ چنگ گانگ کا باپ ہو سکتا ہے کسی قدر غریب خاندان سے رہا ہو، لیکن اس نے ایک جگہ رکنے پر اکتفا نہیں کیا۔ میرے خیال میں اس کی دکانیں اور ذخیرہ اب بھی موجود ہے لیکن یہ چیزیں اب محض اس کا شوق رہ گیا ہے۔ تائیوان میں اس کا شمار متمول ترین افراد میں ہوتا ہے۔ بحرالکاہل کے کنارے کے ساتھ جتنے بھی بھاری منافع بخش کاروبار ہیں، ان سب میں اس کی سرمایہ کاری ہے اور افریقا میں بھی۔ وہ ایک بڑے خاندان کا سربراہ ہے... بیٹے بھی سات ہیں، سب سے چھوٹا تنگ ہے اور سب سے زیادہ فطین بھی۔''

''وہ بظاہر ایک اچھا آدمی ہے۔'' ڈینیل نے کہا۔ ''لیکن کوئی اور چیز بھی تھی جو اس کے ظاہری کردار میں فٹ نہیں ہوتی تھی۔ کیا تم نے اس کے چہرے کے تاثرات نوٹ کیے تھے جب اس کا ہاتھ ہاتھی دانت کی جوڑی پر تھا؟''

''مجھے یہ...'' وہ موزوں لفظ کی تلاش میں رکا۔ ''غیر فطری لگا۔'' اس نے فقرہ مکمل کیا۔

''تم ایک لکھاری بھی ہو۔'' جانی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''جب تمہیں کوئی سنسنی خیز چیز نہیں ملتی تو تم اسے تخلیق کر لیتے ہو۔'' اس پر دونوں کے قہقہے ایک ساتھ گونج اٹھے۔

☆☆☆

رنگ چنگ ایک سیاہ فام رینجر کے ساتھ پہاڑی کے قدموں میں کھڑا جانی اور ڈینیل کو گھور رہا تھا۔

''مجھے یہاں ڈاکٹر ڈینیل کی موجودگی کھل رہی ہے۔'' گوموں نے کہا۔ گومو نیشنل پارک کا سینئر انچارج تھا۔ ''شاید ہمیں کسی اور وقت کا انتظار کرنا پڑے۔''

''ڈاکٹر نے کہا تھا کہ وہ دوپہر میں یہاں سے روانہ ہو جائے گا۔'' تنگ چنگ نے سرد لہجے میں اظہارِ خیال کیا۔ ''اور تم اپنا بھاری حصہ پہلے ہی وصول کر چکے ہو... دوسرے لوگ پہلے ہی روانہ ہو چکے ہیں، ان کو واپس نہیں بھیجا جا سکتا۔ تم جانتے ہو تمہیں کیا کرنا ہے؟''

گومو خاموش رہا۔ غیر ملکی واقعی اسے ہزار ڈالر دے چکا تھا۔ یہ رقم اس کی چھ ماہ کی تنخواہ کے برابر تھی۔ کام پورا ہونے پر اسے پورے سال کی تنخواہ کے برابر معاوضے کی ادائیگی الگ ہوتی تھی۔

''یہ تمہیں کرنا ہے۔'' تنگ چنگ کی آواز میں تحکم تھا۔

''ہاں'' گومو نے جواب دیا۔ ''میں کروں گا۔''

چنگ نے سر ہلایا۔ ''آج رات یا کل رات... اس سے زیادہ نہیں۔ دونوں تیار رہنا۔''

''ہم تیار ہوں گے۔'' گومو نے وعدہ کیا اور لینڈ روور میں سوار ہو گیا جہاں دوسرا سیاہ فام پہلے ہی اس کا منتظر تھا۔

تنگ چنگ وزیٹرز کیمپ کی جانب بڑھ گیا جہاں جنگلی انجیر کے درختوں کے نیچے تقریباً تیس چوبی کاٹیج بنے ہوئے تھے۔ وہ ایک کاٹیج میں داخل ہو گیا۔ ٹھنڈے خشک موسم میں یہ کاٹیج سیاحوں سے بھرے ہوتے تھے جو اس وقت قطعی ویران تھے۔ وہ کسی قدر نروس تھا اور بے قراری محسوس کر رہا تھا۔ اس نے فریج سے ٹھنڈی بوتل نکالی۔ گومو سے پروجیکٹ کے متعلق اس نے بڑی تفصیلی بات چیت کی تھی۔ اس کے خدشات اور غیر یقینی کیفیت بھی حتی الامکان دور ہو گئی تھی۔

دونوں نے ہر پہلو سے ہر امکان کو ذہن میں رکھا تھا۔ لیکن بعض اوقات مکمل منصوبہ بندی کے باوجود غیر یقینی امکانات در آتے ہیں... جیسا کہ ڈاکٹر ڈینیل کی غیر متوقع موجودگی...

یہ پہلا موقع تھا کہ اتنے بڑے حجم کا پروجیکٹ اس نے صرف اپنی صوابدید پر شروع کیا۔ اگر وہ کامیاب ہو جاتا تو اپنے باپ کا دل یقیناً جیت لیتا۔ وہ خود سے کچھ کر کے دکھانا چاہتا تھا۔ یہی امر منافع سے زیادہ اہم تھا، وہ بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ اس کی اہمیت بھی کم تھی۔ اس پروجیکٹ کو اسے ہر حال میں کامیاب بنانا تھا۔

☆☆☆

ہرارے کے سفارت خانے میں گزارے ہوئے برسوں کے دوران میں تنگ نے غیر قانونی ہاتھی دانت کی تجارت میں خود کو بڑی رازداری سے مستحکم کیا تھا۔

اسی دوران مالاوی کا کاروباری سکھ ہرنام سنگھ جب چنگ سے ملا تو بظاہر وہ دریائے مالاوی پر ماہی گیری کے کاروبار کو ترقی دینے کے لیے سرمایہ کاری کا خواہش مند تھا۔ دونوں کی پہلی ملاقات بہت اچھی رہی۔ ذہین چنگ کو ہرنام سنگھ کی باتیں پرکشش لگی تھیں۔ اس نے اپنا تجزیہ تائی پے میں اپنے باپ کو روانہ کر دیا۔ چنگ کے باپ نے مشترکہ کاروبار کی منظوری دے دی...

کاغذات پر دستخط سفارت خانے میں ہی ڈنر کے موقع پر ہوئے...

پہلی میٹنگ کے دوران ہی چنگ نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ہرنام سنگھ کیا چاہتا ہے... نیز اسے یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ ملنے سے پہلے ہرنام سنگھ نے اس کے بارے میں معلومات اکٹھی کی تھیں... یہ سب جان لینے کے بعد ہی اس نے اپنا مکمل تجزیہ باپ کو روانہ کیا اور حسبِ توقع تائی پے سے مثبت جواب آیا تھا۔

باتوں کے درمیان احتیاط سے ہرنام سنگھ نے موضوع تبدیل کر دیا۔ چنگ کو توقع تھی کہ مچھلی کے کاروباری معاہدے کے بعد جلد ہی ہرنام سنگھ کھلنا شروع ہو جائے گا۔ اس کے لیے وہ پہلے ہی تیار تھا۔

''آپ کے معزز و معروف والد، ہاتھی دانت اور اس سے بنی ہوئی اشیا کا بہت شوق رکھتے ہیں؟''

''ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' چنگ نے عام سے انداز میں کہا۔

''ہمارے اس نئے کاروبار کے آغاز میں، میں چاہوں گا کہ آپ کے والد کو تحفہ پیش کروں۔'' ہرنام سنگھ مسکرایا۔

''کیسا تحفہ؟''

''ہاتھی دانت!'' ہرنام نے دھیمے سے کہا۔

''میں سمجھا نہیں، اگرچہ یہ خوش کن بات ہے...'' چنگ اپنی جانب سے آغاز نہیں چاہتا تھا۔

''میرا مطلب ہے کہ ہم اپنے کاروباری رشتے کو مضبوط تر اور وسیع کر سکتے ہیں۔'' ہرنام آگے کی جانب جھکا۔ ''ہمیں ایک دوسرے پر اعتماد کرتے ہوئے کھل کر بات کرنی چاہیے۔'' ہرنام بھی ایک کائیاں شخص تھا۔

''میں اتفاق کرتا ہوں، تم اپنی بات جاری رکھو۔''

''میں بے حد خوشی محسوس کروں گا۔'' ہرنام بولا۔ ''اگر میں آپ کے والد کو ہاتھی دانت کا کچھ ذخیرہ تحفتاً روانہ کر سکوں۔''

''مہر کے ساتھ؟'' چنگ نے آنکھیں سکیڑیں۔

''بغیر مہر کے... ان اسٹیمپڈ۔'' ہرنام نے جواب دیا۔ ''تاہم تم کو سرخ فیتے کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔''

☆☆☆

ابتدا میں چنگ محض ایک اور گاہک کا اضافہ تھا تاہم

جوں جوں ماہی گیری کا کاروبار بڑھنے لگا، ان دونوں کے تعلقات میں تبدیلی آنے لگی۔ دونوں اچھے خاصے بے تکلف ہو گئے تھے۔

بالآخر ہرنام نے ہاتھی دانت کی تجارت میں چنگ کو ایک دلکش پیشکش کر دی۔ شراکت داری کے آپریشنز کو وسیع کرنے کے لیے بھاری رقم کی ضرورت تھی۔ ہرنام نے کھل کر مزید سرمایہ کاری کا عندیہ دے دیا جو تقریباً دس لاکھ ڈالر تک پہنچ جاتی...

ایک مرتبہ چنگ فل پارٹنر بن جاتا تو وہ ہرنام کے آپریشنز، کاروبار کی وسعت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ مختلف ممالک میں ہاتھیوں کے غول اب بھی موجود تھے اور پھیل رہے تھے۔

ہرنام نے سرکاری سطح پر بڑی مہارت سے کڑیاں ملائی ہوئی تھیں۔ اس کے رابطے وزرا کی سطح تک تھے۔ بیشتر میجر پارکس کے افسر اور مخبر اس سے تنخواہ وصول کرتے تھے...

ادھر چنگ کا باپ اور بھائی افریقا میں سرمایہ کاری کی افادیت اور مواقع کو بھانپ گئے تھے... اور ہر طرف ہاتھ پاؤں پھیلا رہے تھے۔

چنگ کا باپ ابھی تک وہائٹ گولڈ کی کشش سے جان نہیں چھڑا سکا تھا۔ ہرنام کی آفر نے اس کے شوق کو مزید پر لگا دیے تھے۔

☆☆☆

چنگ سے آخری ملاقات میں اس کے باپ نے تبصرہ کیا کہ ”میرے بچے تم مجھے بہت زیادہ خوش کر دو گے۔ اگر تم ہاتھی دانت کا ایک بڑا ذخیرہ... جو رجسٹرڈ اور قانونی مہر کے ساتھ ہو... لا سکو۔“

چنگ گھٹنوں کے بل باپ کے سامنے مؤدب بیٹھا تھا۔ ”ابا جان! قانونی ہاتھی دانت کا واحد ذریعہ سرکاری نیلام ہے...“ چنگ کا جملہ درمیان میں رہ گیا جب اس نے باپ کے چہرے کا رنگ بدلتے دیکھا۔

”سرکاری نیلام میں ہاتھی دانت کی خریداری میں منافع کا مارجن بہت کم رہ جاتا ہے۔“ بوڑھا شاطر پھنکارا۔ ”میرے بچے میں تم سے کچھ اور توقع رکھتا ہوں۔“ چنگ کے باپ کا منہ بن گیا تھا۔

☆☆☆

چنگ نے پہلی فرصت میں ہرنام سنگھ سے ملاقات کی۔ ہرنام نے اوپر کی جانب گھومی ہوئی گھنی داڑھی کو پُرسوچ انداز میں کریدا۔ ہرنام صحت مند شخصیت کا مالک تھا اور اس کا مخصوص پگڑ اس کی شخصیت کو نمایاں کرتا تھا۔

”میں اس وقت سوچ رہا ہوں کہ صرف وہی اکلوتا رجسٹرڈ اور قابلِ قدر ہاتھی دانت کا ذخیرہ ہے۔“ وہ بولا۔ ”اور سرکاری گودام میں پڑا ہے۔“

”کونسا؟“ چنگ اپنی بے قراری نہ چھپا سکا۔

”چی واوٴ نیشنل پارک زمبابوے۔“

”کیا تم مشورہ دے رہے ہو کہ سرکاری نیلامی سے قبل وہ ذخیرہ وہاں سے نکالا جا سکتا ہے؟“ چنگ کا منہ بن گیا۔

”شاید...“ ہرنام نے بڑبڑاتے ہوئے کندھے اُچکائے۔

”مجھے سوچنا پڑے گا۔“ چنگ کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

”مجھے بھی پوری منصوبہ بندی کرنی پڑے گی، اس مشکل کو حل کرنے کے لیے۔“

☆☆☆

تین ہفتے بعد وہ دونوں لی لانگ وے میں ہرنام کے دفتر میں بیٹھے تھے۔ ”میں نے اپنا ذہن بنا لیا ہے اور حل بھی ڈھونڈ لیا ہے۔“ ہرنام نے کہا۔

”کتنی رقم لگے گی؟“ چنگ نے سوال کیا۔

”اندازے سے بھی کم...“

چنگ جانتا تھا کہ اس کا باپ کتنا خوش ہوگا۔ بین الاقوامی مارکیٹ میں غیر قانونی ہاتھی دانت کے مقابلے میں، قانونی رجسٹرڈ دانتوں کی قیمت تین سے چار گنا زیادہ تھی۔

”لیکن ہم کو ایک ہی شپمنٹ حاصل کرنے کا موقع ملے گا۔“ ہرنام نے وضاحت کی۔ ”اس لیے عقل مندی کا تقاضا ہے کہ ہم ایک ہی بار میں زیادہ سے زیادہ ہاتھی دانت روانہ کر سکیں۔ میرا مطلب ہے کہ پورا گودام صاف کر دیا جائے۔ ساتھ ہی ہمیں یہ سوچنا ہے کہ سامان لے جانے کے لیے کونسا ملک بہتر ہے۔“ ہرنام سنگھ نے بات آگے بڑھائی۔

”زائر اور جنوبی افریقا مخدوش ہیں، وہاں میں اتنا منظم نہیں ہوں۔ زمبیا، تنزانیہ اور کینیا میں بھی مسائل ہیں، بوٹسوانا بھی موزوں نہیں ہے... لے دے کر زمبابوے ہی رہ جاتا ہے۔ ”وانگی“ ”ہرارے“ اور چی وی وی... ان تینوں میں سے کسی ایک جگہ سے ہم سامان اٹھائیں گے۔“

”کہاں سے؟“

ہرنام سنگھ نے تین انگلیاں بلند کیں۔ ”ہرارے کے گودام پر سیکورٹی سخت ہے۔“ اس نے ایک انگلی گرا دی۔ ”وانگی... سب سے بڑا نیشنل پارک ہے تاہم یہ زمبیا کی سرحد سے دور ہے۔“ اس نے اپنی دوسری انگلی بھی گرا دی۔ چی واوٴ بچتا ہے۔ میرے اعتماد کے لوگ وہاں ہیں، ان کے بیان کے مطابق وہ گودام لبالب بھرا ہوا ہے، سارے دانت رجسٹرڈ ہیں۔“

چنگ، ہرنام سنگھ کے نیٹ ورک اور معلومات پر دل ہی دل میں حیران تھا اور مطمئن بھی۔

”تمہارا ارادہ ہے کہ ہم اس گودام کو لوٹ لیں؟“ چنگ ڈیسک پر آگے کی جانب جھک گیا۔

”ہاں... بلاشک و شبہ۔“ ہرنام نے چنگ کی آنکھوں میں جھانکا۔

چنگ نے محتاط انداز اختیار کیا۔ ”کیا یہ ممکن ہے؟“

”چی واوٴ ملک کے دور دراز اور الگ تھلگ علاقے میں ہے۔ اس کا فاصلہ دریائے زیمبزی سے تیس میل سے بھی کم ہے اور زیمبزی بین الاقوامی سرحد ہے۔ میں بیس زیمبزی آدمیوں کی مسلح پارٹی بھیجوں گا جو جدید اسلحے سے لیس ہوگی۔ میرا بہترین شکاری ان کا لیڈر ہوگا۔ تاریکی میں یہ لوگ دریا پار کریں گے۔ بارہ گھنٹے کے اندر اندر وہ پارک کے ہیڈ کوارٹر تک پہنچ جائیں گے۔“ ہرنام نے ڈھکی چھپی مکاری سے دانتوں کی نمائش کی۔

”یعنی بظاہر یہ ہاتھی دانت چوروں کا ایک چھوٹا گروہ ہوگا... یقیناً، وہ سارا سامان نہیں لے جا سکیں گے... ٹھیک کہہ رہا ہوں؟“

”یہی تو میرے منصوبے کی خوبصورتی ہے۔“ ہرنام مسکرایا۔ ”میں زمبابوے پولیس کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ یہ کارروائی ہاتھی دانت کے پیشہ ور چوروں کی ہے پھر وہ ان کو اپنے ملک میں ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کریں گے۔“

☆☆☆

چنگ اپنے کاٹیج کے دالان میں موجود تھا۔ ہرنام کا منصوبہ بہترین تھا۔ البتہ اس میں ڈاکٹر ڈینیل کا کوئی ذکر نہیں تھا... ہرنام کو پتا نہیں تھا اس بارے میں... یا اس کے مخبروں نے بتا دیا ہوگا کہ ڈاکٹر دوپہر میں پارک چھوڑ دے گا۔ اس لیے ہرنام نے اس کی موجودگی کو محسوس ہی نہیں کیا۔ چنگ اس اندیشے ہائے میں مبتلا تھا کہ اگر ہرنام کی ٹیم شام یا رات گئے تک یہاں پہنچتی ہے اور ڈاکٹر ڈینیل اپنے کیمرا مین کے ساتھ اس وقت بھی یہاں ہوا، وارڈن کی فیملی کے ساتھ... پھر؟

چنگ کے خیالات کا سلسلہ فون کی گھنٹی کے ساتھ منقطع ہو گیا۔

فون اس کے لیے متوقع تھا اور ہرنام کے منصوبہ کا حصہ تھا۔

”ایمبیسیڈر چنگ۔“ اس نے کہا۔

”تکلیف دہی کے لیے معذرت خواہ ہوں، یور ایکسی لینسی، لیکن ہرارے کی ایمبیسی سے کال تھی۔ کوئی مسٹر ہانگ تھے۔“ دوسری طرف سے جانی بول رہا تھا۔

”شکریہ وارڈن، میں بات کرتا ہوں، مسٹر ہانگ سے۔“

اس نے فون بند کیا اور تھوڑی دیر بعد پھر ملایا۔ ”وارڈن، میری موجودگی ہرارے میں ضروری ہے۔ بدقسمتی... میں تو کچھ دن اور یہاں آرام کرنا چاہتا تھا۔“

”مجھے افسوس ہے۔“ جانی نے کہا۔ ”میں اور میرے گھر والے آج ڈنر آپ کے ساتھ کرنے کے خواہش مند تھے... خیر پھر کسی اور وقت سہی۔ شام تک ریفریجریٹڈ ٹرکس ہاتھیوں کا گوشت لے کر کروئی کے لیے نکلیں گے۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ کانوائے کے ساتھ سفر کریں... بارش کسی بھی وقت شروع ہو سکتی ہے اور آپ کی مرسڈیز فور وہیل ڈرائیو نہیں ہے...“

ہرنام نے ہر پہلو کا جائزہ لیا تھا اور اب تک سب کچھ منصوبہ کے مطابق تھا۔ چنگ نے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے... سوال کیا۔ ”ٹرک کب تک روانہ ہوں گے؟“

”ایک میں انجن کی کوئی خرابی ہو گئی ہے۔ تاہم شام چھ بجے تک قوی امکان ہے کہ ٹرک روانہ ہو جائیں گے۔“

گو مور یجبر نے قصداً انجن میں گڑبڑ کی تھی۔ مقصد کانوائے کی روانگی میں تاخیر پیدا کرنا تھا۔ جب تک حملہ آور ٹیم پہنچ نہیں جاتی۔

”ڈاکٹر ڈینیل فوری طور پر روانہ ہو رہے ہیں۔“ جانی نے مزید بتایا۔ ”آپ چاہیں تو ان کے ساتھ بھی روانہ ہو سکتے ہیں۔“

”نہیں، نہیں...“ چنگ نے تیزی سے انکار کیا۔ ”مجھے اتنی جلدی نہیں ہے۔ میں شام تک کانوائے کے ساتھ روانہ ہو جاؤں گا... بہت شکریہ وارڈن۔“ مزید گفتگو سے بچنے کے لیے اس نے فوراً لائن منقطع کر دی۔

☆☆☆

بیس منٹ بعد چنگ نے وارڈن کے مکان کی جانب سے انجن کی آواز سنی۔ وہ دالان میں چلا آیا۔ ڈینیل کی ٹویوٹا

لینڈ کروزر پہاڑی سے نیچے آرہی تھی۔

چنگ نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی۔ حملے سے چار گھنٹے قبل ڈاکٹر نکل رہا تھا۔ ڈینیل نے چنگ کو دیکھ کر بریک لگائے اور اس کی جانب دیکھ کر مسکرایا۔ ”جانی نے بتایا تھا کہ جناب بھی آج روانہ ہونے والے ہیں... کیا آپ کو کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہے، ہماری جانب سے؟“

”اوہ نو، ڈاکٹر... سب بندوبست ہے... پلیز ڈونٹ وری۔“

ڈینیل کی موجودگی اسے غیر آرام دہ محسوس ہوتی تھی۔ وہ ایک مضبوط شخصیت کا مالک تھا۔ گھنگھریالے بال... چوکنی اور دماغ میں گھسنے والی تیز نظر۔ چنگ اسے کوئی سنجیدہ مسئلہ قرار دینے کے لیے تیار نہ ہوتا اگر یہ چمکدار آنکھیں نہ ہوتیں۔

دوبارہ مسکرانے سے پہلے ڈینیل اسے پورے پانچ سیکنڈ تک تکتا رہا... براہِ راست آنکھوں میں... پھر اس نے سیدھا ہاتھ بلند کیا۔

”او کے ایکسی لینسی... شاید پھر ملاقات ہو تو خوب بات چیت رہے گی۔“ یہ کہہ کر اس نے گاڑی کیمپ کے گیٹ کی جانب بڑھادی۔

چنگ نے سکون کی سانس لی اور اس وقت تک گاڑی کو گھورتا رہا جب تک وہ نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوگئی۔

پھر وہ مڑا اور دوسری جانب پہاڑیوں کی چوٹی کی طرف متوجہ ہوگیا۔ گھرے بادلوں نے پہاڑیوں کو دھندلانا شروع کردیا تھا۔

ہرنام کی ٹائمنگ کچھ آؤٹ ہوگئی تھی بارش کے معاملے میں۔ چنگ سوچ رہا تھا کہ ہرنام کی پارٹی وقت سے پہلے پہنچ جائے تو اچھا ہے۔

بالآخر یہ چند گھنٹے بھی گزر گئے۔ چنگ نے دیکھا کہ مرسڈیز کے پاس کوئی سیاہ فام ہیولا موجود ہے۔ چنگ تیزی سے کار کی جانب بڑھا۔

سیاہ فام کے چہرے پر پرانے زخم کی ایک گہری لکیر تھی جو بائیں آنکھ سے شروع ہوکر بالائی ہونٹ کے سرے تک چلی گئی تھی۔ جس سے ہونٹ تھوڑا اوپر کی جانب اٹھ گیا تھا۔ ہرنام سنگھ نے اس نشانی کے بارے میں چنگ کو پہلے ہی بتا دیا تھا۔

”تم سام ہو؟“ چنگ کی آواز میں روانی نہیں تھی۔

”ہاں۔“ سیاہ فام نے اتفاق کیا۔ ”میں ہی سام ہوں۔“

”تمہارے آدمی کہاں ہیں؟“

سام نے گھنی جھاڑیوں کی طرف اشارہ کیا۔

”تم جانتے ہو، کیا کرنا ہے؟“

سام نے چہرے کے نشان پر انگلی پھیری اور اثبات میں سر کو جنبش دی۔

”تمہیں کوئی نشان نہیں چھوڑنا... نہ ہی کسی کو زندہ چھوڑنا ہے۔“ چنگ کی آواز میں سفاکی کی لہر نمایاں تھی۔ ”سوائے گوموا اور ڈیوڈ کے... تم دونوں کو جانتے ہو؟“

”میں جانتا ہوں۔“

چنگ نے اسے بتایا کہ کون کون کہاں ہوگا اور...

”میں سب جانتا ہوں۔“ چنگ کی بات ادھوری رہ گئی۔ ”سام اپنے کام میں غلطی نہیں کرتا۔“

”ٹھیک ہے شروع ہو جاؤ۔“ چنگ نے حکم جاری کیا۔ جواب میں سام نے انگوٹھا اور پہلی انگلی کھڑی کی اور خود اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔

چنگ نے سر ہلایا اور مرسڈیز میں گھس گیا۔ ڈیش بورڈ سے اس نے ڈالرز کے بنڈل برآمد کیے۔ ایک بنڈل میں دس دس ڈالر کے سو نوٹ تھے۔ اس نے تین بنڈل گن کر سام کی کھلی ہتھیلی پر رکھے۔ گودام میں موجود بیش قیمت ذخیرہ اس طرح پانچ ڈالر فی کلو پڑتا۔ جبکہ بین الاقوامی مارکیٹ میں تین سو ڈالر فی کلو... اور تائی پے میں ہزار ڈالر فی کلو تک پہنچ سکتا تھا۔

دوسری طرف سیاہ فام سام اپنا حساب لگا رہا تھا کہ سبز نوٹ اس کی پانچ سال کی سخت اور خطرناک محنت کے معاوضے کے برابر تھے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ سودے سے شاداں و فرحاں تھے۔

خونی اسٹیج تیار ہو چکا تھا۔ ”میں وارڈن کو دفتر میں دیکھ کر آتا ہوں۔ اس کے بعد تم فوراً ہی اپنا کام شروع کر دینا۔“

سام مسکرایا۔ پھر جس طرح آیا تھا اسی طرح غائب ہوگیا۔

ڈھلتی شام ایک بے رحم خونی ڈرامے کا نظارہ کرنے جارہی تھی...

☆☆☆

افریقی معیار کے مطابق سڑک کافی اچھی تھی تاہم ڈینیل کو کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ جاکو کی معیت میں لطف اندوز ہو رہا تھا۔ جب بھی کوئی غیر معمولی پودا یا درخت دکھائی دیتا، ڈینیل گاڑی روک لیتا... وہ نوٹس بناتا اور کیمرا استعمال

لیتا۔ دونوں کے درمیان ہلکی پھلکی گپ شپ جاری تھی۔

شام کے چار بج چکے تھے... اس موقع پر وہ کام کے اختتام پر لندن واپسی کی بات کر رہے تھے۔ فلم بندی کا کام مکمل کرنے کے بعد فائنل ٹچ لندن کے کاسیل فلم اسٹوڈیو میں کرنا تھا۔

اگرچہ اس کا دماغ جاکو کی گفتگو کی طرف مرکوز تھا۔ تاہم اس کی فطری صلاحیتیں اردگرد کے ماحول سے بے خبر نہیں تھیں۔

کچھ آگے نکل جانے کے بعد اسے احساس ہوا کہ وہ کوئی قابلِ توجہ چیز عقب میں چھوڑ آیا ہے... ڈینیل نے فی الفور بریک لگائے۔ جاکو نے الجھی نظروں سے اسے دیکھا۔ ”کیا ہوا؟“

”کچھ کہا نہیں جاسکتا۔“ ڈینیل نے پہلو کو بل دیا اور عقب میں دیکھتے ہوئے ٹویوٹا ریورس گیئر میں ڈال دی۔

”شاید کچھ بھی نہیں...“ وہ غیر یقینی انداز میں بڑبڑایا۔

ایک جگہ گاڑی روک کر وہ نیچے اتر آیا۔

”مجھے تو کوئی خاص بات نظر نہیں آرہی۔“ جاکو نے قرب و جوار کا جائزہ لیا۔

”بات تو ٹھیک ہے۔“ ڈینیل نے اتفاق کیا ”لیکن یہاں ایک سپاٹ نشان ہے۔“ اس نے نیچے گرد آلود سڑک کی جانب اشارہ کیا۔ جو خودرو گھاس پھوس سے آلودہ تھی... پرندوں، چھپکلیوں، کیڑے مکوڑے اور دیگر رینگنے والے جانوروں کے نشانات بھی تھے... قدرے بڑے جانوروں کے سموں کے نشانات بھی تھے۔ پگڈنڈی نما سڑک کا ایک حصہ قطعی صاف تھا۔

ڈینیل اس صاف ٹکڑے کے قریب اکڑوں بیٹھ کر گہری نظر سے جائزہ لے رہا تھا۔

”کسی نے نشانات مٹائے ہیں۔“ اس نے انکشاف کیا۔

”تو اس میں کیا خاص بات ہے۔“ جاکو بھی گاڑی سے اُتر کر اس کے پاس آگیا۔

”شاید کوئی خاص بات نہیں۔“ وہ کھڑا ہوگیا ”یا پھر بہت کچھ... صرف انسان ہی یہ نشانات صاف کرتے ہیں... وہ بھی جب ان کے ارادے نیک نہ ہوں۔“

ڈینیل نے اطراف کا جائزہ لیا اور جلد ہی ایک اور نشان تلاش کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اسے بھی صاف کیا گیا تھا۔ کہیں کہیں گھاس دبی ہوئی تھی جیسے گھاس کو قدم رکھنے کے لیے استعمال کیا گیا ہو اور ریتیلی جگہ پر پڑنے والے نشان کو مٹا دیا گیا تھا۔ ڈینیل کو پرانے دن یاد آئے جب وہ اسکاؤٹنگ کرتا تھا۔ ایک مرتبہ انہوں نے گوریلا دہشت گردوں کے گروپ کو ٹریک کیا تھا۔ اس وقت وہ ویسی ہی کیفیت اور سنسنی محسوس کر رہا تھا۔

پچاس گز کے فاصلے پر اس کو پہلا نمایاں انسانی قدم کا نشان ملا۔ کچھ دور موڑ پر ایک تنگ گیم ٹریک پر اسے پورے قدموں کی قطار نظر آگئی۔ یہاں قدموں کے نشانات کو چھپانے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ قطار کا رخ جی واڈ کیمپ کی جانب تھا۔

ڈینیل کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

اس نے گروپ کے آنے اور جانے کے رخ کا تعین کیا اور اندازہ لگایا کہ ہاتھی دانت چوروں کا کوئی گروہ زیمزی دریا کو پار کرکے علاقے میں داخل ہوا اور یقیناً اس کا ٹارگٹ جانی کا کیمپ تھا۔ اسے جلد از جلد جانی کو خبردار کرنا تھا تاکہ وہ چوروں کی سرکوبی کے لیے متعلقہ یونٹ کو طلب کرے۔

اس نے امکانات کا جائزہ لیا کہ کونسا راستہ اختیار کیا جائے۔ مانا پول کے رینجر آفس سے فون کیا جاسکتا تھا۔ اس کے لیے اس کو ایک گھنٹا ڈرائیو کرنا پڑتی۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ وہ خود نیشنل پارک واپس جائے۔ اسے جلد فیصلہ کرنا تھا۔ اس دوران میں ٹیلیفون کے کٹے ہوئے تار اس کی نظروں میں آگئے اور فیصلہ خود بخود ہوگیا... اسے اب واپس ہی جانا تھا۔

ڈینیل حیران تھا کہ ہاتھی دانت کے چوروں کو تار کاٹنے کی ضرورت کیوں پڑی۔ اس کے دماغ میں انجانے خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں... جو کچھ بھی ہوا تھا یا ہونے والا تھا، بہت بُرا تھا۔

”آخر چکر کیا ہے؟“ جاکو نے پوچھا۔

”مجھے نہیں پتا لیکن جو کچھ بھی ہے بہت برا ہے۔“

اس نے گاڑی تیزی سے گھمائی اور واپس چل پڑا۔

وہ کافی تیز جا رہا تھا...

وہائٹ گولڈ کے چوروں کے خصائل، ٹارگٹ اور انداز وہ سمجھتا تھا لیکن اس کا مشاہدہ اور چھٹی حس کچھ اور ہی قسم کا الارم بجا رہی تھی۔

ہوسکتا ہے وہ اب تک یا پہلے ہی پارک پہنچ چکے ہوں۔ اس کے رخسار پر پسینے کا قطرہ پھسل آیا۔ جانی اور اس کے بیوی بچوں کے تصور نے اس کی ریڑھ کی ہڈی میں دہشت کی

بج سلاخ داخل کر دی۔ لینڈ کروزر جیسے اڑی جا رہی تھی، جیسے ہی اس نے ایک تنگ موڑ کاٹا۔۔۔ تو سامنے سے بڑی سفید گاڑیاں سڑک کو گھیرے چلی آرہی تھیں۔ اس نے ریفریجریٹڈ ٹرکس کو پہچان لیا۔ ڈینیل نے پھرتی سے بریک لگائے۔ ٹویوٹا پھسلی، گھومی۔۔۔ رکتے رکتے گاڑی کی ناک مخالف ٹرک کو تقریباً چھو گئی۔۔۔ جاکو ڈیش بورڈ پر جا پڑا۔

ڈینیل گاڑی سے کودا اور ریفریجریٹڈ ٹرک کی طرف دوڑا۔ اس نے اسٹیئرنگ وہیل کے پیچھے گوموکو پہچان لیا۔۔۔ سینئر رینجر۔

”معاف کرنا! میری غلطی تھی۔ کیا تم ٹھیک ہو؟“

گوموگھبرا گیا تاہم اس نے سر ہلایا۔ ”میں ٹھیک ہوں ڈاکٹر۔“

”تم لوگ کب نکلے پارک سے؟“ ڈینیل نے سوال کیا۔

گومو ہچکچایا۔ ڈاکٹر کے سوال نے اسے بوکھلا دیا تھا۔

”میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔۔۔“

اس وقت دوسرے ٹرک کی آواز سنائی دی۔ اس سے پچاس گز پیچھے چنگ کی نیلی مرسڈیز تھی۔ دونوں گاڑیاں گومو کے عقب میں آکر رک گئیں۔

ڈینیل مرسڈیز کی جانب بڑھ گیا۔ چنگ دروازہ کھول کر باہر آ گیا تھا۔

”ڈاکٹر ڈینیل آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟“

ڈینیل نے اس کا سوال نظر انداز کر دیا۔ ”آپ لوگ وہاں سے کب نکلے؟“ اس نے بے چینی سے الٹا سوال کر دیا۔ رہ رہ کر اسے جانی اور اس کے بیوی بچوں کا خیال آرہا تھا۔

”آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟“ چنگ کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔ ”اور واپس کیوں جا رہے ہیں؟“

”میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہاں کوئی مسئلہ تو نہیں ہے؟“

”مسئلہ؟ ایسا کیوں ہوگا؟“ چنگ نے جیب میں ہاتھ ڈال کر رومال نکالا۔ ”تمہارا کیا مطلب ہے ڈاکٹر؟“

ڈینیل نے بمشکل اپنے تاثرات چھپائے۔ ”میں نے ایک مسلح گروہ کو ٹریس کیا ہے جس کا رخ پارک کی جانب تھا۔ میرے خیال میں وہ ہاتھی دانت کے چوروں کی ٹولی ہے۔ میں وارڈن کو خبردار کرنے واپس جا رہا تھا۔“

”وہاں کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔“ چنگ نے یقین دلایا۔ پسینے کی ہلکی سی نمی چنگ کی پیشانی پر نمودار ہو گئی تھی جو ڈینیل کی تیز نگاہوں سے چھپ نہ سکی۔

”سب ٹھیک ہے۔ میں ایک گھنٹے قبل نکلا تھا۔“ چنگ نے بتایا۔ ”وارڈن بالکل ٹھیک ہے۔“

”ایک گھنٹے قبل؟“ ڈینیل نے اپنی رولیکس پر نگاہ ڈالی۔ چنگ کی یقین دہانی نے اسے کسی قدر پُرسکون کر دیا تھا۔ ”یعنی آپ تقریباً ساڑھے پانچ بجے وہاں سے نکلے؟“

”بالکل بالکل، کیا آپ کو شک ہے میرے بیان پر؟“

چنگ کے لہجے اور آواز کی سختی سے ڈینیل کو حیرت ہوئی۔

”آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ یور ایکسی لینسی۔ یقیناً مجھے آپ کی بات پر کوئی شبہ نہیں ہے۔“

چنگ کا فطری رجحان اس بات کا تقاضا کرتا تھا کہ وہ حملے کے وقت جائے واردات پر موجود نہ ہو۔۔۔ لیکن ہرنام نے آپریشن واپس لینے کی دھمکی دیتے ہوئے اس کی موجودگی کو لازمی قرار دیا تھا۔ مکار سکھ پکا منصوبہ ساز تھا۔۔۔ اگرچہ بعد میں کسی تفتیش کی نوبت آتی تو چنگ کے بیان کی سب سے زیادہ اہمیت ہوتی اور پولیس یہی سمجھتی کہ چور جتنا لے جا سکے، لے گئے اور جاتے جاتے آگ لگا کر سب کچھ تباہ کر گئے۔

”میں معذرت خواہ ہوں یور ایکسی لینسی۔“ ڈینیل نے اسے نرم کیا۔ ”مجھے جانی کے بارے میں تشویش تھی۔“

”ہوں۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ پریشانی کی کوئی وجہ نہیں ہے۔“ چنگ نے رومال عقبی جیب میں ٹھونسا اور شرٹ کی بالائی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ اس نے ایک سگریٹ منتخب کی لیکن سگریٹ پھسل کر اس کے دونوں قدموں کے درمیان مٹی پر جا گری۔۔۔

چنگ سگریٹ اٹھانے کے لیے جھکا تو جبلی طور پر ڈینیل کی آنکھیں بھی نیچے کی جانب گئیں۔ چنگ نے سفید کینوس کے ٹریننگ شوز پہنے ہوئے تھے۔

ڈینیل نے دیکھا کہ اس کی نیلی کاٹن شرٹ اور جوتے کے کونے پر داغ تھے۔۔۔ بظاہر یہ خشک خون کے دھبے معلوم ہوتے تھے۔ ڈینیل الجھن کا شکار ہو گیا۔

معاً اسے یاد آیا کہ اس دن چنگ وہاں موجود تھا جب مردہ ہاتھیوں کے دانت ٹرک سے گودام میں منتقل کیے جا رہے تھے۔ یقیناً یہ ہاتھی کے خون کے خشک دھبے تھے۔

چنگ نے دیکھ لیا کہ ڈینیل کی نظر کہاں ہے۔ وہ عجلت کے ساتھ مجرمانہ انداز میں پیچھے ہٹا اور مرسڈیز میں گھس کر دروازہ بند کر لیا۔

غیر ارادی طور پر ڈینیل نے مچھلی کے چھلکے نما چنگ

کے جوتے کے تلے کا نمونہ دیکھا جس کا نشان سڑک کی ریت پر ثبت ہو گیا تھا۔

”میں سمجھتا ہوں ڈاکٹر کہ تمہاری پریشانی دور ہو گئی ہوگی۔“ چنگ نے خود کو دوبارہ سنبھال لیا تھا۔ اس کی دلکش مسکراہٹ لوٹ آئی تھی۔ ”مجھے خوشی ہے کہ میں نے تمہیں واپسی کے غیر ضروری سفر سے بچا لیا۔“ چنگ نے مرسڈیز اسٹارٹ کی۔ ”مجھے یقین ہے کہ تم کانوائے کے ساتھ مل جاؤ گے اس سے پہلے کہ بادل برسنا شروع ہوں۔“

”شکریہ یور ایکسی لینسی، آپ اپنا سفر جاری رکھ سکتے ہیں۔ میں آپ کے ساتھ شامل نہیں ہو سکتا۔ مجھے بہرحال جانی کو خبردار کرنا ہے۔“

چنگ کی مسکراہٹ ہوا میں تحلیل ہو گئی۔ ”ڈاکٹر تم خود کو غیر ضروری طور پر تکلیف میں ڈال رہے ہو۔ میری تجویز ہے کہ تم مانا پول پہنچ کر بذریعہ فون یہ کام کر سکتے ہو۔“

”میں نے بتایا تھا کہ ٹیلیفون تار کاٹ دیے گئے ہیں۔“

”ڈاکٹر تم توہمات کا شکار ہو رہے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم غلطی کر رہے ہو۔“

”جناب ہو سکتا ہے آپ ٹھیک سوچ رہے ہوں۔“ ڈینیل فیصلہ کن انداز میں مرسڈیز کے قریب سے ہٹ گیا۔ ”لیکن مجھے جانی تک پہنچنا ہے۔“

”ڈاکٹر۔۔۔ بادلوں کو دیکھو، کہیں ہفتوں کے لیے یہاں نہ پھنس جاؤ۔“

”میں چانس لینا پسند کروں گا۔“ ڈینیل اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ چنگ کیوں اپنے موقف پر اتنا زور دے رہا ہے۔

ڈینیل اپنی گاڑی کی جانب چل دیا۔ ٹرکس کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے دیکھا کہ کوئی رینجر ٹرک سے نیچے نہیں آیا تھا۔۔۔ نہ کسی نے اس سے کوئی بات کی تھی۔ ڈینیل کا ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ڈینیل نے الوداعی ہاتھ ہلایا اور ٹویوٹا میں سوار ہو گیا۔

”چنگ کیا کہہ رہا تھا؟“ جاکو نے استفسار کیا۔

”اس کا کہنا ہے کہ ایک گھنٹا قبل جب وہ لوگ وہاں سے روانہ ہوئے تھے تو سب کچھ ٹھیک تھا۔“

اس وقت بارش کے موٹے قطرے ونڈ اسکرین سے ٹکرائے۔ ڈینیل کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا تاہم اس کی ماہرانہ ڈرائیونگ میں کوئی فرق نہیں پڑا۔

کچھ دیر بعد ہی گرج چمک کے ساتھ بارش شروع ہو گئی۔ روشنی بھی کم ہو گئی۔ ڈینیل نے وائپر چلائے اور تازہ ہوا کے لیے کھڑکی کھول دی۔۔۔ فوراً ہی اس نے ناک سکیڑی۔ عین اسی وقت جاکو کی قوتِ شامہ نے کام کیا۔

”دھواں“ وہ قدرے بلند آواز میں بولا۔ ”ہم کیمپ سے کتنی دور ہیں؟“

”بس پہنچنے والے ہیں۔“

وہ پارک کے قریب پہنچ گئے تھے۔ بارش کا پانی ٹخنوں تک آگیا تھا۔

”ایک عمارت میں آگ لگی ہے۔“ ڈینیل نے پریشان کن اطلاع دی۔

جاکو آگے کی جانب جھکا۔ دھواں وہیں سے آرہا ہے۔

مزید قریب ہونے پر ڈینیل نے آتش زدہ گودام کو پہچان لیا۔۔۔ اس کے بدترین خدشات حقائق کا روپ دھار رہے تھے۔ ٹویوٹا رکی اور اس نے کیچڑ میں قدم رکھ دیے۔ تپش نے دیواروں میں کریک ڈال دیے تھے اور کئی دیواریں ڈھے چکی تھیں۔ آگ یقیناً شدید تھی جس نے گودام کا یہ حال کر دیا تھا۔۔۔ بے پناہ حدت خارج ہوئی تھی۔ موسلادھار بارش کے باوجود آگ اب بھی بھڑک رہی تھی۔۔۔

ڈینیل کی قمیص اس کے توانا جسم سے چپک گئی تھی۔ بھیگے بال پیشانی اور آنکھوں پر آگئے تھے۔ برسات کے باوجود دھواں ابھی تک گاڑھا تھا۔ تپش بھی حائل تھی جو دونوں کو مزید آگے جانے سے روک رہی تھی۔

ڈینیل کے جبڑے بھنچے ہوئے تھے۔ وہاں وقت ضائع کرنا بیکار تھا۔ وہ دوبارہ لینڈ کروزر میں گھس گئے۔ اس کا رخ وارڈن کے تاریک مکان کی جانب تھا۔

”جانی!“ وہ چلایا۔ ”ماویس!“ وہ داخلی دروازے کی جانب دوڑ رہا تھا۔ دروازہ قبضوں سے اکھڑ کر آدھا لٹکا ہوا تھا۔ اندر فرنیچر ٹوٹا پھوٹا بکھرا پڑا تھا۔

”جانی!“ ڈینیل حلق کے بل دھاڑا اور نشست گاہ میں جا گھسا۔۔۔ یہاں بھی صورتِ حال ابتر تھی۔ وہ گیلری میں دوڑتا ہوا کمروں کی جانب بڑھا۔

”جانی۔“ اس کی آواز میں غضب کے ساتھ مایوسی بھی شامل تھی۔ تارچ کی روشنی میں گیلری کے کونے پر اسے دیوار نشان زدہ دکھائی دی جیسے کسی نے ستارہ پینٹ کرنے کی کوشش کی ہو۔ چند لمحوں تک وہ خالی ذہن کے ساتھ اس نشان کو گھورتا رہا۔۔۔ اس کی نگاہ نشان سے نیچے پھسلی۔ دیوار

کے ساتھ کوئی گھڑی تماشے پڑی تھی...

جانی اور ماویس نے اپنے اکلوتے بیٹے کا نام ڈینیل کے نام پر رکھا تھا۔ چار سالہ ڈینیل جانی پشت کے بل پڑا تھا۔ اس کی کھلی ہوئی ساکت آنکھیں ڈینیل کے چہرے پر کسی غیر مرئی نقطے کو گھور رہی تھیں۔ ڈینیل بچے کے اوپر جھکا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں... پھر وہ دھیرے سے سیدھا ہوا۔ خواب گاہ کی طرف بھاگا پڑا۔ دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ اس کا ایک قبضہ اکھڑ گیا تھا... وہ واپس دیوار سے ٹک گیا۔ وہ ہانپ رہا تھا... آنسو روک رہا تھا...

جانی کی بیٹیاں، بھائی سے بڑی تھیں۔ مریم دس سال اور سوزی آٹھ برس کی۔ وہ بستر کے کنارے عریاں حالت میں فرش پر پڑی تھیں۔ وحشیوں نے ماں کے ساتھ معصوم بچیوں کی بھی بے حرمتی کی تھی۔

ماویس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور اسکرٹ کمر سے لپٹا ہوا تھا... بچیاں صدمے سے ہی مر گئی تھیں... ماویس غالباً کرب و اذیت کے سمندر کو جھیل گئی تھی۔ بعدازاں اس کے سر میں گولی ماری گئی تھی...

ہمت کر کے ڈینیل کو کمرے میں داخل ہونا ہی پڑا تاہم وہ جلد ہی باہر آ گیا۔

"یہ انسانوں کا کام نہیں۔" جا کو ہکا بکا رہ گیا۔ "جو بھی تھے درندے تھے۔ خونی درندے..."

ڈینیل نے تمام لاشوں کو ڈھک دیا۔ وہ غم و غصے کو قابو کر رہا تھا۔ "جانی" وہ خود سے ہم کلام تھا۔ "کہاں ہو تم؟"

اس نے باقی کمروں کو بھی چھان مارا۔ وہ دیوانوں کی طرح اپنے دوست کو پکارتا ہوا باہر آ گیا۔ وہ تاریکی میں برستی برسات میں کھڑا تھا۔ پھر اس نے چہرہ آسمان کی طرف کیا اور منہ کھول دیا... اس کے حلق میں صفرا کی کڑواہٹ گھل گئی۔

دونوں نے مل کر سرونٹ کوارٹرز اور دیگر کاٹیج بھی دیکھے... نوکروں کو مار کر کانجر میں پھینک دیا گیا تھا اور کاٹیج بھی نذرِ آتش کر دیے گئے تھے۔

"جانی... ی... ی" وہ زخمی درندے کی طرح دھاڑا۔

"سب کو ختم کر دیا۔" ڈینیل بڑبڑایا۔ "کیوں؟" وہ ہاتھی دانت کے پیچھے تھے تو قتل و غارت گری کیوں؟ کیا انہوں نے گواہوں اور نشانیوں کو مٹایا ہے؟ کیا حملہ آوروں میں کیمپ کا کوئی فرد بھی شامل تھا... یا کیمپ میں سے کوئی حملہ آوروں کو پہچانتا تھا۔"

وارڈن کا دفتر صحیح حالت میں اپنی جگہ کھڑا تھا۔ ڈینیل نے ٹارچ کی روشن لکیر کا رخ دفتر کی چھت کی جانب سیاہی مائل حصے پر مرکوز کر دیا۔ وہاں ایک بجھی ہوئی مشعل اٹکی ہوئی تھی... یعنی دفتر جلنے سے بچ گیا تھا۔

ڈینیل دالان سے گزرتا ہوا دفتر کے کھلے دروازے تک پہنچا۔ لمحہ بھر کے لیے ٹھٹکا۔ خود کو مجتمع کیا اور اندر داخل ہو گیا۔ الماریاں، میز کی درازیں، شیلف، سیف سب کھلے پڑے تھے۔ سیف کی چابیاں موجود تھیں لیکن سیف خالی تھا۔

ڈینیل کی چمکدار آنکھیں تیزی سے گھوم رہی تھیں۔ دفعتاً اس کی نظر ڈیسک کے پہلو میں جم گئی... "جانی" اس نے سرگوشی کی۔ "اوہ میرے خدا... نہیں!"

☆☆☆

"انجن کی خرابی دور ہونے تک میں ایک راؤنڈ لگا آؤں۔" سفیر چنگ کی آواز نے جانی کا ارتکاز توڑ دیا۔ تاہم اس نے مسکرا کر ڈیسک سے سر اٹھایا۔ چنگ کے گلے میں دوربین لٹک رہی تھی۔

"ضرور۔ بس روانگی کا ہی وقت سمجھیں۔" اس نے کہا۔

چنگ دفتر سے نکل کر اپنی کار میں بیٹھ گیا۔ کار آگے بڑھتے ہی جانی پھر لیجر اور دیگر کاغذات کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ایک مرتبہ اس نے کلائی کی گھڑی کو دیکھا، پانچ بجنے میں پانچ منٹ کم تھے۔

چنگ کے جانے کے بعد بمشکل پانچ منٹ گزرے ہوں گے کہ اسے ایک بار پھر اپنی توجہ کام سے ہٹانی پڑی۔ اس نے ایک اجنبی سیاہ فام کو دروازے میں کھڑا پایا جس کے دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے تھے۔ چہرے پر ایک لمبے زخم کا نشان تھا اور رنگت الٹے توے کے مانند سیاہ تھی... حلیہ اور لباس بھی گندہ سا تھا۔

"یس؟" جانی نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ "کون ہو؟ کیا چاہیے؟" اجنبی مسکرایا۔

جانی ڈیسک سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "کیا چاہیے تم کو؟" اس نے اپنا سوال دہرایا۔

"تم!" اس نے دونوں ہاتھ آگے کر دیے جن میں اے کے 47 رائفل موجود تھی... بلا تامل اس نے فائر کیا۔ گولی جانی کے پیٹ میں لگی۔ وہ دیوار سے ٹکرایا... کمر سے نیچے سارا بدن سن ہو گیا۔ اس کے ذہن میں ایک ہی خیال آیا

"مردہ بن جاؤ۔"

پیٹ سے خون کا فوارہ چھوٹا... وہ دیوار سے ٹکرا کر آگے آیا۔ ایک ہاتھ میز پر ٹکانے کی کوشش کی اور میز کے ساتھ پھسلتا ہوا نیچے جا گرا... گرتے ہی وہ ساکت ہو گیا۔ گن مین آگے بڑھ کر اس کے سر پر پہنچ گیا۔ جانی کو اس کے جوتے نظر آئے۔ رائفل کی سرد نال اس کی کنپٹی سے ٹک گئی۔ جانی ساکت پڑا رہا... وہ جانتا تھا کہ معمولی سی حرکت بھی دوسرے فائر کو فوری تحریک دے گی۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ حملہ آور کو اس کے مر جانے کا یقین ہو جائے۔

عین اسی وقت باہر سے شور شرابے کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ ساتھ ہی خودکار ہتھیاروں کی شدید فائرنگ۔ اجنبی کے جوتوں کا زاویہ بدلا اور وہ دفتر کے داخلی دروازے کی جانب چل پڑا۔

"جلدی کرو، وقت ضائع مت کرو۔" بدشکل نے چلا کر کہا۔ "ٹرک کہاں ہیں؟" وہ جانی کو چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ "ٹرکوں کو گودام کے ساتھ لگا دو۔"

جانی بخوبی آگاہ تھا کہ وہ ہلاکت خیز وار کا شکار ہوا ہے۔ یہ اے کے 47 کی گولی تھی۔ اسے احساس تھا کہ زندگی سرعت کے ساتھ اس کے بدن سے خارج ہو رہی تھی۔

اسے کوارٹرز اور کانجر کی جانب سے بھی فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔

"یہ پورا گینگ ہے۔" اس نے مایوس کن اندازہ لگایا۔ معاً اسے بیوی بچوں کا خیال آیا... جانی کو دفتر کے بغلی کمرے میں موجود ہتھیاروں کا خیال آیا۔ یہ خیال فوراً ہی رخصت ہو گیا کیونکہ وہ وہاں تک پہنچ ہی نہیں سکتا تھا... اسے ٹرک کے ڈیزل انجن کی آواز سنائی دی۔ امید کی کرن جاگی۔

"گومو" اس نے سوچا۔ پھر اسے ڈیوڈ کا خیال آیا۔ اس نے لیٹے لیٹے گردن گھما کر کھلے دروازے سے باہر کا نظارہ کیا۔

ایک ٹرک اس کی نگاہ کی زد میں آیا۔ گومو ٹرک کو گودام کے ساتھ لگا کر باہر کودا اور بدشکل گینگ لیڈر کے ساتھ زور زور سے باتیں کرنے لگا۔

گومو ان لوگوں کے ساتھ ملا ہوا ہے... جانی کو اپنی بینائی پر شک ہوا۔

بدشکل نے سب کو ایک جگہ اکٹھا کیا اور گودام کا تالا اڑا دیا۔ گروہ کے اراکین نے اپنا اپنا اسلحہ ایک طرف رکھا اور گودام میں گھس گئے... پھرتی کے ساتھ ہاتھی دانت کا ذخیرہ دونوں ٹرکوں میں منتقل کیا جا رہا تھا۔

تاریکی کا بادل جانی کی نگاہ کے سامنے آیا... اس نے ہمت کر کے تاریکی کو پرے دھکیلا۔ خیال آیا کہ نظر کا فریب اب اس کو گومو کی جگہ ننگ چنگ کی صورت دکھا رہا ہے... سفیر دالان کے نیچے کھڑا تھا۔ جانی نے چیخ کر اسے خبردار کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے حلق سے جو آواز برآمد ہوئی وہ بہت مدھم تھی اور کمرے سے باہر بھی نہ جا سکی۔

معاً وہ یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ گینگ کا بدشکل لیڈر چنگ کے پاس آ کر اسے سیلوٹ کر رہا ہے۔ جانی نے بدقت تمام خود کو یقین دلایا کہ یہ سفیر ہی تھا... ان دونوں کی آوازیں وہاں تک آ رہی تھیں جہاں وہ خون میں لت پت پڑا ہوا تھا۔

"سام اپنے آدمیوں سے کہو تیزی دکھائیں۔" چنگ بدشکل سے مخاطب تھا۔ "میں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا ہوں۔"

"رقم۔" سام بولا۔ "ایک ہزار ڈالر..."

"تمہیں ادائیگی کر دی گئی ہے۔" چنگ نے برہمی سے کہا۔

"مزید ضرورت ہے یا پھر میں کام روک دوں... تم خود ہی ذخیرہ ٹرکوں پر چڑھا دینا۔" سام نے دانت نکالے۔

"میرے پاس مزید رقم نہیں ہے۔" چنگ نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

"ٹھیک ہے پھر ہم لوگ چلتے ہیں۔"

"رکو۔" چنگ نے تیزی سے سوچا۔ "رقم تو نہیں ہے تاہم تم لوگ جتنے ہاتھی دانت چاہے لے لو۔" چنگ کو پتا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ بیس دانت ہی لے جا پائیں گے... بیس آدمی بیس دانت۔ سستا سودا ہے۔

سام اس کو گھورتا رہا۔ وہ سفیر کی پیشکش پر غور کر رہا تھا۔

"منظور ہے۔" وہ مڑ کے چل دیا۔

"رکو سام۔" چنگ نے اشارہ کیا۔ "وارڈن اور اس کے بیوی بچوں کا کیا ہوا؟"

رائفل سام کے کندھے پر تھی۔ وہ چلتے چلتے بولا "ختم... سب ختم!" وہ جانی کی حدِ بصارت سے نکل گیا۔ غصے اور صدمے کی لہر نے وقتی طور پر جانی کی جسمانی اذیت کو فنا کر دیا۔

غم و غصے کی لہر نے اسے توانائی دی۔ اس کے پاس

چند منٹ تھے اسی میں اسے کچھ کرنا تھا۔ میز پر ہاتھ ٹکا کر جب وہ پھسل کر نیچے گرا تھا تو کچھ کاغذات بھی زمین پر بکھر گئے تھے۔

آخری امید... وہ کوئی پیغام چھوڑ جائے جو بعد میں پولیس کے کام آسکے۔ جانی نے کاغذ حاصل کرنے کی جدوجہد شروع کردی...

چنگ دفتر کی طرف آیا اور جانی کو متحرک حالت میں دیکھ حیران جانی نے بھی اسے دیکھ لیا۔ چنگ سام کو پکارتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

ڈینیل اپنے دوست کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ خاموش تھا... آنکھیں اشک بار تھیں۔ اس نے ایک ہاتھ جانی کے حلق کے پاس رکھ کر نبض محسوس کرنے کی ناکام کوشش کی۔ سر کے عقبی حصے پر نہایت قریب سے چلائی گئی طاقتور گولی کا بھیانک زخم فیصلہ کن تھا۔

جاکو پر سکتہ طاری تھا... ڈینیل دوبارہ اپنے قدموں پر کھڑا ہوگیا۔ شدتِ غم سے اس کے حلق میں گرہ لگ گئی تھی۔ رخساروں پر بہنے والی گرم لکیروں کا اسے قطعی ہوش نہیں تھا۔ جانی کے لہولہو جسم کو ڈھانپنے کے لیے اس نے اردگرد نگاہ ڈالی۔ کھڑکیوں سے ایک پردہ کھینچ کر وہ واپس اپنے دوست کے بے جان جسم کے پاس آیا۔

جانی کا ایک ہاتھ مڑ کر اس کے جسم تلے دبا تھا۔ سر خون آلود ٹھوس زمین کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ ڈینیل نے آہستگی سے اسے سیدھا کیا۔ غم کی لہر پر غیظ و غضب حاوی ہوتا جارہا تھا۔ جانی کا ایک ہاتھ پیٹ کے زخم میں گھسا ہوا تھا۔ مٹھی سختی سے بند تھی۔

مٹھی میں بند کاغذ کی جھلک ڈینیل کی آنکھوں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ اس کی چھٹی حس نے ٹہوکا دیا۔ ڈینیل نے جانی کی مٹھی کھول کر کاغذ باہر نکالا اور اسے ڈیسک پر پھیلا دیا... جانی نے اپنے ہی خون سے کاغذ پر کچھ لکھنے کی کوشش کی تھی۔ ڈینیل نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ جانی کو پہلے پیٹ میں گولی ماری گئی اور وہ فوراً نہیں مرا تھا پھر کسی وجہ سے اسے وقفہ مل گیا اور مہلت سے فائدہ اٹھا کر اس نے کوئی پیغام چھوڑنے کی کوشش کی تھی... یعنی وہ قاتلوں کو پہچان گیا تھا... بعد میں اسے سر میں گولی مار کر ختم کیا گیا۔

انسانی خون اور پانی کی برسات میں شرابور اس رات کے ہولناک واقعات اور درندگی نے اسے لرزا دیا تھا... افریقا کی اس بھیانک رات کی تمام جزئیات ہمیشہ کے لیے اس کے حافظے پر نقش ہوگئی تھیں۔

وہ خاموش کھڑا میز پر پھیلے کاغذ کو گھور رہا تھا۔ سرخ رنگ کا انگریزی کا حرف این۔ دوسرا حرف جے... این... سی... NJNC۔

یہ ایک شکستہ اور مبہم تحریر تھی۔ ایک باہمت مرتے ہوئے آدمی کی آخری کوشش۔

ڈینیل کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا جے، آئی بھی ہوسکتا تھا یعنی NINC ڈینیل نے نئے سرے سے غور کیا۔ یہ بھی بے معنی لفظ ہے۔

دفعتاً اس کے لاشعور میں ہلچل ہوئی۔ اس نے ایک منٹ کے لیے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور ذہن کو آزاد چھوڑ دیا... NINC اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اور زمین کی طرف دیکھا۔ جلد ہی اسے سرخ رنگ کا جوتے کا ایک واضح نشان نظر آگیا۔ جوتے کا تلا مچھلی کی کھال جیسے ڈیزائن کا تھا۔ NINC اس کے تصور میں وہ مڈبھیڑ کسی فلم کی طرح پوری جزئیات کے ساتھ چلنے لگی جب وہ کیمپ واپس آتے ہوئے راستے میں چنگ والے کا نوائے سے ٹکرایا تھا۔ وہیں سڑک کی ریت پر اسے جوتے کے تلے کا نشان یاد آیا۔ بجلی کے کوندے کی طرح خون سے لکھا گیا لفظ اس کی سمجھ میں آگیا... NING یہ لفظ ننگ تھا۔ جانکنی کے عذاب نے جانی کو مہلت نہیں دی کہ G کو مکمل کرلیتا۔ اس لیے وہ C پڑھنے میں آرہا تھا۔

ڈینیل نے محسوس کیا کہ اس انکشاف نے اس کے جسم میں پھریری کی لہر دوڑا دی ہے۔ اسے چنگ کی آستین اور جوتے پر لگے دھبے یاد آئے... وہ جانی کا خون تھا۔ اسے چنگ کی گفتگو یاد آئی۔ وہ چاہتا تھا کہ ڈینیل واپس جانے کے بجائے ماناپول جائے۔ اس نے تصور میں اس کی انگلیوں سے پھسل کر گرتی ہوئی سگریٹ دیکھی۔ اسے رینجرز کا لاتعلق انداز یاد آیا... یقیناً ٹرکوں میں گودام کے رجسٹرڈ ہاتھی دانت کا ذخیرہ لوڈ تھا۔

ڈینیل کی سمجھ میں سب کچھ آگیا۔ اسے کچھ سوالوں کے جواب ڈھونڈنے تھے۔ چنگ کے مرکزی کردار کے بارے میں اسے رتی بھر شک نہیں رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا...

”میں تم سے حساب لوں گا۔“ اس کے حلق سے غیر انسانی غراہٹ بلند ہوئی۔ ”تمہارے لیے، ماویس کے لیے... بچوں کے لیے۔ جانی! میں وعدہ کرتا ہوں... میری تیری دیرینہ دوستی کی خوشگوار یادوں کی قسم کھاتا ہوں۔“

ڈینیل کا چہرہ فرطِ غضب سے سرخ ہوگیا تھا۔ ”میں اس چنگ کا وہ حال کروں گا کہ وہ اور اس کا باپ...“ ڈینیل زخمی درندے کی طرح ہانپ رہا تھا... نہیں لگ رہا تھا کہ اس وقت وہ مہذب دنیا کا ایک مشہور آدمی ہے جس نے انگلینڈ سے ڈاکٹریٹ کی ہوئی ہے... وہ سرتاپا انتقام نظر آرہا تھا۔

ڈینیل نے خون آلود کاغذ واپس جانی کی مٹھی میں دبا دیا تاکہ اسے پولیس حاصل کرسکے۔ کھڑکی کا پردہ اس نے دوست کے بے روح جسم پر ڈال دیا۔ چند سیکنڈ تک وہ جانی کے پاس کھڑا رہا پھر کھلے ہوئے خالی سیف کے لاک سے چابیاں نکال کر اسلحہ خانہ کا رخ کیا۔ ایک اے کے۔ 47 اٹھائی، اسے لوڈ کیا اور دوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔

بارش رک چکی تھی تاہم اپنے اثرات چھوڑ گئی تھی۔ کیچڑ میں گودام کے قریب ٹرکوں کے ٹائروں کے نشان بہت نمایاں تھے۔ شاندار منصوبہ بنایا گیا تھا۔ آخری لمحات میں ”سام“ کی حرص نے ڈرامے میں مزید رنگ بھر دیے تھے۔ پولیس چوروں کے رخ پر جاتی جو ذخیرے کی بھاری مقدار لے کر دریا کی جانب گئے تھے۔ جبکہ اصل ذخیرہ اور منصوبہ ساز ٹرکوں میں اپنی نامعلوم منزل کی جانب بڑھ گئے تھے۔

☆☆☆

ڈینیل نے لینڈ کروزر اسٹارٹ کرتے وقت گھڑی دیکھی۔ تقریباً آٹھ بج رہے تھے۔ کیا وہ ان کو ہائی وے تک پہنچنے سے پہلے پکڑ لے گا۔ ہائی وے ماناپول سے زیادہ دور نہیں تھا۔ بہرحال اس وقت تو اسے ماناپول پہنچنا تھا۔ وہ ہائی وے پر نکل جاتے تو مشکل ہوجاتی۔ ”جانے نہیں دوں گا اس مردود کو۔“ ڈینیل دانت بھینچ کر بڑبڑایا۔

بارش کے باعث راستہ بہت خراب ہوگیا تھا۔ کہیں کہیں پانی گھٹنوں تک آگیا تھا۔ لینڈ کروزر ممکنہ حد تک تیز جا رہی تھی۔ جاکو نے ڈیش بورڈ کا ہینڈل پکڑ لیا۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ اس کے اعصاب ابھی تک قابو میں نہیں آپائے تھے۔ یہ اس کا افریقا کا دوسرا سفر تھا۔ ڈینیل کے ساتھ... اس قسم کے ہولناک واقعے کا سامنا اسے پہلی مرتبہ کرنا پڑا تھا۔

”آہستہ ڈینیل اس طرح ہم دونوں مارے جائیں گے۔“ اسے ڈینیل کی دیوانگی سے خوف محسوس ہوا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اندر سے وہ سمندر کی طرح ہے۔

ڈینیل نے مختصراً اسے دفتر کا احوال اور اپنا تجزیہ بتایا۔

”لیکن تم اس سفیر کو چھو نہیں سکتے۔“ اس نے کہا ”اگر تم غلطی پر ہوئے تو بری طرح پھنس جاؤ گے۔“

”میں غلطی پر نہیں ہوں۔“ ڈینیل کا لہجہ یقین سے بھرپور تھا۔

وادی کے دامن میں دریا بل کھا رہا تھا۔ یہ بارش کا پانی تھا۔ ڈینیل خشک دریائی راستہ دوبار پار کرچکا تھا۔

”اسے ہم نہیں پار کرسکتے۔“ جاکو فکرمند تھا۔

ڈینیل نے ٹویوٹا پانی کے ساتھ دوڑائی اور ایک گرے ہوئے درخت تک پہنچ گیا۔ ایک لمبی شاخ توڑ کر وہ پانی میں اتر گیا۔ حتی الامکان آگے جانے کے بعد اس نے بازو دراز کیا اور شاخ کو پانی میں ڈبو دیا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ درمیان میں پانی کی سطح زیادہ نہیں تھی۔ دریا کی چوڑائی وہ پہلے ہی لینڈ کروزر کی تیز روشنیوں میں دیکھ چکا تھا۔ اس کی تمام صلاحیتیں بیدار تھیں۔ وہ اس وقت ڈاکٹر سے زیادہ ایک مہم جو لگ رہا تھا۔

”ہم جاسکتے ہیں۔“ اس نے جاکو کی جانب دیکھا۔

”تم پاگل ہوگئے ہو۔“ جاکو نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں نہیں جاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے، تمہارے پاس صرف دو سیکنڈ ہیں۔“ ڈینیل اس کے ردِعمل کو خوب سمجھتا تھا۔

”ٹھیک ہے، ڈبو دو سب کچھ۔“ جاکو نے منہ بنایا۔

ڈینیل کو خود پر اور لینڈ کروزر پر بھروسا تھا۔ اس نے گاڑی پانی میں داخل کردی۔ اس نے گاڑی ایک ہی گیئر میں اور یکساں رفتار پر رکھی تھی۔ چند گز جاتے ہی پانی وہیلو کے بالائی کنارے کے قریب تک آگیا۔ ہیڈ لائٹس مدھم پڑ گئی تھیں چونکہ پانی ان سے اوپر تھا۔ ڈینیل کے لیے یہ غیر متوقع نہیں تھا۔ وہ پہلے ہی تیار تھا۔ پانی اب گاڑی کے اندر رسنا شروع ہوگیا... جلد ہی ان کے پیر پانی میں ڈوب گئے۔

”تم واقعی پاگل ہوگئے ہو۔“ جاکو نے اپنی ٹانگیں ڈیش بورڈ پر رکھ لیں۔ اچانک ڈینیل کا اطمینان تشویش میں ڈھل گیا۔ گاڑی کے اندر ٹریپ ہونے والی ہوا نے گاڑی کو اٹھا لیا تھا... کچھ پانی اور گہرا ہوگیا تھا... ٹائر پانی میں گھوم رہے تھے۔ انجن اسٹارٹ تھا۔ گاڑی ریلے کے ساتھ بہنے لگی... دفعتاً ڈینیل نے محسوس کیا کہ پہیوں نے پھر زمین پکڑی ہے۔ غالباً یہاں زمین کچھ بلند تھی اور اچانک گاڑی خطرے کے علاقے سے نکل گئی۔

گیئر تبدیل ہوا، گاڑی کی غراہٹ بلند ہوئی اور وہ سیلابی ریلے سے نکل آئی۔ پانی اب پہیوں کے نصف تک آرہا تھا تاہم لینڈ کروزر نے ایک مشکل ترین مرحلہ کامیابی سے طے کرلیا تھا۔

"میں زندہ ہوں۔" جاکو کی سرگوشی سنائی دی۔

رات کے ساڑھے گیارہ بجے وہ ماناپول کیمپ پہنچے، وارڈن کا دروازہ بلا تامل دھڑ دھڑایا گیا جبکہ ڈینیل کی ہدایت کے مطابق جاکو ہارن پر ہاتھ رکھ کر بھول گیا۔

وارڈن آئزک ... لڑھکتا ہوا باہر آیا۔ وہ شخص بنیان اور کچھے میں تھا۔ "کون ہے؟" اس نے ہونقوں کی طرح ادھر ادھر دیکھا۔ "کیا مصیبت آگئی ہے؟"

"آئزک میں ہوں۔" ڈینیل نے جواب دیا۔

"ڈینیل؟" اس نے ہتھیلی سے آنکھوں پر چھجا بنایا اسی وقت جاکو نے گاڑی کی روشنی دھیمی کردی۔ "کیا بات ہے، کیا ہوا؟"

"ایک بڑے گروہ نے چی واو نیشنل پارک پر حملہ کردیا ہے۔" ڈینیل نے آئزک کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "انہوں نے کیمپ کا صفایا کردیا ہے اور سب کو قتل کردیا ہے۔"

"اوہ گاڈ!" آئزک پوری طرح سے بیدار ہوگیا۔

"میرے تجزیے کے مطابق وہ زمبین ہیں اور واپسی پر دریائے زمبین کو پار کریں گے۔ انہیں تقریباً بیس میل مارچ کرنا ہے دریا تک پہنچنے کے لیے... اپنی ٹیم تیار کرو جلد از جلد اور ان کی کھوپڑیاں اڑا دو۔" ڈینیل نے تیزی سے صورتِ حال کی وضاحت کی۔ اس کی آواز میں ایک بار پھر طیش کی جھلک محسوس ہوئی۔

اس نے آئزک کو بتایا کہ چوروں نے چی واو نیشنل پارک کب چھوڑا، ان کی تعداد اندازاً کتنی ہے اور دریا کی جانب ان کی ممکنہ رفتار کیا ہوسکتی ہے۔ "پھر اس نے پوچھا۔ "پارک سے ریفریجریٹڈ ٹرک ہرارے جانے کے لیے یہاں سے گزرے ہوں گے؟"

"ہاں ایک گھنٹا قبل۔" آئزک نے تصدیق کی۔ "ان کے ساتھ ایک سویلین بھی تھا، نیلی مرسڈیز میں۔ ایک ٹرک نیلی مرسڈیز کو کھینچ رہا تھا۔" آئزک لباس بدلتے ہوئے بول رہا تھا۔ مرسڈیز کا ذکر آتے ہی ڈینیل مضطرب ہوگیا۔

"تم کیا کرنے جارہے ہو، ڈاکٹر؟ ان خونی کتوں کی کھوپڑیاں اڑانے کے لیے ہمارے ساتھ چلو۔"

ڈینیل نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے مرسڈیز کے پیچھے جانا ہے۔"

"میں نہیں سمجھا۔" آئزک نے جوتوں کی ڈوریاں باندھتے ہوئے سر اٹھایا۔

"میں اس وقت وضاحت نہیں کرسکتا لیکن یہ سب کچھ جانی کے قتل سے متعلق ہے۔ مجھ پر بھروسا رکھو۔" بغیر ثبوت کے ڈینیل ڈ جیرے اور سفیر کے بارے میں کچھ نہیں بول سکتا تھا۔

"ٹرسٹ می، پلیز۔" اس نے دوبارہ کہا اور آئزک نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ ڈینیل اور جانی کی دوستی سے واقف تھا۔

"اوکے ڈینیل۔ دریا پار کرنے سے پہلے میں ان سؤر کے بچوں سے نمٹتا ہوں... یہ میرا تم سے وعدہ کرتا ہے۔"

☆☆☆

ڈینیل کانوائے کے پیچھے روانہ ہوگیا۔ کیچڑ زدہ زمین پر نشانات اس کی مدد کررہے تھے۔ یہاں تک مرسڈیز ساتھ تھی۔ کھینچنے والے ٹرک کی رسی کا نشان بھی اسے نظر آگیا۔ مرسڈیز کو کھینچنے کے باعث کانوائے کی رفتار خاصی سست ہوگئی تھی۔ ڈینیل کو کسی قدر اطمینان ہوا۔

اس نے نشستوں کے درمیان موجود اے کے 47 کو چھوا۔

جاکو نے دیکھ لیا۔ "ڈینیل کوئی جلد بازی نہ کرنا... تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ تم شبے کی بنیاد پر اس کا کھوپڑا نہیں کھول سکتے، پلیز اپنے مزاج کو ٹھنڈا رکھو... میں تمہارے احساسات کو سمجھ رہا ہوں۔"

ڈینیل نے سر ہلایا اور کار ایک دوراہے پر روک دی۔

"ٹارچ دینا۔" ڈینیل گاڑی سے اتر گیا۔ کچھ دیر زمین کا جائزہ لینے کے بعد وہ واپس گاڑی میں آگیا۔

"جنوب۔" جلد ہی طاقتور گاڑی کی اسپیڈ میٹر کی سوئی سو سے اوپر لرز رہی تھی۔ "ہم پکڑ لیں گے۔" اسی وقت اسے فاصلے پر دیے جیسی روشنی نظر آئی۔ "ٹیل لائٹ... ہم پہنچ گئے۔"

ڈینیل کے ہاتھ نے ایک بار اے کے 47 رائفل کے دستے کو چھوا اور جاکو پھر نروس ہوگیا۔

وہ مزید قریب ہوئے تو ڈینیل نے ٹویوٹا کی طاقتور اسپاٹ لائٹس روشن کردیں پھر اس کا منہ بن گیا۔ وہ اونچے سفید رنگ کے ٹرک کی توقع کررہا تھا لیکن وہ کوئی اور ہی گاڑی تھی جو اس سے قبل نہیں دیکھی تھی۔

ڈینیل نے بریک لگایا۔ یہ ایک دیوقامت ٹرک اور اس سے جڑا ہوا ٹریلر تھا جو جانے کے لیے تیار تھا۔ ٹریلر سبز رنگ کے دبیز نائلون کے تارپولین سے ڈھکا ہوا تھا۔

تین آدمی وہاں موجود تھے۔ دو سیاہ فام افریقی، تیسری ایک قدرے بارعب شخصیت جو خاکی سفاری سوٹ میں ملبوس تھی۔ اس کی نمایاں ترچیزیں اس کی داڑھی اور مخصوص پگڑی تھی۔ "ہوں۔ ں... تو یہ کوئی سکھ ہے۔" ڈینیل نے سوچا۔ سکھ نے افریقیوں سے کچھ کہا اور وہ تیزی سے ٹریلر کے آگے لگے ٹرک کی طرف چل دیے۔ ٹریلر روانگی کے لیے تیار تھا۔

"ایک سیکنڈ۔" ڈینیل اپنی گاڑی سے کودا۔ "مجھے کچھ بات کرنی ہے۔"

"کیا بات ہے؟" سکھ نے بغور اسے دیکھا اور اندازہ لگایا کہ یہ کوئی مشرقی باشندہ ہے جو بڑی رواں انگریزی میں بات کررہا تھا۔

"پریشانی کے لیے معذرت خواہ ہوں۔" ڈینیل نے کہا۔ "دو بڑے سفید ٹرک یہاں سے گزرتے دیکھے ہوں گے؟"

سکھ جواب دیے بغیر اسے گھور رہا تھا۔

"کافی بڑے ٹرک تھے جو نظروں میں آئے بغیر نہیں گزر سکتے۔ وہ ساتھ سفر کررہے تھے بہت ممکن ہے کہ نیلی مرسڈیز سیلون بھی کانوائے کے ساتھ ہو۔"

سکھ نے نگاہ ڈینیل پر سے ہٹائی اور دونوں افریقیوں سے کچھ کہنے لگا۔

ڈینیل بے چینی سے منتظر تھا اسی دوران میں اس نے ٹرک پر کمپنی کا لوگو دیکھا۔

ہرنام سنگھ لمیٹڈ، امپورٹ ایکسپورٹ۔ مالاوی۔

"مسٹر سنگھ، میں بڑی جلدی میں ہوں۔" ڈینیل نے اسے مخاطب کیا۔

سکھ چونک پڑا۔ "تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا؟"

ڈینیل نے ٹرک کے لوگو کی جانب اشارہ کیا۔

"اچھا... تم ایک تیز نگاہ شخص ہو۔" سکھ پُرسکون نظر آنے لگا۔ "ہاں میرے آدمیوں نے دو ٹرکوں کی تصدیق کی ہے۔ یہ نصف گھنٹا قبل کی بات ہے۔ ان کا رخ جنوب کی طرف تھا البتہ مرسڈیز کو نہیں دیکھا گیا۔ میں خود بھی جلدی میں ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ میں تمہارے کسی کام آسکا۔ اوکے دوست!" اس نے ٹرک میں بیٹھتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔

ڈینیل کو اس کی آواز میں مصنوعی پن محسوس ہوا۔ اس نے عقب سے رینگتے ہوئے ٹریلر کو دیکھا۔ لگتا تھا ٹریلر پوری طرح لوڈ ہے، ایک بھرے ہوئے بیگ پر لکھا دیکھا۔

"خشک مچھلی، پروڈکٹ آف..." آگے وہ نہ پڑھ سکا۔ البتہ اس کی حسِ شامہ نے بیگز کے مشمولات کی تصدیق کردی۔ مچھلی کی باس تو بند ناک میں بھی گھس جاتی ہے۔

ڈینیل کی چھٹی حس کسی گڑبڑ کا اعلان کررہی تھی تاہم وہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ ٹرک اور ٹریلر دور ہوتے چلے گئے۔

اس نے ہرنام سنگھ کا نام دہرایا اور ذہن میں محفوظ کرلیا۔

"کون تھا؟ کیا کہہ رہا تھا؟" جاکو نے سوال کیا۔

"انہوں نے ٹرک دیکھے تھے جو آدھ گھنٹا قبل جنوب کی طرف گئے ہیں۔ ہمیں ان کے پیچھے جانا ہے۔" جاکو نہ صرف نروس تھا بلکہ کشمکش کا شکار ہوگیا۔ وہ احتجاج کرنا چاہتا تھا پھر چپ رہا۔ سڑک اوپر کی طرف جارہی تھی اور وقتاً فوقتاً خطرناک موڑ آرہے تھے۔

جیسے ہی انہوں نے ایک موڑ کاٹا... دو میں سے ایک سفید ٹرک نے آگے سڑک بلاک کی ہوئی تھی۔ وہ لینڈ کروزر کی آدھی رفتار سے جارہا تھا۔ ڈینیل نے جگہ لینے کے لیے ہارن دیا۔ اگلے ڈرائیور پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ "سائڈ پکڑو... قاتل درندے..." ڈینیل پھنکارا۔

"آرام سے ڈاکٹر۔" جاکو نے التجا کی۔

ڈینیل نے انتہائی کنارے کی جانب ہوکر اوورٹیک کرنا چاہا لیکن سفید ٹرک والے نے سائڈ بلاک کردی۔ وہ ہر بار دونوں کناروں کی طرف ٹرک لہرا کر راستہ بلاک کررہا تھا۔

"وہ جانتا ہے کیا ہونے والا ہے... وہ راستہ نہیں دے گا۔" ڈینیل غضبناک لہجے میں بولا۔ "وہ سمجھ گیا ہے کہ ہم چی واو نیشنل پارک کا خون خرابا دیکھ آئے ہیں۔"

"کم آن ڈاکٹر... درجنوں وجوہات ہوسکتی ہیں... میں اس چکر سے دور رہنا چاہتا ہوں۔" جاکو نے ناراضی ظاہر کی۔

"اب بہت دیر ہوگئی ہے، تم اس چکر کا حصہ بن چکے ہو۔ پسند کرو یا نہ کرو۔"

ڈینیل نے رفتار دھیمی کی، تھوڑا بائیں جانب ہوا۔ اگلا ٹرک بھی دھیما ہوکر بائیں جانب ہٹا۔ ڈینیل نے یک لخت گیئر کم کیا اور ایکسلریٹر فرش سے لگا دیا۔ لینڈ کروزر کمان سے نکلے تیر کی طرح اچھل کر آگے بڑھی اور عین اگلے ٹرک کی دم کے پاس سے ڈینیل نے اسٹیئرنگ مخالف سمت کاٹا۔ سڑک اور ٹرک کے درمیانی خلا میں اس نے گاڑی دبائی۔ وہ خطرناک حد تک سڑک کے کنارے تھا جہاں سے ترچھی ڈھلان سیدھی ایک گہری وادی میں جارہی تھی۔

"تم اپنے ساتھ مجھے بھی مار کر دم لوگے۔" جاکو غصے سے چلّایا۔

لینڈ کروزر نے خطرے کے نشان کو ہٹ کیا جو سڑک کے کنارے لگا تھا۔ لینڈ کروزر جھومتے ٹرک کے ساتھ دوڑ رہی تھی تاہم قدرے پیچھے تھی۔ ڈینیل کی تمام تر توجہ ڈرائیونگ پر تھی۔

اچانک ٹرک والے نے اسٹیئرنگ گھمایا اور ٹرک بری طرح ڈینیل کی گاڑی سے ٹکرایا۔ اس کے وزن اور تصادم نے لینڈ کروزر کو وادی کی جانب دھکیلا۔

ڈینیل نے بریک لگاتے وقت پوری قوت صرف کی... گاڑی پہلے ہی خطرے کی حدود میں تھی۔ اس کا اگلا ایک پہیا کنارے سے اتر گیا تاہم ڈینیل اسے روکنے میں کامیاب ہو گیا۔ ٹرک آگے نکل گیا۔ ڈینیل نے گاڑی کو سڑک پر واپس ڈالا۔ ''اوکے۔'' اس نے جاکو کے خوفزدہ چہرے کو دیکھا۔

''اس سے بڑا کوئی ثبوت چاہیے۔ اس نے عمداً... ہمیں صفحۂ ہستی سے مٹانے کی کوشش کی تھی۔'' وہ غرایا۔

ٹرک اگلے موڑ پر غائب ہو گیا۔ ضدی ڈینیل نے نئے سرے سے تعاقب کا آغاز کیا۔ موڑ مڑنے کے بعد انہوں نے ٹرک کو چند سو میٹر دور پایا۔ اس کا عقبی دروازہ ایک موٹی آہنی سلاخ کے ذریعے مزید محفوظ کر دیا گیا تھا۔ ایک جانب چھت پر جانے کے لیے چھوٹی سیڑھی نصب تھی۔ سیڑھی مخالف جانب تھی۔

''میں اس سیڑھی پر جا رہا ہوں۔'' ڈینیل نے اطمینان سے جاکو کو نئی اطلاع دی۔ ''میرے نکلتے ہی تم ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لینا۔''

جاکو نے اپنا سر پیٹ لیا۔ ''بالکل نہیں، میری برداشت ختم ہو گئی ہے۔ مجھے اس معاملے سے باہر سمجھو۔''

''فائن۔'' ڈینیل نے اس کی جانب دیکھا تک نہیں۔ ''ڈرائیو نہیں کرنا تو کریش کر دینا۔''

ڈینیل دونوں گاڑیوں کی رفتار اور فاصلے کا تخمینہ لگا رہا تھا۔ اس نے اپنی جانب کا دروازہ کھولا۔ اپنی جانب کے بونٹ کے کونے کو وہ اگلے ٹرک کے سیڑھی والے عقبی کونے کے قریب لے گیا۔ اس نے اوورٹیک کرنے کی کوشش نہیں کی، بایاں پاؤں ایکسلریٹر پر تھا اور دایاں پاؤں بالائی فٹ بورڈ پر تھا۔ اگلے ٹرک نے ابھی تک راستہ بلاک نہیں کیا تھا۔ یہ ایک خطرناک بازی گری تھی... سیڑھی پانچ فٹ کے فاصلے پر تھی۔

اچانک ڈینیل بایاں پاؤں ہٹا کر کودنے ہی والا تھا کہ اس کی چھٹی حس نے سوال اٹھایا کہ اگلے ٹرک نے اوورٹیکنگ روکنے، راستہ بلاک کرنے میں ضرورت سے زیادہ وقت لے لیا تھا۔ اس کے دماغ نے تیزی سے کام کیا۔ پچھلی بار وہ ٹرک کے برابر آ گئے تھے لیکن کسی قدر پیچھے تھے اور ان کے بچ جانے میں اسی فرق کا بھی ہاتھ تھا۔ اگلے ٹرک نے قبل از وقت ٹکر مار دی تھی۔ ڈینیل سمجھ گیا حریف اس مرتبہ خود اسے موقع دینا چاہتا ہے کہ وہ آگے نکلنے کی کوشش کرے اور وہ مناسب وقت پر تباہ کن ٹکر مار سکے۔ ڈینیل دروازہ بند کر کے اندر آ گیا۔

جاکو نے سکون کی سانس لی۔ وہ یہی سمجھا تھا کہ یہ چھلانگ ممکن نہیں تھی لیکن جب اس نے گاڑی کو اوورٹیکنگ پوزیشن اختیار کرتے دیکھا تو اپنے بال نوچنے لگا۔ اسے یقین تھا کہ اس مرتبہ وہ گاڑی سمیت کھائی میں ہی ہوں گے۔ وہ اس وقت کو کوس رہا تھا جب اس نے افریقا آنے کی حامی بھری تھی۔

''غور سے سنو۔'' ڈینیل نے کہا۔ ''وہ ہمیں نکلنے دے گا لیکن زیادہ سے زیادہ ٹرک کے گیٹ سے پیچھے تک... پھر ٹکر مارے گا میں شروع میں ہی گاڑی سے نکل جاؤں گا اور تم فوراً گاڑی دھیمی کر کے پیچھے رہ جانا۔''

لینڈ کروزر، ٹرک اور سڑک کے بیرونی کنارے کے درمیانی خلا میں داخل ہو گئی... ڈینیل کو ''ٹائمنگ'' کا خیال رکھنا تھا... نہ زیادہ پیچھے، نہ زیادہ آگے۔ اگر اس کا بونٹ ٹرک کی دم سے آگے نکل جاتا تو وہ ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ ہی نہ کھول پاتا۔

لینڈ کروزر دھیرے دھیرے ٹرک کے برابر سے آگے آ رہی تھی۔ ڈینیل نے آخری لمحات میں اپنا ارادہ بدلا اور وہ ہوا جو جاکو کے گمان میں بھی نہ تھا۔ ٹرک کی عقبی سیڑھیاں بہت قریب تھیں۔ ''جاکو گاڑی تمہاری ہے۔'' ڈینیل چیخا... ایکسلریٹر کو دبا کر چھوڑتے ہی وہ اچھل کر پنجوں کے بل سیٹ پر بیٹھ گیا... آناً فاناً اس کا جسم کھلی کھڑکی سے اڑتا ہوا باہر گیا۔ ایک ہاتھ سیڑھی تھامنے میں کامیاب رہا۔ لینڈ کروزر ہلکے جھٹکے سے تھوڑا آگے ہو کر پیچھے ہوئی... باقی کام جاکو نے سنبھال لیا۔ اسے سنبھالنا ہی تھا۔ لینڈ کروزر، ٹرک کے عین عقب میں آ گئی اور لمحہ لمحہ پیچھے ہوتی جا رہی تھی۔

ڈینیل کچھ دیر تک خود کو سنبھالتا رہا۔ اسے کافی حد تک یقین تھا کہ ٹرک ڈرائیور نے اس کی حرکت نہیں دیکھی تھی۔ جلد ہی وہ چھت پر پہنچ گیا اور پسنجر سیٹ کی طرف رینگنے لگا۔ سامنے گلاس ٹرک کی طرح ہی کافی بڑے سائز کا تھا... اوپر سے جھانک کر ڈینیل نے ہیر جانے کے امکان اور دیگر جزئیات کا جائزہ لیا اور ڈرائیونگ کیبن کے اندر گھسنے کے لیے تیار ہو گیا۔

سامنے سڑک پر اس نے بائیں موڑ کو دیکھا جہاں نہ

صرف ٹرک کی رفتار اور کم ہو جاتی بلکہ موڑ کاٹتے ہوئے اسے خود بخود کیبن کے اندر کی جانب جھکاؤ ملتا۔

جیسے ہی ٹرک موڑ کاٹنے لگا، وہ کسی سانپ کی طرح پھسلا... ونگ مرر کو دبوچا۔ ایک لمحے کے لیے اس کی دونوں ٹانگیں ہوا میں لہرائیں۔ موڑ پر ٹرک کے معمولی جھکاؤ نے اس کا جسم دروازے سے لگا دیا... اگلے لمحے اس کی دونوں ٹانگیں اپنی مطلوبہ جگہ جم چکی تھیں۔ ڈرائیور گومو تھا اور بوکھلائے ہوئے انداز میں اسے دیکھ کر اس طرح چیخ رہا تھا جیسے کسی بلا پر نظر پڑ گئی ہو۔

گومو نے دروازہ لاک کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا ہاتھ وہاں تک پہنچ ہی نہ سکا۔ ٹرک لہرایا تو گومو کو دونوں ہاتھ غیر معمولی بڑے اسٹیئرنگ وہیل پر جمانے پڑے۔ اتنی دیر میں ڈینیل دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

گومو نے اس کے منہ پر گھونسا مارا۔ ڈینیل نے کوئی خاص اثر نہیں لیا۔ وہ موڑ سے گزر چکے تھے۔ اس نے ہینڈ بریک پکڑ کر پورا اوپر کھینچ دیا۔

تمام جسیم وہیلز بیک وقت لاک ہو گئے۔ ایک تیز تر سیٹی جیسی چیخ بلند ہوئی۔ نیلا دھواں اٹھا اور ربر جلنے کی بو نمایاں تھی۔ ٹرک پھسلتا ہوا ترچھا ہوا۔

گومو نے آگے کی جانب جھٹکا کھایا۔ اسٹیئرنگ وہیل اس کے سینے میں لگا اور سر ونڈ اسکرین سے جا ٹکرایا۔ ٹرک وحشی ہاتھی کی طرح جھوم رہا تھا۔ ڈینیل نے اسٹیئرنگ وہیل کو سیدھا رکھنے کی کوشش کی... چند لمحوں میں ٹرک رک گیا۔

اگنیشن بند کر کے اس نے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا اور گومو کو کاندھے سے دھکا دے کر کیبن سے باہر پھینک دیا۔ گومو چھ فٹ سے نیچے جا کر گرا۔ ڈینیل فوراً ہی اس کے سر پر پہنچ گیا۔

''خبیث انسان۔'' ڈینیل نے اس کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔ ''تو نے جانی اور اس کے خاندان کو ہلاک کر دیا۔''

''پلیز، ڈاکٹر... میں نہیں... سمجھا...'' گومو کی آواز ٹوٹ رہی تھی۔

ڈینیل نے اس کے گریبان کو اور مروڑا۔ ''کتنے کی زبان ہے تیری...''

گومو کی بیلٹ کے ساتھ چمڑے کی نیام میں خنجر نما چھری موجود تھی۔

ڈینیل نے بکل کی آواز سنی اور چھری کی دھار نگاہوں میں لہرا گئی۔ ڈینیل نے پھرتی سے اس کا گریبان چھوڑا اور اچھل کر پیچھے ہٹا۔ گومو نے نیچے سے اوپر ہاتھ چلایا۔ ڈینیل بال بال بچا۔

چھری کے بلیڈ نے شرٹ کو چیر دیا تھا۔

''ختم کر دوں گا۔'' افریقی نے مہارت سے چاقو لہرایا۔ اس مرتبہ اس نے پیٹ کو نشانہ بنایا۔ چھری ہوا کو کاٹتی ہوئی ایک انچ کے فاصلے سے گزر گئی۔ گومو پینترا بدل کر پھر حملہ آور ہوا۔ وہ احتیاط کر رہا تھا کہ ڈینیل اس کی کلائی نہ پکڑ پائے۔

ڈینیل نے پیچھے ہٹتے، لڑکھڑا کر گرنے کی اداکاری کی، اس کا بایاں گھٹنا زمین سے جا لگا۔ گرنے سے بچنے کے لیے اس نے ہاتھ کا سہارا لیا۔

گومو نے موقع غنیمت جانا اور فیصلہ کن وار کے لیے آگے بڑھا۔ ڈینیل نے دوسرے ہاتھ سے مٹھی بھر کنکر اس کے چہرے پر اچھال دیے۔ یہ ایک پرانی ٹرک تھی۔ گومو زیرِ دام آ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے آنکھوں کو بچایا اور ڈینیل نے اس کی چاقو والی کلائی جکڑ لی۔

ڈینیل نے قدم بڑھا کر اس کی ناف کے نیچے گھٹنا رسید کیا۔ دوسری، نازک مقام پر پڑنے والی ضرب نے اسے تڑپا دیا۔ ڈینیل نے باآسانی چاقو اس کے ہاتھ سے چھڑا لیا اور ہاتھ مروڑ کر ٹرک کی سائڈ پر اوندھا کر دیا۔

چاقو اب ڈینیل کے ہاتھ میں تھا۔ ''غدار قاتل تیری کہانی تو ابھی سنتا ہوں۔ پہلے ہاتھی دانت کا نظارہ کر لوں۔'' اس نے گومو کی جیب سے چابیاں برآمد کیں۔

''ہاتھی دانت نہیں ہیں۔'' گومو کراہا۔

ڈینیل اسے پیچھے لے آیا اور ٹرک کے عقبی پٹ کھلوائے۔

اندر کی روشنی آن کر کے اس نے جائزہ لیا۔ ہاتھی گوشت کے بڑے بڑے پارچے قریب قریب لٹکے ہوئے تھے۔ ڈینیل کو سخت مایوسی ہوئی۔ وہاں گوشت اور خون کے سوا کچھ نہ تھا۔ دس منٹ صرف کرنے کے بعد وہ باہر آیا۔

''ہاتھی دانت نہیں ہیں۔ میں نے پہلے بتایا تھا۔'' گومو بولا۔ ''تم نے سرکاری ٹرک روکا۔ تم نے مجھ پر تشدد کیا۔ تمہارے لیے کافی مصیبت کھڑی ہونے والی ہے۔''

ڈینیل نے اس کی ایک ہتھکڑی کھولی اور دونوں ہاتھ پشت پر کر کے پھر ہتھکڑی لگا دی۔

''جانی میرا دوست تھا۔'' ڈینیل نے سرد آواز میں کہا۔ ''میں نے جو کچھ جی واؤ کیمپ میں دیکھا ہے، اس کے بعد میں آخری حد تک جاؤں گا۔ تم نے جانی اور اس کے بیوی بچوں کو بیدردی سے قتل کیا ہے۔''

''میں نے نہیں... میں کچھ نہیں جانتا۔'' گومو چلایا۔

ڈینیل نے چاقو سے اس کے سینے پر خراش ڈال دی۔
”میں تمہارے ناک کان کاٹ دوں گا... ایک ایک کر کے دونوں آنکھیں پھوڑوں گا... تمام انگلیاں کاٹ ڈالوں گا۔“ ڈینیل کی آواز میں غضب کی سفاکی تھی۔ ”اور قتل کرنے سے پہلے بھی بہت کچھ کروں گا۔ جانی کا نام تو تمہاری پیشانی پر ضرور کھود دوں گا۔ تمہاری ذہانت ہے کہ جو کچھ بکنا ہے ابھی بک دو یا پھر لہولہان ہونے کے بعد بکو گے؟“

گومو کے سیاہ چہرے پر دہشت کے آثار نمایاں ہو گئے۔ اس نے تھوک نگلا اور قدرے توقف سے بولا۔ ”میں... ل... ں... میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ جاقو ہٹا لو۔“

”گڈ۔“ ڈینیل بولا۔ ”ہرنام سنگھ کے بارے میں بتاؤ۔“ ڈینیل نے ہوائی چھوڑی اور کامیاب رہا۔

”میں ہرنام سنگھ کے بارے میں سب کچھ بتا دوں گا۔“ گومو ڈھیلا پڑ گیا۔

”ڈینیل!“ دوسری آواز نے اس کو گڑبڑا دیا۔ اس نے لینڈ کروزر کی آواز نہیں سنی تھی جس کے سائے میں جاکو کھڑا تھا۔

”اس کو چھوڑ دو، ڈاکٹر۔“ جاکو نے پُرعزم اور سخت لہجہ اختیار کیا۔

”تم اس معاملے سے باہر رہو۔“ ڈینیل غرایا۔

جاکو قریب آ گیا۔ ڈینیل نے اس کے ہاتھوں میں اے کے 47 دیکھی اور بھنا گیا۔

”اسے چھوڑ دو۔“ جاکو کی آواز میں تحکم تھا۔

”یہ قاتل ہے، مجرم ہے۔“

”تمہارے پاس ثبوت نہیں ہے۔ ہاتھی دانت بھی موجود نہیں ہیں۔“

”گومو اعترافِ جرم کر رہا ہے۔“ ”تم اس معاملے سے باہر رہو۔“ ڈینیل نے ناراضی سے کہا۔

”وہ کرے گا کیونکہ تم اس پر تشدد کر رہے ہو۔“

”کیا تم نے کیمپ اور مقتولین کی حالت نہیں دیکھی؟“

”میں یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ تم اس پر تشدد کر رہے ہو... مجھے ہتھکڑیوں کی چابی دو ورنہ میں گولی چلا دوں گا۔“

ڈینیل کچھ دیر تک جاکو کو گھورتا رہا پھر چابی اس کی جانب اچھال دی۔

جاکو نے گومو کی ہتھکڑیاں کھول دیں۔

”تم جنگلی... احمق۔“ ڈینیل دھاڑا۔ ”محض ایک منٹ کی بات تھی یہ کمینہ ساری کہانی سنانے جا رہا تھا۔ ہاتھی دانت کہاں ہیں، وہ بھی بتا دیتا۔ تمہارے احمقانہ فیصلے نے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔“

گومو آزاد ہوتے ہی اپنی پرانی کھال میں لوٹ آیا۔
”میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں جانی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا سوائے اس کے کہ وہ ہماری روانگی کے وقت وہاں خیریت سے تھا۔“

”جو کہنا ہے پولیس سے کہنا، میں تمہیں ہرارے لے جاتا ہوں۔“ جاکو بولا۔ ”میرا کیمرا اور بیگ گاڑی سے نکال لو۔“

”سنو جاکو۔“ ڈینیل نے نرمی سے کہا۔ ”صرف پانچ منٹ دے دو... یہ ابھی سب کچھ تمہارے سامنے بکے گا۔ تمہارا دماغ کام نہیں کر رہا... تم بھول گئے کہ اس نے ہمیں راستے میں مارنے کی کوشش کی تھی۔“ ڈینیل نے آخری کوشش کی۔

”سوری ڈاکٹر، ہمارے راستے جدا ہو گئے ہیں۔ میں اس قسم کے چکروں سے دور رہنا پسند کرتا ہوں۔“

جاکو، گومو کو ساتھ لے کر وہاں سے روانہ ہو گیا اور ڈینیل ہاتھ ملتا رہ گیا۔ ڈینیل کی مشکلات میں اضافہ ہو گیا تھا تاہم وہ آسانی سے ہتھیار پھینکنے والوں میں سے نہیں تھا۔ اسے اپنی قسم ہر حال میں پوری کرنی تھی۔ اسے سب سے زیادہ غصہ جاکو پر تھا جس نے آخری لمحات میں بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا تھا۔ وہ لینڈ کروزر کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

وہ ٹھنڈے دل سے گزرے ہوئے حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اب تک کے واقعات کسی فلم کی طرح ہی تھے۔ تیز، غیر متوقع، خونی... یکے بعد دیگرے... خطرناک اور دہشت ناک...

ڈینیل کی پوزیشن نازک ہو گئی تھی۔ اب اسے کیا کرنا چاہیے؟ یقیناً چنگ اس سارے فساد کی چابی تھا۔ ہاتھی دانت غائب تھے۔ دو چیزیں رہ گئی تھیں۔ جائے واردات پر جانی کے ہاتھ میں شکستہ تحریر اور جوتے کا نشان۔

ڈینیل نے سب سے پہلے مانا پول کے وارڈن سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے یوٹرن لیا۔ چار بجے وہ چرندو پولیس اسٹیشن پہنچا۔ اس نے سوتے ہوئے سارجنٹ کو اٹھایا۔

”چند قتل ہو گئے ہیں، مجھے رپورٹ کرنی ہے۔“ اسے آفس کی مشینری کو متحرک کرنے کے لیے کافی محنت کرنی پڑی۔ وہاں ٹائپ رائٹر تک نہیں تھا۔

”اوہ گاڈ، سارجنٹ قاتل ہاتھ سے نکلے جا رہے ہیں

اور ہم یہاں بیٹھے ہیں۔"

آخر سارجنٹ کو لانگ ہینڈ میں ڈینیل کا بیان لینا پڑا۔

وہ تحریری بیان کے جسے بھی بتا تا رہا تھا اور برہم نظر آ رہا تھا۔ سفیر کا ذکر اس نے بہت احتیاط سے کیا تھا۔ بیان ختم ہونے پر ڈینیل نے دستخط کیے۔ سارجنٹ نے ہرارے میں سی آئی ڈی آفس فون کیا... اسے اپنے وسائل کے ساتھ چی واؤ اسٹیشن کی لینڈ روور پر جانا تھا... ہرارے سے سراغ رسانوں کی ٹیم بذریعہ ائر کرافٹ پہنچی تھی۔

ڈینیل نے اس کے اقدام پر اطمینان کا سانس لیا۔ وہاں اس کا ضرورت سے زیادہ وقت گزر گیا تھا تاہم اس دوران میں اس نے اگلی منصوبہ بندی کر لی تھی۔ اگر آئزک موٹوٹو نے چوروں میں سے چند کو پکڑ لیا تو ان کے ذریعے اب بھی چنگ کو باآسانی ملوث کیا جا سکتا تھا لیکن پہلے آئزک سے بات کرنی ضروری تھی۔ قبل اس کے کہ وہ قیدیوں کو پولیس کے حوالے کر دیتا۔

سارجنٹ اپنے مسلح ساتھیوں کے ساتھ روانہ ہو رہا تھا تب ڈینیل نے پوچھا۔ "مجھے ایک فون کرنا ہے؟" مثبت اشارہ ملتے ہی اس نے آئزک کا نمبر ملایا۔

آئزک کی آواز سنتے ہی اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ "کب واپس آئے؟"

"ابھی ابھی۔" آئزک نے جواب دیا۔

"یعنی تم ان تک پہنچ گئے تھے؟"

"ہاں۔" آئزک بولا۔ "دریا پار کرنے کے لیے جہاں انہوں نے کشتیاں چھپائی تھیں۔ ہم نے گھات لگا کر ان کی واپسی کا انتظار کیا... تم نے صحیح بتایا تھا بڑا گینگ اور بڑے بدمعاش..."

"کوئی قیدی؟" ڈینیل نے بے تابی سے سوال کیا۔

"نہیں۔" جواب آیا۔ "گینگ لیڈر سام سمیت آٹھ مارے گئے۔ باقی مگرمچھوں کی نذر ہو گئے۔ چند ایک دریا پار کر گئے۔"

"ان کے پاس ہاتھی دانت تھے؟"

"ہاں... لیکن وہ کشتیوں کے ساتھ ہی ڈوب گئے۔"

"لعنت ہے۔" ڈینیل بڑبڑایا۔ صورتِ حال اور خراب ہو گئی۔ نہ کوئی قیدی نہ ہاتھی دانت، ذمے داران کو قائل کرنا بہت مشکل ہو گیا تھا کہ بیش قیمت ذخیرے کا بڑا حصہ ٹرکس کے ذریعے نیشنل پارک کے گودام سے نکالا گیا تھا۔ چنگ کو جکڑنے کے امکانات ہر گزرتے ہوئے گھنٹے کے ساتھ معدوم ہو رہے تھے۔

"سنو آئزک، پولیس چی واؤ پارک پہنچ رہی ہے۔"

"او کے ڈینیل۔ میں اپنے ایک زخمی کو ہرارے پہنچا کر وہیں پہنچتا ہوں۔"

"میرے پاس اب ایک ہی سراغ بچا ہے۔" ڈینیل نے آئزک کو بتایا۔

"ڈینیل محتاط رہنا، خطرہ ہے، تم جہاں بھی جا رہے ہو خیال رکھنا۔"

"میں تم سے رابطہ کروں گا۔" ڈینیل نے بات ختم کر دی۔

وہ جانتا تھا کہ بہت جلد پولیس اس سے دوبارہ بات کرنا چاہے گی۔ اس وقت ایک ہی جگہ تھی جہاں وہ جا سکتا تھا اور اس کے لیے اسے یہ ملک چھوڑنا پڑتا۔ اس نے فیصلہ کر لیا۔ اسے زمبین دارالخلافہ لوساکا جانا چاہیے۔

☆☆☆

ڈینیل نے رج وے ہوٹل لوساکا میں قیام کیا اور غسل کر کے سب سے پہلے اس نے برٹش ہائی کمیشن فون ملایا۔ "مجھے مائیکل ہرگریو سے بات کرنی ہے، پلیز۔"

"میں ٹرانسفر کرتی ہوں۔" سریلا جواب آیا۔

"مائیکل... میں ڈینیل آرم اسٹرانگ۔"

"گڈ لارڈ، ڈینیل کہاں غائب ہو؟"

"یہیں لوساکا میں، مجھے تمہاری ضرورت ہے۔"

"میرے خیال میں تم ڈنر پر آ جاؤ، وینڈی بھی خوش ہو گی۔"

اس کے وہاں پہنچنے پر مائیکل نے راٹ ویلر کتوں کو خاموش کیا اور گرم جوشی سے ڈاکٹر ڈینیل سے ملا۔

"تم چانس لینے کے قائل نہیں ہو، مائیک۔" اس نے حفاظتی اقدامات کا جائزہ لیا۔

"صرف اسی ایک سڑک پر اوسطاً روزانہ ڈاکازنی کی ایک واردات ہوتی ہے۔"

وہ ڈینیل کو اندر لے گیا۔ وینڈی نے پرتپاک انداز میں ڈینیل کا استقبال کیا۔ اس کے بال بھورے تھے اور نقش و نگار خالصتاً انگلش تھے۔

مائیکل نے ڈینیل کو جام پیش کیا اور تب تک مصروفِ گفتگو رہے جب تک وینڈی نے انہیں ڈنر کے لیے طلب نہیں کر لیا۔ گھریلو کھانا ڈینیل کی کمزوری تھی اور گزرے ہوئے واقعات نے اس کی بھوک اور بڑھا دی تھی۔ اس نے سیر ہو کر کھانا کھایا۔

"ہاں تو کن ضرورتوں کی بات کر رہے تھے؟" مائیکل نے پوچھا۔

"ہاں دو احسان کرو۔"

"بولو، بھی یار۔"

"ایک تو میری فلم کی ٹیپ سفارتی بیگ میں تمہیں لندن پہنچانی ہیں۔ ان کو زندگی سے زیادہ قیمتی سمجھو... میں زمبین ڈاک خانے پر اعتماد نہیں کر سکتا۔"

"چھوٹا کام ہے، ہو جائے گا دوسرا؟"

"مجھے ایک آدمی کے بارے میں معلومات چاہئیں جس کا نام تنگ چنگ گا تنگ ہے۔ وہ ہرارے میں ایک ملک کا سفیر ہے۔"

"یقیناً اس کی فائل ہمارے پاس ہو گی۔" مائیکل نے کہا۔ "وہ دشمن ہے یا دوست؟"

"اس موقع پر میں کچھ نہیں کہہ سکتا... تاہم دشمن ہی سمجھو!"

"سفارتی بیگ کل روانہ ہو جائے گا... مطلوبہ پرنٹ آؤٹ کل تک مل جائیں گا... کیا اسے ہوٹل پہنچا دوں؟"

"مہربانی ہو گی... بڑے بھائی کی۔" ڈینیل مسکرایا۔

"یاد رکھنا... ڈینی بوائے۔" مائیکل جواباً مسکرایا۔

"نہیں بھولوں گا!"

یہ ایک غیر معمولی سہولت تھی ڈینیل کے لیے کہ اس کے فلم ٹیپ اگلے دن بحفاظت لندن کے لیے نکل جائیں گے۔ ایک سال کی جان توڑ محنت کا صلہ ان ٹیپس پر تھا جو جاکو نے بنائے تھے۔ ڈینیل کی تقریباً ساری دولت اس پر لگی تھی۔ اسے اس پروجیکٹ پر اتنا یقین تھا کہ اس نے سرمایہ کار حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس نے اپنی ہر چیز اس پروجیکٹ پر لگا دی تھی۔

اگلے روز مائیکل نے کسی پر اعتبار کرنے کے بجائے خود پرنٹ آؤٹ کا لفافہ ڈینیل تک پہنچایا۔

"میں نے یہ تمام نہیں پڑھا ہے۔" مائیکل نے بتایا۔ "اتنا جان لیا ہے کہ تنگ خاندان کوئی چھوٹی موٹی چیز نہیں ہے۔ ڈینی احتیاط کرنا... یہ بڑے بدمعاش لوگ ہیں۔" اس نے مہر بند لفافہ ڈینیل کے حوالے کیا۔ "پہلی فرصت میں تم کاغذات کو تلف کر دینا۔"

"فکر مت کرو۔"

☆☆☆

اپنے کمرے میں اُس نے چائے کا آرڈر دیا اور کمرا لاک کر کے بستر پر دراز ہو گیا۔ یہ کل گیارہ صفحات تھے، خاصے دل چسپ۔ تنگ خاندان کی دولت اور اثر و رسوخ کے بارے میں جانی انزا ہو کو پورا اندازہ ہی نہیں تھا۔ تنگ چنگ اچ سوئی خاندان کا سربراہ تھا۔ اس کی آف شور ہولڈنگز بہت وسیع اور متنوع تھیں۔ رپورٹ مرتب کرنے والے نے خود اعتراف کیا کہ ہولڈنگز کی وہ فہرست مکمل نہیں تھی۔

افریقا میں تنگ چنگ گا تنگ کی تعیناتی کے بعد تنگ خاندان کی سرمایہ کاری کا تناسب بڑھنے لگا تھا۔ چھ سال میں افریقا میں سرمایہ کاری صفر سے بارہ فی صد تک آ پہنچی تھی۔ چنگ کی دلچسپیوں اور مشاغل کو ڈینیل نے غور سے پڑھا۔

رپورٹ میں ڈینیل کو تنگ چنگ کی صرف ایک ہی کمزوری ملی، وہ باقاعدگی سے تائی پی کے اونچے قحبہ خانوں میں حاضری دیتا تھا۔ اس کا جنسی رجحان اذیت رسانی کی جانب تھا۔ اس کے ہاتھوں ایک کال گرل کی ہلاکت بھی رپورٹ میں موجود تھی۔ یہ ایک بڑا اسکینڈل بن جاتا تاہم تنگ خاندان نے چنگ کو صاف بچا لیا تھا۔

مائیک کی رائے ٹھیک تھی، ڈینیل نے سوچا، اس کا واسطہ عام آدمی سے نہیں تھا۔ اُس نے ہرنام سنگھ کو ٹارگٹ کرنے کا فیصلہ کیا۔ مسئلے کا حل سردار جی کے پاس ہونا چاہیے۔

☆☆☆

اگلے روز اس نے سارا دن ڈرائیونگ کی، چند گھنٹوں بعد وہ ایک بار پھر مالاوی میں داخل ہو چکا تھا۔

کیپٹل ہوٹل دارالحکومت کے مرکز میں واقع تھا۔ ڈینیل نے یہیں پڑاؤ ڈالا۔ اس نے پہلے مقامی ٹیلیفون ڈائریکٹری چیک کی۔ ہرنام سنگھ یہاں ایک بڑا نام تھا۔ اس کے خاصے نمبر ڈائریکٹری میں موجود تھے۔ لگتا تھا کہ وہ شہر کے ہر اسپاٹ پر اپنی انگلی رکھنا چاہتا تھا... ہرنام فشریز، ہرنام سپر مارکیٹ، ہرنام ساحل، ہرنام ٹویوٹا ایجنسی وغیرہ وغیرہ۔ شیو اور غسل سے فارغ ہو کر اس نے ہرنام سپر مارکیٹس کا قصد کیا۔ رنگ اور قد و قامت کے علاوہ لندن کی سلی ہوئی بش جیکٹ اور لینڈ کروزر کی ابتر حالت کی وجہ سے وہ اس علاقے میں سب سے الگ نظر آ رہا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ ہرنام یہاں نہ ہو یا پھر اس کی نظر اس پر یا گاڑی پر نہ پڑے۔ ہرنام سنگھ کی سپر مارکیٹ چار منزلہ عمارت تھی جو مرکزی سڑک پر موجود تھی۔ گاڑی مناسب جگہ لگا کر وہ اندر داخل ہوا۔ اشیا کا جائزہ لیتے ہوئے وہ اسٹاف کو بھی دیکھ رہا تھا۔ کیش رجسٹر پر چار ایشین لڑکیاں موجود تھیں۔ انہوں نے ساڑی زیب تن کی ہوئی تھی

اور پھرتی سے کام کر رہی تھیں۔ چہروں کی شباہت سے ڈینیل نے اندازہ لگایا کہ یہ ہرنام سنگھ کی بیٹیاں ہو سکتی ہیں۔ فلور کے مرکز میں ادھیڑ عمر کی ایک عورت بلند ڈائس پر بیٹھی تھی۔ وہاں سے وہ ہر کونے پر نظر رکھ سکتی تھی۔ وہ مدھم رنگ کی ساڑی میں ملبوس تھی۔

وہ اشیائے ضرورت منتخب کرنے کے ساتھ ساتھ ہرنام سنگھ کی موجودگی کا بھی اندازہ لگا رہا تھا جو اسے کہیں نظر نہیں آیا۔

معاً ماما سنگھ نے ڈائس پر اپنی نشست خالی کر دی اور شان سے چلتی ہوئی ان سیڑھیوں کی جانب بڑھی جو اوپر ایک اسٹور نما کمرے کی جانب ختم ہو رہی تھیں۔ ڈینیل نے پہلے اس کمرے کی جانب دھیان نہیں دیا تھا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ ڈینیل نے دروازے کے ساتھ نصب قدرے بڑے سائز کے شیشے کو نوٹ کیا۔ یہ یقیناً مخصوص شیشہ تھا، اندر سے سپر مارکیٹ کے فلور کو بخوبی دیکھا جا سکتا تھا جبکہ باہر والا کمرے کے اندر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ بلاشبہ وہی ہرنام کا آفس تھا۔

ڈینیل کیش رجسٹر کی طرف چلا گیا۔ وہاں موجود لڑکیوں میں سے ایک نے چابک دستی سے اپنا کام شروع کیا۔ ڈینیل نے اپنا رخ آفس کے شیشے کی مخالف سمت رکھا تھا۔

ہرنام سنگھ مشاہداتی کھڑکی کے پاس کھڑا تھا۔ اس کی بیوی کو اندر جاتے ہی احساس ہوا کہ ہرنام سنگھ پُرسکون نہیں ہے۔

"وہ سفید آدمی۔" اس نے سر سے فلور کی طرف اشارہ کیا۔ "کیا تم نے اس کی موجودگی کو محسوس کیا۔" وہ پُرسوچ انداز میں اپنی مخصوص داڑھی کو سہلا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سکڑی ہوئی تھیں۔

"ہاں۔" وہ اس کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ "میں نے اسے اندر آتے ہی دیکھ کر لیا تھا۔"

"میرے خیال میں، میں اسے جانتا ہوں لیکن وہ رات کا وقت تھا، مجھے پورا یقین نہیں ہے۔" اس نے فون اٹھایا اور دو بٹن دبائے۔ شیشے میں سے وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کی ایک بیٹی نے فون اٹھایا ہے۔

"احتیاط سے۔" اس نے ہندی میں کہا۔ "وہ سفید فام، جیکٹ والا، کیا وہ کریڈٹ کارڈ سے ادائیگی کر رہا ہے؟"

"جی، پتا جی۔"

"اس کا نام نوٹ کر لو اور پوچھو کہ وہ کہاں ٹھہرا ہوا ہے؟" ہرنام نے فون رکھ دیا۔

سفید فام باہر کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے اچھی خاصی خریداری کی تھی۔ اس کے باہر نکلتے ہی اس نے پھر بیٹی سے رابطہ کیا۔

"اس کا نام آرم اسٹرانگ ہے۔" بیٹی نے جواب دیا۔ "ڈی اے آرم اسٹرانگ۔" اس کا کہنا ہے کہ وہ کیپٹل ہوٹل میں ٹھہرا ہے۔"

"گڈ، شاؤ کو دو۔"

لڑکی نے مڑ کر بیرونی دروازے پر ایستادہ ایک گارڈ کو بلایا اور ریسیور اس کی جانب بڑھا دیا۔ "شاؤ، تم اس آدمی کو پہچانتے ہو جو ابھی ابھی باہر نکلا ہے؟" ہرنام نے پوچھا۔

"میں نے دیکھا، لیکن میں پہچانا نہیں۔" گارڈ نے جواب دیا۔

"وہ چرندو کے قریب۔ تین رات قبل۔" ہرنام سنگھ نے اسے یاد دلایا۔ "سڑک پر جب ہم ٹریلر لوڈ کر رہے تھے تو اس نے رک کر بات کی تھی۔"

شاؤ نے غور کیا پھر بولا "شاید۔" بالآخر وہ بولا۔ "میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔"

"اس کا پیچھا کرو، نظر میں آئے بغیر!" ہرنام نے حکم دیا۔

شاؤ آدھا گھنٹے بعد ہرنام کے سامنے موجود تھا...

"جناب وہی آدمی ہے۔" اپنے پہلوانی قدوقامت کے باوجود وہ ہرنام سنگھ کے سامنے ہراساں دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ماضی میں ان لوگوں کا حشر دیکھ چکا تھا جنہوں نے ہرنام سنگھ کو ناخوش کیا تھا۔

"کیونکر کہہ سکتے ہو؟" ہرنام نے سرد لہجے میں سوال کیا۔

"ٹرک، جناب۔" شاؤ مزید مؤدب ہو گیا۔ "اس نے خریدی ہوئی اشیا اسی گاڑی میں رکھی ہیں... سائیڈ پر نام بھی پینٹ تھا۔"

ہرنام نے رضامندی سے سر ہلایا۔ "تم نے اچھا کام کیا۔ وہ اب کہاں ہے؟"

"میں نے پیچھا نہیں کیا، میں معافی چاہتا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔ تم نے اچھا کام کیا۔" ہرنام نے مطمئن انداز میں سر کو جنبش دی۔ "آج رات گودام پر کس کا پہرا ہے؟"

"میں ہوں!" شاؤ کے دانت نکل آئے جو کافی چوڑے اور بہت سفید تھے۔ "اور یقیناً ناندی بھی ہو گی۔"

"ہم، میں آج شام گودام آؤں گا۔ میں یقین کرنا چاہتا ہوں کہ ناندی اپنے کام کے لیے تیار ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ آج کی رات پریشان کن ہو گی۔ میں کوئی غلطی

برداشت نہیں کروں گا۔" ہرنام نے زور دیا۔

"میں سمجھ گیا جناب۔" شاؤ اشارہ پاتے ہی باہر نکل گیا۔

شاؤ کے جانے کے بعد شاطر ہرنام کچھ دیر تک بیٹھ کر بند دروازے کو گھورتا رہا۔

پھر اس نے فون اٹھایا۔ اس کے بیس منٹ بے چینی میں گزرے۔ پھر چنگ کی آواز اسپیکر سے ابھری۔ وہ ہرارے میں اپنے سفارت خانے سے بات کر رہا تھا۔

"ہمارے درمیان طے تھا کہ تم اس نمبر پر بات نہیں کرو گے۔" چنگ چھوٹتے ہی بولا۔

ہرنام نے مستحکم آواز میں کہا۔ "انتہائی بلکہ ایمرجنسی سمجھو۔ یہ آرم اسٹرانگ سے متعلق ہے۔ وہ جو تم سے چی داؤ پارک میں ملا تھا... اور جب تم "سامان" کے ساتھ نکلے تھے تو اس کے ساتھ مڈبھیڑ ہوئی اور تم نے بتایا تھا کہ اس نے تمہارے کپڑوں کے دھبوں کو دیکھ لیا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔ پریشانی کی بات نہیں ہے، وہ کچھ نہیں جانتا۔"

"پھر اس نے یہاں کیوں ڈیرا ڈالا ہوا ہے۔" ہرنام کی آواز میں تلخی گھل گئی۔ "اور تم کہہ رہے ہو کہ پریشانی کی بات نہیں ہے۔"

دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔ "یہاں؟" بالآخر چنگ کی آواز آئی۔ "کیا چرندو روڈ پر اس رات اس نے تمہیں دیکھا تھا؟"

"ہاں" ہرنام سنگھ نے داڑھی کھجائی۔ "نہ صرف دیکھا تھا... بلکہ رک کر بات بھی کی تھی۔ وہ ٹرکوں کے پیچھے تھا۔"

"کب کی بات ہے؟" چنگ نے پوچھا۔ "کیا جب ہم نے ذخیرہ تمہارے حوالے کر دیا تھا؟"

"ہاں، لیکن اگر وہ کچھ دیر پہلے پہنچ جاتا تو سب کچھ دیکھ لیتا۔" ہرنام کی تلخی برقرار تھی۔

چنگ نے اس کی بات کاٹی۔ "کتنی دیر بات ہوئی تھی؟"

"ایک منٹ..." وہ بلا کسی شبہے کے ٹرک کے تعاقب میں روانہ ہو گیا تھا۔"

"اس نے گومو کو پکڑ لیا تھا۔" چنگ کی آواز میں اشتعال تھا۔ "اس ٹرک کی تلاشی بھی لی تھی تاہم کچھ حاصل نہ کر سکا۔"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کو شبہ ہو گیا ہے۔"

"بے شک۔" چنگ کا اشتعال قائم تھا۔ "لیکن ایک منٹ کی بات میں اس نے کیا کر لیا۔ اس کا تم سے کوئی تعلق نہیں، نہ وہ تمہیں جانتا ہے۔"

"میرا نام اور پتا ٹرک پر چھپا ہوا ہے۔"

"کیا تم نے شپمنٹ کر دی ہے؟"

"ابھی نہیں، کل کا پروگرام ہے۔"

"ڈاکٹر سے نمٹنا ہو گا۔ وہ زیادہ ہی مسئلہ بن رہا ہے۔" چنگ پھنکارا۔

"وہ تو مجھے کرنا ہی ہے۔ تم نے کیا اقدامات کیے؟" ہرنام نے پوچھا۔

"کپڑے نذرِ آتش کر دیے ہیں اور گومو، ڈیوڈ سمیت ایک المناک حادثہ کا شکار ہو گیا ہے۔" چنگ نے مکاری سے بتایا۔

"کیا کوئی ذمے دار افسر تم تک پہنچا؟"

"ہاں، لیکن یہ معمول کی بات ہے۔" چنگ نے اسے یقین دلایا۔ "کسی نے تمہارا نام نہیں لیا... تاہم آئندہ میرے دفتر فون مت کرنا۔"

ڈینیل کی طرف سے چنگ کو توقع تھی کہ کچھ نہ کچھ سننے کو ملے گا مگر ہرنام کی اطلاع اس کے لیے شاک سے کم نہیں تھی۔ جب اس نے پہلی مرتبہ ڈاکٹر کو چی داؤ پارک میں دیکھا تھا، اس وقت سے لے کر اب تک وہ مستقل خدشات کا شکار رہا تھا۔ اب اس نے فیصلہ کر لیا کہ فوراً وطن واپس پہنچ جائے۔ وہ غیر ضروری رسک کا قائل نہیں تھا۔

اس کی فیملی پہلے ہی وطن جا چکی تھی۔ اب اسے بھی یہی کرنا تھا۔ وہ ڈاکٹر کی پھرتیوں سے کسی قدر حیران تھا اور سراسیمگی محسوس کر رہا تھا۔

☆☆☆

سپر مارکیٹ سے نکل کر ڈینیل، ہرنام سنگھ کے دوسرے کاروبار کی طرف چل پڑا۔ اسے منزل تک پہنچنے میں کوئی خاص مشکل نہیں ہوئی۔ یہ صنعتی علاقہ تھا۔ ہرنام سنگھ کے قبضے میں چار پانچ ایکڑ زمین تھی۔ پلاٹ پر آہنی تار کی حفاظتی باڑھ تھی... یہاں اس کی ٹویوٹا ایجنسی کا ورک شاپ تھا۔

وہاں تقریباً سو کے قریب نئی ٹویوٹا گاڑیاں موجود تھیں۔ کھلے ہوئے دروازے سے دوسری طرف ڈینیل نے مستریوں کو کام کرتے دیکھا۔

ڈینیل کے پاس بھی ٹویوٹا تھی اور بظاہر بُری حالت میں تھی۔ وہ اپنی گاڑی کے بہانے ایک فورمین سے ملا۔ جیسے اسے گاڑی کے لیے خدمات کی ضرورت ہو۔ بات چیت کے دوران میں اس نے عمارت کے اندر باہر کا بخوبی جائزہ لے لیا۔ وہاں کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں چرائے گئے ذخیرے کو پوشیدہ رکھا جا سکتا۔

فورمین سے گپ شپ کے دوران میں ہی اس نے لکڑی کے کارخانے اور ٹریڈنگ کمپنی کے گودام کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرلیں۔ یہ دونوں مقامات اگلی سڑک پر تھے۔

لکڑی کی فیکٹری کے جائزے کے دوران اس نے اپنا ٹارگٹ تلاش کرلیا۔ فیکٹری کے ایک حصے میں گوداموں کا سلسلہ تھا۔ ڈینیل کی چھٹی حس پھڑکنے لگی۔

وہاں حفاظتی انتظام معمول سے ہٹ کر تھا۔ بیرونی جانب نیم فوجی طرز کے فولادی تاروں کی باڑھ تھی۔ یکساں فاصلے سے کھمبے لگے تھے اور چیک پوسٹیں بھی موجود تھیں۔ پورا گودام پانچ حصوں پر مشتمل تھا جو معمولی فرق کے ساتھ الگ الگ تھے۔

گودام کے آخری یونٹ کے کھلے دروازے پر اسے سیکورٹی گارڈ دکھائی دیا۔ اس نے اندر کی جانب نگاہ دوڑائی اور اس کی نبض کی رفتار بڑھ گئی۔ یہ وہی بھاری بھرکم ٹرک تھا جو چند روز قبل سڑک پر ٹریلر کھینچنے کے لیے استعمال ہوا تھا۔ جب ڈینیل کی ڈ بھیڑ پہلی بار ہرنام سنگھ سے ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ ٹریلر بھی اس کے عقب میں موجود تھا تاہم خشک مچھلی کے بیگ غائب تھے۔

ڈینیل فیصلہ کن اور منطقی دماغ کا حامل شخص تھا۔ وہ جس مشن پر تھا کسی چوہیا کو بھی نظر انداز نہیں کرسکتا تھا یہاں تو پورا ہاتھی کھڑا تھا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی اپنے ٹارگٹ تک پہنچ جائے گا۔

وہ گاڑی گھما کر واپس ہوٹل کی جانب روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

ہرنام کی کیڈلاک انڈسٹریل ایریا میں داخل ہورہی تھی۔ کار پرانی تھی۔ وہاں زرِمبادلہ کی قلت کسی شہری کو لگژری کار درآمد کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔

کیڈلاک گودام میں داخل ہوگئی جہاں پہلوان نما گارڈ شاؤ موجود تھا۔

"وہ آیا تھا۔" شاؤ نے اطلاع دی۔ "چار بج کر دس منٹ پر اسی لینڈ کروزر پر تھا، گاڑی آہستہ چلا رہا تھا اور آہنی باڑھ کو گھورتا رہا۔" شاؤ نے کارکردگی پیش کی۔

ہرنام کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ "یہ بندہ گوند کی طرح چپک گیا ہے، کوئی بات نہیں۔" اس نے بلند آواز میں کہا۔ "میرے ساتھ آؤ۔" شاؤ، ہرنام کے ساتھ کیڈلاک میں سوار ہوگیا۔

ہرنام سنگھ نے تمام یونٹس کو دیکھا۔ فلڈ لائٹس بند تھیں۔ برگلر الارم بھی نہیں تھے۔ دو تین برس قبل آئے دن کی وارداتوں کو روکنے کے لیے ہرنام سنگھ کے حفاظتی اقدام خاص موثر ثابت نہیں ہوئے تھے۔ تنگ آکر اس نے علاقے کے بوڑھے وچ ڈاکٹر سے رابطہ کیا اور ایک معقول رقم کے عوض اس نے ایک نہایت طاقتور بلا اس کے حوالے کردی اور مزید وعدہ کیا کہ اس کے قبضے میں کالی قوتیں بھی حفاظتی کام کریں گی۔

چھ مہینے تک خاموشی چھائی رہی پھر ایک مقامی گینگ نے وچ ڈاکٹر کی قوت کو چیلنج کرنے کا فیصلہ کرلیا اور کامیاب واردات میں درجنوں ٹی وی اور ریڈیو وغیرہ لے اڑے۔

ہرنام سنگھ بہت بھنایا اور وچ ڈاکٹر کو جا پکڑا اور اس کی گارنٹی یاد دلائی۔ لیکچر بڈھے نے ہرنام سے سودے بازی کر کے ناندی حوالے کردی اور بے فکر ہوجانے کے لیے کہا اور دعویٰ کیا کہ "جو بھی گھسے گا موت کے منہ میں جائے گا۔"

ناندی کے پہنچنے کے بعد صرف ایک واردات ہوئی اور نقب زن اسپتال میں ہلاک ہوگیا۔ اس کے سر کی کھال کھوپڑی سے جدا ہوگئی تھی۔

ہرنام اور شاؤ گودام میں داخل ہوگئے۔ تقریباً آدھا گھنٹا انہوں نے وہاں گزارا اور واپس آگئے۔

"تم اپنے گارڈ ہاؤس میں رہوگے۔" ہرنام نے کہا۔ "پٹرولنگ کی ضرورت نہیں ہے... سفید شیطان کو اندر گھسنے دینا۔ اگر وہ کامیاب ہوگیا تو ناندی کے ذریعے از خود بچ نکل جائے گا۔" دونوں کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

"ناندی اپنا کام شروع کرے تو مجھے فون کردینا۔ جب تک میں نہ آؤں اندر مت جانا۔" اس نے شاؤ کو احکامات دیے۔

☆☆☆

اسٹریٹ لائٹس کی غیر موجودگی نے اس کے کام کو سہل کردیا۔ ہرنام کے سینٹرل ڈپو کی باؤنڈری سے تین سو میٹر دور ڈینیل نے گاڑی روکی۔ اس نے وقت دیکھا، ایک بج رہا تھا۔ دروازہ کھول کر اس نے تاریکی میں قدم رکھا۔

اس نے گہرے نیلے رنگ کا چست لباس پہنا ہوا تھا، اوپر سیاہ رنگ کی چمڑے کی جیکٹ۔ تیز رنگ کی اونی ٹوپی اس کے سر پر تھی۔ کمر کے گرد نائلون بیگ تھا جس میں چند کام کی اشیا تھیں۔ گاڑی کی چھت پر ہلکی المونیم کی دو سیڑھیاں تھیں۔ اس نے سیڑھیاں ایک بغل میں سنبھالیں اور سڑک سے ہٹ کر جھاڑیوں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ ایک زنگ آلود کار باڑی کی آڑ لے کر اس نے سیڑھیاں زمین پر رکھ دیں۔ وہ تاریکی میں ڈوبی عمارت کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ فولادی تاروں میں گھری باؤنڈری فلڈ لائٹس کی روشنی سے محروم تھی۔

صرف گارڈ ہاؤس کے گیٹ کی بتی روشن تھی۔ یہ روشنی جہاں تک جارہی تھی، وہاں تک اسے الارم کا نہ تو کوئی تار نظر آیا، نہ ہی فولادی باڑھ جس میں اس نے کرنٹ محسوس کیا۔ وہ حرکت میں آگیا۔ وہ باڑھ کاٹ کر آسانی سے اندر گھس سکتا تھا مگر وہ اپنے پیچھے کوئی نشانی چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے سیڑھیوں کو کھینچ کر ان کی لمبائی پوری کی اور دونوں کو جوڑ دیا۔

سیڑھی مناسب جگہ لگا کر وہ ٹھٹکا تاہم الارم کی کوئی آواز بلند نہیں ہوئی۔ ڈینیل نے سینے میں رکی سانس خارج کی اور سیڑھی پر قدم رکھ دیا۔ فولادی کانٹوں سے بچتا بچاتا وہ اوپر پہنچ گیا اور ساکت ہوکر گہری نظر سے پھر تاریکی کو کھنگالا۔ اس نے سیڑھی کو دوسری جانب اتارنا شروع کیا تو وہ اس کے ہاتھ سے پھسل گئی... نیچے گھاس تھی پھر بھی جو آواز پیدا ہوئی، وہ بندوق کے دھماکے سے کم نہیں تھی۔ ڈینیل کے اعصاب تن گئے۔ اس نے کسی دھمکی، گولی یا روشنی کا انتظار کیا تاہم کچھ بھی نہیں ہوا۔

ایک منٹ انتظار کرنے کے بعد اس نے جرسی کے اندر سے ربر کا رول نکالا۔ یہ ایک چھوٹے تکیے کی طرح استعمال کیا جاسکتا تھا۔ اسے ڈینیل نے فولادی تار کے گرد لپیٹا۔ اس کے ہاتھ دستانوں میں تھے۔ اس نے مضبوطی سے کانٹوں سے بچ کر گرفت جماتے ہوئے خود کو دیوار کی دوسری جانب اتار لیا۔ چند لمحے لٹکا رہا۔ قدموں سے زمین نو فٹ دور تھی، وہ کود گیا۔

کچھ بھی نہیں، سناٹا ہی سناٹا چھایا رہا۔

اس نے تیزی سے سیڑھی واپس کھڑی کردی تاکہ واپسی میں وقت ضائع نہ ہو۔

اب وہ گودام میں گھسنے کے لیے تیار تھا۔ اسے اندر داخل ہونے کی کوئی راہ دکھائی نہ دی۔ ایک دیوار پر دو روشن دان نما کھڑکیاں تھیں وہ بھی تیس فٹ بلند۔ آخر اسے ایک چھجا نظر آیا جو قدرے نچلی سطح پر گودام کی دیوار کے ساتھ تھا۔ ڈینیل اس طرف آیا تو اس کی حساس ناک نے ایک عجیب لیکن بہت کمزور سی بو محسوس کی تاہم اس کا دھیان چھجے تک رسائی کی جانب تھا۔ بالآخر اسے وہ پائپ نظر آگیا جو اسے چھجے تک پہنچا سکتا تھا۔ اس وقت عجیب سی بو قدرے تیز ہوگئی۔ ڈینیل نے پائپ کی مضبوطی کا اندازہ کیا اور مطمئن ہونے کے بعد بآسانی چھجے پر پہنچ گیا۔ دس فٹ پر اسے دو

کھلے روشن دان نظر آئے۔ اس نے بیگ سے نائلون کی رسی کا لچھا نکالا۔ اس کے ایک سرے پر مخصوص گرہ لگائی پھر بیگ سے خاص پلاسٹک کا مضبوط ہک نکالا اور گرہ میں پھنسا دیا۔ یہ ہک اس نے اس لیے منتخب کیا تھا کہ آواز کم سے کم پیدا ہو۔

بڑی احتیاط سے اس نے رسی روشن دان میں پھینکی... تیسری کوشش میں وہ کامیاب ہو گیا۔ ہک کہیں پھنس گیا تھا۔ اس نے زور لگا کر کئی بار چیک کیا۔ ربر سول کے کینوس شوز کے سہارے وہ پھرتی سے اوپر جا پہنچا۔

فریم میں بیٹھ کر اس نے کچھ دیر سانس بحال کیا۔ رسی لپیٹ کر بیگ میں منتقل کی اور ٹارچ نکالی۔ جو سامان گودام میں بھرا تھا وہ اسے فرش تک نیچے پہنچا سکتا تھا۔ احتیاط سے پیٹیوں، ڈبوں، بوریوں وغیرہ کے سہارے وہ دھیرے دھیرے نیچے پہنچ ہی گیا اور بکسوں کی دو قطاروں کے درمیان دبک گیا۔ پھر وہ حرکت کرنے ہی والا تھا کہ اچانک اپنی جگہ جم گیا۔ مدھم سی آواز اس نے صاف سنی تھی۔

ڈینیل نے ٹارچ روشن کی اور دو رویہ قطار کے تنگ خلا میں حرکت کی۔ پھر رک گیا اور سانس کھینچی۔ یہ خشک مچھلی کی بو تھی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا۔

خشک مچھلی کے بوری نما ہر بیگ پر چھپا تھا ”خشک مچھلی، پروڈکٹ آف مالاوی۔“

دوسری جانب اسی قسم کی اور بھی پیٹیاں تھیں جن کو مضبوطی سے پیک کیا گیا تھا اور ان پر روایتی چائے کی پتی کے لیبل لگے تھے۔

ڈینیل کے جسم میں ہیجانی کرنٹ دوڑ گیا۔ چائے کی پیٹیوں پر لکی ڈریگن انویسٹ منٹ کا پتا چھپا ہوا تھا۔

اس نے فورک لفٹ کو پار کیا اور اس پر لدی پیٹی کے نیچے سے بلا تامل پیچ کس اندر گھونپ دیا۔ پیچ کس مزید دھکیل کر گھمایا اور ذرا اوپر میں گول سوراخ کر دیا۔ ایک ہاتھ اس نے اندر داخل کر دیا۔ مگر آگے پلاسٹک شیٹس راستے میں حائل تھیں۔ ڈینیل نے بیگ سے چاقو نکالا اور مضبوط پلاسٹک کو چیر دیا۔ چاقو بیگ میں رکھ کر اس نے پلاسٹک کی جھری کو چوڑا کرنا شروع کی۔ چائے کی پتیوں کی خوشبو آئی اور سیاہ پتی باہر کنکریٹ کے فرش پر گرنے لگی... جلد ہی اس نے پورا پیچ کس اندر گھسا دیا لیکن وہ کسی ٹھوس شے سے نہ ٹکرایا۔ اس نے سوراخ بڑا کیا اور کوشش جاری رکھی۔ پیچ کس کسی سخت چیز سے ٹکرایا اور ڈینیل کے تاثرات فاتحانہ انداز میں بدل گئے۔ اس نے ہاتھ سے اسی سخت چیز کو ٹٹولا پھر ہاتھ باہر نکال کر دوبارہ پیچ کس اندر گھسیڑ دیا۔

دو چار ضربوں سے اس نے ٹھوس شے کا ایک ٹکڑا ڈھیلا کر دیا۔ یہ انگوٹھے جتنا تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں اس نے بغور جائزہ لیا۔ اس جیسے ماہر کو سیکنڈ بھی نہیں لگے کہ یہ ہاتھی دانت کا ٹکڑا ہے۔

”اب میں دیکھتا ہوں۔“ اس نے سرگوشی کی۔ ”خونی درندوں تم کیسے میری گرفت سے نکل پاتے ہو۔“ اس نے پلاسٹک اور دوسری اشیا کو ٹھونس ٹھانس کے سوراخ بند کیا۔ نیچے گری ہوئی پتی کو جیبوں میں بھر لیا۔ ٹارچ گھما پھرا کر اس نے اطمینان کیا کہ اپنی آمد کی کوئی نشانی تو نہیں چھوڑے جا رہا... اور... اور پھر اس بلا کو اس نے بخوبی دیکھ لیا۔

ایک مہیب شبیہ ریمپ کے کنارے کے ساتھ موجود تھی۔ ٹارچ کی روشنی میں ڈینیل اس کی اوپل جیسی روشن آنکھوں کو دیکھ رہا تھا۔ وسیع گودام کے اندھیارے میں تین بتیاں جل رہی تھیں۔ ایک ٹارچ کی اور دو...

اضطراری طور پر وہ لفٹ کے ساتھ لگ گیا۔ اس کا جسم کھنچے ہوئے تار کی طرح تن گیا۔ دماغ برق رفتاری سے کام کر رہا تھا... اس نے غیر معمولی جسامت کی بلی کو پہچان لیا تھا، یہ تیندوا تھا۔ ڈینیل کی گردن کی پشت جیسے برف ہو گئی۔

سارا ماحول تیندوے کے حق میں تھا۔ افریقا کی قدرتی رات... اندھیرا... تنہائی... اسلحہ ندارد... تاریکی درندے کی خونخواری اور وحشیانہ صلاحیتوں کے لیے مہمیز کا کام دیتی ہے۔

ڈینیل نے ٹارچ روشن رکھی اور گھوم گیا۔ درندہ اس کی پشت پر آ گیا تھا۔ قاتل شکار کے گرد چکر لگا رہا تھا... ہر چکر میں دائرہ مزید تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ یہ اس کا انتہائی جارحانہ داؤ تھا... آخری حملے سے قبل۔

ڈینیل کو اب ادراک ہوا کہ آخر وہ اتنی آسانی سے یہاں تک کیونکر پہنچا... اسے پہنچایا گیا تھا۔ موت کے کنویں میں دھکیل دیا گیا تھا۔ اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ جہاں سے وہ گودام میں داخل ہوا تھا وہ مقام دور رہ گیا۔ خون آشام درندہ گھات میں تھا اور اس موقع پر واپسی کے مقام تک پہنچنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔

اس نے ٹارچ کی مدد سے فرار کے متبادل راستوں کو تلاش کیا۔ اس کی نگاہ خشک مچھلی کے اسٹاک پر ٹک گئی جو دیوار کے ساتھ تقریباً چھت تک بلند تھا۔ وہاں سے وہ روشن دان نما کھڑکی تک پہنچ سکتا تھا۔

ڈینیل مچھلی کے اسٹاک کی جانب دوڑ پڑا۔ اس کے عقب میں خونی تیندوا تاریکی سے گولی کے مانند برآمد ہوا اور اپنے پورے وزن اور رفتار سے ڈینیل کی پشت پر گرا... وہ آگے کی جانب گیا اور اسٹاک کے بلند ڈھیر سے جا ٹکرایا۔ شدید خطرے کے احساس نے اس کی طاقت میں اضافہ کر دیا تھا۔ جنگلی جانور گیند کی طرح ٹکرا کر فوراً ہی واپس آیا تھا۔

تصادم ہوتے ہی اُس نے اپنے خطرناک دانت ڈینیل کے چہرے اور گردن پر آزمانے چاہے۔ ڈینیل پشت کے بل گرا اور گرتے گرتے پیچ کس دونوں ہاتھوں میں لے کر تیندوے کے کھلے منہ میں پیوست کر دیا۔

تیندوے نے دونوں نچلے پنجوں سے ڈینیل کا پیٹ کھولنے کی کوشش کی۔ اچانک ڈینیل نے پیچ کس باہر کھینچا اور پھرتی سے تیندوے کے پھڑکتے ہوئے ایک نتھنے میں گھونپ دیا۔ تیندوا اذیت سے تڑپا۔ اس کے حملے کا زور ٹوٹ گیا تھا۔ ڈینیل نے مہلت سے فائدہ اٹھایا اور قلابازی کھا کر خشک مچھلی کے بورے کے درمیانی خلا میں گھس گیا۔ غضبناک درندہ اس تنگ جگہ میں منہ ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ بری طرح بپھرا ہوا تھا۔ ”جاؤ، بھاگ جاؤ... یہاں سے۔“ ڈینیل چیخا۔ ڈینیل نے محسوس کیا کہ اس کے بازو سے خون بہہ رہا تھا۔ تیندوا دائیں بائیں چکرا کر اندر گھسنے کا راستہ تلاش کر رہا تھا۔ وہ وقفے وقفے سے دھاڑ رہا تھا۔

ڈینیل نے دانتوں اور ایک ہاتھ کی مدد سے رومال کس کر زخم پر باندھ لیا۔

معاً روشنی کا ریلا اندر آیا۔ اس نے کھلے دروازے سے ایک کار اندر داخل ہوتے دیکھی۔ پھر کسی کے چیخنے کی آواز آئی۔

تیندوا بھاگ کر کہیں غائب ہو گیا۔

”پنجرے کا دروازہ جلدی بند کرو۔“ ہرنام کی آواز آئی۔ ”فوراً آرم اسٹرانگ کو تلاش کرو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ زندہ ہو۔“

”اوہ میرے خدا۔ ہمارا دوست یہاں ہے۔ بالکل ٹھیک ٹھاک... کمال ہے۔“ ہرنام سامنے آ گیا۔ ڈینیل خاموشی سے اسے گھور رہا تھا۔

ڈینیل نے پیچ کس پھینک کر شکست کا اعتراف کیا اور کھڑا ہو گیا۔ ہرنام نے لات مار کر پیچ کس کو دور کر دیا۔

”ڈاکٹر آپ باہر آ سکتے ہیں۔“

ڈینیل زخمی بازو تھام کر باہر آ گیا۔ ہرنام کی گن کا رخ اس کے پیٹ کی طرف تھا۔ ”شاؤ چیک کرو ڈاکٹر نے کیا

حکمِ حاکم

پولٹری فارم زبردست خسارے میں جا رہا تھا۔ قرلبے نے تشویش اور غصے کے عالم میں مرغیوں کو خوب لتاڑا اور فرمان سنا دیا کہ اگلے دن سب مرغیوں نے دو دو انڈے نہ دیے تو ان کو ذبح کر کے پکوان ہاؤس کے حوالے کر دیں گے۔ اگلے دن خوف زدہ مرغیوں نے ان کے حکم کی تعمیل کی مگر ایک جگہ صرف ایک انڈا تھا۔

انہوں نے مجرم سے جواب طلب کیا تو اس نے بے بسی سے کہا۔ ”جناب! میں نے آپ کے حکم کی تعمیل میں بہت مشکل سے ایک انڈا دیا ہے، دوسرا میرے بس سے باہر تھا۔ دراصل میں مرغی نہیں، مرغا ہوں۔“

ٹیپو سلطان

انہوں نے چار سالہ ڈگری بہت رو پیٹ کر چھ سالوں میں بارہ امتحانات دے کر حاصل کی۔ قسمت کے دھنی تھے۔ نہ جانے کیسے ایک کالج میں پڑھانے پر مامور ہو گئے۔

کچھ عرصے بعد ملاقات ہوئی تو بہت خوش نظر آئے۔ موصوف سے تفتیش کی تو عقدہ کھلا کہ ماضی کا ناکام طالب علم ایک کامیاب لیکچرر بن چکا تھا۔ بقول خود وہ اتنا عمدہ پڑھاتے تھے کہ ان کے شاگردوں نے انہیں ٹیپو سلطان کا لقب دے دیا تھا۔ ہم ان پر رشک کر کے رہ گئے۔

چار ماہ بعد ایک دوست کے بیٹے سے ملاقات ہوئی اور انکشاف ہوا کہ وہ موصوف کا شاگرد ہے۔ ان کے ذکر پر اس نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر بتایا کہ موصوف بلیک بورڈ پر کتابوں سے نقل کے سوا کچھ نہیں جانتے۔ ٹیپنے یعنی نقل کرنے کی بنا پر لڑکے انہیں ٹیپو سلطان کہتے ہیں۔ اس لقب کا جنگِ آزادی کے نامور ہیرو سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔

راولپنڈی سے شبنم شفیق کی حیرانی

شرارت کی ہے؟''

ڈینیل نے سپر مارکیٹ کے کالے گارڈ کو پہچان لیا۔ ورنڈے سے مارا ماری میں چائے کی پتی ڈینیل کی جیبوں سے گرتی رہی تھی۔ شاؤ نے جھک کر تھوڑی سی پتی اٹھائی اور ٹریس کرتا ہوا پیٹیوں تک پہنچ گیا اور ڈینیل کی کارکردگی بھی ملاحظہ کرلی۔

''تم کافی سے زیادہ تیز ہو۔'' ہرنام نے اسے سراہا۔ ''شرلاک ہومز سے کم نہیں...''

''لیکن تم اپنے تجسس کو اپنی قبر تک لے جاؤ گے؟''

''تمہیں پتا ہے تمہیں کیا کرنا ہے۔'' باہر آکر ہرنام سنگھ نے شاؤ سے کہا۔ ''ماؤنٹین روڈ پر یہ ایک سیدھا اور سادہ حادثہ معلوم ہونا چاہیے۔ تمہیں پہلے بھی میں نے سمجھا دیا ہے؟'' وہ افریقی زبان میں بات کررہا تھا کہ ڈینیل نہ سمجھ پائے۔

پھر وہ ڈینیل کی طرف مڑا۔ ''سر اپنی گاڑی میں آجایئے، شاؤ بتائے گا کہاں جانا ہے۔ امید ہے آپ سعادت مندی کا مظاہرہ کریں گے۔ شاؤ شاٹ گن بہت اچھی طرح استعمال کرتا ہے۔''

ڈینیل ڈرائیونگ سیٹ پر آگیا اور شاؤ نے گن کے ساتھ عین اس کے عقب والی نشست سنبھال لی۔

خوابیدہ آبادی میں وہ خاموش اور ویران سڑکوں پر چلے جارہے تھے۔ گاڑی کا رخ مشرق کی جانب جھیل اور پہاڑوں کی طرف تھا۔

کچھ دیر کے سفر کے بعد سڑک ڈھلوان نما ہوگئی اور موڑ مشکل ہونے لگے۔

''وہاں پر کنارے کے ساتھ روک دینا۔'' شاؤ نے حکم دیا۔ وہ پہاڑی کی چوٹی پر تھے۔ وادی میں تقریباً تین سو فٹ گہرائی میں دریا بہہ رہا تھا جس میں جگہ جگہ پتھر اور چھوٹی چٹانیں صاف نظر آرہی تھیں۔

ڈینیل نے ہینڈ بریک لگایا۔ اس کا دل پسلیوں کے نیچے زور سے دھڑکا۔ ''کیا اب وہ گولی چلائے گا؟'' اس نے سوچا۔

''انجن بند کردو۔'' شاؤ بولا۔ ''اور ہاتھ سر پر رکھ لو۔'' ڈینیل نے ایسا ہی کیا۔ اس کی چھٹی حس نے اشارہ کیا کہ اسے کم از کم ایک موقع ملے گا اور یہ آخری موقع ہوگا... عقبی دروازہ کھلا اور شاؤ باہر نکل گیا...

اس نے بایاں ہاتھ عقبی کھلے دروازے کی نشست کی جانب بڑھایا... ڈینیل نے دیکھا وہاں ایک بھاری جیک پڑا تھا۔

اس موقع پر شاؤ ذرا سا غیر متوازن ہوا... اور ڈینیل جسم و جان کی پوری قوت سے عقبی کھلے دروازے سے ٹکرایا۔ شاؤ بری طرح فولادی دروازے میں پھنس گیا... اس کے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز آئی... اس کی انگلی لبلبی سے پھسلی... پھر اس نے ایک گولی چلا ہی دی... ظاہر ہے اس کی بے تکی اذیت ناک حالت میں گولی کیا نشانے پر بیٹھتی۔

ڈینیل نے باآسانی ہتھیار شاؤ کے زخمی ہاتھ سے چھین لیا۔ نال سے پکڑ کر بندوق کا آہنی دستہ بے رحمی سے اس کے جبڑے پر رسید کیا۔ وہ نشست پر بھی نہیں گر سکتا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ گاڑی کے دروازے میں پھنسا تھا۔

ڈینیل نے ہتھیار ایک ہاتھ میں منتقل کیا اور دفعتاً ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ شاؤ کو اس کی توقع نہیں تھی۔ اس نے باہر نکلنے کی کوشش کی۔ ڈینیل نے اس کا زخمی ہاتھ پکڑ کر جھٹکے سے باہر کھینچا۔ ہاتھ کی ہڈی پہلے ہی ٹوٹ چکی تھی۔ وہ درد کی شدت سے چیخ پڑا اور لڑکھڑاتا ہوا باہر آگیا۔ اس کے جبڑے سے خون بہہ رہا تھا۔ اسے پتا نہیں تھا کہ وہ سڑک کے کنارے پہنچ چکا ہے۔ جب اسے احساس ہوا تو دیر ہوگئی تھی۔ وہ سنبھلتے سنبھلتے بھی کنارے کے گول سفید حفاظتی پتھر سے ٹکرایا اور سر کے بل نیچے غائب ہوگیا۔

چند ثانیوں بعد ڈینیل مناسب راستہ تلاش کر کے وادی میں اتر گیا۔ شاؤ کی نبض چیک کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے جیبوں کی تلاشی لی اور انگوٹھے کی نشان والی پاس بک نکال لی جو شاؤ کی شناخت تھی۔ شاٹ گن کی چار گولیاں اور کنٹرول بکس کا کارڈ بھی اسے ملا۔ یہ بھی اس نے قبضے میں کیں اور لاش کو پانی کے دھارے میں لڑھکا دیا۔

صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور اس کا رخ لی لانگ وے کی طرف کردیا۔ اب وہ لی لانگ وے میں اس گاڑی کے ساتھ آوارہ گردی نہیں کرسکتا تھا۔ چنانچہ وہ ائرپورٹ پہنچا اور لینڈ کروزر کو ایک مناسب مقام پر پارکنگ میں چھوڑ دیا۔ اس نے اپنے سامان سے صاف شرٹ نکالی، ٹوائلٹ بیگ اٹھایا اور ائرپورٹ کی عمارت کے واش روم میں داخل ہوگیا۔

کچھ دیر بعد وہ معقول حلیے میں نکل کر ٹیلیفون بوتھ کی طرف چل دیا

''مجھے ایک ڈاکے اور قتل کی رپورٹ کرنی ہے۔'' اس نے ماؤتھ پیس پر رومال رکھ کر خاتون پولیس آپریٹر کو بتایا۔ نمبر اس نے بوتھ کے ساتھ آویزاں نمبروں کی فہرست سے

حاصل کرلیا تھا۔ ''یہ ایک فوری نوعیت کا معاملہ ہے، میری کسی ذمے دار آفیسر سے بات کرائی جائے۔''

''میں انسپکٹر موپلا ہوں۔'' نسوانی آواز گہری اور پُراعتماد تھی۔

''غور سے سنو۔'' ڈینیل نے سواحلی زبان میں کہا۔ ''ہاتھی دانت کا جو ذخیرہ چی واو نیشنل پارک سے غائب کیا گیا تھا، وہ لی لانگ وے میں موجود ہے۔ کم از کم آٹھ افراد اس واردات میں مارے گئے تھے۔ چرائے گئے رجسٹرڈ ہاتھی دانت چائے کی برآمدی پیٹیوں میں چھپائے گئے ہیں اور ہرنام سنگھ ٹریڈنگ کمپنی کے گودام میں موجود ہیں۔ قبل اس کے کہ انہیں وہاں سے نکال لیا جائے... تمہیں فوری طور پر حرکت میں آجانا چاہیے۔'' ڈینیل نے فون بند کردیا۔

☆☆☆

وہ گودام سے نصف میل سے زیادہ دور نہیں تھا اور جدید دوربین کے ذریعے حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔ گودام میں کافی سرگرمی تھی۔ اس نے بلند ٹرک اور ٹریلر بھی دیکھ لیا۔

ٹرک بھرپور لوڈڈ تھے اور مضبوط کینوس میں پوشیدہ تھے۔ پھر اس نے لوکوموٹیو کو مرکزی لائن پر آتے دیکھا جو سائڈ لائن پر شفٹ ہوکر گودام میں چلی گئی۔ وہ دوبارہ نمودار ہوئی تو اس کے ساتھ تین کھچا کھچ لدے ہوئے ٹرک بھی تھے۔ ڈینیل کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا۔

اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور مرکزی روڈ پر آگیا اور تیز رفتاری سے کراسنگ کی جانب بڑھا جہاں سے گزر کر کارگو کو مرکزی یارڈ میں جانا تھا۔ اچانک آہنی بیریئر نے نیچے آکر کراسنگ بلاک کردی اور ڈینیل بریک لگانے پر مجبور ہوگیا۔ لوکو گڑگڑاتی ہوئی اس کے سامنے سے گزر رہی تھی۔

وہ تیزی سے ٹاؤن سینٹر کے پوسٹ آفس تک پہنچا۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر اس نے آواز بدل کر سواحلی میں پھر پیغام چھوڑا۔

''انسپکٹر موپلا کو بتاؤ کہ چرایا ہوا ہاتھی دانت کا ذخیرہ ساڑھے گیارہ بجے گودام سے نکل گیا ہے۔ اور بذریعہ ٹرین بریا جارہا ہے۔ اسے چائے کی پیٹیوں میں چھپایا گیا ہے... کنسائنمنٹ کلی ڈریگن انوسٹمنٹ کمپنی کے نام ہے۔''

وہاں سے نکل کر وہ ایک جنرل اسٹور میں جا گھسا۔ وہاں سے اس نے ماچس کی ڈبیا، سیلوٹیپ، مچھر مار کوائل کا ڈبا، کچھ نیند کی گولیاں اور دو کلو منجمد قیمہ خریدا۔ پھر واپس ہوٹل کی طرف روانہ ہوگیا۔

جیسے ہی وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا اس کو پتا چل گیا یہاں تلاشی لی گئی ہے۔

''ہرنام کے لیے یہاں کچھ نہیں تھا۔'' وہ اطمینان سے بڑبڑایا۔ اپنے ٹریولرز چیک اور پاسپورٹ اس نے ہوٹل کے سیف میں رکھے تھے۔ تاہم ہرنام سنگھ کی اس حرکت نے ڈینیل کو مجبور کردیا کہ اس کا نام حرام سنگھ رکھ دے...

☆☆☆

وہ چیمبر آف کامرس کی طرف جارہا تھا۔ ڈائریکٹری کی مدد سے اس نے ہرنام سنگھ کا رہائشی پتا حاصل کرلیا تھا۔ راستے میں ہرنام سنگھ کی سپر مارکیٹ بھی تھی۔ اس نے مارکیٹ کا چکر لگایا۔ عقبی گلی میں کاٹھ کباڑ پڑا تھا۔ اس نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ اس نے ایک مقام پر گاڑی روکی اور نیند کے کیپسول کھول کھول کر پاؤڈر قیمے پر چھڑکتا رہا۔ اس نے پچاس کیپسول استعمال کر ڈالے۔ یہ ہاتھی کو بھی لٹانے کے لیے کافی تھا۔ وہ پھر مسکرایا اور ہرنام سنگھ کو ایک غیر مہذب گالی سے نوازا... حرام سنگھ تو مہذب سی چیز معلوم ہوتی تھی۔

اب اس کا رخ حرام سنگھ کے گھر کی جانب تھا۔ حرام سنگھ کی کوٹھی اس کی توقع سے کہیں بڑی تھی۔ صرف لان ہی دو تین ایکڑ پر پھیلا تھا۔ ایک جگہ وہ گاڑی سے اتر گیا اور فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ آہنی باڑھ نے اس کے بنگلے کو گھیرا ہوا تھا۔ وہ باڑھ کے قریب پہنچا تو دو جرمن شیفرڈ کتے کسی گوشے سے نمودار ہوئے اور اندرونی جانب ڈینیل کے متوازی چلنے لگے۔ داخلی گیٹ کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے غور سے لاک کا جائزہ لیا اور چھ سات قدم آگے جاکر پھر واپس آگیا۔ گوشت کا ایک حصہ اس نے اندر اچھال دیا جسے کتے نے فوراً ہی ہڑپ کرلیا۔ خواب آور قیمے کا ایک اور حصہ اس نے اندر پھینک دیا جو دوسرے کتے کے حصے میں آیا۔

وہ اپنی کرائے کی گاڑی کی طرف واپس ہولیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر سپر مارکیٹ کے قریب تھا۔ ایک بلاک دور ڈینیل نے گاڑی روکی۔ جیب سے اس نے وہ دیسی بم نکالا جو اس نے دیاسلائیوں، موم بتیوں اور مچھر مار کوائل کی مدد سے کاغذی گولے میں تیار کیا ہوا تھا۔ اور مچھر مار کوائل کے دونوں ٹکڑوں کو سلگا دیا۔

اس نے کمزور طاقت کا خودساختہ بم کوڑے کے ڈھیر پر ڈال دیا اور گلی سے نکل آیا۔

ایک بار پھر وہ حرام سنگھ کی رہائش گاہ کی جانب پلٹا۔

اس نے چمڑے کے دستانے چڑھا لیے تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ کے نیچے سے اس نے شاٹ گن بھی نکال لی۔ اس نے ہتھیار کے تینوں حصے الگ الگ کر دیے۔ ڈبل بیرل اس نے پتلون کے اندر ٹانگ کے ساتھ رکھی۔ باقی دو حصے اس نے چمڑے کی جیکٹ میں پوشیدہ کیے۔ فالتو گولیاں اور شاؤ سے حاصل کردہ کی کارڈ بھی اس کے پاس تھا۔

بیرل کی وجہ سے وہ لنگڑاتا ہوا حرام سنگھ کے بنگلے پر پہنچ گیا۔ کتے کہیں اندر تحفظ پڑے تھے۔ ہوسکتا ہے مر ہی گئے ہوں۔ لاک کے بارے میں اس کا اندازہ ٹھیک تھا۔ پیپر کلپ کو موڑ توڑ کر اس نے دو منٹ صرف کیے ہوں گے کہ لاک کھل گیا۔ دونوں پٹ اس نے کھلے چھوڑ دیے۔ ہر چیز کو تاڑتا ہوا وہ لان کراس کر رہا تھا۔ کیڈلاک کی موجودگی نے حرام سنگھ کی موجودگی کی نشاندہی کر دی۔ ایک درخت کی آڑ میں رک کر اس نے شاٹ گن جوڑی۔ دوسری خالی بیرل کا پیٹ بھی بھرا...

برسوں پہلے اپنے مختصر فوجی پس منظر میں اسے قصداً لاشیں گرانی پڑی تھیں... تاہم اس نے کبھی ایسے کاموں میں سکون اور خوشی محسوس نہیں کی، لیکن یہاں وہ ایک بار پھر قاتل کا روپ دھار چکا تھا۔ بڑے حساب کتاب سے وہ یہ کام کرنے جا رہا تھا۔ نرم دل ڈینیل کو وہ ہوٹل میں چھوڑ آیا تھا۔

اسی وقت درندگی کے وہ غیر انسانی مناظر اس کے تصور میں گھوم گئے... جو چی واؤ نیشنل پارک میں اس نے دیکھے تھے۔

عمارت کے اندرونی حصے سے ٹیلیفون کی گھنٹی کی مدھم سی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی اور وہ چوکس ہو گیا۔ ذرا دیر میں بھاگتے قدموں کی آواز گیراج کے دروازے کے عقب میں سنائی دی پھر دروازہ جھٹکے سے کھلا۔ چابی کے ذریعے حرام سنگھ عجلت میں کیڈی کا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر اس نے پلٹ کر گیراج کی روشنی کا بٹن دبایا۔ حرام سنگھ ننگے سر تھا۔ اس کی لمبی داڑھی دائیں بائیں سے ہوتی ہوئی اوپر جا کر گرہ کی صورت میں سر پر بندھی ہوئی تھی۔ اس کا ایک پہلو ابھی تک ڈینیل کی طرف تھا... جیسے ہی وہ گاڑی کا لاک کھولنے میں کامیاب ہوا۔ ڈینیل نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور شاٹ گن کی نال اس کی کمر سے لگا دی۔ ”کوئی ہیرو ازم نہیں چلے گا، ڈیئر سر۔“ ڈینیل نے ڈیئر سر پر زور دیا۔

حرام سنگھ جیسے منجمد ہو کر رہ گیا۔ اسے لے کر نکلنے میں ڈینیل کو کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ گیٹ پہلے ہی کھلے پڑے تھے۔ حرام سنگھ نے سنبھلنے میں کافی وقت لیا۔

”مارکیٹ میں آگ لگ گئی ہے، یہ تمہارا کام ہے، ڈاکٹر۔“

”میری ہمدردیاں تمہارے ساتھ ہیں، ڈیئر حرام سنگھ۔“ ڈینیل نے اس کو نئے نام سے آگاہ کر دیا۔

”وہاٹ...؟“ سنگھ غرایا۔

”کیا ہوا، سر؟“

”میرا نام ہرنام ہے ڈاکٹر۔“

”حلال تو تم کھاتے نہیں ہو، ورنہ حرام سنگھ کی جگہ کوئی اور نام رکھ دیتا... میرے خیال میں حرام سنگھ آپ کے لیے بہت موزوں ہے، ڈیئر سر۔“ ڈینیل کی بظاہر مدھم آواز میں بلا کی سفاکی تھی جس نے سنگھ کو لرزا دیا۔

”شاؤ پہلوان کہاں ہے، حرام سنگھ؟“ ڈینیل غرایا۔ سنگھ کو پسینہ آ گیا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ ڈینیل نے شاؤ کو زندہ نہیں چھوڑا ہوگا۔

”تمہیں بھگتنا پڑے گا، ڈاکٹر...“ ہرنام نے اسے دبانے کی کوشش کی، یہ اور بات تھی کہ اس کی آواز میں وہ رعب اور جان نہیں تھی۔

”آخاہ...“ ڈینیل ہنسا۔ ”کیا تم مجھے کئی مرتبہ بھگتا نہیں چکے؟ اب میری باری ہے اور میں ایک کام ایک ہی بار کرتا ہوں... ڈینیل شاؤ یا اس بلی کی طرح نہیں... کیا نام لیا تھا بلی کا تم نے...؟ شاید نندی...؟“

ہرنام کچھ نہیں بولا۔ ”خیر تم گاڑی کا رخ گودام کی طرف کر لو، ڈیئر سر۔“ ڈینیل کی آواز میں زہر ہی زہر بھرا تھا۔

”گودام؟“ ہرنام کے کان کھڑے ہوئے... وہ سوچ رہا تھا کہ چنگ کے چکر میں وہ اس مرتبہ بہت ہی غلط آدمی سے ٹکرا گیا ہے۔ اس نے پینترا بدلا۔ ”ڈاکٹر، پلیز... تم کیوں وحشیانہ طریقے سے مجھے نشانہ بنا رہے ہو... میں جانتا ہوں کہ ہاتھی دانت سے تمہیں کوئی دلچسپی نہیں ہے؟“

”حرام سنگھ تم ٹھیک کہہ رہے ہو، ہاتھی دانت میرا مسئلہ نہیں ہے۔“ ڈینیل بولا۔ ”تم مجھے جیمز بانڈ سمجھو... جو اتنے ہی سکون سے قتل کرتا ہے، جتنے سکون سے ٹائی کی گرہ درست کرتا ہے۔“

ہرنام کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس کی اکڑفوں نکل چکی تھی۔ ”تو پھر چی واؤ کی واردات نے تمہیں مشتعل

کیا ہے۔“ وہ کچھ دیر بعد بولا۔ ”دیکھو مجھے خود کو بچانے پر تم الزام نہیں دے سکتے... تمہارے وقار یا انا کو نقصان پہنچا ہے تو ہم بات کر سکتے ہیں... پچاس ہزار ڈالر؟“

”جانی، میرے بہترین دوستوں میں سے ایک تھا۔“ ڈینیل کی آواز نرم تھی۔

”ٹھیک ہے، مزید پچاس ہزار ڈالر جانی کے لیے۔“ ہرنام کو امید پیدا ہوئی۔ ”یہ رقم میں تمہیں دے سکتا ہوں۔ تم اس چکر سے نکل جاؤ... ہم سب کچھ بھول جاتے ہیں، پلیز ڈاکٹر۔“

ڈینیل خاموش رہا۔

”جانی کے لیے میں دل سے معذرت خواہ ہوں۔“ ہرنام فوراً بولا۔ ”وہ میرے احکامات نہیں تھے... یہ سب کچھ چائنا مین کی وجہ سے ہوا۔“

”چائنا مین کے بارے میں بتاؤ۔“ عقب سے ڈینیل کی سرد آواز ابھری۔

”اگر میں بتا دوں تو تم یقین دلاتے ہو کہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچاؤ گے؟“ ہرنام مسلسل ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ ڈینیل نے ظاہر کیا کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے۔ ہرنام عقب نما شیشے میں اسے دیکھ رہا تھا۔

”ہرنام سنگھ، ٹھیک ہے... فی الحال میں تمہارا نام واپس کرتا ہوں... ہم بغیر کسی مداخلت کے ویئر ہاؤس میں بات کریں گے۔ تنگ چنگ کانگ کے بارے میں جو کچھ تمہیں معلوم ہے، وہ تم نے ٹھیک ٹھیک بتا دیا تو میں بغیر کسی نقصان کے تمہیں چھوڑ دوں گا۔“ ڈینیل نے نرمی سے کہا۔

ہرنام نے سینے میں رکی سانس خارج کی، مجھے یقین ہے، ڈاکٹر، تم جیسا معزز آدمی اپنے الفاظ کی پاسداری کرے گا۔“

”ہر حرف کی!“ ڈینیل نے اسے اطمینان دلایا۔ ”گودام کتنی دور ہے؟“

”ہم پہنچنے والے ہیں۔“ ہرنام کا لہجہ نارمل ہو گیا۔

☆☆☆

شاؤ کا کارڈ استعمال کر کے وہ گودام میں داخل ہو گئے۔ ”تیندوا بغیر اشتعال کے عموماً حملہ نہیں کرتا۔“ ڈینیل نے کہا۔ ”میری سمجھ نہیں آیا کہ تم لوگ اسے کیسے کنٹرول کرتے ہو؟“

”ٹھیک کہتے ہو۔“ ہرنام نے دانت نکالے۔ ”جس سے میں نے یہ خریدا تھا اس کی ہدایت تھی کہ بوقتِ ضرورت یا وقتاً فوقتاً درندے کو ٹارچر کرنا ضروری ہے... اور اس کے لیے میں تپتی ہوئی لوہے کی سلاخ استعمال کرتا ہوں۔“

”تو تم جان بوجھ کر اسے تنگ کرتے ہو؟“ ڈینیل کی آواز میں ناپسندیدگی تھی۔

”یہ عارضی زخمی ہو جاتا ہے... جو جلد ٹھیک ہو جاتا ہے... ایک قسم کی ٹریننگ سمجھ لو۔“

ہیڈ لائٹس کی روشنی میں انہیں تیندوا دکھائی دیا۔ پھر وہ بکھرے ہوئے سامان اور پیٹیوں کی قطاروں میں کہیں غائب ہو گیا۔ ہرنام نے انجن بند کیا... ہیڈ لائٹس بند کیں اور چھت کی بتی روشن کر دی۔

کچھ دیر دونوں خاموش بیٹھے رہے پھر ڈینیل نے آغاز کیا۔

”ہاں تو مسٹر ہرنام سنگھ تم کب پہلی مرتبہ چنگ سے ملے تھے؟“

”یہ تین برس قبل کی بات ہے... ایک درمیانی دوست کے ذریعے مجھے آگاہی ہوئی تھی کہ وہ ہاتھی دانت اور اس سے بنی ہوئی اشیا کا شوقین ہے۔“ ہرنام نے بتایا۔ ”وہ سفارتی بیگ استعمال کرتا تھا تاوقتیکہ کوئی بڑا بھاری معاملہ نہ ہو جیسے چی واؤ کا ذخیرہ...“

”مسٹر سنگھ چی واؤ پارک پر حملے کا خیال کس کا تھا؟“

”یہ اسی کا آئیڈیا تھا، بیش قیمت ذخیرے پر اس کی رال ٹپک گئی تھی۔“

”میرا خیال ہے کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔“ ڈینیل بولا۔ ”ذخیرے کی موجودگی... حملے کا انداز... چوروں کی ٹیم کا بندوبست... آٹومیٹک ہتھیار... آتشزنی... غیر ضروری اور وحشیانہ قتل و غارت گری...“ ”یہ سب کچھ تمہاری مہارت اور تعلقات کا تال میل ہے۔“

”آل رائٹ۔“ ہرنام بولا۔ ”میں کئی برس سے ذخیرے کی موجودگی سے واقف تھا اور موقع کی تلاش میں تھا۔ چنگ نے مجھے بتایا کہ وہ ایک بڑا ہاتھ مارنا چاہتا ہے۔ اس کی تعیناتی کی مدت ختم ہو رہی تھی۔ وہ جانے سے قبل اپنے باپ اور فیملی کو متاثر کرنا چاہتا تھا۔“

”ظاہر ہے کہ چوروں کی ٹیم کا بندوبست تم نے کیا تھا۔“

”لیکن قتل کے آرڈر میں نے نہیں دیے تھے۔“

”یعنی تم چاہتے تھے کہ چی واؤ والے بعد میں ساری کہانی پولیس کو سنا دیں۔“ ڈینیل نے طنز کیا۔

”ہاں... نہیں... نہیں... یہ چنگ کا منصوبہ تھا... میں خون بہانے پر یقین نہیں رکھتا، ڈاکٹر۔“

"اسی لیے تم نے شاؤ اور مجھے ایک ساتھ پہاڑی پر روانہ کیا تھا؟"

"نہیں... نہیں" ہرنام پر گھبراہٹ طاری ہو رہی تھی۔ "ڈاکٹر آرم اسٹرانگ تم نے میرے لیے کوئی راستہ نہیں چھوڑا تھا... پلیز سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں کاروباری آدمی ہوں۔ کوئی قاتل نہیں۔"

"فی الحال اس موضوع کو یہیں چھوڑو۔ ڈینیل نے کہا۔ "اور یہ بتاؤ کہ چنگ کے ساتھ مزید کیا منصوبے تھے تمہارے؟"

"ہم نے کئی امکانات کا جائزہ لیا تھا۔" ہرنام نے اعتراف کیا۔ "ہاتھی دانت کی اس شپمنٹ کے ساتھ چنگ کی حیثیت خاندان میں نمایاں ہو جاتی اور چنگ توقع کر رہا تھا کہ اس کا باپ افریقا میں لگی ڈریگن کے ڈویژن کا چارج اسے دے دے گا۔"

"اور ظاہر ہے اسے تمہاری خدمات کی ضرورت رہے گی، اس صورت میں؟"

"نو..." شاٹ گن کی نال اس کے پیٹ میں گھسی جا رہی تھی۔ "پلیز ڈاکٹر، ایسا مت کرو... میں فشارِ خون کا مریض ہوں۔"

"کیا سیٹنگ تھی تمہاری اس کے ساتھ اور اگلا ٹارگٹ کونسا تھا؟"

"اوبوموٗ" ہرنام کی آواز کھوکھلی تھی۔

"اوبوموٗ؟" ڈینیل متعجب نظر آیا۔ "صدر اومیرو؟"

براعظم میں مالاوی کی طرح اوبوموٗ کی ریاست چند کامیاب کہانیوں میں سے ایک تھی۔

"اومیرو ماضی کی کہانی ہے، بوڑھا اور غیر لچکدار۔ وہ تبدیلی اور ارتقا کو پسند نہیں کرتا، جلد ہی وہ رخصت ہو جائے گا۔ اس کا بندوبست کر لیا گیا ہے... نیا آدمی آئے گا، جوان۔ متحرک..."

"اور حریص۔" ڈینیل نے اضافہ کیا۔ "چنگ اور لکی ڈریگن کا اس سب میں کیا کردار ہوگا؟"

"مجھے تفصیل کا علم نہیں ہے، میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ چنگ مجھ سے فی الحال یہ چاہتا ہے کہ میں اپنے آدمی اوبوموٗ میں بٹھا دوں اور وقت کا انتظار کروں۔"

"وہ وقت کب آئے گا؟ اس سال؟ اگلے سال؟"

"ڈاکٹر یقین کرو... مجھے نہیں پتا۔ میں نے کچھ بھی نہیں چھپایا۔" ہرنام کا لہجہ ملتجی ہو گیا۔ "میں نے اپنے حصے کا وعدہ پورا کر دیا ہے اب تمہاری باری ہے۔"

"ہمارے درمیان کیا طے ہوا تھا؟ مسٹر سنگھ ذرا میری یادداشت تازہ کرنا۔" ڈینیل نے پوچھا۔

"میں چنگ کے بارے میں بتا دوں گا تو تم مجھے نقصان پہنچائے بغیر چھوڑ دو گے۔"

"کیا میں نے تمہیں نقصان پہنچایا، مسٹر سنگھ؟"

"نن... نہیں۔" تاہم ہرنام کے مسامات نے پسینہ اگلنا شروع کر دیا تھا۔ ڈینیل کی آنکھوں میں قاتلانہ پرچھائیاں ناچ رہی تھیں۔

وہ بہت ہی غیر متوقع تھا ہرنام کو ردِعمل کا موقع بھی نہیں ملا۔ ڈینیل نے دوسرا ہاتھ بڑھا کر اس جانب کا دروازہ کھول دیا تھا۔ ہرنام شاٹ گن سے دور ہونے کے لیے دروازے سے چپکا ہوا تھا۔ "مسٹر سنگھ تم آزاد ہو۔" ڈینیل نے کہا۔ ہرنام کا بوجھ دروازے پر تھا اور دروازہ کھلتے ہی وہ پشت کے بل فرش پر جا پڑا۔ شاک نے اسے مفلوج کر دیا تھا۔

ملگجی گہرائیوں میں سے کہیں جنگلی درندے کی غراہٹ ابھری۔ ہرنام اچھل پڑا۔ وہ کھڑا ہو کر گاڑی کے شیشے کو نوچ رہا تھا۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ "تم یہ نہیں کر سکتے... پلیز ڈاکٹر۔" ڈینیل نے کوئی توجہ نہیں دی۔ اس کے جبڑے بھنچے ہوئے تھے۔

"واپس جاؤ، ناندی... واپس اپنے پنجرے میں۔"

دونوں نے دیکھا کہ درندہ دو ڈھیریوں کے خلا میں بیٹھ گیا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں اس کی زرد آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس کی دم اوپر نیچے ایک مخصوص چال میں حرکت کر رہی تھی۔ وہ ہرنام سنگھ کو دیکھ رہا تھا۔

"نہیں!" ہرنام چلایا۔ "تم مجھے اس خونی کے حوالے نہیں کر سکتے، پلیز ڈاکٹر، پلیز رحم کرو... یہ مجھے ختم کرنے والا ہے۔" اور پھر اس کی دہشت زدہ چیخ درندے کی دھاڑ میں مل گئی...

ڈینیل نے گاڑی بیک کی، شیشہ کھول کر ہاتھ باہر نکالا اور ہرنام والا کی کارڈ، کنٹرول باکس میں ڈالا اور کارڈ کو اس کی جھری میں ہی چھوڑ دیا۔ بھاری دروازے کھل گئے۔ شاٹ گن نیچے ڈال کر وہ ڈھیرے سے باہر آ گیا۔ گاڑی کا دروازہ بھی کھلا چھوڑ دیا اور مدھم رفتار سے چلتا ہوا باہر نکل گیا۔ گودام کے اندرونی حصے سے جو آوازیں بلند ہو رہی تھیں وہ ناندی کی مصروفیت کا اعلان کر رہی تھیں...

☆☆☆

کرائے کی گاڑی ڈینیل نے واپس کر دی تھی۔ اس نے اپنی لینڈ کروزر پارکنگ سے نکالی اور لی لانگ وے سے نکل گیا۔ اس کا رخ زمبیا کی بارڈر پوسٹ کی جانب تھا۔ تین گھنٹے کا سفر تھا۔ صبح چھ بجے ریڈیو مالاوی پر اس نے اپنی مطلوبہ مختصر خبر سنی۔ مالاوی کا معروف کاروباری ہرنام سنگھ اپنے گودام میں اپنے ہی تیندوے کی زد میں آ کر بری طرح زخمی ہو گیا۔ ہرنام سنگھ کو لی لانگ وے اسپتال کے آئی سی یو میں رکھا گیا ہے۔ اس کی حالت سخت خطرے میں بتائی جاتی ہے۔ حادثے کی تفصیلات ابھی نامعلوم ہیں...

ڈینیل نے ریڈیو بند کیا اور گاڑی مالاوی کسٹم اینڈ امیگریشن پوسٹ کے قریب روک دی۔

☆☆☆

لوسا کا پہنچ کر ایک گھنٹے کے اندر اس نے مائیکل کو فون کیا۔ ڈنر پر وہ مائیکل کے ساتھ تھا اور واقعات کی تفصیل جاری تھی۔

کہانی ختم ہونے کے بعد سناٹا طاری رہا پھر مائیکل نے خاموشی کا پردہ چاک کیا۔ "یار تنگ چنگ سفیر ہے یا گینگسٹر؟"

"دونوں۔" ڈینیل نے کہا۔ "افریقا میں ہرنام سنگھ اس کا دایاں ہاتھ ہے۔"

"دفع کرو ڈینی... جانی کے بارے میں ہمیں دلی رنج ہے، تم پہلے ہی بہت کچھ کر چکے ہو اور خود بھی دو مرتبہ مرتے مرتے بچے ہو۔"

"یہاں تمہارے لیے بھی ایک دلچسپ خبر ہے۔"

"وہ کیا؟" مائیکل کے کان کھڑے ہوئے۔

"اوبوموٗ میں بغاوت ہونے والی ہے، صدر اومیرو کو ختم کر دیا جائے گا۔"

"کیا؟ تمہیں کیسے پتا۔ ہرنام سنگھ کے ذریعے..."

"پکی اطلاع ہے۔" ڈینیل نے کہا۔

"او ڈیئر... اومیرو نہیں، وہ اچھا آدمی ہے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے۔" مائیکل بولا۔ "تمہارے پاس تفصیلات ہیں؟"

"کچھ خاص نہیں... تنگ اور اس کا خاندان ملوث ہے۔ مجھے شک ہے کہ وہ صرف اسپانسر ہیں۔ اصل کردار چنگ اور ہرنام نے ادا کرنا ہے۔ اگر ہرنام سنگھ بچ گیا... انقلاب کے بعد وہ نئے حکمراں سے مخصوص حقوق اور مراعات کے لیے سودے بازی کریں گے۔"

"جیسے ہوتا آیا ہے۔" مائیکل نے سر کو تفہیمی انداز میں جنبش دی۔ "آنے والا کون ہوگا۔ کوئی آئیڈیا؟"

"نہیں۔ یہ لیکن مجھے خوف ہے کہ آنے والے چند مہینوں میں کارروائی شروع ہو جائے گی۔"

"ہمیں اومیرو کو خبردار کرنا ہوگا۔" مائیکل بڑبڑایا۔ "پھر ساتھ ہی تنگ کو بھی چیک کر لینا، بندہ ممنون ہوگا۔"

"وہ جا چکا ہے، ڈینی۔" مائیکل نے جواب دیا۔ "اس جمعے کی شام کو اس کی الوداعی دعوت تھی اور ہفتے کو نکل گیا۔"

"لعنت۔" ڈینیل کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ "ساری منصوبہ بندی دھری رہ گئی۔ میں تو ہرارے جا رہا تھا..."

☆☆☆

ڈینیل کے لندن والے فلیٹ میں فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ کسی کو نہیں پتا تھا کہ وہ واپس آ چکا ہے۔ پھر یہ ٹیلیفون؟ جواب دے یا نہ دے پھر دسویں گھنٹی پر اس نے فون اٹھا لیا۔

"ڈینی؟ تم ہو؟ مجھے آنسرنگ مشین سے بات نہیں کرنی۔" یہ مائیکل کی آواز تھی۔

"ہاں، میں ہوں، کیا ہوا؟"

"یار، تمہاری اطلاع سو فیصد تھی لیکن اتنی جلدی؟ اومیرو کا تختہ الٹ دیا گیا ہے..."

"اومیرو کے ساتھ کیا ہوا؟ اقتدار میں نیا آدمی کون ہے؟" ڈینیل نے سوال کیا۔

"سوری، ڈینی... ابھی کچھ پتا نہیں چل رہا۔ تم بی بی سی سنتے رہنا، میں جلد پھر فون کروں گا۔"

ڈینی کو بی بی سی سے فوری طور پر کچھ زیادہ پتا نہیں چلا سوائے اس کے کہ فوجی جنتا اقتدار پر قابض ہے۔ پانچ برس قبل وہ صدر اومیرو سے انٹرویو کے سلسلے میں ایک بار ملا تھا۔ اس وقت صدر کی عمر 65 برس تھی۔ وہ اومیرو سے متاثر ہوا تھا۔ اومیرو نہ صرف اپنے لوگوں کے ساتھ مخلص تھا بلکہ وہ قومی دولت اور ورثے کے معاملے میں بھی بہت حساس تھا۔ وہ افریقا سے محبت کرنے والا آدمی تھا۔ ڈینیل بھی افریقا کے عشق میں مبتلا تھا۔ اسے صدمہ ہوا۔ وکٹر اومیرو کے بغیر افریقا مزید غریب اور غمناک ہو جاتا۔

شام کو مشین پر دوبارہ مائیکل کا پیغام انتظار کر رہا تھا۔ اس نے رابطہ کیا۔

"نیا آدمی کرنل الفرم تفاری ہے۔ عمر 42 سال۔" مائیکل کی آواز آئی۔ "لندن اسکول آف اکنامکس اور

یونیورسٹی آف بوڈاپسٹ سے تعلیم یافتہ ہے۔ اس نے آتے ہی ملک کا نام تبدیل کردیا ہے۔"

"نیا نام؟" ڈینیل نے پوچھا۔

"پیپلز ڈیموکریٹک ری پبلک آف اوبومو۔" بری علامت ہے۔ افریقا کی سوشل لائف میں "ڈیموکریٹک" کا مطلب ہے انارکی۔ رپورٹس ملی ہیں کہ سابقہ حکومت کے عہدیداروں کو پھانسی دے دی گئی ہے۔"

"اور صدر اومیرو؟"

"نظربندی کا مفروضہ ہے... فی الحال۔"

"اس کا مطلب ہے جنگ جلد ہی منظرنامے میں داخل ہونے والا ہے؟"

"بہت ممکن ہے، میں دیکھوں گا۔" مائیکل نے جواب دیا۔

☆☆☆

ڈینیل نے سب حالات اور واقعات کو اپنے ذہن سے جھٹکا اور پورے انہماک سے اپنے کام میں جت گیا۔ اس کا ارتکاز اتنا گہرا تھا کہ باقی سب کچھ دور دھند کے پیچھے گم ہوگیا۔ ہفتے گزر گئے۔ صرف اس وقت اسے شاک لگا جب ایک فلم میں اس نے جانی کا چہرہ دیکھا۔ اس کی آنکھیں ڈینیل پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کی آواز ڈینیل کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

وہ ڈارک روم میں تنہا تھا۔ اس نے جانی کے تصور کو جواب دیا۔ "میں تمہیں بھولا نہیں ہوں میرے دوست... نہ اپنے وعدے کو..." ڈینیل نے کام روک دیا۔

فروری کے اختتام تک، کام کرتے ہوئے اسے تین مہینے ہوگئے تھے۔ اس نے شو کی چار قسطیں تیار کرلی تھیں۔ پھر اس نے اپنی ایجنٹ کو اسٹوڈیو کے تھیٹر میں چاروں قسطیں دکھائیں... جس نے آخر تک کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ آخری قسط ختم ہوتے ہی وہ اچھل پڑی۔

"شاندار... غیر معمولی، آرم اسٹرانگ تم جینئس ہو۔ تمہارا اب تک کا سب سے اچھا کام... مجھے چار کاپیاں فوراً چاہئیں۔"

وہ احساسِ تسکین کے ساتھ ہنسا۔ "تم اسے فروخت نہیں کرسکتیں... ابھی میں نے کام فائنل نہیں کیا ہے۔"

"اچھا مگر مجھے اپنی کارگزاری کی جانچ کرنے دو۔"

ایلنا نے سب سے پہلے اٹالین پارٹی کو جلوہ دکھایا۔ وہ ہمیشہ ڈینیل کے مداح رہے تھے۔ ایک ہفتے بعد وہ پھر اس کے فلیٹ پر آدھمکی۔ اس کے پاس ایک معاہدے کا مسودہ تھا۔ "یہ کام ان کو اتنا ہی پسند آیا ہے، جتنا مجھے اچھا لگا تھا۔" وہ بولی۔ "میں نے انہیں 25 فیصد اوپر اٹھایا ہے اور وہ پیشگی بھی دینے کے لیے تیار ہیں۔" وہ مسکرائی۔

"تم جادوگرنی ہو۔" ڈینیل نے اسے نئی بات بتائی۔

گلوبل حقوق فروخت کرنے کے بعد تین ملین ڈالر ڈینیل کی جیب میں ہوتے۔

"بائی دی وے... یہ جاکو کا کیا معاملہ ہے؟" ایلنا نے پوچھا۔ "اس کی کال آئی تھی کہ تم کسی اور ہی معاملے میں الجھ گئے ہو اور وہ اب تمہارے ساتھ کام نہیں کررہا؟"

"تفصیلات کی گنجائش نہیں ہے، بہرحال یہ بات سچ ہے۔"

"افسوس ہے۔ اس کا کوئی متبادل نام ہے تمہارے ذہن میں؟"

"ابھی نہیں، کیا تمہارے پاس کوئی آئیڈیا ہے؟"

وہ تھوڑی دیر سوچتی رہی پھر بولی۔ "کیا تمہیں اعتراض ہوگا اگر وہ کوئی عورت ہو؟"

"نہیں۔ جب تک وہ میری رفتار کا ساتھ دے سکتی ہے... افریقا ایک خطرناک اور بے رحم براعظم ہے۔"

ایلنا مسکرائی۔ میرے ذہن میں جو خاتون ہے وہ کافی مضبوط ہے اور باصلاحیت بھی۔ وہ بی بی سی کے لیے افریقا، انڈیا اور برفانی علاقے میں کام کرچکی ہے۔"

"میں اس سے ملنا پسند کروں گا۔"

اگلے روز اسے پھر مائیکل کی کال ملی۔ "ڈینی تمہارے اسپتال والے دوست کے بارے میں ایک خبر... وہ اسپتال سے باہر آچکا ہے۔"

"واقعی...؟"

"بہت جلدی سنبھل گیا۔ تاہم ایک ہاتھ کاٹنا پڑا۔ کاروبار بھی سنبھال لیا ہے اس نے۔ تمہیں ایک اور تیندوا کرسس پر بھیجنا پڑے گا... پہلے والے نے کام ٹھیک نہیں کیا۔" مائیکل ہنسا۔

ڈینیل نے منہ بنایا۔ "دوسرے کی کیا خبر ہے؟"

"فی الحال کچھ نہیں..."

"وہ منظرعام پر آئے تو اطلاع دینا... میں کچھ عرصے تک لندن سے کہیں نکل سکوں گا۔"

"خادم ہیں... موج کرو..."

☆☆☆

افریقا مر رہا ہے، یہ سیریز ایلنا نے چینل فور کو فروخت کردی تھی۔ ڈینیل کو مزید نمایاں کرنے کے لیے اسی شام

ایلنا نے ایک شاندار پارٹی کا بھی انتظام کیا تھا۔ وہیں ڈینیل کی ملاقات بونی ماہون سے ہوئی تھی۔ بونی کے کام کی ایک کیسٹ ایلنا پہلے ہی ڈینیل کو دے چکی تھی اور وہ حقیقتاً اس کے کام کے انداز سے خاصا متاثر ہوا تھا۔

بونی کا قد چھ فٹ سے کچھ ہی کم ہوگا۔ چہرے کے نقوش پُرکشش تھے تاہم اسے حسین نہیں کہا جاسکتا تھا۔ جسم لمبے قد کے باوجود متناسب تھا۔ سراپا اور رنگت ظاہر کرتی تھی کہ وہ ایک محنت طلب پیشے سے وابستہ ہے۔ اس کی شخصیت میں دو چیزیں نمایاں تھیں... قد اور اس کی سبز آنکھیں۔

جہاں ڈینیل اور بونی کھڑے تھے وہاں سے شمال کی جانب کئی میل دور کوئی اور بھی ٹی وی پر ”ڈینی کی سیریز“ دیکھ رہا تھا۔

وہ اپنے شاندار بنگلے کی تیسری منزل پر اسٹڈی میں موجود تھا۔ اس کے عقب میں پکاسو کی پینٹنگ تھی۔ وحشیانہ اور نفسانی خیال آرائی کا امتزاج۔ دروازے کی پیشانی پر گینڈے کے سینگ استادہ تھے۔

اٹھارہ سال کی عمر میں تہی دست اور فاقہ زدہ، جس کے پاس صرف ایک پرانی رائفل تھی۔ سوڈان کے جھلملاتے صحرا میں گینڈے کا پیچھا کر رہا تھا۔ دریائے نیل کے کناروں سے تیس میل دور اس کی پہلی گولی بھاری بھرکم درندے کے دماغ کو چیر گئی تھی۔

اس دن کے بعد سے اس کی تقدیر بدلنا شروع ہوگئی۔ گینڈے کے سینگ خوش قسمتی کی علامت کے طور پر ہمیشہ اس کے پاس موجود رہے۔ وہ ان کی غیر معمولی قدر کرتا تھا۔

”سیریز“ ختم ہوگئی۔ اس نے ٹی وی آف کیا۔ اٹھارہ قیراط کا طلائی قلم اٹھایا اور نوٹ پیڈ پر لکھا۔ ”ڈینیل آرم اسٹرانگ۔“

ہیرین کا دعوت نامہ ایلنا کے ذریعے ڈینیل کو ملا تو اس نے کافی دلچسپی محسوس کی۔ اس کے گھر کی جانب جاتے ہوئے وہ نگ ہیرین کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ برٹش اوورسیز اسٹیم شپ کمپنی کی طاقت اور دولت سے واقف تھا بلکہ افریقا میں ان کے اثرات کو بھی جانتا تھا۔ ہیرین بروکر، کوریئر، ایڈوائزر، بینکر اور جانے کیا کیا تھا... وہ کسی آکٹوپس کی طرح افریقا میں چھایا ہوا تھا...

ڈینیل اس سے ملاقات میں دلچسپی محسوس کر رہا تھا۔ ایک سیاہ فام نے اس کے لیے دروازہ کھولا۔ ڈینیل نے رواں سواحلی زبان میں بات کی تو اس کا پتھریلا چہرہ خوش کن مسکراہٹ سے بدل گیا۔ سیاہ فام ڈینیل کو لے کر چل پڑا۔ سرخ رہوڈیشین ٹیک کے ڈبل ڈور کے پاس سیاہ فام رک گیا اور جھک کر ڈینیل کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔

نگ ہیرین اپنی ڈیسک سے کھڑا ہوگیا۔ وہ اس عمر میں بھی مضبوط اور چست تھا۔ سر پر بال کم رہ گئے تھے۔ نظر تیز اور چبھنے والی تھی جو اس کے پوشیدہ بے رحم مزاج اور ذہانت کا امتزاج تھی۔

”آرم اسٹرانگ۔“ وہ بولا۔ ”خوشی ہوئی، تم آئے۔“ ہیرین نے ہاتھ ملایا اور آرام دہ کرسی پیش کی۔ ”چائے پسند کرو گے، میرے خیال میں؟“

ڈینیل نے نظریں گھمائیں پھر اس کی نظر گینڈے کے سینگوں پر اٹک گئی۔ ”ایسی ٹرافی تم دوبارہ نہیں پاسکتے۔“ وہ بولا۔

ہیرین دروازے کی جانب بڑھا اور سینگ کو سہلایا۔ ”ٹھیک کہتے ہو۔“ اس نے اتفاق کیا۔ ”میں اس وقت لڑکا ہی تھا جب میں نے اسے ہلاک کیا۔ اس کے لیے مجھے پندرہ دن تعاقب کرنا پڑا تھا۔“ ہیرین نے واپس آکر چائے کا کپ اٹھا لیا۔ ”میں نے چینل فور پر تمہاری قابلِ دید فلم دیکھی ہے، ڈاکٹر۔“ وہ بولا۔ ڈینیل نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ ”تم نے بالکل ٹھیک اور جاندار کام کیا ہے۔“ ہیرین پھر بولا۔ ڈینیل اب بھی خاموش تھا، اس نے محسوس کیا تھا کہ معتدل یا پُرجوش فقرے اس شخص کو بدمزہ کردیں گے۔

”تم نے اپنی انگلیاں افریقی مرض کی جڑوں پر رکھی ہیں، جاگیرداری، گروہ بندی، بڑھتی ہوئی آبادی، جہالت، کرپشن وغیرہ وغیرہ... تمہاری پیش کردہ تجاویز اچھی ہیں، اس سلسلے میں۔“

’ریلیکس ہونے کی ضرورت نہیں۔‘ ڈینیل نے خود کو وارننگ دی۔ ’ایک لمحے کے لیے بھی نہیں... یہ بوڑھا شیر ہے جو تمہیں نرم کر رہا ہے...‘

”تم جیسا شخص عوامی خیالات پر اثرانداز ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔“ ہیرین نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ ”تمہاری ایک ساکھ ہے، تمہارے پاس بین الاقوامی سامعین اور ناظرین ہیں، جو تمہارے خیالات پر بھروسا کرتے ہیں۔“

”شکریہ۔“ ڈینیل دھیرے سے مسکرایا۔

ایک چیز یقینی تھی کہ نگ ہیرین جیسا بندہ کسی معقول وجہ کے بغیر کسی معاملے میں ہاتھ نہیں ڈالتا۔

”تمہارے دوست تمہیں کیا پکارتے ہیں۔ ڈینیل، ڈین، ڈینی...؟“

”ڈینی۔“

”میرے دوست مجھے نگ کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ ہماری تمہاری سوچ یکساں ہے۔ افریقا سے متعلق ہم اپنی کمٹمنٹ کو شیئر کرسکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہم اچھے دوست بن سکتے ہیں۔“

”او کے نگ۔“

ہیرین مسکرایا۔ ”تمہارے پاس شک کرنے کی کوئی بھی وجہ ہوسکتی ہے۔ میں سمجھ سکتا ہوں میری اپنی ایک ساکھ ہے تاہم محض ساکھ کی بنیاد پر ہمیشہ کسی کے بارے میں فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔“

”سچ ہے۔“ ڈینیل نے مسکراہٹ لوٹائی۔ ”اب مجھے بتاؤ کہ میں تمہارے لیے کیا کرسکتا ہوں؟“

”اوہ نو!“ ہیرین دھیرے سے ہنسا۔ ”میں تمہیں پسند کرتا ہوں... ہم دونوں ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں، ہمارا خیال ہے کہ دھرتی پر انسان ایک برتر مخلوق ہے اور اس سبقت کی بنا پر اسے حق ہے کہ دھرتی سے اپنے لیے زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کرسکے... جب تک وہ کرسکتا ہے... پیہم اور متواتر کوشش کے ذریعے۔“

”میں اتفاق کرتا ہوں۔“ ڈینیل نے کہا۔

”یہ توازن ہے کہ صدیوں سے لوگ یورپ میں درخت گرا رہے ہیں، جانوروں کو مار رہے ہیں... پھر بھی جنگل پھیل رہے ہیں اور جانور اتنے ہیں کہ ہزاروں سال پہلے نہیں تھے۔“

”ہاں چرنوبل کی آلودگی اور زہریلی بارشوں کو نظرانداز کردیں تو...“

ڈینیل نے نکتہ اٹھایا۔ ”لیکن پھر بھی یورپ کی حالت بری نہیں ہے۔ افریقا کی کہانی الگ ہے۔“

”تم اور میں افریقا کو پسند کرتے ہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ ہمیں وہاں برائی کے خلاف کھڑے ہونا چاہیے۔ میں وہاں سرمایہ اور رہنمائی کے ذریعے مختلف علاقوں میں غربت کم کرسکتا ہوں...“ ہیرین نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”اور تمہاری صلاحیتیں ان لوگوں کی جہالت کم کرنے اور توہمات دور کرنے میں مددگار ثابت ہوسکتی ہیں۔“

ڈینیل نے سر ہلایا۔ وہ اکتاہٹ محسوس کرنے لگا۔ بلی ابھی تک تھیلے کے اندر تھی۔ ”اصولی طور پر تمہاری باتیں ٹھیک ہیں تاہم یہ پتا چلنا چاہیے کہ ہم کیا کرسکتے ہیں اور کیا کرنا چاہیے؟“ ڈینیل نے احتیاط سے الفاظ کا انتخاب کیا۔

”ٹھیک ہے۔“ ہیرین نے اتفاق کیا۔ ”تمہیں ریاست اوبوسو کے متعلق تو پتا ہوگا؟“

ڈینیل کو جیسے بجلی کا جھٹکا لگا۔ اس نے بمشکل خود کو نارمل رکھا۔ یہ قطعی غیر متوقع تھا... اندر ہی اندر سنبھلنے میں اسے کچھ وقت لگا پھر وہ بولا ”اوبوسو... سرخ مٹی کی سرزمین، ہاں میں وہاں جاچکا ہوں لیکن خود کو وہاں کا ماہر نہیں سمجھتا۔“

”ساٹھ کی دہائی میں برطانیہ سے خودمختاری ملنے کے وقت وہ ایک چھوٹا اور غیر اہم علاقہ تھا۔ دلچسپی اور جاننے کے لیے وہاں کچھ نہیں تھا۔“

ہیرین نے بتایا۔ ”ایک آمر تھا جو ترقی اور تبدیلی کے خلاف تھا۔“

”وکٹر اومیرو۔“ ڈینیل نے کہا۔ ”عرصہ قبل میں ایک بار اس سے مل چکا ہوں۔“

”وہ روایتی طریقۂ کار کا حامی تھا۔“ ہیرین نے کہا۔ ”بہرحال یہ سب اب ماضی ہے۔ اومیرو کا دور ختم ہوچکا اب ایک جوان اور نئے خیالات کا آدمی حکمراں ہے۔“

”کون؟“ ڈینیل نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

”کرنل الفرم تفاری اب صدر ہے وہاں کا... جو لوگوں کو بیسویں صدی تک لے کر آئے گا۔ معدنیات اور لکڑی کی شکل میں وہاں قابلِ قدر ذخائر موجود ہیں۔ میں بیس برس اومیرو کو قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ ہمیں یہ ذخائر لوگوں کے فائدے کے لیے استعمال کرنے چاہئیں لیکن وہ ضدی اور قدامت پرست تھا۔ ملک اب ارتقائی منازل طے کرنے کے لیے تیار حالت میں ہے۔ ایک بین الاقوامی کنسورشیم بنایا گیا ہے اور برٹش اوورسیز اسٹیم شپ کمپنی کا اس میں کافی بڑا کردار ہے۔ میں بات چیت کرچکا ہوں کہ ترقیاتی کاموں میں برٹش اوورسیز اسٹیم شپ کمپنی یعنی بوس کا کیا حصہ ہے۔“

”لیکن نگ اس میں تو کہیں میری ضرورت نہیں ہے۔ کم ازکم اس وقت تک جب تک کوئی اس کی مخالفت نہیں کرتا۔“

ہیرین نے سر ایک جانب جھکایا۔ ”جوان تم نے براہِ راست نتیجہ اخذ کیا ہے تاہم مجھے اس کی توقع تھی۔ دراصل جب اومیرو کی حکومت تھی تو ایک خاتون سائنس داں وہاں کام کررہی تھی۔ صدر اومیرو اس سے کافی قریب تھا۔ اس نے خاتون کو وہ تمام سہولتیں مہیا کی تھیں جو اس سے قبل اس نے کسی اور صحافی یا سائنس داں کو نہیں دی تھیں۔ اس لڑکی نے ایک کتاب شائع کی جس کا نام ”دی پیپلز اوف دی ٹال ٹریز“ تھا۔“

ڈینیل نے مداخلت کی۔ ٹائٹل تھا ”بلند درختوں کے باسی“ وہ کتاب میری نظر سے گزری ہے... لکھاری کا نام

غالباً کیلی وان ہے۔“

”تم ملے ہو اس سے؟“ ہیرسن کے سوال میں مطالبے کا عنصر تھا۔

”نہیں، تاہم ملنا پسند کروں گا... وہ اچھا لکھتی ہے۔“

”وہی مسئلہ بنی ہوئی ہے۔“ ہیرسن نے تلخی سے کہا۔ ”جب تقاری اقتدار میں آیا تو وہ کیلی وان سے ملا اور ترقیاتی منصوبوں میں اس کا تعاون طلب کیا مگر کیلی نے صاف انکار کر دیا۔ اس نے تقاری کی بغاوت کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔ اس نے اوبوموں میں تقاری کے خلاف مہم شروع کر دی ہے۔ نہ صرف اسے حقوقِ انسانی کا مجرم قرار دیا بلکہ ملک کے قدرتی وسائل لوٹنے کے منصوبوں کا خالق بنا دیا۔“

ہیرسن نے دونوں ہاتھ لہرائے۔ ”کوئی تک نہیں تھی، نہ ان باتوں میں کوئی حقیقت تھی۔ تقاری کے پاس کوئی چارہ نہیں بچا۔ وہ مجبور ہو گیا کہ اسے ملک بدر کر دے... چونکہ وہ برطانوی شہریت رکھتی تھی اس لیے اس سے زیادہ وہ کیلی کے خلاف کچھ اور کر بھی نہیں سکتا تھا۔ اب وہ برطانیہ میں ہے۔ ماضی سے اس نے کوئی سبق نہیں سیکھا اور اس کی پروپیگنڈا مہم یہاں بھی جاری ہے۔“

”میں نہیں سمجھتا کہ بوس کو اس سے کوئی فرق پڑے گا۔“ ڈینیل نے نرمی سے کہا۔

ہیرسن نے اسے تیز نظروں سے دیکھا۔

”بدقسمتی سے کیلی...“ وہ ہچکچایا۔ ”اس نے برطانیہ میں گرین پارٹی کی حمایت حاصل کر لی ہے۔ تم ٹھیک کہتے بوس کو فرق نہیں پڑتا... تاہم وہ دردِ سر بنی ہوئی ہے۔ کنسورشیم کو اوبومو میں جو ترقیاتی منصوبے شروع کرنے ہیں، ان منصوبوں کی بھنک بھی اس کو مل گئی ہے۔ کیلی اور اس کے ہم نوا رکاوٹ بنتے جا رہے ہیں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے آنے والی سالانہ جنرل میٹنگ میں شیئر ہولڈرز کو جواب دینا ہے۔ مزید یہ کہ مجھے حال ہی میں پتا چلا ہے کہ کیلی وان بوس کی شیئر ہولڈر ہے جس کی وجہ سے اس کا حق بنتا ہے کہ وہ سالانہ جنرل میٹنگ میں شرکت کرے اور اپنی رائے کا اظہار کرے۔ مجھے کوئی شک نہیں ہے کہ وہ پریس کو ساتھ رکھے گی اور سالانہ جنرل میٹنگ کو سرکس میں بدل دے گی۔“

”یہ نقشہ تو کافی بدنما ہے۔“ ڈینیل نے اپنی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے سر ہلایا۔ ”میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟“

”پبلک میں تمہارا اثر و رسوخ اور تمہارا سائنسی حلقہ، کیلی وان سے کہیں موثر اور بڑا ہے۔ میں تمہیں پیشکش کرتا ہوں کہ تم اوبومو جاؤ اور صحیح حقائق کے ساتھ ایک ڈاکومینٹری بناؤ، جو کیلی وان کو اس طرح تحلیل کر دے جیسے تیز ہوا دھوئیں کے مرغولے کو۔ ٹی وی چھپے ہوئے لفظ سے زیادہ طاقتور ذریعہ ابلاغ ہے اور میں گارنٹی دیتا ہوں کہ اس ڈاکومینٹری کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کیا جائے گا۔“

ڈینیل کا دل چاہا کہ ایک زوردار قہقہہ لگا کر پُرزور انداز میں انکار کر دے۔ یہ پیشکش اس کے مزاج کے قطعی برعکس تھی بلکہ اس کی بے عزتی کے مترادف تھی۔ یقیناً ہیرسن سمجھ رہا تھا کہ ڈاکٹر ڈینیل آرم اسٹرانگ کوئی بکنے والی چیز ہے۔

ڈینیل خاموشی سے بوڑھے شکاری کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ شکاری پھر بولا۔ ”بے شک میں تمہیں یہ بھی گارنٹی دلا دوں گا کہ صدر تقاری اور اس کے حکومتی کارندے تمہیں ہر جگہ رسائی دیں۔ حتیٰ کہ انتہائی خفیہ جگہوں پر بھی جانے سے تمہیں کوئی نہیں روک سکے گا۔ تم جس سے چاہو گے بات کر سکو گے جس چیز کی تمہیں ضرورت ہوگی وہ تمہیں ملے گی... حتیٰ کہ ملٹری...“

”سیاسی قیدیوں سے مل سکوں گا؟“ بالآخر ڈینیل کی زبان پھسل ہی گئی۔

”سیاسی قیدی؟“ ہیرسن نے الفاظ دہرائے۔ ”سیاسی قیدیوں کا کیا کام... تم ایک مخصوص ڈاکومینٹری بنانے جا رہے ہو نہ کہ...“ اس مرتبہ ہیرسن نے ضبط سے کام لیا۔

”پھر بھی فرض کرو اگر مجھے بات کرنی پڑتی ہے کسی سیاسی نظر بند سے؟“ ڈینیل مصر تھا۔

”دیکھو ینگ ڈاکٹر... تقاری ایک ترقی پسند اور ان چند پُرعزم لیڈرز میں سے ہے جو افریقا کے ساتھ مخلص ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس نے کوئی سیاسی قیدی رکھا ہے۔ یہ اس کا طریقہ کار نہیں ہے۔“ تک ہیرسن کی آواز ازخود تیز ہو گئی۔

”اومیرو کا کیا بنا؟“ عمداً آگے کی جانب جھک کر ڈینیل نے استفسار کیا۔ ہیرسن کی رنگت میں ہلکی سی تبدیلی آئی... جواب دینے کے بجائے وہ میز پر موجود پستول سے کھیلنے لگا۔ جب وہ رکا تو پستول کا رخ ڈینیل کے سینے کی جانب تھا۔

”کیا میں یہ سمجھوں کہ تم نے میری تجویز کو مسترد کر دیا ہے یا پھر تم تقاری حکومت کے خلاف ہو؟“

”قطعی نہیں۔“ ڈینیل نے پستول کی جانب دیکھا بھی نہیں۔ ”تمہاری طرح میں بھی ایک کاروباری آدمی ہوں۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ جو کام میں کرنے جا رہا ہوں اس کی حقیقت کیا ہے... تم میری جگہ ہوتے تو تم بھی اندھی چھلانگ نہیں لگاتے... مجھے بھی گرم رقم سے پہلے گرم حقائق کو جاننا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ ہیرسن کسی قدر پُرسکون نظر آنے لگا۔ ”اومیرو ایک بوڑھا ضدی حکمران تھا... بے لچک رویے کا حامل۔ تقاری کے پاس کوئی حل نہیں تھا سوائے اس کے کہ وہ اسے گھر میں نظر بند رکھے۔ صدر تقاری نے اومیرو کے وکلاء اور ڈاکٹرز پر ملنے کی کوئی پابندی نہیں لگائی تھی۔ جب حرکتِ قلب بند ہونے کے باعث اس کا انتقال ہوا... تقاری نے اس کی موت کا اعلان نہیں کیا۔“

”یعنی فوری خاتمہ بغیر ٹرائل کے؟“

”ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔“ ہیرسن نے اتفاق کیا۔ ”مجھے بھی یہ بات کچھ ٹھیک نہیں لگی تاہم میرے پاس کوئی وجہ نہیں تھی کہ میں تقاری کی یقین دہانیوں کو مسترد کرتا کہ معاملہ وہ نہیں تھا جو تم نے یا میں نے محسوس کیا۔“

”ٹھیک ہے مجھے یقین ہے تمہاری بات پر۔“ ڈینیل نے کہا۔ ”تمہیں پروڈکشن کی لاگت کا اندازہ ہے۔ یہ کافی مہنگا پڑے گا۔ کون ادائیگی کرے گا؟ برٹش اوورسیز اسٹیم شپ کمپنی؟“

”نہیں... ادائیگی مشرقِ بعید کی کمپنی کرے گی۔ اگرچہ وہ بھی کنسورشیم کا حصہ ہے تاہم وہ بوس کے ساتھ کھلم کھلا منسلک نہیں ہے۔ ان کی ہانگ کانگ میں ایک فلم کمپنی ہے جسے ہم فرنٹ پر رکھیں گے۔“

”یعنی مشرقِ بعید میں جو کمپنی ہے وہ پس منظر میں رہے گی؟“

”ایسا ہی ہے۔“ ہیرسن نے جواب دیا۔

”وہ کمپنی فار ایسٹ میں ہی ہے؟ اور اس کا نام؟“

”نہیں... اس کی بنیاد تائیوان میں ہے... شاید تم نے لکی ڈریگن کا نام سنا ہوگا؟“

ڈینیل گنگ رہ گیا۔ وہ ہیرسن کو گھورتا رہا۔ ناقابلِ یقین انداز میں تقدیر نے تنگ چنگ کانگ کی تقدیر کو جانی کے قتل کے ذریعے اس کے ساتھ جوڑ دیا تھا۔

ڈینیل کو دوسری بار کرنٹ لگا تھا... پہلے سے زیادہ شدید... یقیناً چنگ اور اس کا معاملہ تقدیر منطقی انجام تک لے جا رہی تھی۔

”کچھ غلط ہے، ڈینی...؟“ ہیرسن نے تفکر کا اظہار کیا۔

”نہیں، میں تمہاری پیشکش پر حتمی غور کر رہا تھا... اصولاً اتنی تفصیل اور تسلی کے بعد انکار کی گنجائش تو نہیں ہے۔“ ڈینیل نے خود کو سنبھالا۔

”تو پھر کنٹریکٹ کے لیے اپنا ایجنٹ بھیج دو تاکہ ہم تفصیلات طے کر لیں۔“ ہیرسن مسکرایا۔ ”مجھے یقین ہے کہ ہمیں معاہدے کے سلسلے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔“

☆☆☆

یونی ماہون اپنے کام میں جتنی اچھی فنکار تھی، سودے بازی میں بھی بہت اچھی تھی۔ ڈینیل کو تین گھنٹے خرچ کرنے پڑے تب کہیں جا کر وہ کسی نتیجے پر پہنچے۔

بوس کے ہیڈ آفس میں پکرنگ نام کے شخص نے ڈاکٹر ڈینیل اور یونی کا استقبال کیا۔ کانفرنس روم میں اس نے دونوں کا تعارف سینئر جیالوجسٹ جارج اینڈرسن سے کرایا جو اوبومو میں معدنیات کے شعبے کا انچارج تھا۔

کانفرنس ٹیبل پر کچھ اور لوگوں سے تعارف ہوا۔ بوس چار معاملات میں ملوث تھی۔ نمبر 1 کان کنی اور معدنی ذخائر، نمبر 2 لکڑی اور زرعی ترقیاتی شعبہ، نمبر 3 ماہی گیری اور آبی حیات، نمبر 4 ہوٹل، کیسینو اور سیاحت۔

”ہمیں امید ہے۔“ پکرنگ نے کہا۔ ”ان چار شعبوں میں ترقی کے بعد اوبومو براعظم افریقا کا سب سے خوشحال ملک بن کر ابھرے گا۔“

بعدازاں اپنے اپنے شعبوں کے ماہرین نے آڈیو ویژول اور دیگر جدید آلات کے ذریعے تمام منصوبوں کی وضاحت کی۔ تاہم ان میں بہت کم امور ایسے تھے جن کے بارے میں ڈینیل کو پتا نہیں تھا۔

کانفرنس کا اختتام خوبی سے ہو گیا اور سب اپنی اپنی جگہ خوش تھے۔

بعدازاں چند منٹ کے لیے پکرنگ نے ان دونوں کی ملاقات سر پیٹر ٹنگ ہیرسن سے کرائی جو ڈینیل کی آنے والی پروڈکشن کے تھیم سے خوش تھا یعنی۔

”اوبومو، ہائی روڈ ٹو دی افریقن فیوچر۔“

ڈینیل کو ان لوگوں کے ناپاک عزائم کے بارے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ ان خون آشام درندوں کو افریقا اور اس کی ترقی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ہر جوڑ توڑ کے ذریعے صرف اور صرف مال بنانا چاہتے تھے۔ یہ آنے والا وقت ہی بتا سکتا تھا کہ افریقا کے سہانے مستقبل پر بنائی جانے والی فلم سے وہ سفاک ٹولہ کون سے مقاصد حاصل کرنا چاہتا تھا۔

سنسنی... تحیر اور رگوں میں لہو کی
گردش تیز کر دینے والے واقعات آئندہ ماہ۔

سیاہ مامبا

ایس... انور

سانپوں کی نسل سے تعلق رکھنے والے ایک زہریلے سانپ کا کارنامہ... اس نے اپنے مالک کی مشکل کو آسانی میں بدل دیا تھا...

حیوانی جبلت اور انسانی فطرت کی قدرِ مشترک... مختصر پیرائے میں تیکھا انداز

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ سیاہ مامبا دنیا کا سب سے زہریلا ترین سانپ ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ زہریلے ترین سانپوں میں اس کا دوسرا نمبر ہے۔ کسی کا کہنا تھا کہ سیاہ مامبا زہریلے ترین سانپوں میں تیسرے نمبر پر ہے۔

میں سانپوں کے بارے میں بخوبی جانتا ہوں۔ میں رینگنے والے جانوروں کے مطالعے میں پی ایچ ڈی کر رہا ہوں۔ اسی لیے میں نے لیبارٹری کے ایک گوشے میں دروازے کے پیچھے شیشے کا ایک بڑا سا پنجرہ رکھا ہوا ہے جس کے اندر ایک بڑا سا سیاہ مامبا موجود رہتا ہے۔ اسی جگہ میں نے وہ پچاس ہزار ڈالرز کی نقد رقم بھی رکھی ہوئی ہے جو میں اپنے بھائی شون سے جوئے میں ہار گیا تھا اور یہ مجھ پر اس کا قرض ہے۔

جب میرے بھائی شون نے اپنی رقم کا مطالبہ کیا تو میں نے اسے بتا دیا کہ رقم کہاں رکھی ہوئی ہے۔

"دروازے کے عین پیچھے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔ کارنر میں شیشے کے بڑے سے پنجرے کے اندر۔" میں نے کہا۔ "جب تک میں مشروب تیار کرتا ہوں۔"

میں نے اپنے لیے پانی ملائے بغیر برف کے ساتھ پی جانے والی وھسکی کا ایک جام تیار کیا اور اس میں برف کے کیوبز ڈال دیے۔

نصف شب بیت چکی تھی اور زوولوجی کی عمارت سنسان پڑی تھی۔ شون نے لیب تھری کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا اس نے لائٹ کا بٹن دبایا تو روشنی نہیں ہوئی۔ یقیناً روشنی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے کہ میں نے ہولڈر میں لگا ہوا بلب پہلے ہی اتار لیا تھا۔ البتہ مجھے علم تھا کہ کافی روم سے آنے والی روشنی اتنی کافی تھی کہ شون کو شیشے کا پنجرہ تلاش کرنے میں دشواری پیش نہیں آتی۔

بلیک مامبا کا شمار اچھے پالتو رینگنے والے جانوروں میں نہیں ہوتا۔ وہ اوچھے اور کمینہ فطرت ہوتے ہیں۔ وہ بنا کسی وجہ کے حملہ کر دیتے ہیں۔ اور جب آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ ان کا رویہ آپ کے ساتھ دوستانہ ہے تو وہ اس سے کہیں زیادہ تیزی کے ساتھ اچانک آپ پر پل پڑتے ہیں...

میں اپنی انگلی کی مدد سے گلاس میں برف کے کیوبز کو گھمانے لگا اور سننے کی کوشش کی۔ مجھے شیشے کے پنجرے کے ڈھکن کو کھسکانے کی چوں چوں سنائی دی۔ میرے بھائی شون نے پنجرہ کھول لیا تھا۔ پھر اس نے اپنی پچاس ہزار ڈالر کی رقم نکالنے کے لیے پنجرے کے اندر ہاتھ ڈالا۔

وہاں کوئی رقم نہیں تھی۔ صرف سیاہ مامبا تھا۔

بے چارہ شون!

میں اس کی لاش پھلانگ کر آگے بڑھا اور بلب دوبارہ ہولڈر میں لگا دیا۔ کیا میں نے آپ کو یہ بات نہیں بتائی کہ وہ میری گرل فرینڈ کو میرے خلاف ورغلا کر اس کے ساتھ گل چھرے اڑا رہا تھا؟

پھر میں نے اپنی وھسکی پینے کے بعد 911 پر فون کر دیا۔

☆☆☆

"شون ہمارے سانپوں کے بارے میں ہمیشہ نہایت تجسس میں رہتا تھا۔" میں نے پولیس ہیڈ کوارٹر میں تفتیشی سراغ رساں کو بتایا۔ "وہ لیبارٹری میں چیزوں کو الٹ پلٹ کرتا اور الٹے سیدھے ہاتھ چلاتا رہتا تھا۔ ان چیزوں میں گھس جاتا تھا جہاں اسے گھسنا نہیں چاہیے تھا۔ چیزوں کو چھونا، تکیٹ کرنا... جو اسے نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یہ اس کی عادت بن چکی تھی۔ میں نے اس بارے میں اسے بارہا تنبیہ کی تھی۔" میں شانے اچکا کر رہ گیا۔

"او کے۔" سراغ رساں نے کہا۔ "بالکل سیدھا سادہ کیس لگ رہا ہے۔ اسے سانپ نے ڈسا ہے اور یہ ایک حادثاتی موت ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔ تمہارے بھائی کی موت کا افسوس ہوا۔"

میں نے سراغ رساں کی ہمدردی پر اس کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے نکل آیا۔

"میں دنیا کے زہریلے ترین سانپ سیاہ مامبا کا بھی شکر گزار تھا کہ اس نے نہ صرف میرے پچاس ہزار ڈالر بچا لیے تھے بلکہ میرے رقیب بھائی سے بھی مجھے نجات دلا دی تھی۔ ☆

عقلِ سلیم

بابر نعیم

بعض اوقات تدبیر اور تقدیر کے داؤ ایک ساتھ ہی چل پڑتے ہیں... کراچی شہر کے قرب و جوار میں گھومتی ایک پولیس والے کی دلچسپ روداد۔ ایک تجربہ کار تھا... جو دوسرے ناتجربہ کار کی راہ میں ہر وہ رکاوٹ کھڑی کر دینا چاہتا تھا جسے عبور کرنا آسان نہ تھا... اعصاب کی کشیدگی کو ہلکا کر دینے والے لوازمات سے بھرپور گل افشانی...

ایک بددماغ پولیس افسر کی لڑکی سے محبت کرنے کا تمنا خسانہ

"ہیڈ لائٹس روشن کر دو۔" جبار احمد نے حکم دیا۔

سلیم نے جھٹ حکم پر عمل درآمد کیا۔ جھٹپٹا ہو چلا تھا... دونوں پولیس موبائل میں تھے۔

"بند کرو احمق۔" جبار چیخا اور سلیم نے بوکھلا کر ہیڈ لائٹس بند کر دیں۔

"کنارے لگاؤ۔"

سلیم نے موبائل روک دی۔

"اندھے ہو۔" جبار نے کڑوے لہجے میں کہا۔

"سنگل روڈ پر دوطرفہ ٹریفک ہے اور تم نے ہائی بیم آن کردی تھی۔ ایک ہفتے میں تین بار تم یہ غلطی کر چکے ہو۔ یہ ڈبل روڈ نہیں ہے۔ ڈبل روڈ پر بھی تم اسی وقت ہائی بیم استعمال کر سکتے ہو جب اسٹریٹ لائٹس بند ہوں۔"

سلیم کو خود پر غصہ تو آیا لیکن وہ سوچ رہا تھا کہ عام لوگ اس بات کا دھیان نہیں رکھتے تو پھر پولیس موبائل پر یہ مجھے "ہائی وے کوڈ" کیوں پڑھا رہا ہے؟

پولیس ٹریننگ سینٹر میں آنے سے پہلے وہ اپنی اس کمزوری پر بہت حد تک قابو پا چکا تھا لیکن جبار احمد کے سامنے وہ کئی بار اس غلطی کا مرتکب ہو چکا تھا۔ اگرچہ یہ ایک غیر اہم بات تھی۔

☆☆☆

دوسرے دن پھر سلیم پولیس موبائل کی ڈرائیونگ سیٹ پر تھا۔ وہ تربیت کے مختلف مراحل سے گزر رہا تھا۔ جیسے روپ کلائمبنگ، شوٹنگ، تحریری ٹیسٹ، دوڑ، ورزش، چیزنگ، قانونی نکات... وغیرہ۔

نئے آئی جی نے فورس میں نئی چیزیں متعارف کرائی تھیں جن میں نفسیات اور کرمنالوجی کی کلاسز بھی شامل تھیں۔ سلیم کے ساتھ موبائل میں جبار احمد موجود تھا۔ موبائل کے عقب میں صرف ایک پولیس والا بیٹھا تھا۔ ظاہر ہے، وہ لوگ ٹریننگ سینٹر سے باہر تھے۔ سلیم پریشان تھا کہ جبار، اس سے عجیب عجیب ٹیسٹ لے رہا تھا۔ سلیم کے خیال میں بعض ٹیسٹ تربیتی نصاب میں شامل نہیں تھے۔

سلیم جانتا تھا کہ جبار عمداً اس کے ساتھ آیا ہے۔ وہ سلیم کو کار چیزنگ کی باریکیاں سمجھا رہا تھا۔ سلیم کو معلوم تھا کہ جبار اسے پسند نہیں کرتا... بہر حال وہ اس کی باتیں غور سے سن رہا تھا۔

وہ لوگ بندر روڈ، ایم اے جناح روڈ کی معروف ترین سڑک پر تھے۔ مغرب ہونے والی تھی اور بے پناہ رش تھا۔ جبار احمد نے قصداً یہ وقت چُنا تھا۔ تاہم سلیم پولیس فورس میں شامل ہونے کے لیے پُرعزم تھا۔ یہ اس کا پرانا خواب تھا۔

ہوٹر کا استعمال کب کرنا ہے، سگنل کب توڑنا ہے، بھری سڑک پر تیزی سے راستہ بنانے کے کیا گر ہیں... عقب کا خیال کیسے رکھنا ہے اور مطلوبہ گاڑی کو روکنے کے لیے کیا ٹرکس استعمال کرنی ہیں۔

سلیم اس بات سے بھی آگاہ تھا کہ جبار کیوں اس کی راہ میں روڑے اٹکانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ جبار کی بیٹی سلیم کی محبت میں گرفتار تھی۔ دونوں کا منصوبہ تھا کہ جیسے ہی سلیم پولیس فورس میں شمولیت اختیار کرلے گا، وہ دونوں شادی کرلیں گے۔ اسی بات سے جبار نالاں تھا۔ اس کی وجہ سے سلیم کو تربیت کے مراحل سے گزرنے کے لیے سخت جدوجہد کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ لیکن وہ بھی ہٹ کا پکا تھا اور جبار کو کوئی موقع فراہم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ تاہم وہ یہ بات جانتا تھا کہ جبار احمد تنگ آ کر کوئی ناجائز حربہ بھی استعمال کرسکتا ہے۔

ادھر اپنی بیٹی کا ذہن بدلنے کی جبار کی تمام کاوش اب تک لاحاصل ہی رہی تھی۔ لے دے کر اب اس کی توجہ سلیم پر مرکوز تھی۔ زیرِ تربیت افراد کی بیشتر تعداد کامیابی سے تربیت کے مراحل طے کر گئی تھی... کچھ کو باہر ہونا تھا اور جبار باہر ہونے والوں میں سلیم کو بھی دیکھنا چاہتا تھا۔

سلیم اب تک یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ آخر جبار کو اس میں کیا عیب نظر آ گیا ہے۔ جبار کافی سینئر تھا اور ٹریننگ یونٹ کا انچارج تھا جبکہ وہ انسٹرکٹرز کی ٹیم میں شامل نہیں تھا۔ غالباً یہ اس کا اثر رسوخ ہی تھا اور جب سے اس کی بیوی کینسر کے ہاتھوں جان ہار گئی تھی، جب سے وہ بیٹی کے لیے ماں اور باپ دونوں کا رول ادا کر رہا تھا۔ سلیم کے مشاہدے اور اندازے کے مطابق وہ کچھ کھسک گیا تھا اور کسی کو اپنی بیٹی کے لائق نہیں سمجھتا تھا۔ وہ کئی رشتے پہلے ہی مسترد کر چکا تھا۔

لیکن اس کی بیٹی سلمیٰ اور سلیم کی محبت نے اسے غصے اور پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔ یہ بھی انوکھا اتفاق تھا کہ اس کی بیٹی کا نام سلمیٰ تھا۔ سلیم اور سلمیٰ... دونوں نہایت سنجیدہ عہد و پیمان کر چکے تھے۔

سلیم اس اتفاق کو تائیدِ غیبی سمجھ رہا تھا اور پُریقین تھا کہ بالآخر وہ دونوں زندگی بھر کے ساتھی بن جائیں گے۔

سلیم اور سلمیٰ ایک ہی کالج سے پڑھے تھے... اور ایک دوسرے کی محبت میں قطعی ثابت قدم اور سچے تھے۔ تاہم عمر رسیدہ جبار اس بات کو نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ جبار کے خلاف کبھی کبھی سلیم کے اندر اشتعال کی لہر اٹھتی لیکن وہ اسے دبانے میں کامیاب ہو جاتا... کہ جبار بہر حال اس کا ہونے والا محترم سسر تھا...

☆☆☆

"تمہارے آگے نسان ایل ایکس ہے۔" وہ بولا۔

"ہاں دیکھ رہا ہوں، جناب۔" سلیم نے جواب دیا۔

"اس کے آگے کرولا انڈس ہے۔ دو منٹ میں اسے اوورٹیک کرو۔" جبار نے حکم صادر کیا۔ "اور ہاں، سائرن استعمال نہیں کرنا ہے... نہ ہی ہارن پر ہاتھ رکھنا ہے۔"

سلیم بوکھلا گیا۔ ٹریفک کا جمِ غفیر تھا۔ بائک والے بھی پریشان تھے۔ جبار وقتاً فوقتاً اچانک ہی سلیم کو مشکل سے دوچار کرنے کا عادی تھا جبکہ سلیم ہمیشہ دعا کرتا کہ اس کے ساتھ جبار کے علاوہ کوئی اور انسٹرکٹر ہو۔ یہ اور بات تھی کہ سلیم کی چابک دستی اور مہارت نے اب تک جبار کو اس کے مقصد سے دور رکھا تھا۔

ہوٹر کے ساتھ وہ ایک منٹ میں بھی کرولا کو اوورٹیک کرسکتا تھا لیکن ظالم نے تو ہارن کے استعمال سے بھی منع کر دیا تھا۔ جبار بے نیازی سے کلائی کی گھڑی پر وقت دیکھ رہا تھا۔ اس کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

سلیم نے حواس مجتمع کر کے تیزی سے ذہن دوڑایا۔ موبائل بُری طرح ٹریفک میں پھنسی ہوئی تھی۔ نسان کے بعد کرولا تقریباً تیس فٹ دور تھی۔ اور ساٹھ فٹ دور ٹریفک سگنل تھا۔

سلیم نے دانت پیستے ہوئے بائیں ہاتھ میں اسٹیئرنگ جکڑا، دایاں ہاتھ کھڑکی سے باہر نکالا اور انڈیکیٹر سمیت موبائل کی تمام بتیاں آن کر دیں... حتیٰ کہ اندر چھت کی بتی بھی روشن کر دی۔ لیور کو ڈپر پر لگانے سے ٹیل لائٹ سمیت تمام بیرونی بتیاں جلنے بجھنے لگیں۔ سورج ویسے ہی مغرب کی جانب جھکتا جا رہا تھا۔ ہیڈ لائٹ، فل بیم پر بلنک کر رہی تھی۔

سلیم نے گیئر بدلا اور وائپر بھی چلا دیے۔ جبار احمد کی مسکراہٹ معدوم ہونے لگی۔ وہ دل ہی دل میں سلیم کی حاضر دماغی کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔

سلیم شوری کا دایاں ہاتھ کھڑکی سے باہر لہرا رہا تھا جس میں جبار احمد کی کیپ دبی تھی۔ کیپ اس نے ڈیش بورڈ سے پوچھے بغیر ہی اٹھائی تھی۔ رہی سہی کسر پولیس موبائل کے مخصوص رنگ و روپ نے پوری کر دی تھی۔

رش کی وجہ سے ٹریفک کی رفتار ہلکی تھی۔ سلیم نے تھرڈ گیئر میں گاڑی دبائی تو پندرہ سیکنڈ میں، موبائل کا بمپر اگلی نسان ایل ایکس کے پچھلے بمپر سے جا ملا۔ نسان نے بوکھلاہٹ میں کسی نہ کسی طرح موبائل کے لیے جگہ بنائی پھر بھی موبائل نے اسے کراس کرتے ہوئے سائڈ مرر توڑ ڈالا... مجبوری تھی۔

اطراف کے ڈرائیور ہراساں ہو گئے تھے۔ پولیس موبائل پر اعتراض کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ عمومی تاثر یہی ابھرا کہ کوئی ایمرجنسی ہو گئی ہے اور موبائل کا سائرن خراب ہے۔

ایک منٹ بعد سلیم کرولا کے عقب میں تھا۔ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے سلیم نے کرولا کے اندرونی ماحول کا جائزہ لیا۔ اتنے عرصے میں وہ جبار احمد کے انداز کو سمجھ گیا تھا۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ اگلا سوال کرولا کی سواریوں سے متعلق کر ڈالے۔

پانچ سیکنڈ قبل اس نے کرولا انڈس کو اوورٹیک کرلیا۔ ذرا ہی دیر بعد سگنل پر دوسروں کی طرح اسے بھی رکنا پڑا۔ وہ عوام کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ وہ بلاشک و شبہ حیران ہوں گے کہ بظاہر جو ایمرجنسی اچانک پیدا ہوئی تھی، اس کا کیا بنا اور اگر نتیجہ آگے جا کر برآمد ہونا تھا تو موبائل سگنل پر کیوں رک گئی؟

☆☆☆

سلیم نے پیشانی کا پسینا صاف کرتے ہوئے بتیاں وغیرہ بند کیں اور ستائش کی امید میں مسکرا کر جبار احمد کو دیکھا۔ لیکن جبار کی مکار مسکراہٹ دیکھ کر اس کے دماغ میں گھنٹی بجی۔

"آخر پھنس گئے بیٹا جی۔" جبار فاتحانہ انداز میں ہنسا۔ "استاد، استاد ہی ہوتا ہے۔"

"جناب! میں سمجھا نہیں۔" سلیم خود کو ہونق محسوس کر رہا تھا۔

"بیٹا یہ بتاؤ کہ نسان ایل ایکس میں پچھلی نشست پر جو شخص بیٹھا تھا، اس نے کس رنگ کی جیکٹ پہنی ہوئی تھی؟"

سلیم کا دماغ گھوم گیا۔ اس کی تمام تر توجہ ٹویوٹا کرولا پر رہی تھی۔ جبار کا سوال اسے گولی کی طرح لگا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"جناب! آپ زیادتی کر رہے ہیں۔" سلیم نے پہلی بار احتجاج کیا۔

"نہیں بیٹا، ایسا نہیں ہے۔ میں تمہاری ہوشیاری کی داد دیتا ہوں۔ مجھے امید نہیں تھی کہ تم بروقت کرولا کو اوورٹیک کرلو گے۔ پھر بھی احتیاطاً میں نے ترپ چال تیار رکھی تھی اور تم فیل ہو گئے۔"

سلیم کو مایوسی اور غصے نے گھیر لیا۔

"تم جیسے جوانوں کو فورس میں ہونا چاہیے اور میں یہ کام بہ آسانی کر سکتا ہوں۔" جبار بولا۔

سلیم کو امید کی کرن دکھائی دی۔

"لیکن ایک شرط ہے۔" وہ بولا۔

سلیم کے منہ میں کڑواہٹ گھل گئی۔ وہ جانتا تھا کہ

''شرط'' کیا ہوگی۔ وہ ہونے والے ''مسسر جی'' کو گھورتا رہا۔ اس کے تصور میں سلمٰی کا چہرہ ابھرنے لگا۔ ''میں ہر شرط مان لوں گا لیکن سلمٰی کو نہیں چھوڑ سکتا۔'' سلیم نے مستحکم لہجے میں کہا۔

''دیکھیں گے... فی الحال میں نے تمہاری تربیت جاری رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔'' جبار اپنی کیپ لے کر گاڑی سے اتر گیا۔

پہلی بار سلیم نے محسوس کیا کہ وہ ''مسسر جی'' کو کسی حد تک متاثر کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ تاہم وہ بڑے میاں کی سنک سے بھی بدکا ہوا تھا۔ وہ اس وقت امید و بیم کی کیفیت میں تھا۔

☆☆☆

کل سلیم کی فزیکل ٹریننگ تھی جہاں عموماً جبار احمد کم ہی نظر آتا تھا۔ سلیم کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ جبار آن ڈیوٹی ہونے کے باوجود ٹریننگ سینٹر میں ٹانگ کیوں اڑا رہا تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ سلیم کے پیچھے کیوں پڑا ہوا تھا۔ محض بیٹی کی وجہ سے؟ حالانکہ وہ ایک قابل افسر تھا اور پچپن سے اوپر جانے کے بعد بھی فٹ نظر آتا تھا۔ ہماری پولیس کی جو حالت ہے، اسے دیکھتے ہوئے یہ بات حیرت انگیز تھی۔ سلیم شروع میں اس سے متاثر ہوا تھا کیونکہ اس کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ بکنا اور جھکنا نہیں جانتا تھا جس کے باعث ماضی میں نہ صرف اس کے تبادلے ہوتے رہے تھے بلکہ جرائم پیشہ افراد کے ہاتھوں وہ کئی مرتبہ مرتے مرتے بچا تھا۔ پولیس ڈپارٹمنٹ میں اس کا نام اور عزت تھی۔

سلیم اور اس کے درمیان ایک ہی رنجش تھی جو سلمٰی سے متعلق تھی۔ سلیم خیالات میں گم یونیورسٹی روڈ پر ڈرائیو کر رہا تھا، وہ اکیلا تھا اور اس بات پر حیران تھا کہ جبار نے اسے سرکاری گاڑی لے جانے کی اجازت کیسے دے دی تھی؟ کیا اس میں بھی جبار کی کوئی چال تھی؟

وہ حسن اسکوائر سے کچھ آگے ایک ریسٹورنٹ میں سلمٰی سے مل کر جا رہا تھا۔ جبار کی رہائش گلشن میں تھی۔ وہ ملاقات کے مخمور اور مستقبل کے سپنوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ دفعتاً سپنے بکھر گئے اور وہ حقیقی دنیا میں لوٹ آیا۔ وہ گولی کا ہی دھماکا تھا۔ اضطراری طور پر اس نے بریک لگائے۔ وہ ایک مشہور بینک کی برانچ تھی۔

دھماکا برانچ کے اندر ہی ہوا تھا۔ چیخ پکار کی آواز آئی۔ دو بدمعاش صورت لفنگے برانچ سے بھاگتے ہوئے نکلے۔ سلیم ایک لمحے کے لیے بوکھلا گیا۔ وہ پولیس مین تھا، نہ اس کے پاس وردی تھی۔ ظاہر ہے وہ مسلح بھی نہیں تھا۔

برانچ پر موجود دو نیلی وردی پوش گارڈز میں سے ایک نے فائر کیا اور چپٹی ناک والا بدمعاش فٹ پاتھ تک آتے آتے گر گیا۔ سلیم اندازہ نہیں لگا سکا کہ گولی اس کے جسم میں کس طرف داخل ہوئی ہے۔ تاہم وہ جس طرح لوٹ پوٹ ہو رہا تھا، لگ رہا تھا کہ فرار نہیں ہو سکے گا۔ بظاہر یہ ڈاکے کی واردات لگ رہی تھی۔

زخمی کے ساتھی نے پلٹ کر بے محابا گولی داغ دی۔ تاہم افراتفری میں نشانہ خطا گیا۔ گارڈز کے سنبھلنے سے پہلے ہتھیار بند بدمعاش اپنے تڑپتے ساتھی کو بھول کر فٹ پاتھ کے کنارے موجود بائک تک پہنچ چکا تھا۔ اس دھینگا مشتی میں اس کی ٹوپی گری تو اندر سے پورا چاند طلوع ہوا۔ سلیم بری طرح چونکا۔ وہ ٹرانس سے باہر آگیا تھا۔ اس نے گنجے بدمعاش کو شناخت کر لیا۔

وہ شمس گنجا تھا جو ''انڈا'' کے نام سے معروف تھا۔ معروف کیا بدنام تھا۔ اس کا سب سے بڑا عیب، آتشیں ہتھیاروں کا شوق تھا... اس سے بڑھ کر ان ہتھیاروں کو بے دھڑک استعمال کرنے کی عادت۔ سات قتل تو پکے اس کے ریکارڈ پر تھے۔ پولیس عرصے سے ''انڈے'' کی تاک میں تھی۔ تاہم وہ بھی ایک کائیاں تھا۔ ایک آدھ بار تو گرفت میں آتے آتے صاف نکل گیا تھا۔

لوگ اپنی اپنی جان بچانے کی فکر میں کونے کھدروں میں گھس رہے تھے۔ زخمی اپنے ریوالور تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پتا نہیں وہ گارڈ سے انتقام لینے کے چکر میں تھا یا اپنے ساتھی کی راہ ہموار کرنے کے لیے موبائل کے ٹائر پر گولی ٹھونکنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

برانچ کے گارڈ موبائل کی موجودگی میں مزید ایکشن لینے سے احتراز کر رہے تھے۔ سلیم نے کچھ اور آنکھوں میں بھی امید کی کرن دیکھی۔ پولیس پہلے ہی بدنام تھی اور یہاں اس کی ساکھ بری طرح داؤ پر لگی تھی۔ اس بات سے ہر کوئی بے خبر تھا کہ موبائل میں ایک زیر تربیت غیر مسلح شخص موجود ہے جس سے کسی کارروائی کی توقع عبث تھی۔

سلیم کے بدن میں سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ پولیس کا مان رکھنے کی ذمّے داری اس پر آن پڑی تھی اور اسے یہ ذمّے داری نبھانی تھی۔ وہ اس امر سے بخوبی آگاہ تھا کہ بعد ازاں جبار احمد کا ریکارڈ بھی داغ دار ہو جاتا۔ اسے اپنا وجود بھی خطرے میں نظر آرہا تھا۔

وہ شمس گنجے کی دیدہ دلیری پر حیران تھا۔ شاید وہ تاڑ گیا تھا کہ موبائل میں ایک ہی بندہ ہے۔ بھتا پرچی اور لوٹ مار کے چند مضبوط و منظم گروہوں میں سے ایک ''شمس گنجے'' کا سرپرست... بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ''انڈا'' اس گروپ کے لیے بہت اہمیت رکھتا تھا جبکہ دوسری طرف پولیس بھی عرصے سے ''انڈا'' پھوڑنے کے چکر میں تھی۔ لیکن وہ بھی قسمت کا دھنی تھا... مکاری اور بے رحمی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

تقدیر سلیم کو عجیب موڑ پر لے آئی تھی۔ اگر وہ ''انڈے'' کو قابو کر لیتا تو نہ صرف خطرناک گروہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا بلکہ سلیم کی پولیس میں نوکری بڑی دھوم دھام سے پکی ہو جاتی۔

دوسری جانب جبار احمد پر بھی کوئی آنچ نہ آتی اور سب سے بڑھ کر سلمٰی... اس سے آگے سلیم نے سوچنا بند کر دیا۔ تقدیر جیسے سرگوشیاں کر رہی تھی۔ داؤ لگا لے، لگا لے داؤ لگا لے... اور سلیم نے داؤ لگانے کا فیصلہ کر لیا۔

''انڈا'' بائک اسٹارٹ کر چکا تھا۔ سلیم نے سائڈ مرر میں دیکھا کہ وہ بائک کو گیئر میں ڈالنے سے قبل موبائل کا ٹائر برسٹ کرنے کے لیے نشانہ باندھ رہا تھا۔ قبل ازیں اس نے دو ہوائی فائر بھی کیے۔

سلیم کی تربیت تو کب کی پوری ہو چکی تھی۔ محض جبار احمد کی وجہ سے وہ پھنسا ہوا تھا۔ پولیس میں آنے کا فیصلہ اس نے اچانک نہیں کیا تھا بلکہ یہ اس کا خواب تھا جس کے پیچھے کچھ مثبت مقاصد تھے۔ وہ فطری طور پر ایک قابل فخر اور دلیر شخص تھا۔ البتہ تربیت کے دوران اس نے ضرور کچھ نئی چیزیں سیکھی تھیں۔

☆☆☆

اس نے ہر خطرے کو ذہن سے جھٹک کر پھرتی سے ریورس گیئر لگایا اور ایکسلریٹر کو دباتا چلا گیا۔ گاڑی کے ٹائر چرچرائے۔ موبائل کا عقبی حصہ شدت کے ساتھ بائک سے ٹکرایا۔ سلیم نے عقبی آئینے پر نظر ڈالی تو کچھ نظر نہ آیا۔ گاڑی سے اترنے سے قبل اس نے ڈیش بورڈ پر ہاتھ مارا کہ شاید کوئی بھولا بھٹکا ہتھیار مل جائے۔ تاہم اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

معاً دوسری جانب کا دروازہ کھلا اور سیاہی مائل ''انڈا'' زخمی سانپ کی طرح اندر رینگ آیا۔ جدید طرز کا پسٹل اس کے ہاتھ میں تھا۔ سلیم ششدر رہ گیا۔ گنجے کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے۔ ''چلو۔'' وہ گن ہلاتے ہوئے پھنکارا۔

سلیم کو شدید خطرے کا احساس ہوا لیکن وہ گاڑی آگے بڑھانے پر مجبور تھا۔ اسی وقت برانچ کی جانب سے پھر فائرنگ کی آواز آئی۔ شاید گارڈز نے بدمعاش کو گاڑی میں گھستے دیکھ لیا تھا۔ یقیناً وہ موبائل کو روکنے کے لیے ٹائرز پر فائرنگ کر رہے تھے۔

سلیم نے ان پر لعنت بھیجی۔ عموماً یہ نمائشی گارڈ اس حد تک کارکردگی نہیں دکھاتے۔ اگر وہ احمق گاڑی روک بھی لیتے تو پہلے سلیم کو مرنا پڑتا۔ ظاہر ہے کہ وہ ''شمس گنجے'' کے کارناموں سے واقف نہیں تھے۔

''نکلو۔'' انڈے نے گن سلیم کی کنپٹی پر رکھ دی۔ سلیم نے موبائل بھگانے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔

''اپنا سروس ریوالور ادھر بڑھا دے۔'' انڈے نے سفاک لہجے میں کہا۔

''میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔''

''جانتا ہے، میں کون ہوں؟'' انڈا غرایا۔

''پپ... پتا نہیں۔'' سلیم ہکلایا۔

''جھوٹ بولے گا تو گولی کھائے گا۔'' وہ بولا۔ ''حیرت ہے، مجھے نہیں جانتا۔''

''میں نہیں جانتا، نہ میں ہتھیار کے بارے میں جھوٹ بول رہا ہوں۔'' سلیم نے نئے لیکن خطرناک لائحہ عمل کی تیاری شروع کر دی۔ ''بے شک گولی مار دو۔ تم دیکھ نہیں رہے کہ میرے جسم پر وردی نہیں ہے۔ میں محض ایک نیا ڈرائیور ہوں۔''

گنجے کی سرخ آنکھوں میں شک کے سائے لہرائے لیکن سلیم کی اداکاری اور وردی والی بات نے اسے گڑبڑا دیا۔ تاہم وہ بھی ایک کائیاں تھا۔

محبت

''محبت شادی سے پہلے ہونی چاہیے یا بعد میں؟'' ایک نے سوال کیا۔

''کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' دوسرے نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ''محبت شادی سے پہلے ہو یا بعد میں، دونوں صورتوں میں بیوی کو اس کی ہوا بھی نہیں لگنی چاہیے۔''

بنوں سے ہمایوں سعید کا تجزیہ

"اگر یہ بات ہے تو گاڑی ریورس کر کے مجھ پر کیوں چڑھائی تھی؟" اس نے زہریلے انداز میں پوچھا۔

"غلط بات ہے۔ میں تو گھبرا کر بھاگ رہا تھا۔" سلیم اس سوال کے لیے تیار تھا۔ "لیکن بدحواسی میں گیئر غلط پڑ گیا۔ اسی اناڑی پن کی وجہ سے تم بچ گئے۔" سلیم نے اطمینان سے کہا۔

انڈا خاموش تھا۔ تاہم اس نے چند ثانیے کے بعد گن، سلیم کی کنپٹی پر سے ہٹالی اور ریڈیو کا تار توڑ ڈالا۔

"رفتار بڑھاؤ اور سیدھے نکلتے جاؤ۔" اس نے حکم جاری کیا۔

سلیم اس وقت اردو کالج سے گزر کر فلائی اوور پر چڑھ رہا تھا۔ اس نے "انڈے" کی ہدایت پر عمل کیا۔ آگے نیپا کا سگنل آنے والا تھا۔ سلیم کا ذہن برق رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ "شمس انڈے" نے گن گود میں رکھ لی تھی۔ غالباً اس نے سلیم کی بات میں وزن محسوس کیا تھا یا پھر حد سے زیادہ خوداعتمادی کا شکار تھا۔

گاڑی سگنل کے قریب تھی اور سگنل بند تھا۔ البتہ وہ دائیں جانب گلستان جوہر کی جانب مڑ سکتا تھا۔ اسے پھر پل پر چڑھنا پڑتا۔ چورستے پر اسے رینجرز کی گاڑی نظر آئی۔ اس کے دماغ میں برق سی کوندی۔ سنہری موقع تھا، اسے موبائل رینجرز پر چڑھاتے ہوئے پھرتی سے دروازہ کھول کر باہر لڑھک جانا تھا۔ اس نے سائڈ مرر پر نظر ڈالی۔

انڈے نے بھی رینجرز کو دیکھ لیا تھا اور شاید سلیم کا دماغ بھی پڑھ لیا تھا۔ گن اب بھی اس کی گود میں تھی۔ تاہم ہتھیار اب اس کے ہاتھ کی گرفت میں تھا۔

"کوئی ہوشیاری نہیں۔" اس کی خونی غراہٹ اُبھری۔ چہرہ اس نے سلیم کی طرف کر لیا۔ "میرا کچھ بھی بنے، سب سے پہلے گولی تمہاری کھوپڑی میں گھسے گی۔"

سلیم کو اس دھمکی پر کسی قسم کا شک نہیں تھا۔ اب ایک ہی امید تھی کہ رینجرز بدنام قاتل کو دیکھ لے۔ سلیم کو اس کے ایک ہاتھ میں موبائل فون دکھائی دیا۔ سلیم اس کی زبان نہیں سمجھ سکا۔ کچھ دیر بات کر کے اس نے موبائل بند کر دیا۔ تاہم اس میں انگریزی کے بھی چند الفاظ تھے۔ ان لفظوں نے سلیم کو بتا دیا کہ "انڈے" نے اپنے کسی ساتھی سے "کار" منگوائی ہے۔ یعنی وہ جلد ہی موبائل چھوڑ کر کار میں نکل جائے گا۔ اس کی درندگی سے کوئی بعید نہیں تھا کہ جاتے جاتے ایک گولی وہ سلیم پر بھی خرچ کر ڈالے۔

"کدھر جاؤں؟"

"سیدھے نکلو۔" وہ بولا۔ سلیم کو اسی جواب کی توقع تھی کیونکہ دائیں بائیں کے راستے گنجان علاقے میں نکلتے تھے۔ ایک جانب گلستانِ جوہر تو دوسری طرف گلشنِ اقبال۔

سلیم نے ہدایت پر عمل کیا۔ وقت کم تھا۔ سلیم کا ذہن برق رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ ایک طرف جان خطرے میں تھی، دوسری طرف اپنی چاہت کو حاصل کرنے کا سنہری موقع تھا۔ اگر وہ کسی طرح "انڈے" پر قابو پالیتا تو نہ صرف جبار احمد پر کوئی زد نہ پڑتی بلکہ کریڈٹ بھی انہی کے حصے میں جانے کا پورا امکان تھا۔ اس غیر یقینی کارنامے پر پولیس کی نوکری بھی پکی تھی اور سلمیٰ کا حصول بھی یقینی۔

اس نے کن انکھیوں سے شمس انڈے کو دیکھا تو اسے پوری طرح چوکنا پایا۔ گود میں ہونے کے باوجود گن پر اس کی گرفت مضبوط تھی۔

سفاری پارک سے گزرنے کے بعد سامہ سینٹر سے ذرا دور ٹریفک کے رش میں اسے گاڑی کی رفتار دھیمی کرنی پڑی۔ اسی وقت "انڈے" نے سیل فون پر دوبارہ بکواس شروع کر دی۔ سلیم نے بے قراری محسوس کی۔ دفعتاً وہ بری طرح چونک اٹھا۔ سامہ سینٹر کی پارکنگ میں اسے جبار احمد کی صورت نظر آئی۔ وہ سول ڈریس میں تھا۔ "سسر جی! ادھر دیکھو۔" سلیم کا دل چیخا۔ لیکن سسر جی دوسری جانب شاپنگ سینٹر کی طرف متوجہ تھے۔ ٹریفک رینگ رہا تھا۔ بسیں، کوچز اور ویگنیں بھی ٹریفک میں شامل تھیں۔

اسٹیئرنگ پر سلیم کی ہتھیلیاں پسینے کی زد میں تھیں۔ اس نے جبار کی نگاہوں کا تعاقب کیا تو دنگ رہ گیا۔ جبار، شرٹ اور پتلون میں کھلی زلفوں والی ایک بے باک طالبہ کا ناپ لے رہا تھا۔ جو شاید NED سے نکل کر ادھر آئی تھی۔

"شرم کرو سسر جی... جس حلیے میں بھی ہے لیکن ہے تو آپ کی بیٹی جیسی... ادھر منہ کرو۔ تم اور تمہارا داماد دونوں پھنسے ہوئے ہیں۔" سلیم نے منہ بناتے ہوئے دل ہی دل میں کہا اور ایک بار پھر شمس انڈے کو چور نظروں سے دیکھا۔ اس کے انداز میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وردی ہوتی تو عام لوگوں کے درمیان، انڈا فوراً جبار کو پہچان لیتا۔

جبار نے منہ پھیرا تو سلیم کی پریشانی کم ہوئی لیکن یہ کیفیت عارضی ثابت ہوئی۔ جبار پھر پتلون والی لڑکی کا جائزہ لینے میں مگن ہو گیا۔

"لعنت ہے... سسر جی نشے میں تو نہیں ہیں؟" سلیم گڑبڑا گیا۔

اسی وقت ایک بائک والا چلبلا نوجوان عدم برداشت کے باعث مِیں مِیں... کرتا زگ زیگ بناتا ٹریفک میں آگے نکلا۔ تاہم کامیاب ہونے کے بجائے ایک رکشا کے گلے لگ گیا۔ ہیلمٹ کی وجہ سے اس کا سر بچ گیا لیکن ٹریفک جام ہونے لگا۔ ادھر جبار کا ارتکاز ٹوٹ گیا۔ اب وہ ایکسیڈنٹ کی جانب متوجہ تھا۔

"دائیں طرف رکھو اور نکل چلو۔" انڈا غرایا۔ سلیم تو خود وہاں پھنسنا نہیں چاہتا تھا۔

وہ اب جبار سے زیادہ دور نہیں تھا لیکن جبار بدستور جائے حادثہ کی جانب دیکھ رہا تھا۔

سلیم کو کچھ نہیں سوجھا تو اس نے نہایت صفائی سے ہیڈ لائٹ روشن کر دیں۔ دن کی تیز روشنی اور ٹریفک کے غل غپاڑے میں "انڈا" سلیم کی حرکت نوٹ نہ کر سکا۔

"سسر جی! اب تو دیکھ لو، میں پھر غلطی کر رہا ہوں۔" سلیم کا دل چیخا اور پھر اس کی گاڑی گزرتی چلی گئی۔ سلیم نے ٹھنڈی سانس بھری۔ وقت اس کے ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔

ٹریفک کی رفتار بڑھنے لگی۔ "کرو یا مرو۔" سلیم کے ذہن نے نعرہ بلند کیا۔ اس وقت اگر وہ ہینڈ بریک کھینچ دیتا تو عقب سے ایکسیڈنٹ لازمی تھا۔ اس کا دل ڈھول بجا رہا تھا۔ ایک خونی درندہ اس کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ٹریفک مزید رواں ہو جاتا تو یہ موقع بھی ہاتھ سے نکل جاتا۔ ہینڈ بریک کھینچتے ہی اسے دروازہ کھول کر باہر لڑھک جانا تھا۔ خطرہ ہی خطرہ تھا۔ اندر بھی اور باہر بھی۔

اسے اسٹیئرنگ سے ایک ہاتھ ہٹانا تھا۔ پھر دوسرے ہاتھ سے دروازہ کھولنا تھا۔ انڈے کو موقع دیے بغیر نہایت تیزی کا مظاہرہ کرنا تھا۔

وہ جس شعبے میں جا رہا تھا، وہاں بھی تو خطرات ہی تھے۔ اسے ایک پرانی فلم یاد آئی جس کا نام تھا "جو ڈر گیا وہ مر گیا۔"

دوسرا خطرہ باہر گرنے کا تھا۔ کوئی پیچھے والی گاڑی اس پر چڑھ سکتی تھی۔ سلیم نے سوچا کہ ٹریفک کی رفتار مزید بڑھنے دے۔ رفتار پیما دس کے قریب تھرک رہا تھا۔

"بس، ڈرائیور صاحب! تمہاری آزادی میں چند منٹ رہ گئے ہیں۔" معاً انڈے نے اسے مخاطب کیا۔ وہ پُرسکون اور پُراعتماد لگ رہا تھا۔

سلیم اچانک مخاطب کیے جانے پر چونک پڑا۔ کیا شمس انڈے کے فرار کا وقت قریب ہے؟ یا وہ سلیم کو قیدِ حیات سے آزاد کرنے کی بات کر رہا ہے؟

تاہم اس اچانک مکالمے سے سلیم کو اندازہ ہو گیا کہ انڈا کوئی خاص چوکنا نہیں ہے۔

اس نے رفتار پیما کو دیکھا اور فیصلہ کر لیا۔ اس کی کامیابی کا دارومدار پھرتی اور قسمت دونوں پر تھا۔ اس نے ہر امکان کو ذہن میں رکھا۔ عقبی شیشے پر نظر ڈال کر سر ہلائے بغیر سائڈ مرر میں جھانکا۔ ایکسیڈنٹ نہیں بھی ہوا تو ہینڈ بریک کا جھٹکا لازمی لگنا تھا۔ عقب سے کوئی گاڑی ٹکراتی تو دوسرا جھٹکا اس کے کام کو اور آسان کر دیتا۔ ایک یا دونوں جھٹکوں کے لیے صرف وہ تیار تھا اور اسے ایک سیکنڈ سے زیادہ وقت نہیں لینا تھا۔ اسے خوب اندازہ تھا کہ کسی بھی صورت میں انڈا گولی ضرور چلائے گا۔

اسپیڈومیٹر کی سوئی بیس کا ہندسہ کراس کر رہی تھی۔ سلیم نے خدا کے بعد سلمیٰ کو یاد کیا... پھر اس نے یکلخت ہی ناقابلِ یقین پھرتی کا مظاہرہ کیا.... گاڑی کے پہیے چلا اٹھے لیکن انڈے کا ردِعمل بھی دیدنی تھا۔ تاہم اچانک جھٹکے کی شدت سے بچنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس کا سر ونڈ اسکرین سے ٹکرایا۔ گاڑی کا دروازہ کھلا اور انڈے نے انتہائی مشکل زاویے سے فائر کیا...

سلیم جھکی ہوئی حالت میں گاڑی سے نکل گیا۔ دوسری گاڑیوں کے ٹائروں نے چیخیں بلند کیں۔ سلیم کی سماعت سے مزید تین دھماکے ٹکرائے۔ وہ اپنے حواس میں تھا۔ تاہم جسم جیسے سُن ہو گیا تھا۔ چار دھماکے... تین گولیوں کے اور ایک پیچھے آنے والی کار کی ٹکر کا... سلیم کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ انڈے نے اچانک لگنے والے دو دھکوں کے قلیل وقفے میں تین فائر کیسے کر دیے؟ سڑک پر اس کا جسم قلابازی کھا کر ساکت ہوا تو اس کے قریب ایمرجنسی بریک لگانے والی گاڑی کا اگلا پہیا سلیم کے سر سے چند انچ دور تھا۔ کوئی بائک سوار کار سے بچتا ہوا سلپ کر گیا اور بائک سمیت رگڑتا ہوا سلیم کو چھوتا ہوا گزر گیا۔

معاً سلیم کو احساس ہوا کہ اسے گولی لگ چکی ہے۔ کہاں اور کیسے؟ اس نے نیم باز آنکھوں سے موبائل کے کھلے دروازے میں نگاہ ماری۔ شمس گاڑی کی نشست پر اوندھا پڑا تھا۔ خون اس کے سر سے اس طرح بہہ رہا تھا جیسے ٹوٹے ہوئے انڈے کا مواد... آخری منظر دوسری جانب کی کھڑکی کا تھا جس میں سلیم نے جبار احمد کا چہرہ دیکھا۔ اس تمام کارروائی میں دو سیکنڈ لگے ہوں گے۔ سسر جی کا چہرہ دیکھنے کے بعد سلیم کو حیران ہونے کا موقع بھی نہیں ملا۔ اس کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں اور ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

اسپتال سے سلیم کی چھٹی ایک ہفتے بعد ہوئی تھی۔ چار

دن وہ سرجیکل وارڈ میں رہا تھا۔ تقدیر نے نیا موڑ کاٹا تھا۔ اس نے جان لیوا داؤ کھیلا تھا۔ لیکن اسی داؤ نے اس کے اہم ترین خوابوں کی تعبیر اس کی جھولی میں ڈال دی تھی۔

نازک اندام سلمیٰ سات دن تک اسپتال میں اس کے ساتھ تھی۔ اس دوران میں جبار تین مرتبہ مختصر وقت کے لیے آیا تھا۔ سلیم کو لگا کہ وہ ایک رنگین خواب دیکھ رہا ہے۔ اس پر تو جیسے شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری تھی۔ ادھر سلمیٰ کی مسرت بھی چھپائے نہیں چھپتی تھی۔ سلمیٰ کی متواتر موجودگی نے اسے سب کچھ سمجھا دیا تھا۔ باقی احوال اخبارات اور خود سلمیٰ کی زبانی اسے پتا چلتا رہا۔

پولیس فورس میں تقرری کا پروانہ اسے اسپتال میں ہی پہنچا دیا گیا تھا۔ جبار کا رویہ یکسر بدل چکا تھا۔ سلیم نے سلمیٰ کی وساطت سے اخبارات میں جبار احمد کے ساتھ اپنی تصویر بھی دیکھی تھی اور ''شمس انڈے'' کی بھی۔ اسے خیال آیا کہ انڈا زندہ ہاتھ آجاتا تو کیا بات تھی۔ پھر اپنی زندگی کا خیال آتے ہی، انڈے کا دھیان اس کے ذہن سے نکل گیا۔

سلمیٰ کے چہرے پر شفق کے رنگوں نے جیسے ڈیرے ڈال لیے تھے۔ چار دھماکوں کا معما بھی حل ہوگیا۔ اسے سمجھ آگیا کہ وہ اس روز اتنی تیزی سے ہوش وحواس سے بیگانہ کیوں ہوا تھا۔ درحقیقت اسے دو گولیاں لگی تھیں۔ ایک ''انڈے'' کی اور دوسری سسرجی کی... تیسری گولی نے انڈا توڑ ڈالا تھا اور چوتھا دھماکا گاڑیوں کے تصادم کا تھا۔

تاہم سلیم سمجھ نہ سکا کہ سسرجی وہاں کیونکر پہنچے۔ سلمیٰ کی زبانی اسے جو معلوم ہوا، اس کے مطابق جبار احمد نے گاڑی اور شمس انڈے دونوں کو دیکھ لیا تھا اور فی الفور ایک مسافر کی بائک ہتھیا کر تعاقب میں لگ گئے تھے۔

صورتِ حال کی نزاکت کا تجربہ کار جبار کو پورا اندازہ تھا۔ بدنام زمانہ انڈا ہتھیار بدست تھا اور سلیم نہتا۔ جبار کسی قسم کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ یہ بھی اتفاق ہی رہا کہ جب جبار نے شمس انڈے کا ناریل توڑنے کی تیاری مکمل کی، عین اسی وقت سلیم نے اپنے خطرناک منصوبے کو عملی شکل دے دی۔

پہلے ''انڈے'' کی گولی چلی جو باہر گرتے ہوئے سلیم کی ران میں گھس گئی۔ وہ پوری طرح سلیم کی طرف متوجہ تھا جب جبار نے پے در پے دو فائر کیے۔

سلیم کی ناگہانی حرکت کے باعث، جبار کی پہلی گولی ''انڈے'' کے بجائے سلیم کی کنپٹی چھیلتی گزر گئی اور قریبی کھمبے سے اچٹ کر ایک رکشے والے کے شانے میں گھس گئی۔ وہاں ٹریفک گھنٹے بھر سے زیادہ معطل رہا۔ رکشے والا اسی اسپتال میں طبی امداد کے بعد سلیم سے پہلے فارغ ہو چکا تھا۔

قبل اس کے کہ انڈا اپنی درندگی کا رخ جبار کی جانب موڑتا، جبار کی دوسری گولی نے اس کی کھوپڑی کھول دی۔

☆☆☆

چہ بوالعجبی است... سلیم اسپتال سے جبار احمد کے گھر منتقل ہوا تھا۔

آج پہلی بار نشست گاہ میں اس کی گفتگو سسرجی سے ہو رہی تھی۔ سلیم کے نزدیک وہ اب پکے سسرجی تھے لہٰذا وہ ان کی گولی کھا کر بھی مؤدب تھا۔ سلمیٰ اندرونی کمرے میں تھی۔

''برخوردار۔'' جبار احمد نے پُروقار انداز میں لب کشائی کی۔ ''سب سے پہلے میں تمہارا شکریہ ادا کروں گا کہ تم نے موجودہ بدتر حالات میں نہ صرف پولیس کی ساکھ بحال کرنے میں اپنا کردار ادا کیا بلکہ میری وردی کو بھی داغ دار ہونے سے بچا لیا۔'' انہوں نے کھلے دل سے اعتراف کیا۔

''حسنِ ظن ہے جناب کا۔ ورنہ میں تو تقریباً عالم بالا کا اپائنٹمنٹ لیٹر پکڑ چکا تھا۔'' سلیم دھیرے سے مسکرایا۔

''تمہارے بارے میں، میری رائے شروع سے غلط رہی۔ مستقبل میں تم بہت نام کماؤ گے۔'' جبار احمد نے مژدہ سنایا۔ ''ویسے تم ہو خطرناک لڑکے۔ اب کیا پروگرام ہے؟''

جبار احمد کا لہجہ ذو معنی ہوگیا۔

''جی... ی... ی؟'' سلیم چونکا پھر رک کر بولا۔ ''سر! پروگرام تو آپ بتائیں گے۔''

''بڑی سعادت مندی کا مظاہرہ کر رہے ہو۔'' جبار احمد بھی مسکرانے لگے۔

''سر! ایک بات معلوم کرنی تھی۔'' سلیم نے کہا۔

''اب کیا بات رہ گئی ہے؟''

''میں اب تک نہیں سمجھ سکا کہ آپ وہاں کیسے وارد ہوئے۔ میں یہی سمجھ رہا تھا کہ آپ ہمیں دیکھنے میں ناکام رہے ہیں بلکہ...''

معاً اسے طرح دار طالبہ کا خیال آگیا تھا۔ اس نے زبان روکنے میں دیر نہیں لگائی۔

''سلمیٰ!'' جبار نے بیٹی کو آواز لگائی اور کھڑے ہو گئے۔ ''تم دن میں بھی ہیڈلیمپ روشن کر کے گاڑی چلاتے ہو۔'' جبار احمد کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ ''باز آجاؤ۔'' انہوں نے قدم اٹھایا۔ سلیم نے بمشکل اپنی ہنسی روکی۔

سلیم کو اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا۔ اسی وقت نشست گاہ میں خوشبو کا جھونکا در آیا۔

برخود غلط

کاشف زبیر

حسن کو وبال جان کہا جاتا ہے تو کچھ غلط نہیں کہا جاتا... کبھی کبھی حسن و خوب صورتی کا خراج بڑے دردناک انداز میں ادا کرنا پڑتا ہے... ایک نازک اندام... پری چہرہ... خوش جمال کا قصہ... کرسمس کی خوشیوں بھری رات اس کے لیے جان لیوا گھڑیوں میں بدل گئیں...

جنون و دیوانگی کی حدوں میں داخل ہو جانے والے دشمن کی ایذا پسندی کا مشغلہ...

وہ اسے اسکرین پر دیکھ رہا تھا۔ یہ لفٹ میں لگے کیمرے کی وڈیو تھی جو اس کی اسکرین پر آرہی تھی۔ وہ بہت حسین اور دلکش عورت تھی۔ کسی قدر فٹنگ کے اسکرٹ اور بلاؤز میں اس کا سراپا نمایاں تھا۔ سنہری بال، سنہری رنگت اور نازک نقوش کے ساتھ نیلی آنکھیں اس کے حسن کو مکمل کر رہی تھیں۔ اس کی عمر تیس بتیس سے زیادہ نہیں تھی۔ اس نے سنا تھا کہ یہ وہ عمر ہوتی ہے جب عورت کا حسن عروج پر ہوتا ہے۔ اسے دیکھ کر اسے اس بات کا یقین آگیا تھا۔

اس نے لرزتا ہاتھ آگے بڑھا کر اسکرین کو چھولیا۔ اسے لگا جیسے اس نے سچ مچ اسے چھولیا ہو۔ وہ کانپ اٹھا۔

☆☆☆

باربرا کارٹر جو دفتر میں باربی کہلاتی تھی اور بعض بے تکلف افراد اسے باربی ڈول بھی کہتے تھے۔ کیونکہ وہ سچ مچ گڑیا جیسی لگتی تھی۔ باربی ہیڈ فون مائک لگائے آنے والی کالز کا جواب دے رہی تھی۔ وہ میٹ انشورنس کی ہیلپ لائن آپریٹر تھی۔ وہ انکوائری کے لیے آنے والی کالز کا جواب دیتی تھی۔ اس کی ڈیوٹی عام طور سے شام چھ بجے آف ہو جاتی لیکن آج اسے دفتر میں آٹھ بج گئے تھے۔ چھ بجتے ہی دفتر کے باقی لوگ جا چکے تھے کیونکہ آج چوبیس دسمبر تھی اور آج سے چار دن کے لیے تمام دفاتر بند ہو جاتے۔ سات بجے پورے فلور پر سناٹا ہو گیا۔ سات بجے جانے والا آخری فرد میش تھا۔ وہ باربی کے ساتھ والے کمرے میں ہوتا تھا۔ میش خوش شکل اور ہنس مکھ نوجوان تھا۔ وہ دو سال پہلے یہاں آیا تھا اور آتے ہی باربی پر عاشق ہو گیا تھا مگر جلد یہ جان کر اس کے جذبوں پر اوس پڑ گئی کہ باربی کا ایک عدد بوائے فرینڈ موجود ہے اور وہ جب شادی کرتی، اسی سے کرتی۔ میش نے اس سے پوچھا۔

”تم کہیں مدعو نہیں کرسمس پر؟“

”مجھے اپنی بہن کے گھر جانا ہے۔“ باربی نے جواب دیا۔ ”وہاں میرا پورا خاندان مدعو ہے۔ سال میں ایک بار ہم کرسمس کے موقع پر ملتے ہیں۔“

”نیویارک جانا ہے؟“

”نہیں... مجھے فلاڈلفیا جانا ہے۔ میں یہاں سے ہائی وے پچانوے پکڑوں گی اور دو گھنٹے بعد اپنی بہن کے گھر ہوں گی۔“

”تو بس نکل جاؤ... جنوب میں موسم مزید خراب ہو رہا ہے اور طوفان کی پیش گوئی ہے۔“ میش نے باہر کا رخ کرتے ہوئے کہا۔

”میں آٹھ بجے نکلوں گی۔“ باربی نے جواب دیا۔ ”مجھے گھر نہیں جانا ہے، میں براہ راست فلاڈلفیا جاؤں گی۔“

باربی کی رہائش نیویارک کے علاقے بکس والا میں تھی اور اس کا دفتر بروکلین میں تھا۔ ریکس ٹاور کی تیس منزلہ عمارت پوری کی پوری دفاتر پر مشتمل تھی۔ اگرچہ وہ کرسمس ڈنر کے لیے لیٹ ہو جاتی مگر اسے امید تھی کہ وہ کرسمس پارٹی میں شریک ہو سکے گی۔ میش کے جانے کے بعد باربی کالز لینے لگی۔ بعض لوگ ویٹنگ پر تھے اور وہ انہیں نمٹا کر جانا چاہتی تھی۔ آخری کال اس نے سات بج کر پچپن منٹ پر لی اور مزید کالز کے لیے سسٹم کو ڈی ایکٹی ویٹ کر دیا۔ اس کال سے نمٹ کر اس نے اپنا اوور کوٹ پہنا اور بیگ سنبھالتی ہوئی کمرے سے باہر آئی تھی کہ اچانک کوئی سامنے سے آیا اور اس کی چیخ نکل گئی۔ پھر باربی نے آنے والے کو دیکھا اور سکون کا سانس لیا۔ وہ مورگن تھا۔ اس عمارت کا منیجر اور نگران۔ وہ مچی ہوئی آنکھوں والا ادھیڑ عمر شخص تھا۔ باربی کو اس کے دیکھنے کے انداز سے الجھن ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اسے نظروں سے ٹٹول رہا ہے مگر وہ اسے ناپسند نہیں کرتی تھی۔ باربی نے رکا ہوا سانس بحال کرتے ہوئے کہا۔

”تم نے تو مجھے ڈرا دیا۔“

”سوری باربی۔“ وہ بولا۔ ”میں نے سوچا نہیں تھا کہ تم یہاں ہو گی۔ میں عمارت کو شٹ ڈاؤن کرنے سے پہلے آخری راؤنڈ لے رہا ہوں کہ کوئی رہ تو نہیں گیا ہے۔“

”بس شاید میں ہی ہوں۔“

”نہیں، نیچے ایک جاپانی جوڑا بھی ہے۔ ان کا اپنا دفتر ہے۔ کیا تم جا رہی ہو؟“

”ہاں میں نکلوں گی۔ مجھے پارکنگ تک جانا ہے، آخری فلور پر۔“

وہ باہر آئے تو مورگن نے اس حصے کو لاک کیا۔ وہ لفٹ میں آگئے۔ باربی کا دفتر چوبیسویں فلور پر تھا۔ عمارت کے تین زیر زمین فلور پارکنگ کے لیے مخصوص تھے اور گراؤنڈ کے بعد اس کے انتیس فلور اور تھے۔ بیسویں فلور پر لفٹ رکی اور جاپانی جوڑا اس میں داخل ہوا۔ وہ اس وقت لڑ رہے تھے۔ انہوں نے جھک کر باربی اور مورگن کو تعظیم دی اور پھر آپس میں جھگڑنے میں مصروف ہو گئے۔ لابی میں لفٹ رکی تو مورگن اور جاپانی جوڑا باربی کو ہیپی کرسمس کہتا ہوا وہیں اتر گئے۔ جاپانی جوڑا شاید لابی سے باہر جاتا۔ ان کے اترنے کے بعد باربی پارکنگ میں اتری۔ اس کے اترتے ہی لفٹ کا دروازہ بند ہوا اور اس کے اوپر روشن پینل بند ہو گیا۔ مورگن نے لفٹ بند کر دی تھی۔ اب کسی نے اوپر جانا یا نیچے آنا ہوتا تو اسے سیڑھیوں کا سہارا لینا پڑتا۔ مگر عمارت خالی ہو چکی تھی اس لیے سیڑھی استعمال کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

وہ کار کی طرف بڑھی۔ اس کے پاس پانچ سال پرانی شیورلیٹ تھی مگر تقریباً نئی جیسی حالت میں تھی۔ باربی نے اسے بہت سنبھال کر رکھا تھا۔ وہ اندر آئی، بیگ برابر میں رکھ کر اس نے کار اسٹارٹ کرنے کے لیے سیلف گھمایا مگر ہلکی

سی گھرگھراہٹ ہوئی اور انجن نے اسٹارٹ ہونے سے انکار کر دیا۔ اس نے دوبارہ کوشش کی اور پھر کوشش کرتی چلی گئی۔ ابتدا میں تو ہلکی سی گھرگھراہٹ بھی ہوئی تھی لیکن بعد میں وہ بھی بند ہو گئی اور اب انجن بالکل خاموش تھا۔ باربی پریشان ہو گئی۔ کار نے بہت غلط وقت پر دغا دیا تھا۔ پندرہ منٹ بعد وہ تھک ہار کر نیچے اتر آئی۔ اسی لمحے اس کے موبائل نے بیل دی۔ یہ کارل تھا، اس کا بوائے فرینڈ۔ وہ کرسمس منانے میساچوسٹس گیا ہوا تھا جہاں اس کے باپ کا فارم ہاؤس تھا۔ اس کا سارا خاندان وہاں جمع ہوتا۔ یہ جگہ یہاں سے کئی سو میل کے فاصلے پر تھی اس لیے کارل گزشتہ روز ہی چلا گیا تھا۔ باربی نے کال ریسیو کی۔ ”ہیلو۔“

”باربی! تم راستے میں ہو؟“ کارل نے پوچھا۔

”نہیں، میں ابھی دفتر کی عمارت میں ہوں۔ یہاں میری کار مسئلہ کر گئی ہے، اسٹارٹ ہی نہیں ہو رہی ہے۔“

”اوہ، یہ تو مسئلہ ہو جائے گا۔ تم فوری کیب کو کال کرو۔ ممکن ہے وہ بھی سروس بند کر دیں۔ کرسمس پر تو سب ہی چھٹی کرتے ہیں۔“

”میں کال کرتی ہوں، تم پہنچ گئے؟“

”ہاں، میں کچھ دیر پہلے گھر پہنچا ہوں۔ راستے میں موسم بہت خراب تھا۔ اور ہاں، مام نے مجھے وارننگ دے دی ہے۔ اگلی بار میں کرسمس پر اکیلا نہیں آؤں گا بلکہ اپنی بیوی کے ساتھ آؤں گا۔“

باربی دل سے ہنسی۔ ”تو مام کی خواہش پوری کر دو نا۔“

”کیسے کر دوں... میری ہونے والی بیوی مانتی کہاں ہے؟“

”ڈھنگ سے منواؤ گے تو مان بھی جائے گی۔“ باربی نے شوخی سے کہا۔

”بس تو واپس آتے ہی ڈھنگ سے منواتا ہوں۔“

”اوکے بائے... مجھے اب کیب کو کال کرنی ہے۔“

باربی نے پہلے ہیلپ لائن سے نمبر لیا اور پھر کیب کمپنی کو کال کی۔ وہاں سے اسے بتایا گیا کہ سروس بند ہونے والی ہے مگر باربی نے اپنی مجبوری بتائی اور درخواست کی کہ اسے لازمی جانا ہے تو آپریٹر نے کیب بھیجنے کی ہامی بھر لی۔ باربی نے سکون کا سانس لیا۔ تاخیر سے سہی لیکن وہ آج کی رات اپنی بہن کے گھر پہنچ ہی جاتی۔ موبائل پر بات کرتے ہوئے اس نے کار کی ڈکی سے وہ شاپرز نکالے جن میں اس کے گھر والوں کے لیے کرسمس کے تحفے تھے۔ اس نے ساری شاپنگ دو دن پہلے کر لی تھی۔ آج سے ساری مارکیٹس بھی بند ہو چکی تھیں۔ ان سارے شاپرز کو لیے وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر لابی کی طرف جانے والے راستے تک آئی مگر دروازہ بند تھا۔ اس نے ہینڈل گھمایا۔ دروازہ نہیں کھلا۔ باربی نے شاپرز نیچے رکھ کر پھر کوشش کی اور اس بار بھی ناکام رہی۔ دروازہ لاک تھا۔ اس نے سر پر ہاتھ مارا۔ اب اسے پارکنگ سیکیورٹی آفیسر کے پاس جانا تھا، وہی اس دروازے کو کھول سکتا تھا۔ اس نے شاپرز وہیں چھوڑے اور سیڑھیوں سے نیچے آئی۔

سیکیورٹی آفیسر کا دفتر آخری فلور پر اس کی کار سے کچھ ہی دور تھا۔ اس کے چاروں طرف شیشے لگے ہوئے تھے۔ ایک طرف شیشے کا ہی دروازہ تھا۔ اس نے دروازہ بجایا لیکن جب کوئی جواب نہیں آیا تو اس نے دروازہ دھکیلا اور اندر آئی۔ یہاں ہر طرف سامان تھا۔ ایک طرف مانیٹرز لگے تھے جن پر پارکنگ کے مختلف حصوں میں لگے کیمروں کی ویڈیو آ رہی تھی۔ کرسمس کی مناسبت سے غبارے اور آرائشی اشیا سے کمرے کی چیزیں سجی ہوئی تھیں۔ مگر اسے سیکیورٹی آفیسر نظر نہیں آیا۔ وہ ذرا آگے آئی تھی کہ ایک سیاہ شے میز کی سائیڈ سے جھپٹی اور کتے کے بھونکنے کی بھیانک آواز آئی۔ باربی نے چیخ ماری اور اچھل کر پیچھے ہوئی۔ کتا اس سے فٹ بھر کے فاصلے پر رکا تھا کیونکہ اس کی زنجیر کی حد اتنی تھی۔ اگر وہ ایک فٹ اور آگے ہوتی تو کتا اسے کاٹ سکتا تھا۔ اب وہ زور و شور سے بھونک رہا تھا۔ اسی لمحے باتھ روم سے سیکیورٹی آفیسر نکلا۔ وہ جوان اور خوش شکل تھا۔ اس نے کتے کو ڈانٹا تو کتا دم دبا کر واپس اپنی جگہ پر چلا گیا۔ آدمی نے اس سے معذرت کی۔

”سوری... اس نے تمہیں پریشان کیا۔ ویسے گورک بہت فرینڈلی کتا ہے۔“

باربی کہتے کہتے رک گئی کہ کتے نے اس پر حملہ کیا تھا۔ اس نے کہا۔ ”میں معافی چاہتی ہوں لیکن میری کار اسٹارٹ نہیں ہو رہی ہے اور اب مجھے لابی میں جانا ہے۔“

”لابی میں جانا ہے۔“ آدمی نے دہرایا۔ ”کار کیوں نہیں اسٹارٹ ہو رہی؟“

”پتا نہیں۔“

”کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں؟“ اس نے پیشکش کی۔ ”میں تھوڑا بہت جانتا ہوں۔“

”نہیں شکریہ... میں نے کیب منگوالی ہے۔ پلیز تم چل کر لابی کی طرف جانے والا دروازہ کھول دو۔“

''اوہ ہاں، کیوں نہیں۔'' اس نے کہا پھر اس نے کرسمس سجاوٹ کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ سب میں نے کیا ہے۔ میں آج یہاں اکیلا ہوں۔ کیا خیال ہے اگر تم میرے ساتھ کرسمس ڈنر کرو؟''

باربی حیران ہوئی۔ ''ایکسکیوز می؟''

''اوہ، میں مذاق کر رہا تھا۔'' آدمی مسکرایا۔ ''آؤ میرے ساتھ۔''

باربی اس کے ساتھ اوپر آئی۔ راستے میں اس نے اپنا تعارف کرایا۔ ''میں پارکنگ سیکیورٹی آفیسر مائیکل کیرن ہوں۔''

اس نے اپنا پنچ کارڈ لگا کر دروازہ کھولا تو باربی نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے شاپرز اٹھانے میں اس کی مدد کی اور پھر وہ لابی کی طرف نکل آئی۔ مائیکل نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ ''ہیپی کرسمس۔''

''ہیپی کرسمس۔'' باربی نے جواب دیا تو وہ مسکراتا ہوا واپس چلا گیا۔ باربی ابھی لابی کی طرف جا رہی تھی کہ اس کے موبائل نے بیل دی۔ اس نے دیکھا اجنبی نمبر تھا۔ اس نے کال ریسیو کر لی۔ دوسری طرف سے ایک مردانہ آواز نے کہا۔

''میڈم باربرا کارٹر؟ میں کیب ڈرائیور ہوں اور عمارت کے سامنے موجود ہوں۔''

لابی میں آتے ہوئے باربی نے اسے دیکھ لیا اور بولی۔ ''میں آ رہی ہوں۔''

لیکن جب اس نے باہر جانے والا دروازہ کھولنا چاہا تو وہ لاک نکلا۔ ''نہیں... نہیں۔'' اس نے کہا اور پھر اشارے سے کیب ڈرائیور کو بتایا کہ دروازہ لاک ہے، وہ اسے کھلوا کر آ رہی ہے۔ مورگن کو لابی میں ریسپشن پر ہونا چاہیے تھا۔ عام اوقات میں یہاں کوئی اور ہوتا مگر اس وقت سب جا چکے تھے اور مورگن رہ گیا تھا۔ وہ ریسپشن پر آئی۔ یہاں اس کی سیٹ خالی تھی۔ سامنے دائرے میں درجن بھر مانیٹرز اور کنٹرول سسٹم تھا جس کی مدد سے مورگن اس عمارت کی تمام چیزوں کو کنٹرول کرتا تھا۔ ان میں لائٹس اور لفٹس بھی شامل تھیں۔ یہیں سے دروازے لاک اور ان لاک کیے جاتے تھے۔ مورگن کو وہاں موجود نہ پا کر باربی نے کمپیوٹر سسٹم پر دیکھا اور لابی کی مین انٹرنس کو ان لاک کیا اور پھر دروازے کی طرف آئی مگر وہ اب بھی لاک تھا۔ پتا نہیں کیا مسئلہ تھا اور شاید مورگن ہی اسے کھول سکتا تھا مگر وہ خود غائب تھا۔ باربی نے ناکامی کے بعد کیب ڈرائیور کو کال کی۔

''پلیز تم کچھ دیر رکو۔ میں نیچے جا کر پارکنگ کے راستے سے باہر آتی ہوں۔''

''سوری میڈم! میں اتنا انتظار نہیں کر سکتا۔ ویسے بھی میں آف ہونے والا ہوں۔''

''میری بات سنو...'' باربی چلائی مگر ڈرائیور نے کال کاٹ دی اور پھر باربی نے دیکھا کیب وہاں سے جا رہی تھی۔ اس نے عجلت میں کیب آپریٹر کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی مگر وہ کال اٹھا نہیں رہا تھا۔ ایک بار بیل بج بج کر بند ہوئی تو اس نے دوبارہ نمبر ملایا۔ اس بار بھی ناکامی کے بعد اس نے موبائل فون پٹخ دیا۔ ''لعنت ہو۔''

وہ وہیں لابی میں ماربل کی بنی بنچ پر بیٹھ گئی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کی کرسمس کی رات غارت ہونے والی ہے۔ گاڑی خراب تھی اور کیب سروس بھی بند ہو چکی تھی۔ پھر اسے خیال آیا کہ بس سروس تو چل رہی ہوگی۔ وہ اس کی مدد سے بھی فلاڈلفیا جا سکتی تھی لیکن پہلا مرحلہ تو یہاں سے نکلنے کا تھا۔ وہ مورگن کا انتظار کر رہی تھی۔ وہی آ کر انٹرنس کا دروازہ کھول سکتا تھا۔ باربی نے تھک کر دیوار سے سر ٹکا لیا۔ عمارت کا سینٹرلی ہیٹنگ سسٹم بند ہو گیا تھا۔ اس لیے اندر کسی قدر سردی ہو گئی تھی۔ مگر باہر سے پھر بھی یہ بہت بہتر تھا کیونکہ باہر درجۂ حرارت منفی میں تھا۔ سڑک پر برف کے ڈھیر جمع تھے۔ باربی نے اوور کوٹ اپنے گرد لپیٹ لیا۔ اسے بھوک لگ رہی تھی۔ دیوار سے سر ٹکائے نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ پھر وہ چونکی۔ اس نے گھبرا کر آس پاس دیکھا مگر لابی بدستور خالی تھی۔ اس کی نظر وال کلاک پر گئی جس میں بارہ بجنے میں بیس منٹ باقی تھے۔ وہ ڈھائی گھنٹے سے یہاں بیٹھی تھی۔ اسے حیرت ہوئی کہ مورگن اب تک کیوں نہیں آیا تھا اور اگر آیا تھا تو اس نے اسے جگایا کیوں نہیں؟ اس کی کرسمس کی رات برباد ہو گئی تھی۔ اب وہ کسی صورت آج رات اپنی بہن کے گھر نہیں پہنچ سکتی تھی۔

وہ اٹھ کر ریسپشن تک آئی۔ اس کی تمام اسکرینیں آن تھیں۔ ان پر مختلف جگہوں کی ویڈیو دکھائی جا رہی تھی۔ باربی سوچنے لگی کہ وہ اب کیا کرے؟ ایسا لگ رہا تھا کہ مورگن کہیں آرام کر رہا تھا کیونکہ اب کرنے کو کچھ نہیں تھا۔ پوری عمارت اور اس کی چیزیں بند کی جا چکی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ صبح سے پہلے یہاں نہیں آتا۔ باربی صبح تک کا انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ اب اس کے پاس ایک ہی راستہ تھا کہ وہ نیچے جائے اور مائیکل سے پارکنگ کا راستہ کھلوائے۔ لیکن وہ نیچے کیسے جاتی؟ لابی میں کھلنے والا

سیڑھیوں کا راستہ بھی بند تھا اور اسے اندر سے مائیکل ہی کھول سکتا تھا۔ اچانک اسے لفٹس کا خیال آیا۔ اس کی مدد سے وہ نیچے جا سکتی تھی۔ اس نے کنٹرول پینل کا جائزہ لیا اور جلد اسے لفٹس کو آن آف کرنے کا سسٹم سمجھ میں آ گیا۔ اس نے لفٹ نمبر چار کو آن کیا اور پھر لفٹس کی طرف آ کر دیکھا۔ نمبر چار کے اوپر لگی روشنی جل اٹھی تھی۔ باربی نے اپنے شاپرز سنبھالے اور لفٹ میں آئی۔ اس نے پارکنگ کا بٹن دبایا تو لفٹ نیچے پہنچ گئی۔ وہ باہر آئی اور مائیکل کے دفتر کی طرف بڑھی۔

اس بار اس نے اندر جانے کے بجائے دروازے سے مائیکل کو آواز دی مگر اس کی طرف سے جواب نہیں آیا۔ ہاں، اس کے کتے نے بھونکنا شروع کر دیا تھا۔ باربی نے کچھ دیر انتظار کیا۔ اچانک پارکنگ میں ایک لائٹ بند ہوئی پھر دوسری اور پھر تیسری لائٹ بھی بند ہو گئی۔ وہ خوفزدہ ہو گئی۔ اس نے جلدی سے آ کر اپنی گاڑی کا دروازہ کھولا اور شاپرز سمیت اس میں گھس گئی۔ یہاں سردی زیادہ تھی مگر اس کی کپکپاہٹ کی وجہ کچھ اور تھی۔ اسے ڈر لگ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پارکنگ کی بیشتر روشنیاں بند ہو چکی تھیں اور اب چند ایک لائٹس ہی آن تھیں مگر اس کے بڑے حصے پر تاریکی کا راج تھا۔ باربی سوچ رہی تھی کہ وہ کیا کرے؟ اب یہاں سے کیسے نکلے؟ وہ ہمت کر کے کار سے باہر آئی اور اس نے چند قدم بڑھائے تھے کہ اچانک ایک ہاتھ آ کر اس کے منہ پر جم گیا۔ اس میں موجود کپڑے سے اٹھتی کلوروفارم کی تیز بو براہِ راست باربی کے دماغ پر حملہ آور ہوئی۔ اس نے مزاحمت کرنا چاہی مگر دوسرے ہاتھ نے اسے جکڑ لیا اور جیسے ہی اس نے سانس لیا، اسے ہوش نہیں رہا۔

☆☆☆

باربی کو ہوش آیا تو اس کا سر گھوم رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے من بھر کی کوئی شے اس کے شانوں پر رکھی ہے۔ ساتھ ہی اسے سردی بھی لگ رہی تھی۔ پھر اسے تیز چبھتی بو آئی تو وہ ہوش میں آ گئی۔ مائیکل نے اس کی ناک سے شیشی ہٹائی جس میں امونیا تھا۔ اس کی تیز بو اسے ہوش میں لے آئی تھی۔ باربی ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور سب سے پہلے اس کی نظر اپنے لباس پر گئی۔ اس کے جسم پر ہلکے گلابی رنگ کا فراک تھا۔ شانے پر دو ڈوریوں کے سہارے یہ اس کے جسم سے لٹکا ہوا تھا اور اس کا گریبان کچھ زیادہ ہی کشادہ تھا۔ نیچے یہ بہ مشکل اس کی نصف رانوں تک پہنچ رہا تھا۔ لباس سنسنی خیز تھا مگر سچویشن ایسی نہیں تھی کہ وہ اس کے بارے میں سوچتی۔ اس نے سر اٹھایا۔ سامنے مائیکل بیٹھا ہوا تھا۔ وہ مسکرایا اور بولا۔

''ہیپی کرسمس۔''

باربی نے اٹھنا چاہا تو اس کے ہاتھوں اور ایک پیر میں بندھی زنجیر جھنجھنائی۔ یہ زنجیریں میز کے پائے سے بندھی تھیں اور پائے فرش میں نصب تھے۔ یہ میز دھات کی بنی ہوئی اور بہت مضبوط تھی۔ باربی نے کسمسا کر کہا۔ ''یہ کیا ہے؟''

''کرسمس ڈنر۔'' اس نے سادگی سے سامنے رکھے ڈنر کی طرف اشارہ کیا۔ اس میں سوپ اور سلاد تھا۔ چاپ تھے اور اس کے ساتھ شیمپین کی بوتل تھی۔ مائیکل اٹھا۔ ''اوہ، سب سے اہم چیز...'' وہ ایک طرف رکھے اوون تک گیا اور اسے کھول کر اندر سے بیک ہو جانے والا کیک نکال کر میز پر رکھا۔ پھر اس پر چاکلیٹ اور کریم کی ٹیوب سے ڈریسنگ کی۔ ''یہ میں نے خود بنایا ہے۔'' اس کے لہجے میں فخر تھا۔ ''تم کھاؤ گی تو میری کوکنگ کی قائل ہو جاؤ گی۔''

''میں پوچھ رہی ہوں یہ سب کیا ہے؟'' باربی تیز لہجے میں بولی۔ ''تم نے مجھے کیوں باندھا ہے اور میرا لباس...''

''آرام سے ڈیئر... آرام سے۔'' مائیکل نے نرم لہجے میں کہا۔ ''تم جذباتی ہو رہی ہو... یہ صرف کرسمس ڈنر ہے۔ کیا تمہاری تیاری میں کوئی کمی ہے؟''

اس نے لا کر اسے آئینہ دکھایا۔ باربی نے خود کو دیکھا۔ اس کا میک اپ بھی ہوا تھا مگر بھدے پن سے۔ اس کی لپ اسٹک اور آنکھوں کا مسکارا پھیل رہا تھا۔ اس نے آئینہ واپس رکھ دیا اور فخر سے بولا۔ ''یہ سب میں نے کیا ہے۔''

''مگر کیوں؟'' اس بار باربی چلا اٹھی۔

''اپنے ساتھ ڈنر کے لیے۔'' وہ بدستور نرم لہجے میں بول رہا تھا۔ ''میرا مقصد تمہیں نقصان پہنچانا نہیں ہے۔''

باربی گہرے سانس لے کر خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ اسے احساس تھا کہ وہ ایک ایسی مشکل میں پھنس گئی ہے جس سے نکلنا آسان نہیں ہوگا۔ وہ مکمل طور پر بے بس اور اس شخص کے رحم و کرم پر تھی جس کے عزائم اس کے لیے اجنبی تھے۔ وہ صرف پُرسکون رہ کر اور حکمتِ عملی سے اس مشکل سے نکل سکتی تھی۔ چند منٹ بعد وہ خود کو پُرسکون محسوس کرنے لگی۔ اس نے مائیکل کی طرف دیکھا۔ ''تو تم نے صرف میرے ساتھ ڈنر کرنے کے لیے یہ سب کیا ہے؟''

''بالکل۔'' وہ خوش ہو گیا۔ ''میرا مقصد تمہیں نقصان

پہنچانا نہیں ہے۔ یقین کرو میں کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔"

باربی نے سر ہلایا۔ "جب ہم ڈنر کرلیں گے تو تم مجھے آزاد کردو گے؟"

"بالکل۔" اس نے پھر کہا۔ "اگر تم مجھ سے اتفاق کروگی تو میں تمہیں آزاد کردوں گا۔"

"اتفاق؟" باربی نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"میں جو کررہا ہوں اس سے اتفاق۔" مائیکل نے کہا اور میز کی طرف اشارہ کیا۔ "میرا خیال ہے ڈنر شروع کیا جائے ورنہ یہ ٹھنڈا ہوجائے گا۔"

اس نے چاپ اور سلاد باربی کی پلیٹ میں نکالی۔ پھر اپنے لیے نکالی۔ اس کے بعد اس نے دو گلاسوں میں شیمپین ڈالی۔ پھر چھری کانٹا اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ باربی نے بھی چھری کانٹا اٹھالیا۔ اصولاً اس وقت اسے اچھی خاصی بھوک ہونی چاہیے تھی مگر ایسی صورتِ حال میں کسے بھوک لگ سکتی ہے۔ اس کا ذرا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے مجبوراً چاقو سے گوشت کا ٹکڑا کاٹا اور اسے منہ میں ڈال کر چبانے لگی۔ بہ مشکل اسے حلق سے اتار کر اس نے چھری کانٹا رکھ دیا۔ "مجھ سے نہیں کھایا جارہا۔"

مائیکل نے اصرار نہیں کیا۔ "اوکے، تم شیمپین ٹرائی کرو... ایک نمبر ہے۔"

باربی نے جام ایک ہی سانس میں خالی کردیا۔ ایک لمحے کو اس کا سر چکرایا۔ مائیکل نے بھی چھری کانٹا رکھ دیا تھا۔ وہ اٹھ کر اس کے پاس آیا اور ذرا جھک کر بولا۔ "تم بہت خوب صورت ہو۔"

باربی خوفزدہ ہوگئی۔ وہ اس کے شانے پر، گردن پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ "تم کسی مجسمے کی طرح حسین ہو... لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لوگ تمہارے ساتھ اکیلے میں بے قابو ہوجائیں۔"

باربی چونکی۔ "کیا مطلب؟"

"بتاتا ہوں۔" مائیکل نے کہا اور ایک ڈبے سے ایک ویڈیو کیسٹ نکال کر وی سی آر میں لگائی اور پلے کا بٹن دبا دیا۔ اسکرین پر لفٹ کا منظر نمودار ہوا۔ مائیکل نے اشارہ کیا۔ "تم نے پہچان لیا ہوگا، یہ اسی عمارت کی لفٹ نمبر سات ہے۔" اس نے ویڈیو کو فاسٹ فارورڈ کیا اور پھر ایک جگہ روک دیا۔ چند لمحے بعد لفٹ میں باربی اور اس کے آفس کولیگ جیمس جارڈ داخل ہوئے۔ جیمس کسی قدر طویل قامت اور پینتیس برس کا آدمی تھا۔ اس کے بال سامنے سے اڑ رہے تھے اور قبل از وقت کھچڑی ہوچکے تھے۔ باربی دیکھ رہی تھی، اچانک جیمس نے اسے پکڑلیا اور اسے چومنے کی کوشش کرنے لگا۔ باربی مزاحمت کررہی تھی۔ بہ مشکل باربی نے اسے پیچھا دھکیلا اور خود کو چھڑایا۔ اس دوران میں لفٹ رک گئی۔ باربی فوراً باہر نکل گئی اور اس کے پیچھے جیمس بھی نکل گیا۔ اسکرین کی طرف دیکھتے ہوئے باربی کا چہرہ سرخ ہورہا تھا۔ اسے یہ تو معلوم تھا کہ لفٹ کے کیمرے اسکرین پر منظر دکھاتے ہیں لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ منظر ریکارڈ بھی ہوتے ہیں۔ مائیکل نے اس کی طرف دیکھا۔

"ایسے لوگوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"وہ جیمس گھٹیا آدمی ہے۔"

"کیا ایسے شخص کو سبق سکھانا چاہیے؟"

باربی نے نہ سمجھنے کے انداز میں سر ہلایا۔ "ہاں، ایسے لوگوں کو سبق سکھانا چاہیے۔"

مائیکل خوش ہوگیا۔ "یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ دیکھا تم نے مجھ سے اتفاق کرنا شروع کردیا۔ ایسے لوگوں کو جسمانی سزا دینی چاہیے نا؟"

ایک بار پھر باربی نے سوچے سمجھے بغیر اس کی تائید کی۔ مائیکل وی سی آر کی طرف بڑھا اور اس نے کیسٹ نکالی۔ اس دوران میں باربی نے کانٹا اٹھا کر اپنی ران کے نیچے چھپالیا۔ یہ سخت اسٹیل کا کانٹا تھا اس سے ہتھیار کا کام لیا جاسکتا تھا۔ مائیکل نے کیسٹ واپس اسی ڈبے میں رکھی اور اس کی طرف آیا۔ "میں تمہاری زنجیریں کھول رہا ہوں کیونکہ تم میرے ساتھ اتفاق کررہی ہو۔"

اس نے پہلے باربی کے ہاتھ کھولے پھر جھک کر اس کے پاؤں کی زنجیر میں لگا تالا کھول رہا تھا کہ باربی نے ران کے نیچے سے کانٹا نکال کر اس کی پشت میں اتار دیا۔ مائیکل کے حلق سے چیخ نکلی۔ وہ پیچھے گرا۔ باربی کا پاؤں آزاد ہوگیا تھا۔ وہ اٹھ کر بھاگی لیکن مائیکل نے ہاتھ بڑھا کر اس کا پاؤں پکڑلیا اور وہ منہ کے بل گری۔ اس کا ماتھا فرش سے ٹکرایا اور چند لمحے کے لیے اس کے حواس گم ہوگئے۔ اس سارے ہنگامے میں مائیکل کے کتے نے پھر بھونکنا شروع کردیا تھا۔ جب تک اس کے حواس بحال ہوتے، مائیکل اس کے دونوں ہاتھ جوڑ کر ان میں ہتھکڑی ڈال چکا تھا۔ پھر اس نے بڑی مشکل سے ہاتھ پیچھے لے جا کر اپنی پشت میں گڑا ہوا کانٹا کھینچ کر نکالا۔ اس نے اپنی جیکٹ پہلے ہی اتار دی ہوئی تھی اور نیچے سفید شرٹ تھی۔ اس کی پشت پر خون کا دھبا پھیل رہا تھا۔ باربی کھسک کر پیچھے ہوئی۔ اس کے منہ سے

سسکیاں نکل رہی تھیں۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس حرکت کے جواب میں وہ کیا ردِعمل ظاہر کرے گا۔ مائیکل نے خون آلود کاندھا دیکھا اور اس سے شکایتی لہجے میں پوچھا۔

''تم نے ایسا کیوں کیا؟''

''پلیز، مجھے جانے دو... پلیز... مجھے جانے دو۔''

مائیکل نے اسے اٹھا کر کرسی پر پٹخ دیا اور بولا۔ ''مجھے تم سے ایسی توقع نہیں تھی۔''

''وہ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔''

''وہ کون؟'' مائیکل چونکا۔

''میری بہن، اس کے بچے، میری ماں اور میرا بھائی۔''

''وہ کہاں ہیں؟''

''فلاڈلفیا میں۔''

''فلاڈلفیا میں۔'' مائیکل نے دہرایا۔ ''کیا تم ان سے بات کرنا چاہتی ہو؟''

باربی کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس نے سر ہلایا۔ اسے امید نہیں تھی کہ اس کے اس حملے کے جواب میں مائیکل اتنا مہربان ہوگا۔ وہ تو خوفزدہ تھی کہ وہ اس کے ساتھ نہ جانے کیا کرے۔ مائیکل فون سیٹ اٹھا لایا اور اس نے نمبر ملانے کو کہا۔ باربی نمبر ملانے لگی تو اس نے اسے روکا اور پھر اسپیکر کا بٹن دبا کر اشارہ کیا کہ اب وہ نمبر ڈائل کرے۔ ساتھ ہی اس نے میز سے چاقو اٹھا لیا اور اسے یونہی ہاتھ میں گھمانے لگا۔ باربی نے نمبر ملایا۔ بیل جانے لگی پھر اس کی بہن مارینا نے کال ریسیو کی۔ عقب سے شور کی آواز آ رہی تھی۔ باربی کی آواز سن کر وہ چلّائی۔ ''تم کہاں ہو... تمہارا سیل بھی بند جا رہا ہے... تم اب تک آئی کیوں نہیں؟''

باربی خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ ''میں نہیں آسکی... کار خراب ہوگئی ہے اور کوئی کیب نہیں چل رہی۔''

پھر فون باربی کی ماں نے لے لیا۔ ''میری جان! تم کہاں ہو؟''

''مام! میں گھر پر ہوں۔'' باربی کی آواز بھرّانے لگی۔

''باربرا! تم ٹھیک ہو نا؟''

''ہاں مام! اصل میں مجھے فلو ہو گیا ہے۔''

''اوہ، تب تو تم نے ٹھیک کیا۔ تم آرام کرو میری بچی۔''

''اوکے مام... بائے۔''

''اپنا خیال رکھنا۔'' ماں نے کہا تو مائیکل نے ہاتھ آگے بڑھا کر کریڈل دبا دیا۔ باربی نے ریسیور رکھ دیا۔ اس کے آنسو رخسار پر آ گئے تھے۔ اس نے مائیکل کی طرف دیکھا۔

''اب تم میرے ساتھ کیا کرو گے؟... میں نے تمہیں زخمی کیا ہے۔''

''میں تمہارے ساتھ کیا کروں گا؟'' وہ حیرت سے بولا۔ ''کچھ بھی نہیں کروں گا۔ میں نے بتایا نا میں کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ خاص طور سے کسی عورت کو... میرے ساتھ آؤ۔''

مائیکل نے اپنے زخم کی پروا کیے بغیر اس پر جیکٹ پہن لی۔ پھر اس نے ایک کونے میں رکھا بیس بال کا بلّا اٹھایا۔ آخر میں وہ باربی کا بازو تھام کر اسے باہر لے آیا۔ باربی کے ہاتھ سامنے کر کے بندھے ہوئے تھے۔ ہتھکڑی دھات کی بنی ہوئی تھی۔ مائیکل اسے ایک گریے شیرا ڈ تک لایا اور اس کی فرنٹ سیٹ پر دھکیل کر وہ خود ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔ باربی نے پوچھا۔ ''تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟''

''ڈرائیو پر۔'' مائیکل نے کہا اور کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ باربی کی کار کچھ فاصلے پر کھڑی تھی اور اسے پہلی بار خیال آیا کہ اس کی کار میں خرابی کیسے پیدا ہوئی۔ صبح جب وہ دفتر آئی تو کار بالکل ٹھیک کام کر رہی تھی اور اس نے ذرا بھی مسئلہ نہیں کیا تھا۔ تو کیا یہ اس کی سازش تھی؟ اس نے برابر میں بیٹھے مائیکل کی طرف دیکھا۔ پھر اسے مورگن کا خیال آیا۔ وہ کہاں غائب تھا؟ کیا وہ بھی اس کے ساتھ شامل تھا؟ تبھی اس نے لابی کا انٹرنس بند کر دیا تھا اور اسے لاک بھی کر دیا تھا۔ مائیکل نے کار دوسرے فلور کی طرف موڑ دی۔ وہ اوپر آیا اور کار کو راہداریوں میں گھمانے لگا۔ اس نے باربی کی طرف دیکھا۔ ''تم جیمس کے لیے اپنے الفاظ پر قائم ہو؟''

''ہاں۔''

''گڈ! تب تم اسے سزا دے سکو گی۔''

''کیا مطلب؟'' باربی چونکی۔ اسی لمحے مائیکل نے کار گھمائی تو دور دیوار کے پاس ایک شخص آفس چیئر پر بیٹھا نظر آیا۔ کار اس کے نزدیک پہنچی تو باربی نے اسے پہچان لیا۔ وہ جیمس تھا۔ وہ کرسی پر بندھا بیٹھا تھا۔ چوڑے ٹیپ کی مدد سے اسے پوری طرح کرسی سے جکڑ دیا گیا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں اور جسم سب کرسی سے بندھے تھے۔ اس کا منہ بھی ٹیپ سے بند کر دیا گیا تھا۔ کار کی روشنی دیکھ کر وہ سر ہلانے اور خود کو آزاد کرانے کی کوشش کرنے لگا۔ باربی لرز

اٹھی۔ ''تت... تم نے اسے کیوں باندھا ہے؟''

''تاکہ تم اسے سزا دے سکو... یہ تمہارا ہی نہیں، ہر عورت کا مجرم ہے۔ اسے سزا ملنی چاہیے تاکہ یہ آئندہ کسی عورت سے دست درازی نہ کر سکے۔''

''سنو، وہ ایک غلط فہمی تھی۔'' باربی نے جلدی سے کہا۔ ''جیمس اس وقت نشے میں تھا۔ بعد میں اس نے مجھ سے سوری کر لی تھی۔''

''اس شخص کے ذہن میں عورتوں کے حوالے سے گند گھسا ہوا ہے اور تم اعتراف کر چکی ہو کہ یہ قابلِ سزا ہے اس لیے اب تم اسے سزا دو گی۔'' مائیکل نے بیس بال کا بلّا اٹھایا۔ ''نیچے اترو اور اسے بتاؤ کہ عورت کو چھیڑنے کی کیا سزا ہو سکتی ہے۔''

''پلیز نہیں۔'' باربی نے رونا شروع کر دیا۔ اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ ایک جنونی کے ہتھے چڑھ گئی ہے۔

''اگر تم اسے سزا نہیں دو گی تو میں اسے سزا دوں گا۔'' مائیکل نے کہا اور کار سے اتر گیا۔ اسے بلّے کے ساتھ آتا دیکھ کر جیمس کرسی کو ہلا کر... دور لے جانے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر وہ کرسی کو ایک حد سے زیادہ نہیں ہلا سکتا تھا۔ ساتھ ہی وہ ناک سے آوازیں بھی نکال رہا تھا۔ مائیکل اس کے نزدیک پہنچا اور بلّا بلند کیا تھا کہ باربی چلّائی۔

''رُک جاؤ۔''

مائیکل نے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا تم تیار ہو؟''

''پلیز، ایک بار میری بات سن لو۔'' باربی نے التجا کی تو مائیکل پلٹ کر آیا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔ باربی جلدی جلدی کہنے لگی۔ ''سنو، اس کی بیوی ہے اور اس کی دو چھوٹی بیٹیاں ہیں۔ اس واقعے کے بعد اس نے مجھ سے سوری کی تھی اور ایک بار مجھے اپنی بیوی سے بھی ملوایا تھا۔ یقین کرو اس کے بعد سے اس نے کبھی مجھ سے بدتمیزی یا کوئی غلط حرکت نہیں کی۔ ایک بار اس سے غلطی ہوئی تھی۔''

''ایک بار کی غلطی۔'' مائیکل کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔ ''تم اس کی کچھ زیادہ ہی حمایت نہیں کر رہی ہو؟'' اس نے کہتے ہوئے کار اسٹارٹ کی اور اسے جیمس کی طرف بڑھایا۔ باربی چلّانے لگی۔ وہ مائیکل سے کار روکنے کو کہہ رہی تھی۔ جیمس کے پاس پہنچ کر مائیکل نے اچانک بریک لگائے اور کار جیمس سے چند انچ کے فاصلے پر رکی۔ اس کی آنکھیں خوف و دہشت سے پھٹ رہی تھیں۔ مائیکل کچھ دیر اسے گھورتا رہا پھر اس نے باربی کی طرف دیکھا۔ ''یہ شخص کسی رعایت کا مستحق نہیں ہے۔''

اس سے پہلے باربی کچھ کہتی، مائیکل نے ایکسلریٹر دبایا تو کار کرسی کو لے کر دوڑنے لگی۔ کرسی کے نیچے پہیے تھے۔ کار اور کرسی دونوں کا رخ دیوار کی طرف تھا۔ اچانک باربی نے دروازہ کھولا اور نیچے کود گئی۔ اس نے ایک قلابازی کھائی اور چوٹوں کی پروا کیے بغیر کھڑی ہو کر بھاگی۔ ایک دھماکا ہوا اور اس نے مڑ کر دیکھا۔ کار کرسی سمیت دیوار سے ٹکرائی تھی۔ جیمس کا منہ بند تھا اس لیے وہ چیخ بھی نہیں سکا تھا۔ کار پیچھے ہوئی تو باربی نے دیکھا۔ وہ شدید زخمی تھا۔ اس کا جسم کرسی کے ساتھ ہی ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ مائیکل نے اسی ٹکر پر بس نہیں کیا تھا۔ دوسری بار اس نے زیادہ قوت سے کار لے کر پیچھے پڑے جیمس سے ٹکرائی۔ دھات ٹوٹنے کے ساتھ ہڈیاں ٹوٹنے کی آوازیں بھی نمایاں تھیں۔ باربی منہ پر ہاتھ رکھ کر بھاگی۔ اس کی سسکیاں نکل رہی تھیں۔ سیڑھیوں سے نیچے جاتے ہوئے اس نے کار کو تیسری بار جیمس کی طرف بڑھتے دیکھا۔ دھماکا اسے سیڑھیوں پر سنائی دیا۔

بندھے ہاتھوں کے ساتھ بھاگتے ہوئے اسے مشکل پیش آ رہی تھی۔ وہ نیچے پہنچی۔ اس کا رخ مائیکل کے دفتر کی طرف تھا۔ اس کے کپڑے اور سامان وہیں تھا جس میں اس کا سیل فون بھی تھا۔ مگر جب وہ دفتر تک پہنچی تو اس کے دروازے کو لاک پایا۔ اس کا لاک بھی چپ کارڈ والا تھا۔ باربی اپنی کار کی طرف آئی مگر اس کے دروازے لاک تھے۔ پھر اس نے بونٹ اٹھایا اور اس کی ٹکانے والی سلاخ اوپر کی اور زور لگا کر اسے الگ کرنے لگی۔ بہ مشکل اس نے سلاخ موڑی مگر وہ الگ نہیں ہو رہی تھی۔ باربی بار بار زور لگاتی رہی اور بالآخر سلاخ اپنے جوڑ سے الگ ہو گئی۔ وہ سلاخ لے کر دفتر کی طرف آئی اور اسے شیشے کے دروازے پر مارا۔ تیسری ضرب پر شیشہ بکھر گیا اور وہ اس کے ٹکڑوں سے پاؤں بچاتی ہوئی اندر آئی۔ مائیکل نے فون سیٹ اٹھا کر واپس اپنی جگہ رکھ دیا تھا اور وہاں کتا موجود تھا۔ وہ کسی صورت فون تک نہیں جا سکتی تھی۔ اسے دیکھتے ہی کتا غرانے لگا۔

پھر باربی کی نظر اپنے پرس پر گئی۔ وہ ذرا آگے ٹی وی کے ساتھ ریک پر رکھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹی سی میز تھی۔ باربی میز پر کھڑی ہوئی تو کتا بھونکتا ہوا اس پر جھپٹا اور زنجیر نے اسے بہ مشکل باربی تک پہنچنے سے روکا۔ اس کا کھلا جبڑا باربی سے چند انچ دور رہ گیا تھا۔ اس نے اپنی چیخ روکی اور بندھے ہاتھ آگے بڑھا کر پرس اٹھانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے پرس اٹھا لیا مگر اسی لمحے کتا جھپٹا اور اس نے پرس پکڑ لیا۔ اب باربی اور کتے میں کھینچا تانی جاری

تھی۔ بارنی نے پورا زور لگایا اور پرس اس کے جبڑوں سے چھڑا لیا۔ اس نے اس سے اپنا سیل فون اور کار کی چابیاں نکالیں اور پھر پرس وہیں چھوڑ دیا۔ اس دوران میں وہ مانیٹرز پر دیکھ رہی تھی۔ مائیکل جیمس کی کچل جانے والی لاش وہاں سے کہیں لے جارہا تھا۔ پھر اس نے فرش پر پھیلا خون صاف کیا اور دیوار پر لگنے والے خون کو چھپانے کے لیے اس پر کہیں سے ایک پرانا میٹریس لگا کر رکھ دیا۔ وہ واپس آنے والا تھا۔

بارنی باہر آئی۔ اس نے سیل فون سے نائن ون ون ملایا۔ دوسری طرف سے ریکارڈڈ آواز نے اسے بتایا کہ تمام آپریٹرز اس وقت مصروف ہیں۔ وہ ایک کار کے پیچھے دبک گئی۔ ”پلیز... پلیز...“ اس نے التجا کی۔ اسی لمحے آپریٹر نے کال ریسیو کی۔

”میں تمہاری کیا مدد کرسکتی ہوں؟“

”میں باربرا کارٹر بات کر رہی ہوں... میں ریکس ٹاور کی پارکنگ میں پھنسی ہوں۔ یہاں ایک جنونی نے مجھے قید کرلیا ہے، اس نے ایک شخص کو ہلاک کردیا ہے۔ اس کا نام...“

اچانک موبائل پر سگنل گرنے لگے۔ پھر کال کٹ گئی اور لکھا ہوا آیا کہ کرنسی کی وجہ سے موبائل کوریج محدود کی جا رہی تھی۔ ”نہیں... نہیں۔“ اس نے اضطراب سے کہا۔ اس نے پھر نمبر ملایا۔ اس بار بیل جاتی رہی اور کال ریسیو بھی نہیں کی گئی۔ پھر نیٹ ورک کنکشن ایرر لکھا آیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ سگنل محدود ہو گئے تھے۔ پھر یہ زیر زمین پارکنگ تھی، یہاں سگنل ویسے ہی کم آتے تھے۔ اس کا خدشہ درست نکلا۔ کچھ دیر بعد موبائل سے سگنل مکمل طور پر غائب ہو گئے۔ اسے خیال آیا کہ وہ لفٹ سے اوپر لابی میں جائے تو شاید سگنل مل جائیں۔ پھر وہاں ریسیپشن پر بھی فون تھا۔ وہ اس سے بھی پولیس کو کال کرسکتی تھی۔ بارنی لفٹ کی طرف آئی۔ اس نے لفٹ کا بٹن دبایا تھا کہ اوپر سے مائیکل کی کار نمودار ہوئی اور اس نے بارنی کو لفٹ کے پاس دیکھ لیا۔ وہ کار سے اتر کر اس کی طرف لپکا۔ لفٹ کا دروازہ کھلا اور بارنی نے اندر گھس کر لابی کا بٹن دبایا۔ پھر مائیکل کو پاس آتے دیکھ کر بار بار بٹن دبانے لگی۔ بالآخر دروازہ بند ہوا۔ مائیکل باہر دروازے سے ٹکرایا۔

بارنی جانتی تھی کہ وہ اب سیڑھی سے اوپر آئے گا۔ اس کے پاس لابی میں کھلنے والے دروازے کا کارڈ تھا۔ گویا وہ وہاں بھی محفوظ نہیں تھی۔ لابی پر لفٹ رکی اور دروازہ کھلا تھا کہ اسے لابی کی طرف سے مائیکل آتا دکھائی دیا۔ اس نے پھرتی سے ساتویں فلور کے بٹن پر ہاتھ مارا اور لفٹ کا دروازہ بند ہونے لگا۔ وہ اوپر جارہی تھی۔ اچانک ہی لفٹ کو جھٹکا لگا اور اس کی روشنیاں بند ہو گئیں۔ لفٹ رک گئی تھی۔ بارنی کا دل بھی رک سا گیا۔ اسے خیال نہیں آیا تھا کہ مائیکل کنٹرول پینل سے لفٹ بند کرسکتا ہے۔ اب وہ یہاں قید ہو کر رہ گئی تھی۔ اس نے موبائل اسکرین آن کی تو کسی قدر روشنی ہو گئی۔ وہ قید تھی لیکن اسے اطمینان تھا کہ مائیکل بھی لفٹ میں نہیں آسکتا۔ لفٹ اس طرح رکی تھی کہ وہ دو منزلوں کے درمیان میں پھنس گئی تھی۔ بارنی کو سردی لگ رہی تھی۔ وہ سمٹ کر ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ اچانک اوپر سے ایسی آواز آئی جیسے کسی نے زبردستی دروازہ کھولا ہو اور پھر مائیکل کی آواز آئی۔

”بارنی! تم میری آواز سن رہی ہو... تم لفٹ سے باہر آجاؤ، میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا... میں تمہارے ساتھ صرف ڈنر کرنا چاہتا تھا، اس سے زیادہ میرا اور کوئی مقصد نہیں تھا۔“

جواب میں بارنی خاموش رہی تو اس نے کہا۔

”بارنی! اگر تم نے جواب نہیں دیا تو بھگتو گی۔“

اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس کے خلاف کیا کرسکتا ہے۔ کچھ دیر خاموشی رہی اور پھر اچانک ہی اوپر سے جیسے شاور کھل گیا۔ لفٹ کی چھت جالی دار تھی۔ پانی بہت تیزی سے آیا تھا اور یہ بہت سرد تھا۔ بارنی لمحوں میں شرابور ہو گئی۔ لفٹ کے فرش میں نکاسی کا نظام تھا لیکن پانی جتنی تیزی سے آرہا تھا، اتنی جلد نکل نہیں رہا تھا اس لیے فرش پر پانی جمع ہونے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بارنی کے گھٹنوں اور پھر کمر تک آگیا۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی اور بدحواس ہو کر ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ موبائل پہلے ہی پانی میں گر گیا تھا۔ اس نے چابی اپنے گریبان میں رکھ لی۔ اگر یہ بھی گر جاتی تو شاید وہ ملنے والے موقع سے فائدہ نہیں اٹھا سکتی تھی۔ موبائل تلاش کرنا بیکار تھا۔ پانی نے اسے ناکارہ کردیا ہوگا۔ اب پانی اس کی گردن تک آگیا تھا۔ اچانک اوپر سے جالی کا خانہ کھلا اور کوئی پانی میں گرا۔ بارنی ہڑبڑائی۔ اس کا خیال تھا کہ مائیکل نیچے آیا تھا مگر اوپر سے گرنے والا جسم پانی میں بے جان سے انداز میں تیر رہا تھا۔

اسی لمحے لفٹ نیچے سرکنے لگی۔ اندر بھرنے والے پانی کا بوجھ اسے نیچے لے جارہا تھا۔ چند لمحے کے لیے لفٹ تیزی سے نیچے گئی اور پھر ایک جھٹکے سے رکی۔ اس کا دروازہ کھلا اور

اندر بھرا پانی تیزی سے باہر نکلا تو بارنی اور بے جان جسم بھی باہر آگئے۔ وہ لابی والے حصے میں نکلے تھے۔ بارنی پانی کے زور پر پھسلتی دور تک آئی پھر دوسرا جسم آکر اس سے ٹکرایا۔ تب بارنی نے دیکھا۔ وہ مورگن تھا، اس بلڈنگ کا منیجر۔ اس کی کھلی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اس کی روح کو پرواز کیے خاصی دیر ہو چکی ہے۔ بظاہر اس کے جسم پر کوئی نشان نہیں تھا۔ بارنی اپنی چیخ روکتی ہوئی اٹھی اور لابی کی انٹرنس کی طرف آئی۔ وہ باہر دیکھ رہی تھی کہ ایک طرف سے پولیس کار نمودار ہوئی۔ وہ سست روی سے سامنے سے گزری۔ بارنی بندھے ہاتھ ہلا کر اس میں موجود پولیس والوں کو متوجہ کررہی تھی مگر وہ اس کی طرف دیکھے بغیر گزر گئے۔

مائیکل کسی وقت بھی یہاں آسکتا تھا۔ اس نے آگ بجھانے والے پائپ سے پانی برسایا تھا۔ بارنی کا سردی سے برا حال تھا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے کنٹرول پینل کی طرف آئی اور ایک اور لفٹ آن کی۔ اس کی مدد سے وہ نیچے پارکنگ میں پہنچی۔ اس عمارت میں یہی ایک جگہ تھی جہاں وہ چھپ سکتی تھی ورنہ پوری عمارت میں.........

...... چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ اس نے ایک جگہ رک کر اپنی فراک اتار کر نچوڑی۔ بندھے ہاتھوں کے ساتھ یہ خاصا مشکل کام تھا مگر اس نے کسی طرح کرلیا۔ لباس کا گیلا پن کم ہوا مگر ٹھنڈ میں کوئی کمی نہیں آئی۔ وہ دفتر کی طرف بڑھی۔ شاید اسے وہاں سے اس کے کپڑے مل جاتے تو وہ سردی سے بچ جاتی۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اندر داخل ہوئی اور میز پر موجود شیمپین کی بوتل سے چند گھونٹ لیے۔ اسے گرمی کا احساس ہوا۔ اس کا لباس سلیقے سے طے کیا ہوا ایک الماری کے اوپر رکھا ہوا تھا مگر وہ جگہ اس کی پہنچ سے دور تھی کیونکہ درمیان میں کتا بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے حسرت سے اپنا لباس دیکھا۔ اچانک اسے پارکنگ ایگزٹ کی جانب سے ایک لمحے کو پولیس سائرن سنائی دیا اور وہ خوش ہو کر دروازے کی طرف بڑھی تھی کہ اچانک ہی مائیکل سامنے آیا اور اس نے بارنی کا گلا دبوچ کر اس کا سر بیدردی سے شیشے کی دیوار پر مارا۔ بارنی کا دماغ چکرایا اور پھر اسے ہوش نہیں رہا۔

☆☆☆

ایک پولیس کار ریکس ٹاور کی پارکنگ کے ایگزٹ ریمپ پر موجود تھی۔ خودکار طریقے سے کھلنے اور بند ہونے والا جالی دار دروازہ اس وقت بند تھا اسی لیے پولیس والوں نے ایک لمحے کو سائرن دیا تھا۔ چند منٹ بعد انہیں اندر کی

طرف سے مائیکل آتا دکھائی دیا۔ کار سے ایک پولیس آفیسر اتر آیا۔ مائیکل نے پوچھا۔ ”میں تمہارے لیے کیا کرسکتا ہوں؟“

”تم کون ہو؟“

”میں پارکنگ سیکورٹی آفیسر مائیکل کیرن ہوں۔“

”پولیس کو ریکس ٹاور سے ایک ایمرجنسی کال ملی ہے۔ دروازہ کھولو۔“

مائیکل ایک لمحے کے لیے ساکت ہوا پھر اس نے جیب سے چابی نکال کر اسے دروازے کے ساتھ لگے سوئچ میں ڈال کر گھمایا تو جالی دار فولادی دروازہ اوپر سرکنے لگا۔ راستہ کھلتے ہی پولیس کار اندر آگئی۔ نیچے موجود پولیس افسر نے مائیکل سے پوچھا۔ ”یہاں اتنی تاریکی کیوں ہے؟“

”پارکنگ اس وقت بند ہے۔ نہ کوئی آرہا ہے اور نہ کوئی جارہا ہے اس لیے اضافی روشنیاں بند کی ہوئی ہیں۔ اگر تم کہو تو میں روشنیاں آن کردیتا ہوں۔“ مائیکل بولا۔ وہ اپنے دفتر کی طرف چلنے لگا۔ پولیس کار کے اوپر لگی سرچ لائٹ آن ہوکر چاروں طرف گھوم رہی تھی۔ مائیکل کے ساتھ چلتے پولیس افسر نے کہا۔

”ہمیں اس پوری جگہ کو چیک کرنا ہوگا۔“

مائیکل نے شانے اچکائے۔ ”مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ میں اپنے دفتر میں ہوں اگر میری مدد کی ضرورت ہو تو مجھ سے رابطہ کرلینا۔“

دوسرا پولیس افسر پلٹ کر کار میں چلا گیا اور وہ گھوم پھر کر پارکنگ کا جائزہ لینے لگے پھر کار ریمپ سے اوپر گئی۔ مائیکل اپنے دفتر میں لگے کیمروں میں دیکھ رہا تھا۔ کار اس جگہ پہنچی جہاں اس نے جیسں کو دیوار سے کچل کر مارا تھا اور وہاں اس کا خون پھیلا ہوا تھا۔ اسے چھپانے کے لیے اس نے دیوار کے ساتھ پرانا میٹریس کھڑا کردیا تھا۔ اگر پولیس والے میٹریس ہٹاتے تو دیوار پر لگا خون نظر آجاتا۔ پولیس کار چند لمحے کو وہاں رکی مگر پھر پلٹ کر پارکنگ کا جائزہ لیتی ہوئی آخری فلور پر چلی گئی۔ تقریباً دس منٹ بعد وہ نیچے آئی اور دفتر کے سامنے رکی۔ مائیکل اپنا کتا لے کر باہر نکل آیا۔ اس نے کہا۔ ”اگر تم لوگوں کا موڈ ہے تو میں کافی پیش کرسکتا ہوں۔ بائی دی وے کال کس نے کی تھی؟“

”پتا نہیں۔“

”تب کسی نے مذاق کیا ہوگا... کرسمس کے موقع پر بچے عام طور سے ایسا کرتے ہیں۔“

”شاید ایسا ہی ہے۔“ پولیس افسر نے کہا۔ ”تم دروازہ بند کرلو۔“

پولیس کار کی کھڑکی کا شیشہ بند ہوا اور اسی لمحے کچھ فاصلے پر موجود باربی کی کار کی ڈکی سے دھم دھم کی آوازیں آنے لگیں۔ مائیکل نے پولیس والوں کی طرف دیکھا مگر انہیں کچھ سنائی نہیں دیا۔ پولیس کار پلٹ کر ایگزٹ کی طرف جارہی تھی۔ مائیکل اس کے پیچھے چل پڑا۔ باربی اس کی توقع سے پہلے ہوش میں آگئی تھی۔ مگر خوش قسمتی سے پولیس والے اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئے تھے۔

☆☆☆

باربی کو ہوش آیا تو وہ کسی تنگ و تاریک جگہ قید تھی۔ اس نے ہاتھ چلائے تو اسے اندازہ ہوا کہ وہ کار کی ڈکی میں قید ہے۔ مزید ہاتھ پاؤں چلانے پر اسے پتا چلا کہ وہ اپنی ہی کار کی ڈکی میں تھی۔ یہاں ایک چھوٹا سا جیک تھا، اس نے اس کا لیور ٹٹولا۔ لیور اسے مل گیا۔ وہ اندازے سے اسے ڈکی کے لاک پر برسانے لگی۔ اس وقت باربی پر جنونی کیفیت طاری تھی۔ لیور پلٹ کر اسے بھی لگ رہا تھا مگر اسے پروا نہیں تھی۔ اچانک کھٹ کی آواز آئی اور ڈکی کا لاک نکل گیا۔ باربی نے ڈکی اوپر کی اور باہر نکل آئی۔ اس نے وحشت زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ تب اسے ایگزٹ کا راستہ بند ہوتا دکھائی دیا اور ایک پولیس کار ریمپ سے اوپر جاتی نظر آئی۔ باربی بے اختیار چلائی اور اس طرف دوڑی۔ مگر جب وہ گیٹ کے سامنے پہنچی تو ٹھٹک گئی۔ وہاں مائیکل اپنے خوفناک کتے سمیت موجود تھا۔ وہ مسکرا رہا تھا اور کتا غرا رہا تھا۔ پولیس کار ریمپ پر چڑھ کر باہر نکل گئی تھی۔

باربی پیچھے ہٹی۔ مائیکل جھکا اور اس نے کتے کے پٹے سے زنجیر نکالی۔ باربی پلٹ کر دوڑی۔ اسے عقب میں کتے کے بھونکنے کی آواز آرہی تھی۔ باربی سیڑھیوں کی طرف آئی۔ وہ پھرتی سے سیڑھیاں چڑھتی ہوئی دوسرے فلور پر آئی۔ وہ گاڑیوں کے دروازے چیک کررہی تھی مگر سب کے دروازے لاک تھے۔ کتا بھی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آگیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی باربی نے ایک کار کے عقبی کھڑکی کے شیشے کو جیک کا لیور مار کر توڑا اور اندر ہاتھ ڈال کر لاک کھولا۔ وہ اندر گھس گئی۔ اسی لمحے کتا آکر دروازے سے ٹکرایا۔ پھر وہ اچھل اچھل کر اندر گھسنے کی کوشش کرنے لگا۔ باربی ڈری ڈری آواز میں روتے ہوئے کتے کو روکنے کی کوشش کررہی تھی۔ مگر کتا کسی طرح سر اور اگلے پاؤں اندر لانے میں کامیاب رہا تھا۔ اس سے بچنے کے لیے باربی پیچھے ہوئی تو کتا اندر گھس آیا۔ اس نے آتے ہی باربی کا بایاں بازو جبڑے میں دبوچ لیا۔ اس نے چیخ ماری اور پھر اسے گھما کر لیور مارا۔ کتے کی آواز میں کرب آیا مگر اس نے باربی کا ہاتھ نہیں چھوڑا۔ اس نے پھر وار کیا اور پھر مارتی چلی گئی۔ کچھ دیر بعد کتے نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور ایک طرف لڑھک گیا مگر باربی بار بار لیور مارتی رہی۔ اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہورہی تھی۔

کچھ دیر بعد اسے احساس ہوا کہ کتا اب ساکت ہے۔ تب باربی نے دیکھا کہ اس کے سر کا کچھ مر نکل گیا تھا اور اس کا خون ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ خود وہ بھی خون میں تربتر ہورہی تھی۔ اس نے دوسری طرف کا دروازہ کھولا اور باہر گرگئی۔ اس نے اٹھ کر ہراساں نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور پھر لڑکھڑاتے قدموں سے ایک طرف چل پڑی۔ اس کے سامنے سیڑھیاں آئیں وہ چڑھ کر اوپر آگئی۔ وہ اس راہداری میں آگئی جو لابی کی طرف جاتی تھی۔ اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ لابی میں آکر ماربل کی بنچ پر ڈھیر ہوگئی اور گہرے سانس لینے لگی۔ کچھ دیر بعد اس کا ذہن سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا تو اسے احساس ہوا کہ اس نے ایک کارنامہ انجام دیا تھا۔ اس خونخوار کتے کو مارنا کارنامہ ہی تھا۔ اس نے مائیکل کے بارے میں سوچا تو اس کے اندر غصہ ابھرنے لگا۔

اب اسے مائیکل سے نمٹنا تھا۔ اس کے بغیر وہ اس جگہ سے باہر نہیں جاسکتی تھی۔ مورگن کو مار کر مائیکل نے تمام راستے بھی بند کردیے تھے۔ یقیناً اس نے سسٹم کو ری پروگرام کیا تھا جس کی وجہ سے لابی کا دروازہ نہیں کھل رہا تھا۔ پارکنگ کی ایگزٹ کی چابی اس کے پاس تھی اور اس کے علاوہ یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ ہر فلور پر ایک کی بورڈ تھا جس پر مختلف گاڑیوں کی چابیاں ہوتی ہیں۔ یہ چابیاں مالکان خود چھوڑ جاتے ہیں تاکہ کسی ہنگامی صورت میں پارکنگ کا عملہ ان کی گاڑیاں یہاں سے نکال سکے۔ باربی نے ذہن میں تازہ کیا کہ اس فلور کا کی بورڈ کہاں تھا اور پھر وہ اس طرف چل پڑی۔ کی بورڈ تلاش کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ اس پر درجن بھر سے زیادہ چابیاں تھیں مگر مسئلہ یہ تھا کہ کون سی چابی کس کار کی تھی، اس کا علم صرف پارکنگ کے عملے کو ہوتا تھا۔

باربی نے ایک نسان کی چابی اتاری۔ اس طرح اسے تلاش کرنے میں آسانی رہتی۔ وہ گاڑیوں کے درمیان گھوم کر نسان کاروں میں چابی آزمانے لگی۔

سچی محبت

ایک لڑکا، لڑکی کو بہت چاہتا تھا اور اس سے محبت کر بیٹھا تھا۔ اس نے لڑکی کو پروپوز کیا لیکن لڑکی بولی۔ ”تمہارے مہینے کی پاکٹ منی میرا روز کا خرچہ ہے۔“ لیکن لڑکا پھر بھی اسے چاہتا رہا۔

دس سال بعد وہ لڑکا ایک شاپنگ مال میں تھا۔ اچانک اسے وہی لڑکی نظر آئی۔ لڑکی اس سے بولی۔ ”میرا شوہر ایک بڑی کمپنی میں جاب کرتا ہے۔ اس کی تنخواہ چالیس ہزار ہے۔ میں خوش ہوں۔ یہ سن کر لڑکے کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کچھ دیر بعد اس لڑکی کا شوہر آیا۔ لڑکے کو دیکھ کر بولا۔

”سر! آپ یہاں؟“ پھر اپنی بیوی سے کہا۔ ”یہ میری کمپنی کے مالک ہیں اور ایک سال میں 15 کروڑ کا منافع ہوتا ہے۔ سر ایک لڑکی سے محبت کرتے تھے لیکن انہیں نہیں ملی۔ اس لیے اب تک شادی نہیں کی۔“

اقتباس: سید اکبر شاہ، اوگی مانسہرہ

اچانک ریمپ کی طرف سے روشنی لہرائی اور پھر ٹائر چرچرانے کی آواز آئی۔ مائیکل کار میں اوپر آرہا تھا۔ باربی کے جسم میں جیسے بجلی دوڑ گئی۔ وہ بھاگ بھاگ کر نسان کاریں دیکھنے لگی۔ پارکنگ میں ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی مگر روشنی کی وجہ سے اسے پاس جاکر دیکھنا پڑ رہا تھا۔ روشنی اوپر آئی اور بالآخر کار نمودار ہوئی۔ مائیکل اپنی کار میں تھا۔ باربی ایک نسان کار تک پہنچی۔ یہ نئے ماڈل کی اور طاقتور انجن والی کار تھی۔ اس نے دروازے میں چابی لگاتے ہوئے کہا۔ ”کم آن...“

اور جب لاک کھلا تو اسے بے اندازہ خوشی ہوئی۔ وہ تیزی سے اندر گھسی اور جھک کر دونوں ہاتھ اگنیشن کی طرف لاتے ہوئے چابی لگائی اور گھما کر انجن اسٹارٹ کیا۔ مائیکل اب پارکنگ میں گھوم رہا تھا۔ باربی نے گیئر بدلا اور کار کو آگے بڑھایا۔ فوراً ہی مائیکل نے اسے دیکھ لیا۔ وہ تیزی سے اس کی طرف آیا اور اس سے بچنے کے لیے باربی راہداریوں میں کار گھمانے لگی۔ پھر اسے موقع ملا تو وہ ریمپ کی طرف بھاگ نکلی۔ اس وقت مائیکل اس حصے میں تھا جہاں ایک کار میں اس کا کتا مرا پڑا تھا۔ کار کا دروازہ کھلا دیکھ کر وہ رکا اور پھر اتر کر اندر جھانکا۔ کتے کو دیکھ کر اس کے منہ سے چیخ نکلی۔ اس نے بے تابی سے اسے باہر نکالا اور پھر

مردہ پاکر چلا اٹھا۔

"میرے خدا! یہ تم نے کیا کیا... یہ ایک معصوم کتا ہی تو تھا۔"

باربی ریمپ کے پاس رکی عقبی آئینے میں دیکھ رہی تھی۔ اس نے مائیکل کی بات سن لی اور حیران رہ گئی۔ وہ اس خونخوار جانور کو معصوم کہہ رہا تھا۔ اس کتے نے اس پر حملہ کرنے اور اسے زخمی کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اگر اسے موقع ملتا تو وہ اسے مار ہی ڈالتا۔ وہ تو باربی نے ہمت کی اور الٹا اسے ٹھکانے لگا دیا۔ مائیکل کا رونا دھونا سن کر باربی کے اندر ابال سا آرہا تھا۔ اس نے کار ریمپ پر آگے بڑھا دی۔ عقبی آئینے میں اسے آخری بار مائیکل اپنی گاڑی کی طرف بڑھتا نظر آیا۔ پھر وہ نچلے فلور پر آگئی۔ ریمپ سے نکلتے ہی اس نے آس پاس دیکھا اور ایک جگہ گاڑی روک لی۔ یہاں تاریکی تھی۔ اس نے انجن آن رکھا لیکن ہیڈ لائٹس اور گاڑی کی دوسری روشنیاں بند کر دیں۔ اب اسے انتظار تھا کہ مائیکل ریمپ سے نیچے آئے۔

کچھ دیر بعد اس کی کار نمودار ہوئی۔ اس کی رفتار سست تھی اور پھر وہ راہداریوں میں گھومنے لگا۔ وہ اسے تلاش کر رہا تھا۔ پھر اس کی کار سامنے سے نمودار ہوئی اور ہیڈ لائٹس کی روشنی باربی کی کار پر آئی تو وہ جلدی سے نیچے جھک گئی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ یہ کار سلور گرے رنگ کی تھی اور یہاں اس رنگ کی درجنوں کاریں تھیں۔ اس کے باوجود اسے ڈر تھا کہ مائیکل کار کو پہچان نہ لے۔ مگر نزدیک آکر روشنی دائیں طرف گھوم گئی۔ وہ سیدھی ہوئی۔ مائیکل کی کار آگے بڑھ رہی تھی۔ نسان کار کا انجن بہت اعلیٰ درجے کا تھا۔ یہ ذرا بھی شور اور تھرتھراہٹ پیدا نہیں کر رہا تھا ورنہ مائیکل آواز سے نہ سہی، تھرتھراہٹ سے جان سکتا تھا کہ کار کا انجن چل رہا ہے۔ اب باربی منتظر تھی کہ وہ واپس آئے۔ یہ راہداری آگے سے بند تھی اور اسے اسی جگہ سے واپس گزرنا پڑتا۔ پھر وہ گھوم کر آنے لگا۔ باربی نے اسٹیرنگ مضبوطی سے تھام لیا۔ اس کا پاؤں ایکسلریٹر پر تیار تھا۔

مائیکل کی کار کی رفتار سست تھی۔ اس کی نظریں چاروں طرف گھوم رہی تھیں۔ جیسے ہی وہ نزدیک آیا، باربی نے گیئر بدلا اور کار کو ٹاپ گیئر میں لے آئی۔ مائیکل کی کار سامنے سے نمودار ہو رہی تھی۔ تب اس نے ایکسلریٹر دبایا اور کار اچھل کر آگے بڑھی۔ مائیکل نے بالکل آخری موقع پر دیکھا۔ اس نے اپنی کار کی رفتار بڑھانے کی کوشش کی مگر اسے دیر ہوگئی تھی۔ باربی کی کار نے اسے ٹکر ماری۔ شیشے بکھرنے اور دھات ٹوٹنے کی سمع خراش آوازیں ہال میں گونجیں۔ باربی کی کار مائیکل کی کار کو دھکیلتے ہوئے لے گئی۔ یہ لیفٹ ہینڈ ڈرائیو تھی اس لیے مائیکل براہِ راست ٹکر سے بچ گیا تھا۔ مگر جب کار اسے دھکیلتی ہوئی لے گئی تو وہ راستے میں آنے والے ستون کے تصادم سے نہیں بچ سکا۔ اس تصادم نے اس کی طرف کا دروازہ پچکا دیا تھا اور مائیکل متاثر ہوا تھا۔ جھٹکے سے دونوں کاریں رکیں۔ باربی کی کار کا انجن بند ہو گیا تھا۔ وہ نیچے اتری تو اسے مائیکل کے چلّانے کی آواز آئی۔ وہ مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ اس تصادم نے باربی کو بھی متاثر کیا تھا۔ وہ بہ مشکل چلتی ہوئی مائیکل کی کار تک آئی۔ اس کا عقبی دروازہ کھولا اور اندر گھس کر مائیکل کی جیبیں ٹٹولنے لگی۔ وہ سیٹ اسٹیرنگ اور دروازے میں بری طرح پھنسا ہوا تھا۔

"پلیز، مجھے باہر نکالو۔"

"شٹ اپ۔" باربی نے کہا۔ بالآخر اس نے ہتھکڑی کی چابی تلاش کر لی۔ اپنے ہاتھ کھول کر وہ باہر نکلنے لگی تو مائیکل نے پھر کہا۔

"خدا کے لیے... مجھے باہر نکالو۔ کار کا پیٹرول لیک کر رہا ہے۔"

باربی نے بھی بو سونگھ لی تھی مگر وہ باہر نکل آئی۔ اب مائیکل اپنا راگ الاپ رہا تھا کہ اس کا مقصد باربی کو نقصان پہنچانا نہیں تھا۔ وہ تو صرف اس کے ساتھ ڈنر کرنا چاہتا تھا۔ باربی کا دماغ گھوم گیا۔ وہ پلٹ کر آئی اور غرا کر بولی۔ "اپنی بکواس بند کرو... میرے ساتھ ڈنر کے لیے تم نے دو آدمیوں کو قتل کیا ہے۔"

"وہ اسی قابل تھے... وہ عورتوں کی عزت نہیں کرتے تھے۔"

"اور تم کرتے ہو؟" باربی کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔ "تمہارے ساتھ جو ہونے والا ہے، تم اسی کے مستحق ہو۔"

یہ کہہ کر باربی آگے بڑھ گئی۔ مائیکل اسے پکار رہا تھا پھر اس نے باربی کو گالیاں دینا شروع کر دیں۔ اسے طوائف تک کہہ دیا۔ جب عقب میں دھماکے سے کار میں آگ لگی تو باربی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ وہ مائیکل کے دفتر میں آئی اور پولیس کو کال کر کے اس نے اپنا لباس پہننا شروع کر دیا۔ اس کا کرسمس خراب ہوا تھا لیکن ایک بر خود غلط شخص کا درست علاج ہو گیا تھا۔

دل فگار

بشریٰ امجد

شوق و مشاغل ہر قید سے آزاد ہوتے ہیں... مگر ہر شخص کا شوق اس کے ذوقِ طبع کا ضرور عکاس ہوتا ہے... مغرب کے موسموں کی طرح شوق بھی جدا جدا اور انوکھی نوعیت کے ہوتے ہیں... ایک ایسے ہی دیوانے کا احوال جو ہر صورت اپنے شوق کی تسکین چاہتا تھا...

محبوب کی دل داری سے دل فگاری تک کے مراحل عبور کرتی کہانی...

ایڈی پرانے خیالات کا مالک تھا۔ اسے پرانی چیزیں پسند تھیں حتیٰ کہ وہ پرانے وقت کو بھی یاد کرتا اور موجودہ دور سے موازنہ کرتا۔ نوادرات میں اس کی دلچسپی بہت زیادہ تھی۔

"لینا لولی" سے اسے پیار تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ بھی کوئی پرانی چیز تھی۔ وہ تو جوان تھی، ایک دلنواز حسینہ جو چینی گڑیا کی طرح تھی۔ اس کے بیضوی چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔

وہ دونوں تقریباً ہر شام ساتھ بیٹھ کر سبز چائے نوشِ جاں کرتے۔ ایڈی ہر اتوار کی شام لینا کو مدعو کرتا۔ دونوں ٹیرس پر ہلکی پھلکی گفتگو میں مگن ہو جاتے۔ لینا کے وجود سے

پھوٹنے والی دھیمی دھیمی خوشبو ہمیشہ اس کے اعصاب پر سوار ہو جاتی تھی۔ تنہائی میں بھی وہ اپنی اس پسندیدہ خوشبو کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔

تاہم وہ ہر بار دل کی بات زباں تک لانے میں ناکام رہتا۔ کبھی وہ لینا کو خوش رنگ پھولوں کا تحفہ دیتا۔ کبھی ریشمی رومال... وغیرہ وغیرہ۔

لینا ہر بار پُروقار تبسم کے ساتھ اس کے تحفے قبول کر لیتی۔ ایڈی خوش تھا کہ ایک دن وہ لینا کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

سب ٹھیک چل رہا تھا۔ پہلی بار وہ نجی ذخیرۂ نوادرات میں کوئی نئی چیز شامل کرنے جا رہا تھا، یعنی لینا اور اس کی محبت۔

کبھی وہ سوچتا کہ محبت تو نہایت پرانی چیز ہے اور ازل سے یہ پھول کھلتے ہی چلے آرہے ہیں۔ یہ زاویۂ نظر اپنایا جائے تو وہ اس بار بھی ایک پرانی چیز کی آرزو میں ہی مبتلا تھا۔

☆☆☆

بالآخر ایک شام بڑے اسٹائلش انداز میں گھٹنا ٹیک کر اس نے لینا کا ہاتھ تھام لیا اور محبت بھری نگاہوں کے ساتھ حرفِ مدعا زبان پر لے آیا۔

نرم، ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی جس میں باغ کے پھولوں کی خوشبو بسی تھی۔

''لینا، میں پاگل ہو جاؤں گا۔'' اس نے کہا۔ ''مجھے یہ اعزاز بخش دو... مجھے شوہر کی حیثیت سے قبول کر لو۔''

اس کی آواز شدتِ جذبات سے بھرا گئی۔ وہ بے صبری سے لینا کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

''اوہ ایڈی۔'' لینا نے لبوں کی مہر توڑی۔ ''میں تو مدت سے منتظر تھی کہ آخر کب تم اپنا دل مجھے پیش کرو گے۔''

اس کی آواز بھی لڑکھڑا رہی تھی۔

''دل؟'' وہ بولا۔ ''صرف دل... میری روح، میری زندگی... سب کچھ تمہارے قدموں میں پڑا ہے۔''

☆☆☆

وہ خوامخواہ ہی ہچکچاتا رہا۔ وہاں تو آگ برابر کی لگی ہوئی تھی۔ آناً فاناً دونوں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ یہ ایک پرانے انداز کی مگر دلکش شادی تھی۔

ہنی مون کے لیے دونوں نے نیاگرا آبشار کا انتخاب کیا۔ وہاں سے واپسی پر دونوں نے قدیم طرز کی قلعہ نما عمارت میں رہائش اختیار کر لی۔ وہ مینشن سابقہ شوہر کی وراثت سے لینا کے حصے میں آیا تھا۔

ایڈی کو دہری خوشی ملی تھی۔

رہائش گاہ اس کے ذوق کے مطابق تھی جبکہ لینا میں اسے ہر وہ چیز ملی جس کی وہ خواہش کر سکتا تھا۔

بس ایک کمی تھی کہ لینا کو اس کے قدیم اشیا جمع کرنے کے شغل سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ویسے بھی یہ خواہش عملی زندگی کے تقاضوں کے برعکس تھی۔ ایڈی کی مسرت سے بھرپور نئی زندگی میں اس شوق کے سبب کوئی خلل نہیں پڑا تھا۔

وہ اپنے مشغلے سے گہرا لگاؤ رکھتا تھا اس لیے فطری طور پر اس کے دل میں کبھی کبھی یہ خواہش جاگتی کہ لینا بھی اس کے نوادرات کے مجموعے کو سراہے... لیکن دل ہی دل میں وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ایسا ہونا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ فریقِ ثانی ہم ذوق نہ ہو۔ لینا بے چاری کیونکر نوادرات کی حیثیت یا قدر و قیمت کو سمجھ سکتی تھی۔

ایک روز ایڈی نے محبت بھرے لہجے میں اسے پکارا۔ ''لینا ڈارلنگ! میری جان میری ہابی تمہارے لیے اجنبی ہے۔ شاید تمہاری بھی کوئی ہابی ہو جسے جان کر مجھے خوشی ہو گی۔ ایسا ہے تو تم مجھے ضرور بتاؤ۔'' ایڈی کی آواز میں اشتیاق تھا۔

لینا دلکش انداز میں مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ دل کھینچ لیتی تھی اور ایڈی اس مسکراہٹ کا گرویدہ تھا۔ ''کچھ خاص نہیں... بس ایسے ہی۔''

لینا نے مبہم جواب دیا۔

''یعنی کچھ نہ کچھ تو ہے؟''

''شاید ہر کسی کی کوئی نہ کوئی ہابی ہوتی ہے۔'' اس نے پھر گول مول جواب دیا۔

ایڈی نے سوچا کہ یہ عورتوں کا انداز ہے۔ یہ عجب پہیلی ہوتی ہیں جنہیں سمجھنا کبھی بھی آسان نہیں ہوتا۔ اس نے موضوع تبدیل کر دیا۔

☆☆☆

ایک روز اس نے ایک کمرا دریافت کیا جو مقفل تھا۔ کمرے کا دروازہ کافی وزنی تھا۔ اس کا تجسس فطری تھا۔ اس نے لینا سے دریافت کیا۔

لیکن لینا نے پھر غیر واضح انداز اختیار کیا اور مبہم سا جواب دے کر موضوع بدلنے کی کوشش کی تو ایڈی کے تجسس کو مہمیز ملی اور اس نے مزید اصرار کیا تو لینا بسورنے لگی۔

''ارے جانِ من، اس میں رونے کی کیا بات

ہے؟'' ایڈی نے اس کی دل جوئی کے انداز میں کہا۔ ''شاید تمہارا مشغلہ کچھ زیادہ ہی ذاتی ہے۔'' وہ مسکرایا۔ ''خیر چھوڑو دفع کرو۔'' اس نے لینا کی پیشانی پر بوسا دیا۔

پھر بھی اس نے مقفل کمرے کا ذکر نہیں چھیڑا لیکن اندر ہی اندر اس کا تجسس پہلے سے زیادہ بڑھ چکا تھا۔ وہ حیران بھی تھا۔ بالآخر اس نے فیصلہ کر لیا کہ لینا کی بے خبری میں یہ راز وہ خود دریافت کرے گا۔ آخر کمرے میں کیا ہے؟ لینا کی نامعلوم ہابی یا کچھ اور؟ اس کے ذہن میں کسی قسم کا شک یا منفی سوچ نہیں تھی۔ تاہم وہ پختہ ارادہ کر چکا تھا۔

ایک روز وہ لینا اور ملازم کو خوابیدہ چھوڑ کر مشن پر روانہ ہو گیا۔ اسے شرمندگی بھی محسوس ہو رہی تھی مگر تجسس اسے اکسا رہا تھا۔

اس شام کو اسے لینا خاموش خاموش سی لگی تھی۔

''کیا بات ہے جانِ عزیز!'' اس نے لینا کو آغوش میں لے کر استفسار کیا۔ ''میری پیاری بیوی اتنی خاموش کیوں ہے؟''

''میں تمہیں بتانا نہیں چاہتی۔'' اس نے اداسی سے جواب دیا۔ ''آج وہی رات ہے جب میرے سابق شوہر نے اچانک اس دارِ فانی سے کوچ کیا تھا۔ وہ... وہ...'' یہاں تک پہنچ کر وہ سسکنے لگی۔

''اوہ ہنی... مائی ڈیئرسٹ...'' اس نے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے اس کی ریشمی زلفوں کو سہلایا۔ ''قدرتی بات ہے، میں سمجھتا ہوں۔ تمہیں اب آرام کرنا چاہیے۔''

لینا نے ایک حزنیہ نظر شوہر پر ڈالی اور اسے پیار کر کے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ ایڈی نے اندازہ لگایا کہ لینا کا سابق شوہر غالباً غیر فطری موت کا شکار ہوا تھا جس پر وہ بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔ یقیناً اس کے ذکر سے اسے اذیت ہوتی ہو گی۔ شاید کوئی حادثہ وغیرہ رہا ہو گا۔

لینا نے ابتدائی ملاقاتوں میں ہی اسے بتا دیا تھا کہ وہ شادی کے تجربے سے گزر چکی ہے اور اس کا سابق شوہر زندگی کی دوڑ میں اسے دغا دے کر تنہا چھوڑ گیا۔ ایڈی کے لیے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ لینا نے اگر دس شادیاں بھی کی ہوتیں تب بھی وہ اس کی محبت کو اپنے دل سے نہیں نکال سکتا تھا۔ اس کے لیے سب سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ لینا کا مسحور کن، خوشبو بکھیرتا ہوا حسین پیکر اب ہر رشتے کی قید سے آزاد اور اس سے بھی بڑھ کر، اس کی طرف مائل تھا۔

اس گفتگو کے چند گھنٹے بعد ایڈی مقفل کمرے کے بھاری دروازے پر کھڑا تھا۔ اس نے فلیش لائٹ کے بجائے موم بتی ساتھ رکھی تھی۔

عجیب قسم کا تالا تھا۔ اسے کمرے میں داخل ہونے کے لیے اندازے سے زیادہ جدوجہد کرنی پڑی۔ اندر داخل ہو کر اس نے دروازہ عقب میں دھیرے سے بند کر دیا۔ موم بتی کا شعلہ فلیش لائٹ کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ تاہم اس کی مدھم زرد روشنی ایڈی کے لیے کافی ثابت ہوئی۔ کچھ دیر بعد اس کی آنکھیں بھی تاریکی سے مانوس ہو گئیں۔ کمرا قدیم طرزِ تعمیر کا نمونہ تھا... اس نے دلچسپی سے اطراف کا جائزہ لیا۔ سب سے عجیب چیز انوکھی بناوٹ کے وہ جار تھے جو ایک شیلف میں قطار کی صورت میں رکھے ہوئے تھے۔ ان میں کسی قسم کا گدلا محلول بھرا ہوا تھا... ہر جار کے محلول میں کوئی ناقابلِ شناخت چیز موجود تھی۔

دہشت ناک وہم نے ایڈی کے تصور میں یلغار کی۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر داخل ہو گئی۔ شمع اونچی کر کے اس نے غور سے ان میں سے ایک جار میں موجود شے کو جانچا تو گُن ہو کے رہ گیا۔ اس نے دوسرا جار جانچا، پھر تیسرا... چوتھا... اس کے چہرے کی رنگت میں زردی شامل ہوتی چلی گئی اور دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ وہ سائز میں ضرور چھوٹے بڑے تھے لیکن سب ہی ایک جیسے اور مخروط نما تھے۔ وہ کل چھ تھے۔ آٹھ میں سے دو جار خالی تھے۔ ان میں صرف گدلا محلول سا کن تھا۔

☆☆☆

دفعتاً شمع کا کمزور شعلہ بھڑکا۔ ہوا کا جھونکا تھا... جیسے کسی نے کمرے کا دروازہ کھولا ہو۔ ہوا کے ساتھ اس کی جانی پہچانی پسندیدہ خوشبو بھی تھی۔ شعلہ بجھنے سے پہلے وہ تمام تر صورتِ حال کا ادراک کر چکا تھا جو کہ نہایت خوفناک تھی۔

وہ ساکت کھڑا رہ گیا۔ تاریکی میں موت کا سکوت اور خوف کا راج تھا... اسے ٹیرس کی وہ شام یاد آگئی، جب لینا نے کہا تھا۔

''میں تو مدت سے منتظر تھی کہ آخر کب تم اپنا دل مجھے پیش کرو گے؟''

تو کیا وہ ایڈی سے زیادہ اس کے دھڑکتے ہوئے دل کی طلب گار تھی... اس کے ذہن میں یہ خیال کوندا اور وہ چکرا کر وہیں پختہ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

اس کی پسندیدہ، دھیمی دھیمی خوشبو اس کے بہت قریب آکر دل فریب مسکراہٹ کے ساتھ مجسم ہو گئی تھی!

جواری

احمد اقبال

نویں قسط

زندگی کی بساط پر اندھا جوا کھیلنے والے کھلاڑی کی ہوش ربا داستان
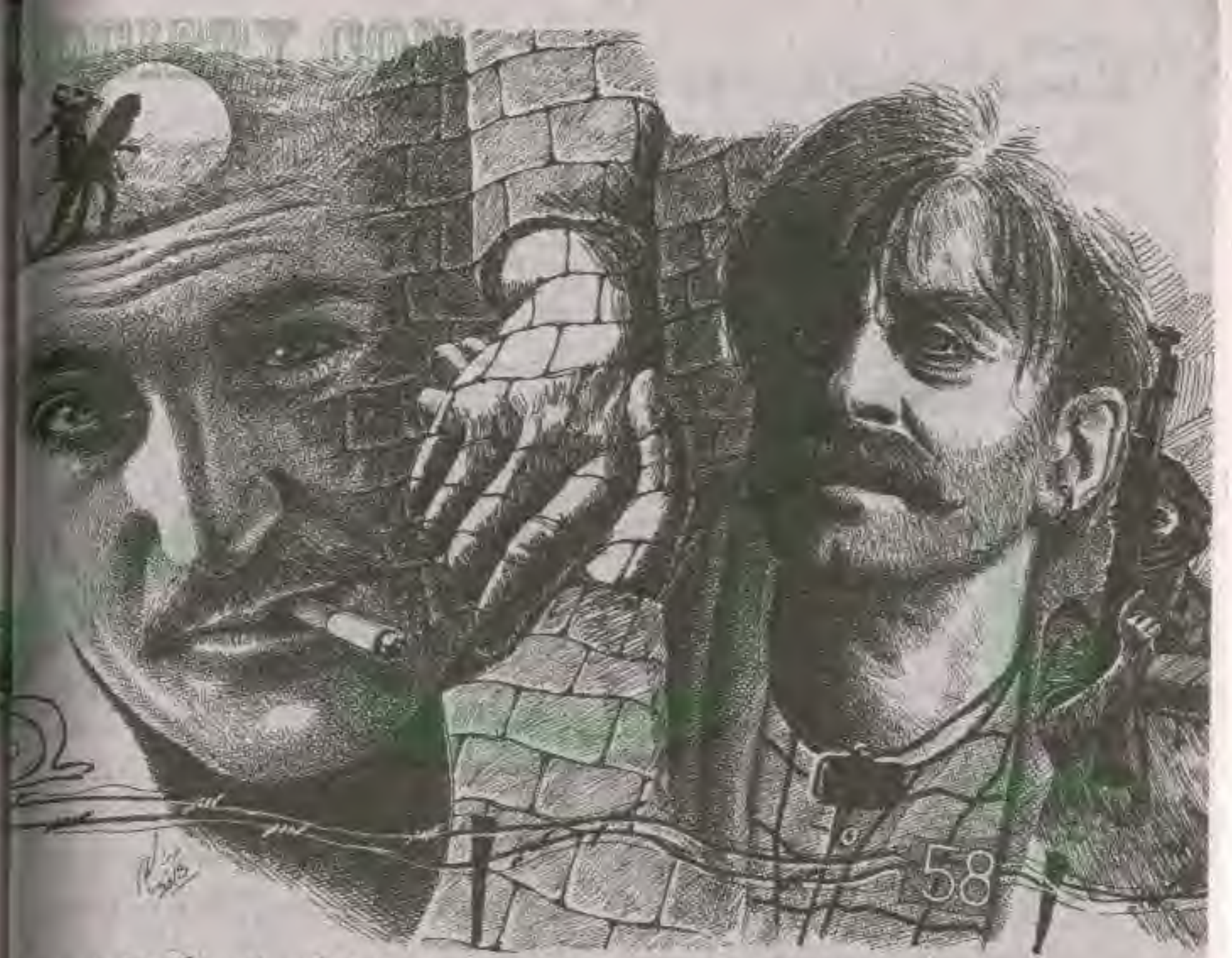
سکسپیئر کا کہا ہوا ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے کہ زندگی ایک اسٹیج ہے جس پر ہم سب اداکار ہیں جو اپنا اپنا کھیل دکھا کے چلے جاتے ہیں... ہر اداکار زندگی کے آغاز سے انجام تک ایک جوا کھیلتا ہے... جس میں خطرات اور حادثات کی بازی پہلی سانس کے ساتھ لگتی ہے اور آخری سانس تک جاری رہتی ہے... تخلیق کے نقائص ہوں یا بیماریاں... وہ زندگی کے ہر نومولود کو شکست سے دوچار کرنا چاہتے ہیں مگر زندگی مقابلہ کرتی ہے اور یہ کھیل انسانی تدبیر اور نوشتۂ تقدیر کے ساتھ زندگی کے تمام اہم اور غیر اہم فیصلوں میں جاری رہتا ہے... خوشی... غم... نفع... نقصان... دوستی... دشمنی... محبت اور نفرت... سب ہار جیت کے وہ روپ ہیں جن سے ہر انسان ایک جواری بن کے سامنا کرنے پر مجبور ہوتا ہے... جواری... انسانی جذبوں کے ردعمل سے جنم لینے والی وہ کہانی ہے جو نگر نگر گلی گلی اور گھر گھر نئی بھی لگتی ہے اور پرانی بھی... آپ بیتی بھی اور جگ بیتی بھی... تجسس اور حیرت... سارے رنگ... جادو اثر...

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

ایم اے پاس خاور سکھر جیل میں سزائے موت کا منتظر تھا۔ اس پر قتل کا جھوٹا الزام ایک گینگ لیڈر نادر شاہ کے ایما پر عائد کیا گیا تھا۔ وہیں ڈاکوؤں کے گروہ کا سردار گاما رستم بھی پھانسی کا منتظر تھا۔۔۔ اس کے ساتھی جیل پر حملہ کر کے اسے چھڑا لے جاتے ہیں۔ گاما، خاور کو ساتھ لے جاتا ہے۔ خاور ایک پرانی غیر آباد حویلی میں پناہ لیتا ہے۔ خاور کو اس حویلی کے کھنڈر میں نورین ملی جو لباسِ عروسی میں تھی اور اپنے شوہر کو قتل کر کے آئی تھی۔ اس کی پرورش کرنے والے چچا نے نورین کی تمام جائداد اور دولت پر قبضہ کر لیا تھا اور زبردستی اس کو اپنے پاگل بیٹے سے بیاہ دیا تھا۔ پاگل چچازاد کی دست درازی سے بچنے کے لیے نورین نے اسے قتل کر دیا اور کھڑکی کے راستے آسیب زدہ مشہور حویلی میں آ گئی۔ کسی نے اسے دیکھا تو بدروح سمجھ کے بھاگ گیا۔۔۔ نورین یہاں سلمان خان نامی ایک شخص سے چھپ کر ملتی تھی۔ اسے پتا تھا کہ وعدے کے مطابق وہ یہاں موجود ہوگا لیکن وہ نہیں آیا تھا۔ نورین پریشان تھی کہ صبح پولیس اسے قتل کے الزام میں گرفتار کرلے گی۔ وہیں اس کی ملاقات خاور سے ہوئی۔ اس کھنڈر کی دوسری منزل پر خاور کو سلمان کی لاش نظر آئی۔ وہ اپنا وعدہ نبھانے پہنچا تھا لیکن قتل ہو گیا تھا۔ تلاشی پر خاور کو اس کی جیب سے دس لاکھ نقد ملے۔ خاور نے اپنے کپڑے اسے پہنائے اور خود اس کے کپڑے پہن کر رقم جیب میں ڈال لی۔ اس نے اپنا حلیہ بدلا اور نورین کو برقع میں چھپا کر لے گیا۔ وہ اکیلا نورین کے گھر گیا تو اسے علم ہوا کہ نورین پر شوہر کے قتل کا الزام ہے جبکہ نورین نے نکاح نہ ہونے کے باعث اسے تسلیم نہیں کیا تھا۔ خاور نے نورین سے جھوٹ بولا کہ سلمان جو پہلے سے بے روزگار تھا، نوکری ملنے پر دبئی چلا گیا تھا۔ باہر جانے میں خطرہ تھا کیونکہ خاور کے جیل سے فرار کی اطلاع کے بعد نادر شاہ نے اپنے کارندے اسے تلاش کرنے پر لگا دیے تھے جو کتوں کی طرح ہر جگہ اس کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ دوسرا خطرہ پولیس سے تھا جن کو خاور کے علاوہ نورین کی بھی تلاش تھی۔ خاور، نورین کو لے کر ایک ہوٹل میں ٹھہر گیا۔ تاہم وہاں غیر محفوظ ہونے اور نورین کی اچانک طبیعت خراب ہونے پر وہ ایک اسپتال میں آ گئے۔ خاور اور نورین وہاں سے نکلے۔ ہر بڑے ریلوے اسٹیشن، بس اسٹینڈ اور ائرپورٹ پر وہ پکڑے جا سکتے تھے چنانچہ انہوں نے پنجاب کا رخ کیا اور کئی مقامات پر ٹرین بدلتے رہے۔ اس کے باوجود نادر شاہ کے بندوں نے جو ویٹر کی وردی میں تھے، خاور کو پہچان لیا۔ ایک کو خاور نے چلتی ٹرین سے کودنے پر مجبور کر دیا۔ دوسرے نے نورین اور خاور کو حفاظت اور اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ جذباتی نورین اسے اپنا بھائی تسلیم کر چکی تھی۔ خاور بھی اسے معاف کرنے پر مجبور ہو گیا، اس کا اصل دشمن نادر شاہ تھا۔ خانپور کے ویٹنگ روم میں رات گزار کے وہ دونوں ایک پرائیویٹ کیری ڈبے سے لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ نازی نے انہیں رات بھر کے لیے کسی اجنبی قصبے کے باہر ایک کچے خالی گھر میں رکھا اور انہیں تسلی دی کہ صبح وہ لاہور کے مضافات میں پہنچ جائیں گے۔ لیکن صبح جاگنے پر نادر شاہ کے آدمی آ گئے اور نورین اور خاور کو لے گئے لیکن راستے میں نورین نے جانے کیا کیا کہ گاڑی حادثے کا شکار ہو گئی۔ خاور بچ گیا مگر نورین کا پتا نہ چل سکا۔ خاور نے رحیم بخش نامی شخص کے گھر میں پناہ لے لی۔ مقامی چودھری رحیم بخش کی بیٹی سے شادی کا خواہش مند تھا۔ رحیم بخش کو قتل کر دیا گیا اور ریشم اور خاور کو چودھری کے کارندے اغوا کر لے گئے۔ خاور کو قید کر دیا گیا تاہم وہ اکبر کے بھائی انور کے ساتھ رہا ہو گیا اور انور نے حویلی پر اپنا اختیار حاصل کر لیا۔ ریشم بھی حویلی میں ہی تھی۔ چودھری انور نے اکبر کو قید کر دیا۔ اکبر اور خاور کو حویلی سے نکال کے دوسری جگہ پہنچایا گیا۔ تاہم کچھ وقت گزرنے کے بعد دوبارہ حویلی میں قید کر دیا گیا۔ ادھر بڑے چودھری کو دل کا دورہ پڑا لیکن اس نے اسپتال میں داخل ہونے سے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ تمام کام گھر پر ہی کیے جائیں۔ خاور اور انور نے اسپتالوں کو ایکوپمنٹ سپلائی کرنے والی کمپنی سے رابطہ کیا۔ وہیں ایک شخص نے خاور کو فریدالدین کی حیثیت سے شناخت کیا تاہم خاور نے انکار کر دیا۔ انور اسے لے کر شناختی کارڈ آفس گیا اور ملک سلیم اختر کے نام سے نیا شناختی کارڈ بنوا دیا۔ ایکوپمنٹ کمپنی کے اہلکار سازوسامان لے کر حویلی پہنچ گئے اور بڑے چودھری کے کمرے کو اسپتال جیسا بنا دیا۔ کمپنی کے ورکر نے خاور کو فریدالدین کی حیثیت سے پہچان لیا مگر اس بات کو راز میں رکھنے کا وعدہ کیا۔ حویلی میں کوئی سازش ہو رہی تھی، ایک گارڈ کی موت کے بعد انور نے تمام گارڈ بدلنے کا فیصلہ کیا۔ قبرستان میں ایک سرنگ کھودی گئی تھی جو پوری ہونے پر انور کے کمرے میں جا نکلتی۔ تاحال یہ سازش بے نقاب ہو گئی تھی۔ ادھر اکبر کے سسر نے خاور عرف ملک سلیم کو زبردستی اٹھا لیا اور آستانے کے تہ خانے میں قید کر دیا۔ وہیں خاور کو نورین نظر آئی۔ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھی تھی۔ رات کو کچھ نامعلوم لوگوں نے آستانے پر دھاوا بول دیا۔ فائرنگ ہونے لگی۔ خاور کے کمرے کے باہر موجود محافظ گولی کا نشانہ بن گیا۔ خاور وہاں سے بھاگ نکلا اور نورین کی تلاش میں نکل گیا۔ لیکن وہ جب نورین کے گھر پہنچا جہاں نورین فاطمہ کے نام سے رہ رہی تھی تو اسے وہاں موجود نہ پایا۔ نورین کا فرضی باپ اسے لے کر شہر چلا گیا تھا۔ خاور وہیں بیٹھ گیا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

اچانک میں صحرا کا راہ گم کردہ مسافر ہو گیا تھا۔ میں نے نیم دیوانگی کی کیفیت میں اس کھلے دروازے والی ویران کوٹھری کو دیکھا جس کی ہوا میں نورین کی مہک محسوس ہوتی تھی۔ اس جواری کی طرح جو اپنا سب کچھ ہار جانے کے بعد کہ اس نے ایک غلط چال نہ چلی ہوتی تو وہ سب کچھ اس کا ہوتا جواب کسی اور کا مقدر ہوا۔۔۔ میں دکھ کے کانٹوں پر چلتا رہا کہ وقت نے پھر مجھے مات دی ہے۔ اگر میں چند دن نہیں صرف چند گھنٹے قبل یہاں پہنچ جاتا۔۔۔ جب نورین کے ماہتاب حسن سے اس کوٹھری میں اجالا تھا تو شاید یہ ناکامی اور نامحرومی اس ویران گھر میں میرا نصیب نہ ہوتی۔

کوئی کچھ بھی کہے، کچھ بھی سمجھے، میرا یقین متزلزل ہونے والا نہیں تھا کہ وہ فاطمہ نہیں نورین تھی۔ گلاب کو کسی بھی نام سے پکارو، وہ گلاب ہی رہے گا۔ تلاش کا یہ سفر رائگاں گیا تھا لیکن اس ناکامی نے مجھے بددل نہیں کیا تھا بلکہ خواہشِ طلب کو اور بڑھا دیا تھا۔

کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ ساون خان، فاطمہ کو کس شہر لے گیا ہے اور درحقیقت وہ نورین کا کسی نفسیاتی امراض کے اسپتال میں علاج کرائے گا یا اسے کسی اجنبی خودساختہ نقلی پیر کی درگاہ پر چھوڑ دے گا۔ ساون خان کا اس سے کیسا جذباتی رشتہ۔۔۔ ایسی پری جمال نوجوان لڑکی دنیا کے بازار میں فروخت کے لیے پیش کی جائے تو ساری عمر مفلسی میں گزارنے والے ساون خان کو لکھ پتی بھی بنا سکتی تھی۔

اس خیال نے مجھے خود اپنی نظر میں شرمسار کر دیا۔ آخر وہ بھی تو ہیں جو بے نام و نسب بچوں کو اپنا بنا کے وہی محبت دیتے ہیں جو سگی اولاد کو دیتے۔ کیا پتا ایسا ہی حرماں نصیب ساون خان بھی ہو جس نے اولاد کی آرزو میں عمر بتا دی ہو اور اب اگر خدا نے رحم کھا کے اسے ایک جوان پلی پلائی بیٹی دے دی ہے تو وہ قدرت کے اس انعام کو سب سے بچا کے اور سب سے چھپا کے کیوں نہ رکھے۔۔۔

اچانک میرا خیال پیر صاحب کی طرف گیا اور میرے تصور میں وہ منظر ابھرا جب میں نے نورین کو فاطمہ کے نام سے دوسری بہت سی مظلوم اور معذور عورتوں کے درمیان دیکھا تھا۔ وہ فاطمہ کو ہر جمعرات خود درگاہ پر لے جاتا تھا کیونکہ اسے پیر صاحب کے دستِ شفا پر بھروسا تھا۔۔۔ لیکن پھر کسی نے اسے سمجھایا یا اس نے خود سمجھ لیا کہ کسی بھی جمعرات کی مبارک رات میں فاطمہ کے دماغ کے ساتھ اس کے جسم کی طہارت اس سے چھن جائے گی۔۔۔ وہ فریاد لے کر کہاں جائے گا اور فریاد سے وہ فاطمہ تو واپس نہیں ملے گی جس کا وجود قطرۂ شبنم کی طرح پاکیزگی رکھتا تھا چنانچہ وہ خاموشی سے فاطمہ کے ساتھ کسی کو کچھ بتائے بغیر کسی نامعلوم سمت میں نکل گیا۔

جب میں دل شکستہ اس نیم تاریک کوٹھری سے باہر آیا تو دکھی ضرور تھا، مایوس نہیں۔ میرا یقین، میرے ساتھ تھا کہ اپنا جنونِ عشق یونہی سلامت رہے تو ایک دن میں نورین کو پالوں گا۔ بے شک دنیا بہت بڑی اور بہت بُری جگہ ہے مگر نصیب مہرباں اور خدا ساتھ ہو تو کامیابی کی منزل کا سراغ مل ہی جاتا ہے۔

باہر اب صبح صادق کا اجالا پھیل رہا تھا۔ آسمان پر صرف صبح کا تارا روشن رہ گیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ نورین کی آنکھوں کی چمک ہے۔ اس کی مسکراہٹ ہے جو مجھے حوصلہ دے رہی ہے، بلا رہی ہے۔ میں لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھا اور چلتا گیا، یہاں تک کہ نہر آ گئی۔ کنارے سے نیچے اتر کے میں نے بہتے پانی سے منہ دھویا اور آگے تک جھکے ہوئے ایک درخت کی چھاؤں میں لیٹ گیا۔

افق سے طلوع ہونے والے سورج کا اجالا آسمان کی بیکراں وسعت میں پھیلتا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی جیسے میرے ذہن سے ناکامی اور مایوسی کا اندھیرا بھی چھٹ رہا تھا۔ گزری ہوئی رات کا سارا منظر اپنی تمام حیرت ناک تفصیل کے ساتھ میرے تصور میں کسی فلم کی طرح چلنے لگا۔ وہ معمولی معاوضے پر بڑی عقیدت سے پیر صاحب کی حفاظت پر مامور تھا مگر جب گولی آئی تو اس پر خود محافظ کا نام لکھا ہوا تھا۔ اسے میں دوسری طرح دیکھتا تو سمجھتا کہ میرا راستہ صاف کرنے کے لیے قدرت نے اسے میری راہ سے ہٹا کے راہِ عدم پر ڈال دیا۔

بظاہر پیر صاحب کے گھر اور خانقاہ پر حملے کا سبب بھی غیر واضح تھا اور حملہ آوروں کا بھی کچھ پتا نہ تھا۔۔۔ میں صرف اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ پیر صاحب کی دختر نیک اختر کو لے جانا چاہتے تھے۔ روزینہ کے متعلق مجھے خاندانی ذرائع سے معلوم ہوا تھا کہ وہ اکبر سے منسوب تھی کیونکہ وہ خود بھی چھوٹی تھی اور اب وہ انور سے شادی پر کسی طرح رضامند نہ تھی جو عمر میں اصل منگیتر سے بڑا تھا۔ یہ تقدیر نے عجب چکر چلایا تھا کہ جو بڑے سے منسوب تھی، وہ چھوٹے کو تھما دی گئی تھی۔ شاہینہ تمام عمر خوابوں اور خیالوں میں انور کو چاہتی اور پوجتی رہی مگر آخری وقت میں اسے اکبر کی تحویل میں دے دیا گیا۔ یہی حادثہ روزینہ کے ساتھ ہوا۔ اچانک اسے پتا چلا کہ اب اس کا مستقبل انور سے وابستہ کر دیا گیا ہے چنانچہ اسے اکبر کی محبت کا سوئچ آف کر کے اپنے جذبات کا کنکشن انور سے جوڑنا ہوگا۔ ظاہر ہے یہ جسمانی طور پر ممکن ہو سکتا ہے، جذباتی طور پر ناممکن ہی رہتا ہے۔

مجھے اندازہ نہ تھا کہ اب شاہینہ کے دل میں انور کے لیے تمام عمر پرورش پانے والی محبت کا کتنا اثر باقی ہے اور کہاں تک وہ اکبر جیسے شوہر کی طرف اپنے جذبات کا رخ موڑنے میں کامیاب ہے لیکن روزینہ کے بارے میں شک و شبے کی کوئی بات نہ تھی۔ وہ اس تبادلے کے حکم کو مسترد کر چکی تھی اور شاید یہ اس لیے بھی ممکن ہوا تھا کہ اسے کسی اور نے پسند کر لیا تھا۔ یہ والدین کے حکم پر کی جانے والی ازدواجی محبت نہ تھی۔ کسی ماموں زاد نے روزینہ کو دیکھ اور جان کر اور اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کے اظہارِ محبت کیا تھا

اور یقیناً وہ اس قابل سمجھا گیا تھا کہ روزینہ خود بھی اس سے محبت کر سکے۔ یہ انہونی بات ہو گئی تھی۔

مجھے اس ماموں زاد کے نام کا بھی پتا نہ تھا۔ یقیناً وہ ان جاگیرداروں کا ہم پلہ ہو گا۔ دولت میں بھی اور طاقت میں بھی... پیر صاحب نے مجھے عملی زندگی کا درس دے کر ثابت کیا تھا کہ اس عمر کی محبت صرف فلموں میں ممکن ہے... نہ میں نے ان سے کہا تھا اور نہ انہوں نے اعتراف کرنا ضروری سمجھا تھا کہ روزینہ اب کسی اور کی محبت میں مبتلا ہے اور اسی سے شادی کی آرزو مند... یہ اس عالی نسب باپ کی خاندانی عزت کا مسئلہ تھا۔ اگر روزینہ کو چاہنے والے ماموں زاد نے اس کا ہاتھ مانگا تھا تو یہ معاملہ وہیں دبا دیا گیا تھا۔ اس ماموں زاد سے کیا کہا گیا اور کس طرح روزینہ کو سمجھایا گیا' یہ بات باہر کسی کو معلوم نہیں ہو سکتی تھی۔

ظاہر ہے اس کے بعد روزینہ کی پہرے داری سخت کر دی گئی ہو گی اور اس ماموں زاد کے لیے خانقاہ کی طرف آنے والے تمام راستوں پر پہرے بٹھا دیے گئے ہوں گے۔ اس وارننگ کے ساتھ کہ وہ آئے گا تو اپنے پیروں پر... مگر جائے گا چار کندھوں پر یا پھر یوں غائب ہو گا کہ قیامت تک اس کا سراغ کسی کو نہ ملے گا۔ شاید ایسے ہی حالات نے اس ماموں زاد کو مجبور کیا کہ اب وہ اپنی محبوبہ کو بزورِ بازو اس قید خانے سے نکال کے لے جائے... پیچھے سے آنے والی آوازوں اور فریاد و فغاں سے اندازہ بھی ہوتا تھا کہ روزینہ اس رات کی سحر ہونے سے پہلے اپنے باپ کی عزت کا جنازہ اٹھا کے نکل جائے۔

یہ اندازوں کی غلطی تھی یا مخبری کہ ایسا نہ ہو سکا۔ اب یہ تو بعد میں ہی معلوم ہو گا کہ اس عاشق جانباز ماموں زاد نے جان کی بازی لگائی تھی تو وہ ہار آیا جیت نہ سکا تو جان بچا کے لوٹ گیا۔ آگے روزینہ پر کیا گزرے گی جو سہاگن بننے سے پہلے ہی بیوہ ہو گئی تھی۔ کیا اب اپنا جسم انور کے حوالے کر کے بھی وہ اس کی شریک حیات ہو گی یا نہیں... کم سے کم پیر صاحب کے لیے اس کی کوئی اہمیت نہ تھی کہ وہ انور سے اپنے ماموں زاد جیسی محبت کرتی ہے یا نہیں...

آہستہ آہستہ آسمان کی بیکراں وسعت میں کونجوں کی ایک ڈار اڑتی گزری... ایک سمت میں ترتیب برقرار رکھتے ہوئے یکساں رفتار سے پرواز کرنے والے ان پرندوں کو دیکھ کے مجھے اپنی زندگی کا خیال آیا جس کی کوئی سمت نہ تھی، کوئی منزل نہ تھی اور جو اب کسی مقصد کے بغیر ایک لاحاصل جدوجہد ہو گئی تھی۔ میرے ساتھ جو بھی ہو رہا تھا، وہ زندگی مجھ سے کرا رہی تھی۔ سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات... ایک وقت تھا جب اپنے مقتول بھائی کے خون کا بدلہ لینے کی خواہش نے مجھے پاگل کر رکھا تھا اور اس کے قاتل نادر شاہ کو قتل کرنے کے چکر میں خود میں تختۂ دار تک پہنچ گیا تھا... پھر جیسے دستِ قدرت نے میری منزل بدل دی... اپنے بھائی کے بے گناہ لہو کی پکار کی طرف سے اپنے کان بند کر کے میں خود زندہ رہنے کی خواہش میں جان ہتھیلی پر رکھ کے جیل سے فرار ہوا تو انتقام کی جگہ نورین کی محبت میری منزل بن گئی۔ تقدیر نے پھر کانٹا بدلا اور اب نہ میں چودھری فریدالدین تھا اور نہ خاور رہا تھا۔ میں ملک سلیم اختر ہو گیا تھا۔

آخر میں کیوں سوچ رہا ہوں کہ روزینہ کا کیا ہو گا اور اس جاگیر کی ملکیت حاصل کرنے کی خاندانی جنگ میں جیت اکبر کی ہو گی یا انور کی... اجنبیت کے سوا میرا کسی سے کوئی رشتہ ہی نہیں تو رقابتوں کی اس بازی میں ہر جواری مجھے کیوں داؤ پر لگا رہا ہے؟ ایک کی ہار دوسرے کی جیت سے میرا تعلق اس پانسے جیسا ہی ہے جو ہر جواری کے ہاتھ میں استعمال ہوتا ہے۔ اس خیال نے مجھ پر غلبہ پالیا کہ مجھے خود کو اس کھیل سے الگ کر لینا چاہیے۔ آخر میری اپنی بھی ایک زندگی ہے جو یوں بے مقصد نہ تھی۔ یہ خود میں ہوں جس نے اسے بے مقصد بنا لیا لیکن ابھی کچھ بگڑا نہیں... مجھے اپنے لیے زندگی کی ایک سمت متعین کر لینی چاہیے اور یہ سمت اب نورین کی محبت ہو سکتی تھی۔

سورج نکل آیا تھا۔ پیڑ کی چھاؤں میں ہونے کے باوجود اس کی سنہری کرنیں میرے چہرے کو روشن کر رہی تھیں۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ خود سے جائزہ لینے پر مجھے اپنے پیچھے تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر وہ نہر کا پل نظر آیا جو مقامی لوگ اِدھر سے اُدھر آنے جانے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا میں پل پر پہنچا۔ نہر کی چوڑائی بیس فٹ کے قریب ہو گی۔ اس پر دو درختوں کے تنے چار فٹ کے فاصلے سے رکھ دیے گئے تھے اور ان کے درمیان تختے جوڑ کر پیدل یا سائیکل پر جانے والوں کے لیے راستہ بنا دیا گیا تھا۔ ایک انچ موٹے تختے اس سے زیادہ وزن برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

پل پر ٹھہر کے میں نے دونوں کناروں کے ساتھ پھیلی ہوئی زمین کو دیکھا... میں گرد و نواح کے جغرافیے سے تو کسی حد تک واقف ہو گیا تھا مگر مجھے یہ اندازہ نہ تھا کہ ایک بھائی کی جاگیر کی حد کہاں تک ہے اور دوسرے کی کہاں تک...

نہر ان دونوں کے درمیان حدِ فاصل تھی جو ایک اچھی بات تھی ورنہ آئے دن ان کے درمیان سرحدی خلاف ورزی کے جھگڑے سر اٹھاتے۔ اس تنازعے میں زمینوں پر کاشت کرنے والے غلام زادے اور نمک خوار کم ذات رعایا کام آتے۔

اس گاؤں کا جہاں سے فاطمہ یا نورین اب کسی نامعلوم سمت میں ہجرت کر گئی تھی پیر صاحب کے آستانے تک فاصلے کا مجھے کچھ اندازہ نہ تھا۔ میں نے گزشتہ شب کچھ فاصلہ پیدل طے کیا تھا اور کچھ اس کھٹارا سائیکل پر جو بالآخر پنکچر ہو گئی تھی۔ رات کے اندھیرے میں جان بچانے کے لیے بھاگتے ہوئے میں خوف سے بدحال تھا اور میں نے سیدھا راستہ بھی نہیں لیا تھا ورنہ فاصلہ کم تھا۔ غور سے پیچھے دیکھنے پر مجھے درختوں کے ایک جھنڈ کے اوپر آستانے کے گنبد پر لہراتے جھنڈے کی جھلک سی دکھائی دی۔ شاید یہ ایک کلومیٹر کا فاصلہ تھا۔ نہر کے دوسرے کنارے پر اتنی ہی مسافت پر چودھریوں کی حویلی ہو گی۔

میں چلنے ہی والا تھا کہ مجھے ایک دیہاتی اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں گنا تھا جو وہ اپنے مضبوط دانتوں سے چھیل چھیل کر چوس رہا تھا۔ میرے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے مجھے بڑی مشتبہ اور سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ان بستیوں کے مکین کئی نسلوں سے یہاں آباد تھے اور ایک دوسرے کو صورت سے ہی نہیں، نام سے بھی جانتے تھے۔ اس کے لیے میں اجنبی ہی تھا مگر نہ جانے کیوں اس نے مجھ سے کوئی سوال کرنا ضروری نہیں سمجھا۔

وہ چند قدم دور تھا کہ میں نے اسے روکا۔ ”بات سنو... تم یہاں کے رہنے والے ہو... اس گاؤں کے...؟“

وہ پلٹ کے رک گیا۔ ”آہو جی... یہ چک چھ سو ستاسی ہے۔“

”نام کیا ہے تمہارا؟“ میں نے اپنا رویہ دوستانہ رکھا تاکہ اسے تفتیش کا شبہ نہ ہو۔

”نور محمد۔“ اس نے بلاتذبذب کہا۔

”تم ساون خان کو جانتے ہو... اسی گاؤں کا رہنے والا تھا؟“

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ”ساون خان... جو جیل میں تھا... ابھی دو سال ہوئے چھُٹ کر آیا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”یہ تو مجھے نہیں معلوم... حلیہ بتا سکتا ہوں۔“

میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی اس نے گنا چوسنا ملتوی کیا اور اسے کسی بندوق کی طرح کندھے پر رکھ لیا۔ ”وہی جی... آپ کیوں پوچھتے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”میں اس سے ملنے آیا تھا... معلوم ہوا کہ وہ گاؤں سے چلا گیا ہے۔“

”چلا گیا ہے... کہاں چلا گیا ہے؟“ وہ اس انکشاف پر حیران ہوا۔

”یہ تو کوئی نہیں جانتا... پرسوں رات وہ خاموشی سے نکل گیا تھا... اس کے گھر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے دیکھ لیا... تم کیا جانتے ہو اس کے بارے میں؟“

وہ سوچ کے بولا۔ ”آپ ماما سے پوچھو... میرے ماما سے... اس کو سب پتا ہو گا۔“

”کیا وہ دوست تھے؟“

”دوست بن گئے تھے۔ پھر ایک ساتھ جیل میں رہے تھے۔ ماما پہلے آ گیا تھا جیل کاٹ کے۔“

میں نے کہا۔ ”ان کا جرم کیا تھا نور محمد؟“

”دیکھو جی... مجھے معلوم نہیں آپ کون ہو اور یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو مجھ سے... میں وہی بتا سکتا ہوں جو سنا۔ انہوں نے سب کو تنگ کیا ہوا تھا... مل کے چوریاں کرتے تھے۔“

”کیا چراتے تھے؟“ میں نے حیرانی سے کہا۔

”کسی کی مرغی... کسی کی بکری... ایک بار گائے بھی لے آئے تھے کہیں سے اور اسے کاٹ کے گوشت شہر میں بیچ دیا تھا۔ میں نے دیکھا کچھ نہیں... صرف سنا ہے... ادھر نگی کمہارن رہتی ہے... اس کے ساتھ۔“ وہ رک گیا۔

میں نے اس دلچسپ کیس کی تفصیل جاننے کی کوشش نہیں کی ورنہ وہ باتونی شخص سنی سنائی کو چشم دید بنا دیتا۔ ”پکڑے کیوں گئے تھے آخری بار... جس کی وجہ سے انہیں جیل ہوئی تھی؟“

اس نے پھر کہا۔ ”جھوٹ سچ رب جانے... یہ جو نگی ہے نا بڑی بدذات ہے۔ جب سے اس کا خصم جانو کمہار سانپ کے کاٹنے سے مرا، اس نے اپنا کام چھوڑ کر یہ کام شروع کر دیا ہے۔ برتن بھانڈے بناتی نہیں... رہتی ٹھاٹ سے ہے۔ جانو کے ساتھ تھی تو ایسے کپڑے بھی نہیں پہنتی تھی۔ ماے کو گھر والوں نے نکال دیا تھا۔ وہ ساون کے ساتھ رہتا تھا۔ ساون کی گھر والی چودھریوں کی حویلی میں رہتی تھی۔ ادھر سے کہیں چلی گئی۔ دونوں کا کام دھندا کوئی نہیں تھا۔ نگی ان سے پیسے مانگتی تھی اپنے... پتا نہیں کتنا

ادھار تھا۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ اس مرتبہ عید پر اسے چاندی کے کڑے لا کر دیں گے۔ ساون کی بیوی نے راستہ بتایا تھا۔ یہ چودھری کی بھینس لینے گئے تھے، پکڑے گئے۔ سنا ہے خود ساون کی بیوی نے پکڑوا دیا تھا۔ پھر جیل تو جانا ہی تھا۔ ماما گیا تین سال کے لیے اندر... ساون نے پانچ سال جیل کاٹی۔"

وہ خود ہی رک گیا تو میں نے کہا۔ "چلو یہ تو ان کے ذاتی معاملات ہیں۔ انہوں نے جیسا کیا ویسا بھگت لیا۔ مجھے ساون کے بارے میں معلوم کرنا تھا، اس کے رشتے دار بھی تو ہوں گے یہاں؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "ساون سے کوئی ملتا نہیں تھا جیسے ماما سے کوئی نہیں ملتا۔"

"تمہارا یہ ماما... شادی شدہ ہے؟"

"لو جی... اسے کون اپنی بیٹی دے گا... یہ جو نگی کمہارن ہے اس کی ایک چھوٹی بہن تھی، وہ راضی تھی شادی پر لیکن نگی کا پتا چلا تو اس نے بھی انکار کر دیا۔ یہ تو نہیں ہو سکتا جی کہ بڑی بہن کے بعد چھوٹی سے..."

میں نے کہا۔ "کتنی عمر ہو گی تمہارے ماما کی... اور ساون کی؟"

"یہ تو پتا نہیں جی... آپ خود مامے سے مل کے جو پوچھنا ہے پوچھ لو۔ مجھے پتا ہے اس وقت وہ کہاں ہو گا۔ مگر میرا نام مت لینا آپ۔"

میں نے پیچھے چلتے ہوئے کہا۔ "میں ادھر چودھریوں کی حویلی میں رہتا ہوں... ان کا مہمان ہوں۔"

وہ ایک دم رکا اور پلٹ کر مجھے یوں دیکھنے لگا جیسے آخری بات کہتے ہی میرے سر پر سینگ نکل آئے ہیں۔

"آپ چودھریوں کے مہمان ہو؟"

"ہاں... کبھی موقع ملے تو میرے پاس آنا۔"

"لو جی ادھر کون جانے دے گا مجھے؟" وہ پھر چل پڑا۔

"تم میرا نام لینا، کہنا ملک سلیم اختر نے بلایا تھا... پھر کوئی نہیں روکے گا۔"

اس کے پیچھے پیچھے میں گاؤں کے باہر سے نکل کے ایک ٹیوب ویل پر پہنچا۔ ایک طرف آم کے درخت ایک جنگل کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ دوسری طرف ہموار زمین پر فصل پکنے کے قریب تھی۔ ٹیوب ویل بند پڑا تھا اور ایک کچے پکے کمرے کے باہر بان کی چارپائی پڑی تھی۔ مجھے یہاں تک لانے والا سو قدم پیچھے درختوں کی اوٹ میں رک گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ماما یہاں سو رہا ہو گا۔ میں نے بغیر دروازے کی کوٹھری میں جھانک کر بھی دیکھا لیکن اندھیرے اجالے میں مجھے ٹیوب ویل سے پانی کھینچنے والی موٹر اور پمپ کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔ نور محمد نے اپنے مامے کا نام رشید عرف شیدا پاپی بتایا تھا۔ پاپی اس کا تخلص نہیں تھا۔ غالباً اپنے اعمال کے باعث اسے یہ خطاب دے دیا گیا تھا۔

نور محمد جو کسی درخت کی اوٹ سے دیکھ رہا تھا، اچانک میرے قریب آ گیا۔

"وہ تو بڑی دیر سے سو کے اٹھتا ہے۔ صبح صبح کدھر نکل گیا؟"

میں نے کہا۔ "چلو اس سے میں بعد میں مل لوں گا۔ یہ تو تم بھی بتا سکتے ہو کہ یہ ساون بڈھا ہے یا جوان... تمہارے مامے کی طرح؟"

"مامے سے بڑا ہی ہو گا۔ بڈھا نہیں کہہ سکتے، چالیس سال کے بندے کو۔"

"اچھا، اس کی شادی کے بعد کوئی بیٹی تھی؟"

وہ ہنسنے لگا۔ "گھر والی رہتی تھی چودھریوں کے گھر میں تو بیٹی کہاں سے ہوتی؟"

"تم آدمی سمجھ دار ہو... ساون کہتا ہے اس کی ایک بیٹی فاطمہ ہے۔ اس بیٹی کی عمر ہو گی بیس سال سے اوپر۔"

اس نے سوچ کے کہا۔ "ہو سکتی تھی مگر ہوئی نہیں تھی... نہ بیٹا نہ بیٹی... اب تو اس کی وہ ہٹی بھی پتا نہیں کہاں ہے۔ پہلے چودھری اصغر کے منشی سے شادی کر لی تھی۔"

"ساون نے طلاق دے دی تھی اسے؟"

"وہ تو کہتا تھا کہ نہیں دی، پکڑے جانے کے بعد... مگر اس نے کہا کہ کمینہ بکواس کرتا ہے۔ منشی کے سامنے طلاق دی تھی۔ منشی نے گواہی دی کہ وہ سچ کہتی ہے۔ جب یہ جیل میں تھا تو وہ پتا نہیں کہاں چلی گئی اور کس کے ساتھ... ورنہ دو چار سال حویلی میں گزار کے سب ہی واپس آ جاتی ہیں اپنے اپنے گھر... اگر وہ چودھریوں کو پسند آ جائیں۔"

نور محمد ملی جلی پنجابی اور سرائیکی زبان بول رہا تھا۔ یہ جگہ ملتان اور لاہور کے درمیان تھی چنانچہ یہاں پر دونوں شہروں کے تہذیبی اثرات نظر آتے تھے۔ نور محمد زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھا مگر ذہین تھا۔ اس نے میرے سوالوں کے جواب دیتے ہوئے مقامی معاشرت کا جو نقشہ پیش کیا تھا وہ طبقاتی فرق کی صحیح عکاسی کرتا تھا۔

"نور محمد... یہ کون بتا سکتا ہے کہ ساون خان اچانک گھر اور گاؤں چھوڑ کے کیوں گیا؟ اور وہ شہر گیا ہے تو کدھر... ملتان یا لاہور... اس کا وہاں کون ہے؟"

"یہ تو پوچھنا پڑے گا جی؟"

"دوسری بات... تم کہتے ہو کہ ساون خان کی اولاد کوئی نہیں تھی۔ نہ کوئی لڑکا نہ لڑکی... پھر وہ جس فاطمہ کو بیٹی بنا کے اپنے ساتھ لیے پھر رہا ہے وہ کون ہے... کہاں سے آئی ہے؟ وہ فاطمہ کو پیر اظہر علی کے آستانے پر بھی لے گیا تھا تاکہ اس پر جنات کا جو اثر ہے وہ ختم ہو جائے۔ پرسوں رات فاطمہ وہیں تھی۔ کل کسی وقت ساون خان اس کے ساتھ واپس آیا اور کسی کو کچھ بتائے بغیر گاؤں سے چلا گیا۔ اگر تم یہ سب معلومات حاصل کر کے مجھے بتاؤ تو تمہیں انعام ملے گا۔"

"کیسا انعام؟" اس کا چہرہ توقعات کی تصویر بن گیا۔

میں نے سوچ کے جواب دیا۔ "ایک ہزار روپے۔"

میرا خیال تھا کہ اس غریب اور کچھ نہ کرنے والے لڑکے کے لیے اتنی بڑی رقم کا لالچ کافی ہو گا مگر اس پر خوشی کی کوئی روشنی نہ پھیلی۔ اس نے چند سیکنڈ کے توقف سے کہا۔

"آپ مجھے کوئی کام نہیں دلا سکتے؟"

"کام؟ کیا کر سکتے ہو تم؟"

"میں نے دسویں پاس کی ہے جناب... کام جو مل جائے کر لوں گا۔ میں دوسروں کی طرح کھیتوں میں ہل نہیں چلا سکتا اور فصل کو پانی لگانے یا کاٹنے جیسا کام نہیں کر سکتا جو میرے بھائی، باپ اور چچا سب کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں پڑھ لکھ کے میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ میں تو آگے بھی پڑھنا چاہتا تھا لیکن یہاں ایک ہائی اسکول ہے... چھ میل دور... کالج کوئی نہیں۔ سوچتا ہوں لاہور چلا جاؤں۔ دن میں کوئی بھی کام کروں، رات کو پڑھوں۔ آپ میری مدد کر سکتے ہو؟"

میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی اور اسے اپنے ساتھ چارپائی پر بٹھا لیا۔ "جو تم چاہتے ہو مشکل نہیں... میں ضرور تمہاری مدد کروں گا لیکن پہلے خود کو انعام کا مستحق ثابت کرو۔ مجھے اس لڑکی کے بارے میں معلوم کرنا ہے جس کو آج کل ساون فاطمہ کے نام سے اپنے ساتھ لے کر پھر رہا ہے۔ وہ لڑکی اسے کہاں ملی... اس کا اصل نام کچھ اور ہے۔"

وہ حیرانی سے میری صورت دیکھنے لگا۔ "آپ یہ سب کیسے جانتے ہو؟"

"ابھی میں یہ سب نہیں بتا سکتا۔ مجھے دیکھنا ہے کہ تم پر کس حد تک بھروسا کیا جا سکتا ہے۔ اب تصدیق ہو گئی ہے کہ فاطمہ اس کی بیٹی نہیں ہو سکتی۔ پھر وہ ساون کو کہاں ملی، کیسے ملی؟ بات یہ ہے کہ لڑکی کو کچھ یاد نہیں... اپنا اصل نام بھی یاد نہیں۔"

"کیا ہے اصل نام؟"

میں نے قدرے تذبذب کے بعد کہا۔ "نورین... اب یہ مت پوچھنا کے نورین سے میرا کیا رشتہ ہے اور میں اسے کیوں تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔"

"فاطمہ کو یہ سب کیوں یاد نہیں... کہ وہ کون ہے؟"

"اس کے ساتھ ایک حادثہ ہوا تھا۔ تم نے سنا ہو گا کہ ادھر جہاں نہر کے اوپر لاہور جانے والی سڑک کا پل ہے... وہاں ایک حادثہ پیش آیا تھا۔ بہت زیادہ پرانی بات نہیں... چار پانچ مہینے پہلے۔"

"ایک بس دریا میں گر گئی تھی۔" نور محمد کو کچھ یاد آیا۔

میں نے اسے درست نہیں کیا کہ وہ ایک ڈبل کیبن پک اپ تھی۔ "ہاں، کچھ مسافر ڈوب گئے تھے۔ نورین کو بھی میں نے بہت تلاش کیا تھا مگر وہ نہیں ملی۔ میرا خیال تھا کہ وہ ڈوب کے مر گئی۔ لیکن دو دن پہلے میں نے آستانے پر فاطمہ کو دیکھا تو میرا خیال بدل گیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہ کسی ساون خان کی بیٹی ہے۔ میں نے اس سے بات کی اور اسے بہت یاد دلایا کہ وہ نورین ہے... مگر اس کو کچھ یاد نہیں آیا۔ وہ پاگل نہیں ہے، بس بھول گئی ہے سب کچھ۔"

نور محمد نے حیرانی کا اظہار کیا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ایسا ہو جاتا ہے۔ یہ بیماری بھی ہوتی ہے اور سر کی چوٹ ہو تو یہ بھی ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم فلمیں نہیں دیکھتے ورنہ تمہیں معلوم ہوتا۔"

"فلمیں دیکھنے لاہور جانا پڑتا ہے یا ملتان... اور ابا کہتا ہے کہ اس سے ایمان خراب ہوتا ہے۔"

"میرا نام یاد ہے نا؟ ملک سلیم اختر... ادھر آؤ گے تو میرے نام پر کوئی تمہیں روکے گا نہیں۔ یاد رکھنا کہ تمہیں دو کام کرنے ہیں۔ ایک معلوم کرنا ہے کہ فاطمہ کو ساون خان کہاں سے لایا اور کیسے؟ دوسرے یہ کہ اب وہ کہاں جا سکتا ہے... کہاں ملے گا... کسی کو معلوم نہ ہو، یہ کام کس کے لیے کر رہے ہو۔"

"آپ بھروسا رکھو جی... اور اپنا وعدہ بھی یاد رکھو۔" وہ پُرجوش لہجے میں بولا۔

جب میں پھر نہر کے پل پر سے گزرا تو بہت پُرامید تھا۔ نور محمد میرے ساتھ آنا چاہتا تھا مگر میں نے اسے روک دیا۔ ”ابھی تک کسی نے تمہیں میرے ساتھ نہیں دیکھا۔ کوئی شک نہیں کر سکتا کہ تم یہ پوچھ گچھ میرے لیے کر رہے ہو۔“

اس وقت تک سورج کافی بلند ہو چکا تھا۔ اِدھر اُدھر کے لڑکے اپنی بھینسوں کے ساتھ خود بھی نہر میں نہانے آ گئے تھے۔ پانی کی سطح سے پل کی بلندی زیادہ نہیں تھی۔ وہ چھ آٹھ سال سے بارہ چودہ سال کے لڑکے تھے اور اس نہر نے ان سب کو ماہر سوئمر بنا دیا تھا۔ وہ ہر طرح سے اس کھیل کو انجوائے کر رہے تھے۔ مجھے ان کی فحش کلامی پر افسوس ہوا۔ گالیاں ان کے نزدیک گالیاں نہیں تھیں۔ میں ان کے درمیان سے گزرا تو وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوئے اور ان سب کی پُرتجسس سوالیہ نگاہیں مجھ پر مرتکز ہو گئیں۔ میرے گزر جانے کے بعد وہ پھر اپنے شغل میں لگ گئے۔

آدھے گھنٹے کی مسافت طے کر کے میں حویلی میں داخل ہوا تو اندر ایک غیر معمولی پُرآسیب اور ماتمی سناٹا محسوس ہوا۔ سب اپنے اپنے کمروں میں تھے حالانکہ ناشتا ختم ہونے کے بعد روزمرہ زندگی کے معمولات کی گہما گہمی شروع ہو جاتی تھی۔ ملازم کمروں کی اور برآمدے کی جھاڑ پونچھ اور صفائی میں مصروف ہو جاتے تھے اور شاہینہ بھابی ان کی یوں نگرانی کرتی تھی جیسے محاذِ جنگ پر کمانڈر ہر طرف اور سب پر نظر رکھتا ہے۔ کوئی ذرا بھی ہاتھ روکے یا تساہل سے کام لے، شاہینہ کی تیز آواز اسے مستعد کر دیتی تھی۔ چودھری صاحب اور ان کے معالج ڈاکٹر جلالی ناشتے سے پہلے حویلی کے چکر لگاتے تھے۔ ایک چکر سے شروع ہونے والا سلسلہ اب چار پر آ گیا تھا۔ اس کے بعد وہ درمیان کے صحن میں اپنی عمر کی مناسبت سے ہلکی پھلکی ورزش کرتے تھے اور پھر غسل کر کے ناشتا... ان دونوں کے درمیان مریض اور مسیحا کا جو کاروباری رشتہ قائم ہوا تھا، وہ اب یگانگت اور دوستی کے سارے مراحل صرف ایک ماہ میں طے کر چکا تھا... جو نصف صدی میں اعتماد اور بے تکلفی کے اس درجے تک پہنچتے ہیں۔

میں کچھ دیر منتظر رہا کہ کوئی نظر آئے تو اس سے حویلی کی خانہ ویرانی کا سبب پوچھوں۔ توقع مجھے یہ تھی کہ حویلی میں قدم رنجہ فرماتے ہی مجھے ہر طرف سے گھیر لیا جائے گا اور ہر شخص مجھ سے میری پُراسرار گمشدگی اور اس کے بعد پیش آنے والے واقعات کی تفصیل جاننا چاہے گا۔ میرے... بیڈروم کا دروازہ بند تھا مگر لاک نہیں تھا۔ اندر داخل ہونے سے پہلے میں نے ایک خادمہ کو اشارے سے بلایا۔ ”کچن میں جا کے کسی سے کہو کہ میرے لیے ناشتا لائے۔“

”جی صاحب۔“ خادمہ جانے کے لیے مڑی۔

”اور دیکھو کہ سب لوگ کہاں ہیں۔ ابھی تم ریشم بی بی کو دیکھو اور ان سے کہو کہ میں بلا رہا ہوں۔“

اس نے دوبارہ ”جی صاحب“ کہا اور خاموشی سے چلی گئی۔ میں واش روم میں گھس گیا تا کہ ریشم کے آنے تک نہا کے لباس بدل لوں۔ میں نے شیو بھی بنائی اور دس پندرہ منٹ بعد نکلا تو برآمدے کی طرف سے خود ریشم ناشتے کی ٹرے کے ساتھ اندر آئی۔

ٹرے میز پر رکھ کے وہ ایک دم میری طرف بڑھی جیسے مجھ سے چمٹ جائے گی مگر وہ سامنے آ کے رک گئی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے اور اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ ”کیا ہوا ریشم... تم رو رہی ہو؟“

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”مجھ سے پوچھتے ہو کیا ہوا؟ تین دن سے کہاں تھے... یہاں سب کتنے پریشان تھے۔“

میں نے نرمی سے شانوں پر ہاتھ رکھ کے اسے بٹھا دیا۔ ”ابھی سب بتاتا ہوں... کیا تمہیں معلوم نہیں کہ مجھے اغوا کر لیا گیا تھا؟“

”معلوم ہے... بڑے چودھری صاحب نے بتایا تھا۔“

میں نے حیرانی سے کہا۔ ”انہیں معلوم تھا کہ مجھے اغوا کیا گیا ہے؟“

”نہیں... یہ تو نہیں... جب وہ شکار کے بعد واپس آئے تو تم وہاں نہیں تھے۔ وہ بہت دیر انتظار کرتے رہے۔ جب رات ہونے لگی تو خود ڈاکٹر جلالی اس وین کو چلا کے لائے۔ اس وقت وہ ناراض بھی تھے اور حیران بھی کہ یوں کسی کو کچھ بتائے بغیر تم کدھر نکل گئے... کس نے اغوا کر لیا تھا تمہیں؟“

”وہ اپنے عالی مرتبت پیر اظہر علی شاہ نے۔“

وہ دم بخود رہ گئی۔ ”پیر صاحب نے... کیوں؟“

”اس کیوں کا جواب میں دوں گا۔ پہلے تم یہ بتاؤ کہ حویلی میں یہ خاموشی اور اداسی کا ماحول کیوں ہے؟“

ریشم نے ایک گہری سانس لی۔ ”تم مراد کو جانتے ہو؟“

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”میں صرف وحید مراد کو جانتا تھا جو دنیا سے نامراد گیا... سکندر کی طرح خالی ہاتھ۔“

وہ مجھے بے وقوفوں کی طرح دیکھنے لگی۔ ”وحید مراد کون... اور یہ سکندر کون تھا؟“

میں نے افسوس سے سر ہلایا مگر اس میں ریشم کی کوئی غلطی نہیں تھی۔ اس نے شہری لڑکی جیسے نئے فیشن کے کپڑے پہن لیے تھے اور تھوڑا بہت پڑھ لیا تھا مگر اس نے وحید مراد کا یا سکندرِ اعظم کا نام نہیں سنا تھا تو یہ گاؤں کے اس ماحول کا قصور تھا جس میں ریشم کی پرورش ہوئی تھی۔ نہ اس نے فلمیں دیکھی تھیں اور نہ تاریخ یا ادب کا مطالعہ کیا تھا۔

ناشتا ختم کر کے میں نے چائے کا دوسرا مگ بنایا تو مجھے خیال آیا کہ میں نے اخلاقاً بھی ریشم سے نہیں پوچھا کہ وہ ناشتا کر چکی ہے یا نہیں۔ میں کم سے کم اسے چائے پیش کر سکتا تھا۔ میں نے کہا۔ ”چائے ہے... پیو گی؟“

اس نے خفگی سے کہا۔ ”اب پوچھ رہے ہو... ناشتا میں نے بھی نہیں کیا تھا۔ یہ ہم دونوں کے لیے تھا۔“

”اوہ آئی ایم سوری... میں نے واقعی بڑی بداخلاقی کا مظاہرہ کیا... دراصل اغوا کرنے والوں نے مجھے بھوکا پیاسا بھی رکھا تھا... چلو اب کر لو۔“

وہ منہ پھلائے بیٹھی رہی۔ ”رہنے دو۔“

”اچھا، میں اپنے ہاتھ سے کھلاتا ہوں... ساتھ بیٹھ کر۔“

وہ گھبرائی۔ ”رہنے دو... میں کھا لوں گی... کوئی دیکھ لے گا۔“

”تم نے کسی لڑکے کے بارے میں پوچھا تھا؟“

”ہاں، وہ شاہینہ بھابی کا ماموں زاد بھائی تھا۔ روزینہ اس سے شادی کرنا چاہتی تھی۔“ ریشم نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

”آئی سی... وہ تھا مراد... کیا ہوا اسے؟“ میں چوکنا ہو گیا۔

”کل رات وہ مر گیا۔ مار دیا گیا۔ وہ بھی گھر سے گیا تھا شکار کے لیے اپنے دوستوں اور ایک ملازم کے ساتھ... مرغابیاں آتی ہیں فجر سے بھی پہلے... انہوں نے جھیل کے کنارے خیمہ لگایا تھا۔ کھانے کے بعد سب سو گئے تھے۔ رات کو تین بجے اٹھنا تھا مگر نوکر نے دیکھا تو اس کا خیمہ خالی تھا۔“

میں نے اس اطلاع پر غور کیا۔ ”یعنی اسے بھی اغوا کر لیا گیا تھا؟“

”یہ تو کسی نے نہیں کہا۔ ملازم واپس آئے تو انہوں نے بتایا کہ ساتھ جانے والوں میں دوست کوئی نہیں تھا۔ سب اجنبی لوگ تھے اور وہ سب بھی مراد کے ساتھ ہی غائب ہو گئے تھے۔ نوکر نے واپس آ کے بتایا کہ ان کی تعداد سات تھی۔ کوئی بھی اس علاقے کا نہیں تھا۔“

”کون سا علاقہ؟“

”یہ سارا علاقہ... بڑے چودھری صاحب کا اور پیر صاحب کا... اور اس گاؤں کے آس پاس کا علاقہ جہاں مراد رہتا تھا۔“

میری نظر ریشم پر جمی رہی۔ ”مراد کا گاؤں کہاں ہے؟“

”یہاں سے نو میل شمال کی طرف... مجھے شاہینہ بھابی نے بتایا ہے۔“

”اور یہ مراد... کیا یہ بھی جاگیردار فیملی سے تھا؟“

”ہاں لیکن انہوں نے اپنی ساری زمین بیچ دی تھی جو سڑک کے کنارے تھی۔ وہاں پکے مکان اور کوٹھیاں بن رہی ہیں... مراد کے باپ کی بھی ایک کوٹھی تھی... اپنا پیسا انہوں نے کاروبار میں لگایا۔“

”یعنی وہ زمینداری کو چھوڑ کے بلڈر ہو گئے تھے۔ اب کنسٹرکشن کے بزنس میں آ گئے تھے... رئیل اسٹیٹ۔“

ریشم میری صورت دیکھنے لگی۔ ظاہر ہے اسے میری بات سمجھ نہیں آئی تھی۔ ”انہوں نے ایک فیکٹری بھی لگائی تھی۔ سنا ہے وہاں پلاسٹک کے برتن بنیں گے۔“

”آئی سی۔“ میں نے غیر ارادی انداز میں کہا۔ ”روزینہ کی پسند کی وجہ تو سمجھ میں آتی ہے... یہ مراد کیوں روزینہ پر فریفتہ تھا؟“

”کیوں کا کیا مطلب ہے جی... اسے محبت تھی۔“

”کیوں؟“ میں بے خیالی میں بول گیا۔

ریشم بگڑ گئی۔ ”پھر کیوں...؟ محبت کیوں ہوتی ہے... تمہیں نہیں ہے نورین سے محبت... جس کا پتا نہیں کہ زندہ ہے یا اسی رات ڈوب گئی تھی۔ تمہیں تو نکال لیا تھا میں نے... اسے کون بچاتا؟“

میں نے مگ کو میز پر رکھ دیا۔ ”ایسا مت کہو... وہ زندہ ہے۔ اسے بھی بچا لیا تھا کسی نے۔“

ریشم حیرانی سے میرا منہ دیکھنے لگی۔ ”کس نے... تمہیں معلوم ہے؟“

”کیا تمہیں معلوم تھا کہ کس وقت گاڑی نہر میں گرے گی اور میں تیرتا ہوا تمہارے سامنے سے گزروں گا... چنانچہ تم صحیح وقت پر وہاں آ کے بیٹھ گئیں؟“

”یہ کیا فضول بات ہے... خدا کی مرضی یہی تھی۔“

ابھی میں ریشم کو ساون یا فاطمہ کے معاملے سے باخبر کرنے کے موڈ میں نہیں تھا چنانچہ میں نے کہا۔ ”خدا کی مرضی یہ تھی میرے لیے تو نورین کے لیے بھی ہو سکتی ہے۔ خدا مجھ پر مہربان ہوا تو اس سے کیوں ناراض ہوگا... اس کے لیے بھی آگیا ہوگا کوئی... خیر چھوڑو یہ بحث۔“

ریشم خفا رہی۔ ”مجھے بتاؤ کہ تم کیوں محبت کرتے تھے نورین سے؟“

”وہ بہت خوب صورت تھی... انتہائی خوب صورت... تم سے بھی زیادہ... اتنی کہ تم تصور نہیں کر سکتیں۔“

”ایک بات بتاؤں تمہیں؟“ اس کا چہرہ کچھ لال ہوا۔ ”ایسا ہی وہ بھی کہتا ہے مجھے... کہ مجھ سے زیادہ حسین لڑکی دنیا بھر میں اس نے نہیں دیکھی۔“

”وہ کون؟“

ریشم کا چہرہ اور لال ہوا۔ ”تنگ مت کرو... وہی... انور اور کون... کسی کو لگتی ہے کوئی سب سے حسین... کسی کو اور کوئی...“

میں نے تائید میں سر ہلا دیا۔ ”اس لیے کہتے ہیں کہ حسن ہوتا ہے دیکھنے والے کی نظر میں۔ چلو وجہ معلوم ہوگئی، مراد کو روزینہ سے کیوں محبت تھی... مگر اس نے خودکشی کیوں کرلی؟ ایسی مایوسی کی کیا بات تھی؟ کیا پیر صاحب اس کی انور سے شادی کا ارادہ چھوڑ دیتے؟“

”کیا فضول بولے جا رہے ہو خود ہی... دماغ پر اثر ہو گیا ہے تمہارے۔“ ریشم چلّائی۔ ”یہ کس نے کہا ہے کہ مراد نے خودکشی کی؟“

میں نے چونک کے کہا۔ ”اچھا؟ مگر تم نے کہا تھا کہ وہ مر گیا اور اس سے پہلے وہ غائب ہو گیا تھا۔“

”اس کی لاش کل ان کی حویلی سے کچھ فاصلے پر پانی سے بھرے ایک گڑھے میں ملی۔ اسے ایک گولی سر میں لگی تھی اور دوسری سینے پر... وہ جو اس کے ساتھ تھے... انہی میں سے کسی نے یہ کام کیا ہوگا۔“

میں نے اس رات کا تصور کیا جب مراد اپنی محبوبہ کو بزورِ بازو نکال لے جانے کے لیے گھر سے سر بکف آیا تھا۔ میرے کانوں میں روزینہ کی مظلوم فریاد اور چیخ پکار ابھی گونج رہی تھی۔ شور میں کچھ نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے مگر اب یقین کے ساتھ سمجھا جا سکتا تھا کہ وہ مراد کی زندگی کی بھیک مانگ رہی ہوگی۔ اس ظالم جاگیردار، انا پرست اور روایت پسند باپ سے جو پیر بن کے دنیا کے روحانی آلام دور کرتا تھا مگر اپنی بیٹی کی روح کو وہ زخم دینے پر تلا ہوا تھا جس کا آزار اسے تمام عمر تڑپاتا اور رلاتا۔ مجھے اس بے گناہ مارے جانے والے محافظ کا چہرہ بھی یاد آیا جس نے پیر صاحب کے آستانے پر جان قربان کر دی تھی اور وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ قربانی رائگاں گئی۔

”کس سوچ میں پڑ گئے تم؟“ ریشم نے میری آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔

”کیا ابھی تک ان میں سے کوئی پکڑا نہیں گیا جو اس کے ساتھ شکار پر گئے تھے؟“

”سب پکڑے جائیں گے۔ پولیس اس نوکر کے ساتھ ہر گاؤں میں پوچھتی پھر رہی ہے۔ وہ دوست بھی... لندن سے تو نہیں آئے ہوں گے... مل جائیں گے سب بالآخر۔“

”ہاں، زندہ ہوئے تو...“ میرے منہ سے نکل گیا۔

”زندہ کیوں نہیں ہوں گے؟ قتل کسی ایک نے کیا ہوگا... تو اس نے بعد میں خودکشی نہیں کرلی ہوگی... قتل کی وجہ ضرور ہوگی۔“

اب میں نے اسے چھیڑنے کے لیے پوچھا۔ ”کیوں؟“

اس نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ ”یا میرے مولا! اب یہ بھی ہے کوئی پوچھنے کی بات... بلاوجہ قتل ہوتا ہے کوئی؟“

”ہاں، سب چاہنے والے ہوتے ہیں... جیسے انور تمہارے ہاتھوں ہوا۔ کیا یہ غلط ہے؟ ویسے وہ ہے کہاں؟ مجھے بات کرنی ہے اس سے۔“

اس نے نخرے اٹھائی اور ایک مسکراہٹ بھرے غصے کے ساتھ شرماتی ہوئی واک آؤٹ کر گئی۔ ابھی میں اسے اپنے انکشافات سے پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا جو کسی چشم دید گواہ کی طرح حقائق پر مبنی تھے۔ میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ مراد نے ظالم دیو کے قلعے میں قید شہزادی کو نکالنے کے لیے کچھ لوگوں کی خدمات حاصل کی تھیں۔ ظاہر ہے یہ کام کسی اور طریقے سے ہونے والا نہیں تھا۔ وہ سات افراد کی فوج کے ساتھ حملہ آور ہوا۔ یہ سات افراد کون تھے؟ کہاں سے لائے گئے تھے؟ انہیں خودکشی کر کے مرنے کا شوق تو نہیں تھا۔ ضرور مراد نے انہیں بھاری معاوضہ دیا ہوگا جس کے بعد وہ اپنی جان کی بازی لگانے آگئے۔ جواری مراد تھا... جان ہاری اس کے ساتھ ان بے وقوفوں نے بھی جو کرائے کے قاتل بننے پر راضی ہو گئے تھے۔ مراد کو اندازہ نہ تھا یا کسی غدار کی مخبری کے باعث یہ اندازے غلط ہو گئے

تھے۔ وہ خود بھی مارا گیا اور اس کا ساتھ دینے والوں میں سے کتنے مارے گئے، اس کا پتا شاید کبھی نہ چلے۔ فتح کے بعد پیر صاحب کے مریدوں نے سب کی لاشوں کو غائب کر دیا ہوگا، سوائے مراد کی لاش کے... وہ اس کے آبائی گھر کے قریب ایک پانی کے گڑھے میں اس لیے پھینکی گئی کہ سب کو عبرت ہو۔ اس کے ماں باپ کو بھی اگر وہ بیٹے کے جرم میں شریک تھے۔

یہ سب میں کس کو بتاؤں اور کیسے بتاؤں... کون یقین کرے گا مجھ پر... میں جائے واردات پر موجود ضرور تھا مگر میں نے کچھ دیکھا نہیں تھا، سوائے ایک محافظ کی موت کے... اور میرے انکشافات پر یقین کرنے سے بھی کیا ہوگا؟ پیر صاحب قبلہ کے روحانی درجات وہی رہیں گے، ان کی طرف انگلی کون اٹھا سکتا ہے؟

باہر سے شاہینہ کی آواز آئی جو کسی سے اونچی آواز میں بات کر رہی تھی۔ ایسا یہاں کا دستور نہیں تھا۔ مرد ضرور شیر کی طرح دہاڑتے تھے لیکن عورتیں جھگڑا کرتی بھی تھیں تو بند دروازوں کے پیچھے۔ اس احتیاط کا مقصد صرف یہ تھا کہ گھر کی بات ملازموں کے کان میں نہ پڑے جو ہر جگہ موجود ہوتے تھے اور پھر ان کی زبان سے اپنی اپنی تشریح، تبصرے اور حاشیہ آرائی کے ساتھ حویلی کے باہر پہنچ کر افواہوں کو جنم نہ دے اور جھوٹی سچی کہانیاں نہ پھیلیں۔

میں نے کھڑکی کے شیشے سے جھانک کر دیکھا تو مجھے شاہینہ کے مقابل بڑی چودھرائن نظر آئی جو اسے اپنی وضاحت سے مطمئن کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ معلوم نہیں اختلاف کس بات پر تھا۔ آج تک میں نے اسے روایتی انداز میں اپنی ساس سے جھگڑتے نہیں دیکھا تھا۔ شاید آواز بڑے چودھری کے کانوں تک گئی ہوگی۔ ڈاکٹر جلالی اچانک کمرے سے نکلا اور اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی بڑے چودھری صاحب اپنے کمرے کے دروازے میں نمودار ہوئے۔

اس نے دہاڑ کے کہا۔ ”یہ کیا بک بک ہو رہی ہے اتنی دیر سے... اپنے پرائے کسی کا خیال نہیں... مجھے بتاؤ کیا بات ہے؟“ اور اس کے ساتھ ہی دونوں عورتیں خاموشی سے اندر چلی گئیں۔ اگر میں دروازے سے نکلتا تو چودھری صاحب کو اچھا نہ لگتا۔ ڈاکٹر جلالی کی طرح میں بھی باہر کا آدمی تھا۔ ابھی تک انہیں میری واپسی کی خبر بھی نہیں ملی تھی۔

میں نے ریشم سے کہا بھی تھا کہ مجھے انور سے بات کرنی ہے لیکن وہ حویلی سے نکل کے کہیں گیا ہوا ہوگا... ابھی تک اس کا چہرہ نظر نہیں آیا تھا۔ ریشم کے بھول جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ایک لمحے کے لیے مجھے اپنے غیر اہم ہونے کا خیال آیا۔ مجھے واپس آئے ایک گھنٹے سے زیادہ ہو رہا تھا۔ جب میں نے خادمہ کے ذریعے کچن سے ناشتا طلب کیا تھا خبر تو اسی وقت پھیل گئی تھی۔ پھر ریشم نے بھی بریکنگ نیوز سب کو دی ہوگی لیکن ابھی تک نہ انور آیا تھا اور نہ مجھے بڑے چودھری صاحب نے طلب کیا تھا۔ میری گمشدگی اور بازیابی کے پراسرار واقعات کا تعلق انہی کی ذات سے تھا۔ حویلی میں صرف شاہینہ کا مراد سے براہِ راست رشتہ تھا۔ باقی سب سے قریبی تعلق ہوتا تو وہ سب یہاں نہ بیٹھے ہوتے۔ مرنے والے کی آخری رسوم میں شرکت کرتے... اس ماتمی فضا اور سوگوار خاموشی کے پیچھے صرف مراد کی مرگِ ناگہاں کا صدمہ نظر نہیں آتا تھا... بات کچھ اور تھی۔

میں سونا چاہتا تھا لیکن اب یہ مشکل ہو گیا تھا۔ اگر ان کے کمرے میں ساس بہو کا مقدمہ نہ سنا جا رہا ہوتا تو میں خود بڑے چودھری صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کے انہیں اپنے اغوا کیے جانے کی پوری رپورٹ دیتا۔ آستانے میں اسیری صرف قید و بند میں مجھ پر گزرنے والے روز و شب کے واقعات تک محدود نہ تھی... اب اس میں کچھ ایسے معاملات بھی آگئے تھے جن پر میرا زبان نہ کھولنا ہی بہتر تھا۔

ایک معاملہ مراد کا تھا جس کی روزینہ کے عشق میں جان کی بازی لگانے کا واقعہ میری موجودگی میں پیش آیا تھا۔ وہ واقعاتی شہادت تھی۔ یہاں اس واقعے کو خاندان کی عزت بچانے کے لیے ایک بالکل مختلف کہانی بنا دیا گیا تھا۔ میری سلامتی اور بہتری اسی میں تھی کہ اپنی زبان بند رکھوں اور انجان بن جاؤں جیسے میں نے کچھ دیکھا نہ سنا۔ میرے حقائق پر مبنی تمام انکشافات کی رپورٹ خاندان کی عزت کے محافظوں کو تشویش میں مبتلا کرتی اور عام ہو جاتی تو میرے لیے زیادہ سنگین مسائل پیدا کرتی۔

دوسرا معاملہ نورین کا تھا جس کا تعلق ابھی تک صرف میری ذات سے تھا۔ کسی اور کو فاطمہ کے نورین ہونے یا نہ ہونے سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ آستانے میں جو کچھ ہوتا تھا سب جانتے تھے اور کسی حد تک یہ بھی گھر کی بات تھی۔ کم سے کم شاہینہ میری کہانی پر احتجاج کرتی کہ یہ اس کے محترم والد ماجد کو بدنام کرنے کی سازش ہے۔ میں نے ایک اجنبی نوجوان نور محمد کو ضروری معلومات کے حصول پر مامور کر دیا تھا۔ اس کی تفتیشی رپورٹ ملنے تک میں کچھ بھی نہیں کر سکتا

تھا۔

بلاوا اچانک آیا۔ میں آنکھیں بند کیے لیٹا تھا جب ریشم نے دروازے میں آ کے کہا۔ ”ملک صاحب! بڑے چودھری صاحب بلا رہے ہیں۔“

میں ایک دم اٹھ بیٹھا۔ ”اور انور... میں نے تم سے کہا تھا...“

”وہ بھی ہے وہاں۔“ وہ بولی۔

”کیا بات ہے... تم نے ایسی رونی شکل کیوں بنا رکھی ہے؟“

”مجھے شکایت ہے ان سب کے رویے سے۔“ وہ جیسے پھٹ پڑی۔ ”سب مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں کیونکہ میں خاندان میں شامل نہیں ہوں... باہر سے آئی ہوں۔“

”اس میں غلط کیا ہے اور خفا ہونے والی کون سی بات ہے؟“

”پھر تمہیں یہ خصوصی درجہ کیوں دیا جا رہا ہے؟ تم بھی تو غیر ہو۔ تمہیں اس میٹنگ میں کیوں بلایا گیا ہے جہاں خالص خاندانی معاملے پر بات ہو رہی ہے؟“

میں ہنس پڑا۔ ”ہاں یار! یہ ہے تو بہت بے عزتی کی بات... اگر تم احتجاج کرو گی تو انور دے نہ دے... میں ضرور تمہارا ساتھ دوں گا۔“

بڑے چودھری کے اسپتالی کمرے میں خاندانی پارلیمنٹ کا اجلاس چل رہا تھا اور شرکا ضرورت سے زیادہ پُرملال چہرے بنائے ساکت بیٹھے تھے۔ ان میں انور بھی تھا جو شاید کہیں باہر سے آیا تو براہِ راست اجلاس میں طلب کر لیا گیا۔ بڑے چودھری صاحب اپنے بیڈ پر نیم دراز تھے اور سرہانے کے مانیٹر سے ان کے ہائی ہو جانے والے بلڈ پریشر کا اندازہ ہوتا تھا۔ باقی سب چند فٹ کے فاصلے پر دیوار کے ساتھ لگے صوفے پر تھے۔ ساس، بہو ایک پر اور انور میرے بالکل سامنے۔

سلام کے بعد میں نے پُرسکون لہجے میں پوچھا۔ ”کیسے ہیں آپ چودھری صاحب؟“

چودھری صاحب کے ماتھے کی شکنوں میں کوئی کمی نہیں آئی۔ ”اوئے ملکا... ہم تو جیسے تھے ہیں... تو کہاں تھا... بھوت کی طرح کہاں غائب ہو گیا تھا؟“

میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”کیا بتاؤں چودھری صاحب... مجھے کچھ لوگ اغوا کر کے لے گئے تھے۔“

چودھری نے مجھے بے یقینی سے دیکھا۔ ”کون لوگ... تیرے پیچھے بھی لگے ہوئے ہیں دشمن؟“

”دوست، دشمن سب کے ہوتے ہیں چودھری صاحب... لیکن اس روز اچانک اٹھا کر لے جانے والے میرے دشمن نہیں تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ میں اتنا غیر ذمے دار نہیں ہوں۔ خدمت کے لیے ساتھ گیا تھا تو واپس بھی لاتا... مگر وہ اچانک آئے اور گن پوائنٹ پر اپنے ساتھ گاڑی میں ڈال کر لے گئے۔“

”یار کون لوگ تھے وہ... کہاں لے گئے تھے؟“ چودھری جھنجلایا۔

میں نے چند سیکنڈ کے توقف میں سب کی طرف دیکھا۔ ”آپ یقین کریں گے کہ وہ آپ کے برادرِ عزیز... محترم پیر اظہر علی شاہ تھے۔“

بے یقینی کا شائبہ سب کی آنکھوں میں محسوس ہوتا تھا لیکن فوری ردِعمل صرف شاہینہ کا سامنے آیا۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہو تم...؟“

میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”وہی جو میرے ساتھ ہوا۔ جھوٹ بولنے کی مجھے ضرورت بھی کیا ہے۔ میں کوئی نادان بچہ نہیں ہوں جسے ڈر ہو کہ اسے اجازت نہیں ملے گی تو وہ بہانہ بناتا ہے... اور پھر آپ کے والد ماجد کا نام لینے میں کیا فائدہ ہے میرا؟“

انور نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے تسلی دی۔ ”اچھا کیا ہوا تھا... پوری بات بتا... یہاں سب پریشان تھے۔“

”پریشانی کیسے نہ ہوتی، شام تک انتظار کیا... پھر ڈاکٹر گاڑی چلا کے لایا۔ دو دن سے ہر طرف بندے لگا رکھے ہیں... کسی طرح بھی خبر کر دیتا۔“

میں نے کہا۔ ”کیسے خبر دیتا چودھری صاحب! جو مجھے گن پوائنٹ پر اغوا کر کے لے گئے تھے، میرے ساتھ شطرنج کھیلنا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے مجھے قید میں ڈال رکھا تھا۔ پیر صاحب کے آستانے کے نیچے تہ خانہ ہے۔ وہاں اور بھی بہت لوگ تھے۔ میرے نزدیک تو وہ نفسیاتی مریض تھے اور کچھ پاگل بھی... لیکن کہا یہ جاتا تھا کہ ان پر آسیب کا اثر ہے... جنات آتے ہیں... معلوم نہیں ان کو صرف انڈیا پاکستان کی عورتیں ہی کیوں پسند ہیں... یہاں کے مرد محفوظ ہیں...“

چودھری نے شاہینہ کی طرف دیکھا جو اپنے غصے کو ضبط کرنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔

انور نے کہا۔ ”اغوا کیا اور تین دن قید میں رکھ کے چھوڑ دیا؟ کوئی بات نہیں ہوئی پیر صاحب سے؟“

میں نے سوچ کے کہا۔ ”انور! یہ تمہارا خاندانی معاملہ ہے۔ معلوم نہیں میں کیوں اس کا حصہ بن رہا ہوں۔ میں نے بہت کچھ سنا ہے یہاں بھی... معلوم نہیں اس میں کتنی حقیقت ہے۔ مجھے جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں۔ وہاں بھی مجھے ان معاملات میں بلاوجہ گھسیٹا گیا۔ میں نے بہت کہا پیر صاحب سے کہ آپ یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہیں اور کس امید میں؟ میں باہر کا آدمی ہوں... چودھری صاحب یا انور نے مجھے حویلی میں جگہ دی اور مجھ پر بھروسا کیا تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ میں اس خاندان میں شامل ہو گیا اور اب خاندانی معاملات میں دخل دے سکتا ہوں۔ لیکن انہوں نے بھی وہی کہا جو سب مجھ سے یہاں بھی کہتے ہیں۔ ایک ہی بات کہ انور میرا دوست ہے... میری مانتا ہے۔ میں اس سے ہر بات منوا سکتا ہوں۔ یہ زیادتی ہے۔ انور سمجھ دار، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ذہین آدمی ہے۔ اپنے اور حویلی کے تمام معاملات کو خود سمجھتا ہے اور انہیں اپنی مرضی سے طے کرتا ہے۔ میری عزت کرتا ہے لیکن میری ہر بات مان لے گا... ایسا سوچنا ہی غلط ہوگا... کیا میں نے غلط کہا انور؟“

انور چونکا۔ ”تو وہ بتا جو پیر صاحب نے کہا تھا؟“

میں پہلے ہی طے کر چکا تھا کہ مراد والے معاملے پر لب نہیں کھولوں گا بلکہ اس کا حوالہ بھی نہیں دوں گا۔ ”اگر میں نے سب بتا دیا... تو شاید آپ بُرا مانیں گے چودھری صاحب... غلطی میری نہیں... پیر صاحب کو یہ باتیں مجھے نہیں بتانی چاہیے تھیں۔ تفصیل میں جانا بیکار ہے۔ انہوں نے زمینوں کی تقسیم کے بارے میں بتایا... جو آپ کے اور ان کے درمیان خلیج کا سبب بنی لیکن اصل مسئلہ ہے رشتوں کا... کہنے کو سب کہتے ہیں کہ رشتے آسمانوں پر بنتے ہیں مگر باتوں سے ایسا لگتا ہے کہ (نعوذ باللہ) آسمانوں پر وہ خود بیٹھے ہیں۔ شاہینہ بھابی اپنے شوہر سے خوش ہیں۔ ہر وفادار بیوی کی طرح محبت بھی کرتی ہوں گی اس سے... اگر ان کا رشتہ انور سے طے ہوا تھا اور ان کی شادی بڑوں نے اکبر سے کر دی تو کون سی قیامت آگئی۔ بڑے جو کرتے ہیں کچھ سوچ کے کرتے ہیں اور ظاہر ہے بہتری کے لیے کرتے ہیں۔ کوئی خوامخواہ افلاطونیت کا مظاہرہ کرے کہ زندگی بھر کسی ایک سے منسوب رہنے والی لڑکی کو دوسرے کے پلّے باندھ دیا جائے تو وہ کیسے خوش رہ سکتی ہے... عملی زندگی میں ایسا نہیں ہوتا۔“

”ایسا کون کہتا ہے آخر...“ بھابی کے ضبط کا حوصلہ جواب دے گیا۔

”افلاطون... خوامخواہ عقل مند بننے والے... معلوم نہیں کون لوگ ہوں گے جنہوں نے ایسا سمجھا اور باتیں بنائیں۔ کوئی بات منہ سے نکلے تو کانوں میں پڑ ہی جاتی ہے... اور یہ مسئلہ پیدا ہوا ہے انور کے واپس آنے سے... پیر صاحب کا خیال ہے کہ یہ گھر کی بات ہے اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ انور موجود نہیں تھا تو شاہینہ کی اکبر سے شادی کر دی گئی... لیکن اب... انور موجود ہے تو اسے روزینہ سے شادی کر لینی چاہیے۔“

میں خاموش ہو گیا اور اس بات کا اثر دیکھتا رہا۔ چودھری صاحب، ان کی شریکِ حیات اور خود شاہینہ کا چہرہ سپاٹ رہا۔ ردِعمل انور کی طرف سے آیا۔ ”یہ کیا فضول دلیل ہے؟“

”تمہارے نکتے سے۔“ میں نے کہا۔

”زندگی میری ہے تو نقطۂ نظر بھی میرا ہوگا۔“ انور نے برہمی سے کہا۔

”ہاں... تمہارے لیے شادی ایک مسئلہ ہے... مگر وہ سمجھتے ہیں کہ یہ بہت سے مسئلوں کا حل ہے... اور ہم سب جانتے ہیں کہ وہ مسئلے کیا ہیں۔ پیر صاحب کو یقین ہے کہ اس سے برابری، توازن اور انصاف کی فضا پیدا ہوگی۔ ظاہر ہے وہ اکبر کی اس پوزیشن سے دکھی ہیں۔“

انور نے تلخی سے کہا۔ ”جب میں تھا اس پوزیشن میں تو وہ خوش تھے، اس وقت انہوں نے کسی مسئلے کو حل کرنے کی کوشش نہیں کی۔“

شاہینہ غیر متوقع طور پر میری حمایت کرنے لگی۔ ”چلو یہ ان کی غلطی تھی۔“

”صرف غلطی؟“ انور بھڑک اٹھا۔

”تم اسے گناہ یا جرم کہہ لو... اب وہ معاملات کو ٹھیک کرنے کی بات کرتے ہیں تو اسے سننا چاہیے۔“

میں نے کہا۔ ”ان کا خیال ہے کہ سارا فساد زمین کا ہے۔ اگر انور کا رشتہ روزینہ سے ہو جائے تو یہ جھگڑا ختم ہو سکتا ہے۔ اکبر کو نہر کے اس طرف کا علاقہ دے دیا جائے اور انور کو دوسری طرف کا۔“

شاہینہ نے اعتماد سے خالی لہجے میں کہا۔ ”یہ ہو سکتا ہے۔“ اور پھر ڈرتے ڈرتے انور کی طرف دیکھا جیسے اس نے صرف سوال کیا ہو۔

میرا خیال تھا کہ انور صاف انکار کر دے گا یا احتجاجاً واک آؤٹ کر جائے گا۔ انور نے مصالحت کے اس خاندانی فارمولے پر عمل کیا ہوتا تو شاید کوئی خرابی پیدا ہی نہ ہوتی لیکن وہ کئی سال باہر کی خاک چھان کے آیا تو اس کے

خیالات اور نظریات بدلے ہوئے تھے۔ وہ کسی حد تک سوشلسٹ ہو چکا تھا۔ وہ معاشرتی انصاف... انسانی حقوق اور آزادیٔ اظہار وغیرہ کی باتیں کرتا تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ صدیوں کے جاگیردارانہ نظام سے باغی ہو چکا ہے۔ وہ خاندانی روایات کے مطابق بزرگوں کے فیصلے کو قبول کرتے ہوئے روزینہ کو اپنانے سے انکار کر چکا تھا۔ بعد میں حالات بدل گئے اور اس نے گیارہ مہینے اپنے ہی گھر میں تخت نشین ہو جانے والے بادشاہِ وقت کے قیدی کی حیثیت سے گزارے۔ اورنگ زیب کی طرح اکبر نے باپ کو معزول اور بھائی کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور ماں نے بیٹے کا ہاتھ نہ تھاما ہوتا تو وراثت کا یہ جھگڑا ہماری تاریخی روایات کے مطابق کب کا ختم ہو جاتا۔ اس تلخ تجربے نے انور کے خیالات بدل دیے اور جب اسے تختہ الٹ کے اختیار و اقتدار پر قابض ہونے کا موقع ملا تو اس نے وہ نہیں کیا جو سکندر نے پورس کے ساتھ کیا تھا۔ اس نے کسی کو معاف نہیں کیا۔ کس میں ہمت تھی کہ اس سے خاندانی روایت کے مطابق روزینہ کو ملکہ بنانے کی درخواست کرتا۔

بعد میں حالات نے یہ ناممکن کر دیا تھا۔ انور نے ریشم کا انتخاب کر لیا تھا اور یہ بھی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی کہ اب روزینہ بھی مراد کو پسند کرتی ہے اور انور سے شادی پر راضی نہیں۔ یہ بات میرے جیسا باہر کا آدمی بھی جانتا تھا۔ مجھے بڑی حیرانی ہوئی جب کسی نے بھی نہ مراد کے قتل کی بات کی اور نہ روزینہ سے اس کے جذباتی تعلق کا کوئی حوالہ دیا۔ حالانکہ یہ ایک طرح سے اوپن سیکرٹ تھا۔ ایک ایسا معاملہ جس کے بارے میں حویلی کے سب مکین جانتے تھے لیکن ایک دوسرے کے سامنے اس پر کھل کے بات کرنے سے گریز کرتے تھے۔ یہی رویّہ اس وقت بھی سب کو لب کشائی سے روک رہا تھا۔ ریشم نے حویلی کے اندر خاموشی اور سوگواری کو مراد کی موت سے منسوب کیا تھا، شاید ایسا نہیں ہوگا۔ یہاں تو اس کا ذکر بھی کسی نے نہیں کیا تھا۔

میرا یہ خیال بھی غلط ثابت ہوا کہ کسی کے جذبات کی پروا کیے بغیر اپنی بات کہہ دینے والا انور اپنی روزینہ سے شادی کے ذکر پر پھٹ جائے گا۔ اس لیے کہ وہ اپنے جذبات کا رخ ریشم کی طرف موڑ چکا تھا اور اس لیے بھی کہ روزینہ خود اسے چھوڑ کے مراد کی ہو چکی تھی... ان کے جذبات کتنے بھی پاکیزہ کیوں نہ ہوں، یہاں اس کی حیثیت ناجائز تعلق کا مسئلہ تھی جس پر جان لی بھی جاسکتی تھی اور دی بھی جاسکتی تھی۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مراد کے قتل کو تائیدِ ایزدی سمجھتے ہوئے سب یہ چاہتے ہیں کہ پرانی باتیں بھلا کے تمام مسائل کو مصلحت اور مصالحت کے جذبے سے حل کیا جائے۔ یہ تبدیلی بھابی شاہینہ کے خیالات میں انقلاب سے آئی تھی۔ پہلے وہ چھوٹی بہن کی زبردستی انور کے ساتھ شادی کے خلاف تھی۔ شاید اسے اپنے تجربے کا احساس تھا۔ نہ چاہنے کے باوجود اسے اکبر کے حوالے کر دیا گیا تھا اور اب تمام عمر اسے محبت کرنے والی وفادار مشرقی بیوی کا رول نبھانا تھا۔ وہ نہیں چاہتی ہوگی کہ اس کی چھوٹی بہن بھی جبر کے تحت ساری زندگی ایک سزا کے طور پر کاٹے جو ماں باپ کی فرمانبرداری کے جرم میں ملے... وہ روزینہ کی مراد سے شادی کی پُرزور حمایت کرتی تھی۔ مراد ہر لحاظ سے روزینہ کے لیے ایک آئیڈیل شوہر تھا۔ وہ خوبرو اور تعلیم یافتہ تھا۔ دولت مند تھا اور سب سے بڑھ کر روزینہ کے لیے پاگل تھا۔

مراد کی موت نے سب کچھ بدل دیا۔ بھابی شاہینہ کے لیے بھی یہ بہت بڑا صدمہ تھا لیکن وہ اپنی چھوٹی بہن کی دلجوئی اور اشک شوئی کے لیے باپ کے گھر نہیں جاسکتی تھی۔ وہ اندازہ کر سکتی تھی کہ مراد کو کس نے قتل کرایا ہوگا اور کیوں۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس جذباتی سانحے کا اس کی چھوٹی بہن پر کیا اثر ہوگا مگر اس کی ہمدردی اور غم گساری بھی بدنامی کی تشہیر کا سبب ہوتی۔ شاید اس نے حویلی میں کوئی ایسی بات کہہ دی تھی جو اسے نہیں کہنی چاہیے تھی اور حویلی کے اندر ٹینشن کی وجہ بنی تھی مگر وہ ابتدائی شاک کا ردِعمل تھا۔

وہ نارمل ہو چکی تھی۔ جب میرا پروپوزل سامنے آیا جو درحقیقت شاہینہ کے باپ کا تھا، ایک دم بڑی بہن کی سوچ بدل گئی۔ اس نے دور کا سوچا۔ مراد جو روزینہ کی زندگی میں خوشیاں بھر سکتا تھا، مر گیا تھا یا مار دیا گیا تھا۔ اس سے فرق نہیں پڑتا تھا۔ اہم روزینہ کا مستقبل تھا۔ اب یہ مستقبل غیر یقینی ہو گیا تھا۔ اب بڑی بہن کی حیثیت سے اسے اپنے باپ کا پلان قابلِ عمل نظر آنے لگا تھا۔ قابلِ عمل اور سارے مسائل کا حل... چنانچہ اس نے محتاط رہتے ہوئے کہہ دیا تھا کہ روزینہ کی شادی انور سے ہو سکتی ہے۔ اس لیے میری حمایت میں بول کے ردِعمل دیکھا تھا جو خلافِ توقع نارمل رہا تھا۔ پھر وہ کھل کے اس تجویز کے حق میں بات کرنے لگی۔ بڑے چودھری اور چودھرائن کی خاموشی ظاہر کرتی تھی کہ وہ آج بھی پہلے کی طرح سوچتے ہیں۔

مجھے خیال تھا ریشم کا... اگر بعد میں دباؤ یا ضرورت کے تحت انور نے بھی پیر صاحب کے فارمولے کو قبول کر لیا تو

ریشم کیا کرے گی؟ اس کا حامی یہاں کون ہوگا جہاں وہ ایک کم ذات مزارع کی بیٹی کے سوا کچھ نہ تھی۔ وہ لڑکی جس سے خاندانی رشتہ جوڑنے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا... آنے والے وقت کا کچھ پتا نہیں تھا۔ انور کے بارے میں پیر صاحب کا تجزیہ بالکل درست تھا کہ سارا علم الماری میں بھری ہوئی پرانی کتابوں کی طرح اس کے دماغ میں پڑا ہے۔ اپنی اصل زندگی میں انور وہی جاگیردارانہ مزاج رکھتا ہے جو اس کے آباؤ اجداد سے ورثے میں ملا ہے۔ جو اس کے خون میں شامل ہے۔

بوجھل خاموشی کا یہ وقفہ بہت طویل ہو گیا جس میں ہر شخص میری طرح اپنے خیالات میں گم تھا اور قیاس آرائی کے محدب عدسے کی مدد سے مستقبل کے خدشات اور امکانات پر غور کر رہا تھا جو ابھی نظروں سے اوجھل تھے۔

اس خاموشی کو ٹیلی فون کی گھنٹی نے توڑا۔ فون چودھری صاحب کی بیڈ سائڈ پر رکھا رہتا تھا اور اس کا تار اتنا لمبا تھا کہ وہ اٹھ کر صوفے پر آجائیں تو فون کارنر ٹیبل پر پہنچ جائے۔ چودھری صاحب نے فون اٹھا کے اخلاقاً کہا۔ ''وعلیکم السلام بھائی جی... خیر تو ہے۔''

بھائی جی صرف پیر صاحب ہو سکتے تھے۔

ہمیں خاموش رہنے کا اشارہ دے کر چودھری صاحب نے کہا۔ ''آپ کیسی بات کرتے ہیں بھائی جی؟ چھوٹے بھائی کے گھر میں آنے کے لیے آپ کو اجازت کی ضرورت ہے؟ او چھڈو جی... لڑکی آئی ہے آپ کی ہمارے گھر میں تو کیا آپ چھوٹے ہو گئے... پہلے ہمیں بڑے بھائی سے ڈر لگتا تھا... اب زیادہ ڈر پیر صاحب سے لگتا ہے... آپ سو بار آؤ...''

''اللہ خیر کرے... اس ہفتے میں دوسری بار قدم رنجہ فرما رہے ہیں پیر صاحب۔'' انور نے طنز اور تلخی سے کہا۔

یہ ہمیشہ کی طرح شاہینہ کو برا لگا۔ ''بھائی جی! وہ آپ سے نہیں اپنے بھائی سے ملنے آرہے ہیں اور مجھ سے ملنے بھی آسکتے ہیں... تم کیوں برا مانتے ہو؟''

''ان کا آنا کبھی بے مقصد نہیں ہوتا۔'' انور بولا۔

''میرا خیال ہے کہ وہ چاچا جی کے ساتھ تعزیت کے لیے جائیں گے... مراد ان کے سالے کا بیٹا تھا۔'' اب مراد کا ذکر دوسرے حوالے سے ہوا۔

چودھری نے ناپسندیدگی سے کہا۔ ''اب یہ بھی رسم ہے دنیا کی لیکن ابھی تو اس کی لاش پڑی ہے اسپتال میں... پوسٹ مارٹم ہوگا تو ملے گی۔ مجھ میں تو اب ہمت نہیں ہے کہ جنازے کے ساتھ قبرستان جاؤں اور تدفین تک رکوں... یہ ڈاکٹر جلالی کہاں اجازت دے گا۔''

''آپ بعد میں تعزیت کر لیتا اباجی۔'' انور بولا۔

''ہاں، بھائی صاحب کے بھی اپنے سالے کے ساتھ کون سے بہت اچھے تعلقات تھے بلکہ ایک طرح سے ناچاقی تھی۔ بھائی صاحب کو وہ ڈبا پیر اور نہ جانے کیا کچھ کہتا تھا۔ بھائی صاحب کا خیال تھا کہ وہ راشی اور بے ایمان ہے۔ سرکاری افسروں سے مل ملا کے کوڑیوں کی زمین موتیوں کے بھاؤ بیچ دی... پھر ٹھیکا لے لیا ہاؤسنگ اسکیم کا... سڑک نکلی... اور سڑک بھی وہ خود ہی بنائے گا جو اس علاقے میں آئے گی... دس میل کا ٹکڑا ہے۔''

شاہینہ نے کہا۔ ''چھوڑیں چاچا جی! اب وہ آرہے ہیں تو...''

''وہ آئیں شوق سے مگر مجھے نہیں لگتا کہ ان کا کوئی تعزیت کرنے کا ارادہ ہوگا۔ یہ جو لڑکا مارا گیا مراد... اللہ معاف کرے... اس کی شہرت کون سی اچھی تھی۔ سارے علاقے میں بدنام تھا۔ باپ نے حرام کا پیسا کمایا اور بگڑ گیا بیٹا... یہ تو ہوتا ہی ہے۔ مراد کے ساتھ یہی ہوا۔ میرا خیال ہے ان کے آج آنے کا مقصد کچھ اور ہے۔''

جب تک چودھری صاحب مراد کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کرتے رہے، سب مروتاً یا مجبوراً چپ تھے۔ اس بات نے سب کو چونکایا۔ ''کیا مقصد ہے اباجی؟'' انور بولا۔ ''میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ وہ بے مقصد نہیں آتے۔''

''یہ ہو سکتا ہے کہ وہ روزینہ کے رشتے کی بات کریں۔ ہمارے بندے کو تین دن مہمان رکھ کے انہوں نے بات تو کہلوا دی تھی۔''

انور ایک دم اٹھا۔ ''یہ کون سا موقع ہے ایسی بات کا؟''

انور کی بات نے مجھے پھر حیران کیا۔ میرے اندیشے سچ ثابت ہونے لگے تھے۔ انور نے صاف انکار نہیں کیا تھا کہ وہ ہرگز روزینہ سے شادی نہیں کرے گا۔ باپ سے بھی نہیں کہا تھا کہ رشتے کی بات ہو تو وہ سختی سے انکار کر دیں۔ اس نے صرف ''موقع'' پر اعتراض کیا تھا۔ گویا کسی اور موقع پر بات ہوتی تو حرج نہ تھا۔ کسی اور نے سمجھا ہو یا نہیں لیکن اب میرے دل میں ریشم کے مستقبل کے بارے میں کوئی شبہ نہ رہا تھا۔ حالات کے مطابق خود کو بدلنے والا انور مصلحت پر محبت قربان کرنے کے لیے تیار تھا۔

چودھرائن نے کہا۔ ''اگر بھائی جی نے کوئی بات کی تو آپ کیا کہو گے جی؟''

چودھری صاحب کا جواب سننے سے پہلے ہی میں معذرت کر کے اٹھا اور کمرے سے باہر آگیا۔ مجھے خوب اندازہ ہو رہا تھا کہ کمرے میں رہ جانے والے تینوں فریق اس مسئلے پر ہم خیال ہو جائیں گے۔ ان کے مشترکہ مفادات ہیں۔ وہ تمام رکاوٹوں کو دور کر دیں گے کیونکہ اب تک وہ بھی انور کے تیور دیکھ چکے ہیں۔ رہی روزینہ... تو کب تک روئے گی اور سوگ منائے گی۔ مراد کے ساتھ اسے مرنا ہوتا تو اب تک اس کی لاش بھی اسی قبرستان میں پڑی ہوتی۔ پیر صاحب اور چودھری صاحب پرانے جہاندیدہ لوگ... مناسب وقت کا انتظار کریں گے کیونکہ وقت سب سے بڑا چارہ گر ہے، جو ہر غم کو بھلا دیتا ہے۔

میں اپنے کمرے میں آکے لیٹ گیا اور سوچتا رہا کہ آخر تقدیر نے ریشم کو محبت کا یہ سنہرا خواب کیوں دیا؟ اس نے تو خواب ہی کو منزل کی حقیقت جان لیا تھا۔ روزینہ کی عالی نسبی سے شکست کھا کے وہ کہاں جائے گی۔ یہی سوچتے سوچتے میں سو گیا اور پھر اٹھا تو رات کی تاریکی اتر چکی تھی۔

شاہینہ کے والد ماجد قبلہ پیر صاحب اپنی تشریف کا بابرکت ٹوکرا اٹھا کے واپس جا چکے تھے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میری ان سے ملاقات نہ ہوئی ورنہ وہ ضرور پوچھتے کہ ملک صاحب! پھر کیا سوچا ہے... کب جا رہے ہو حویلی سے ریشم کے ساتھ... انہوں نے کیا بات کی، کیا نہیں... اس کا اندازہ کسی کے موڈ سے نہیں ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ چودھری صاحب نے ٹھیک ہی سوچا تھا۔ ایک بات مجھے سمجھانے کے بعد پیر صاحب نے دیر نہیں کی۔ وہ فوراً ہی روزینہ سے انور کے رشتے کو پکا کرنے آگئے تھے۔

میں اکیلا ہی اپنے کمرے میں کافی پی رہا تھا جب سلوٹی نمودار ہوئی۔ ''سنا ہے آپ اغوا ہو گئے تھے ملک صاحب؟'' وہ میرے سامنے بیٹھ گئی۔

''سنا تو میں نے بھی ہے... آج کل تم کہاں رہتی ہو... تمہاری صورت ہی دکھائی نہیں دیتی؟''

''مجھے چودھری انور صاحب نے مامور کر رکھا ہے ریشم کی تربیت یعنی گرومنگ پر... وہ چاہتے ہیں کہ وہ جلد از جلد میرے جیسی ہو جائے۔ سوشل اور پرسنل ایٹی کیٹس میں... اٹھتے بیٹھتے میں اسے ایک معزز لیڈی بنانے میں لگی رہوں۔''

میں نے کہا۔ ''جلدی کیوں ہے انور کو آخر؟''

وہ شوخی سے مسکرائی۔ ''یہ بھی اب کوئی راز کی بات ہے... انہوں نے ریشم سے شادی کا فیصلہ جو کر لیا ہے... مگر...''

''مگر کیا؟''

''مگر اس میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔'' وہ بولی۔

میں نے ہنس کے کہا۔ ''سلوٹی! یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے... جب دولہا دلہن چاہیں گے تو قاضی بھی آجائے گا۔''

''بے شک یہ باہمی رضامندی کا معاملہ ہے۔''

میں نے کہا۔ ''باہمی رضامندی تو ہے لیکن وہ کورٹ میرج تو نہیں کر رہے... اس میں خاندان کے بزرگوں کی رضامندی بھی ضروری ہے۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن... میرا خیال ہے کہ اس میں تاخیر کی گنجائش نہیں۔'' وہ کچھ تذبذب میں تھی۔

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ ''سلوٹی! تم کچھ کہنا چاہتی ہو جو کہہ نہیں پا رہی ہو۔''

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''ریشم یقیناً بہت خوش قسمت ہے اور خوش ہے کہ انور صاحب نے اسے پسند کیا۔ ایسی عزت افزائی کا اس نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا ہوگا لیکن اس کی سادگی ہے یا ناتجربہ کاری کہ محبت میں وہ محتاط نہیں رہی۔''

میں چونکا۔ ''کیا مطلب؟''

''مطلب وہی جس پر آپ چونکے۔ میں نے کئی بار اسے انور صاحب کے کمرے سے نکلتا دیکھا ہے اور جب نظر رکھی تو مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وہ کب جاتی ہے اور کب آتی ہے۔ کسی اور کی زندگی کا معاملہ ہوتا تو میں پروا نہ کرتی... یہ کھیل تو یہاں ہر نسل کھیلتی آئی ہے۔ میں خود اس کھیل میں شریک رہی... جیسے فٹ بال کے مقابلے میں فٹ بال شریک سمجھی جاتی ہے... ریشم کا معاملہ الگ ہے۔''

''تم نے کبھی اسے سمجھانے کی کوشش کی؟''

''دکھ تو یہی ہے کہ اس نے مجھے جھٹلا دیا۔ اس نے کہا کہ مجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ تو کبھی پانچ دس منٹ کے لیے کوئی ضروری بات کرنے چلی جاتی ہے۔ مجھے غیر ضروری تجسس میں مبتلا ہونے اور اس پر شک کرنے کی کوئی ضرورت نہیں... کوئی سنے گا تو خواہ مخواہ بدنامی ہو گی۔ خواہ مخواہ... اس نے مجھے جھوٹا کر دیا سر... اسے غیر ضروری تجسس قرار دیا۔ اب میں آپ کو بتاؤں کہ گزشتہ رات بھی وہ بارہ بجے کے قریب گئی تھی... اور پھر صبح چار بجے واپس اپنے کمرے میں جا کے سو گئی۔ ایسا ہی پرسوں بھی ہوا تھا۔ میری

جگہ آپ ہوتے تو کیا کرتے؟" وہ روہانسی ہورہی تھی۔

"میں ایک جھانپڑ رسید کرتا اور اسے واپس انور کے کمرے میں لے جاکر انور سے پوچھتا... تم نے شرافت سے کام لیا۔"

سلونی نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی۔ "ان شہزادوں کے کمرے ایسے ہی آباد رہتے ہیں سر... میں نے بھگتا بھی ہے اور دیکھا بھی ہے۔ جوانی سے بڑھاپے تک ان کی راتیں ایسے ہی آباد رہتی ہیں اور جو آتی جاتی رہتی ہیں میرے جیسی لاوارث بھی ہوتی ہیں... رعایا بھی... مجبور بھی اور زرخرید بھی... خدا کرے کہ ریشم سے انور صاحب کی محبت قائم رہے۔"

"تم کیوں یہ خطرہ محسوس کرتی ہو کہ قائم نہیں رہے گی؟"

"ابھی تو ایسی کوئی بات نہیں۔ اسی لیے میں کہتی ہوں کہ ریشم کو دیر کا خطرہ مول نہیں لینا چاہیے۔ کل کا کیا بھروسا... میری طرح ریشم وقت سے نہیں لڑ سکے گی۔ خرابی صرف اس کا نصیب ہوگی۔ بدنامی صرف اس کا مقدر ہوگی... پھر رونے پیٹنے سے اور فریاد کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ آج تک نہیں ہوا۔ میرے جیسی بہت ہیں جو نہ جان دیتی ہیں اور نہ لے سکتی ہیں... بس وہ ذلت کے ساتھ زندہ رہنا سیکھ لیتی ہیں۔ اسے اپنا نصیب جان کے قبول کر لیتی ہیں۔ آپ ریشم کو اس انجام سے بچانے کی کوشش ضرور کر سکتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "میں آج ہی انور سے بات کروں گا۔ وہ مجھے انکار نہیں کر سکتا۔"

"اور انہوں نے کہا کہ مجھے کچھ وقت چاہیے... بڑے چودھری صاحب کو راضی کرنے کے لیے... اپنی ماں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے... پھر؟"

"ظاہر ہے یہ ضروری ہے۔"

"اور آپ انور صاحب کو کتنا وقت دیں گے اس کام کے لیے؟" اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"زیادہ نہیں... وہ ارادہ کرے تو آج بھی بات کر سکتا ہے۔ کل کا انتظار کس لیے؟"

سلونی نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ "تھینک یو سر... آپ نے میری پریشانی دور کردی۔" وہ ہنسی۔ "حالانکہ مجھے کوئی ضرورت نہیں ریشم کے لیے پریشان ہونے کی... کیا رشتہ ہے میرا اس کے ساتھ؟"

"تم نے جذبات کا رشتہ قائم کرلیا ہے ریشم کے ساتھ... کیونکہ تم بے حس اور خود غرض نہیں ہو۔"

ایک سیکیورٹی گارڈ دروازے میں نمودار ہوا۔ اس نے اجازت طلب نظروں سے دیکھا اور بولا۔ "سر! کوئی ملنا چاہتا ہے آپ سے۔"

میں نے بے خیالی میں پوچھا۔ "کون؟"

"وہ اپنا نام نور محمد بتاتا ہے لیکن میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا... کہہ رہا تھا کہ مجھے ملک صاحب نے بلایا ہے... تم روک نہیں سکتے۔"

میں نے مسکرا کے کہا۔ "اسے لے آؤ یہاں۔"

سلونی جانے کے لیے اٹھی۔ "یہ نور محمد کون ہے؟"

میں نے کہا۔ "ہے کوئی... بعد میں بتاؤں گا۔"

نور محمد اپنے گرد و پیش کو بڑے پُرتجسس انداز میں دیکھتا ہوا نمودار ہوا۔ شاید کسی حویلی کی وسعت کا مشاہدہ کرنے کا یہ پہلا تجربہ تھا کہ وہ حیران بھی تھا اور خوش بھی۔ میرے اشارے پر وہ سلونی کی جگہ بیٹھ گیا۔

"آپ کا گھر تو بہت بڑا ہے جی۔" وہ بولا۔

"یہ میرا گھر نہیں... تم بتاؤ کیا خبر لائے ہو؟" میں نے کہا۔

"میں نے مامے سے پوچھا۔ کل وہ درگاہ شریف پر تھا۔ وہاں وہ بوٹی پینے جاتا ہے مگر پتا نہیں کسی نے کیا پلا دیا تھا۔ اس کی ڈبی سے میں بھی سگریٹ نکال کے پی لیتا ہوں کبھی کبھی... کل ایک سگریٹ لی میں نے تو مجھے اس میں ایک پتلی سی بتی سی نظر آئی۔ وہ بھی سگریٹ تھی جو مامے نے خود بنائی تھی اور بعد میں میرے سامنے جلا کے پی۔"

میں نے کہا۔ "وہ ہیروئن والی سگریٹ ہوگی۔"

"کون سی ہیروئن جی... ابھی دو مہینے پہلے ادھر کسی فلم کی شوٹنگ ہوئی تھی تو ایک ہیروئن آئی تھی۔ کیا نام تھا اس کا... بھول گیا... تھی بڑی خوب صورت... ڈانس بھی کرتی تھی... ہاں... انجمن۔"

میں نے ہنس کے کہا۔ "بے وقوف... میں جس ہیروئن کی بات کر رہا ہوں وہ نشہ ہوتا ہے... سگریٹ میں ڈال کے استعمال کیا جاتا ہے۔"

اس نے گھڑے جیسا سر ہلایا۔ "ماما تو بالکل پاگل ہو گیا تھا کہنے لگا گرمی بہت ہے نور محمد... سارے کپڑے اتار کے نہاتا رہا... پھر ایسے ہی لیٹ گیا اور مجھ سے پوچھنے لگا کہ آخر کپڑے پہننے کی کیا ضرورت ہے... اچانک خیال آیا کہ اس وقت ماما ہوش میں نہیں ہے... کچھ چھپائے گا نہیں... میں نے اس سے ساون خان کے بارے میں

پوچھا کہ وہ کہاں چلا گیا ہے؟ ماما اسے گالیاں دینے لگا کہ وہ بڑا کمینہ ہے، اسی طرح دھوکا دیتا ہے مجھے... اس کی وجہ سے جیل جانا پڑا تھا مجھے... خود پکڑا گیا تو مجھے بھی پکڑوا دیا خواہ مخواہ... جیل کاٹ کے آجاتا... جیل میں بھی ایسا ہی کرتا تھا اور اس کمہارن کے معاملے میں بھی... میں نے پوچھا کہ اب کیا دھوکا دیا ہے تمہیں تو مامے نے پھر گالیاں دیں کہ اس نے کہا تھا فاطمہ کی مجھ سے شادی کردے گا۔ بیس ہزار مانگ رہا تھا، میں نے بڑی مشکل سے تیرہ ہزار پورے کیے۔ ایک بھینس مل گئی تو گاہک نہیں ملتا تھا پھر جو ملا بڑا کمینہ تھا۔ پچاس ہزار کی بھینس پندرہ میں لے گیا۔ کہنے لگا کہ چوری کا مال ہے تو بس یہی قیمت ہوگی۔ میں نے لے لیے... دو رکھے اپنے پاس اور تیرہ ساون خان کو دینے گیا تو اس نے انکار کردیا کہ بیس سے ایک پیسا کم نہیں لوں گا۔ میں نے منت سماجت کی اور کہا کہ باقی ایک ہفتے میں کردوں گا تو بولا کہ شادی بھی ایک ہفتے بعد ہوگی... مگر وہ سور کا بچہ لڑکی اور میرے پیسے دونوں لے کر بھاگ گیا..."

میں نے مایوسی سے کہا۔ "یعنی تمہارے مامے کو بھی پتا نہیں کہ ساون خان کہاں گیا ہے؟"

نور محمد نے سر کو دائیں بائیں ہلایا۔ "مگر سر جی! اسے معلوم تھا کہ فاطمہ نام کی کوئی بیٹی نہیں تھی اس کی۔ میں نے پوچھا کہ پھر یہ کہاں سے آگئی تو اس نے ساون خان کو اور گالیاں دیں کہ کمینہ مجھے بے وقوف بناتا تھا۔ گائے بھینس ہوتی تو میں کہتا کہ کسی دوسرے گاؤں سے لے آیا ہوگا۔ لڑکی کا کہہ رہا تھا کہ نہر سے پکڑی تھی جیسے لڑکی نہیں مچھلی تھی۔"

میں چونک پڑا۔ "یہ کہا تمہارے ماما سے؟"

"ہاں جی... ساون خان نے یہی بتایا تھا اسے... لڑکی نہر میں سے نکالی تھی۔ کبھی موسم میں مچھلیاں بھی آجاتی ہیں نہر میں... یہاں لڑکے ہاتھ سے پکڑ لیتے ہیں۔ ساون خان بانس میں ڈوری باندھ کے کنارے پر بیٹھا رہتا تھا۔ مامے نے کہا کہ اس کی ماما سے کئی بار لڑائی ہوئی اس بات پر لیکن اس نے سچ کبھی نہیں بتایا۔"

"سچ تو وہی تھا جو اس نے بتایا تھا۔" اس انکشاف نے میرے جذبات کی دنیا میں ایٹم بم کا دھماکا کردیا تھا۔ "یہ کب کی بات ہے؟"

"کافی دن پہلے کی بات ہے۔ پہلے ساون خان نے کسی کو بھی پتا نہیں چلنے دیا۔ پھر لوگوں سے کہا کہ میری ایک رشتے دار اسے درگاہ پر لائی ہے۔ اس پر آسیب ہے... وہ باہر سب سے الگ رہتا تھا۔ اس سے کوئی ملتا نہیں تھا لیکن وہ اس کمہارن کے ساتھ فاطمہ کو درگاہ پر لے گیا تھا تو سب نے دیکھا تھا۔"

"اچھا! وہ کمہارن کہاں ہے؟"

"وہ بھی ساون خان کے ساتھ نکل گئی ہے۔ ساون خان اتنا بڈھا تو نہیں تھا۔ میرے مامے کے مقابلے میں دس سال زیادہ عمر تھی اس کی... یہ مجھے مامے نے بتایا لیکن کمہارن اسے زیادہ پسند کرتی تھی۔"

"وہ کوئی اچھی عورت تو نہیں ہے۔" میں تشویش میں مبتلا ہوگیا۔

اس نے تائید میں گردن ہلا دی۔ "لوگ ایسا ہی سمجھتے ہیں۔"

"نور محمد... تمہاری اور کسی سے بات ہوئی؟ پتا یہ چلانا تھا کہ وہ فاطمہ کے ساتھ کہاں جا سکتا ہے۔ تم نے کہا تھا کہ گاؤں میں اس کے رشتے دار ہیں جو اس سے ملنا پسند نہیں کرتے۔"

"ایک اس کا رشتے کا چاچا ہے۔ اس سے پوچھا تھا میں نے۔ وہ گرم ہوگیا کہ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ الٹا مجھ سے پوچھنے لگا کہ وہ میرا کیا لگتا ہے۔ میں نے آپ کا حوالہ دے کر بڑی مشکل سے جان چھڑائی۔ دوسری ایک خالہ ہے دور کی... پاگل... خود کو سو کا بتاتی ہے... جھوٹ بولتی ہے۔ ستر، اسی کے درمیان ہوگی۔ ٹھیک سے نظر نہیں آتا، اب بہری بھی ہوتی جارہی ہے۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا ساون خان کے بارے میں... ادھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ مجھے بہت چلا کے کان میں بات کرنا پڑی۔ کہہ رہی تھی کہ پچھلی عید پر آیا تھا وہ، کئی مہینے پہلے کی بات ہے پھر اس کا شوہر آگیا... اس سے آدھی عمر کا... بڑھیا کی کچھ زمین تھی۔ اس کے لالچ میں شادی کرلی کہ وہ کتنے دن جیے گی مگر بڑھیا مرنے کا نام نہیں لے رہی... مجھے تو لگتا ہے کسی دن وہ خود نہ مار دے۔"

میں نے کہا۔ "نور محمد! ان باتوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ دیکھو جو کمہارن اس کے ساتھ ہے، کیا نام ہے اس کا نگی... وہ بدکردار عورت ہے۔ اس کے صرف تمہارے ماما شیدے پاپی اور ساون خان سے ہی مراسم نہیں ہوں گے اور بھی اس کے بہت چاہنے والے ہوں گے۔ وہ ساون کے ساتھ نکلی ہے تو اس کا پہلے سے پروگرام ہوگا۔ ہوسکتا ہے اس نے کسی سے ذکر بھی کیا ہو۔ عورت کے لیے راز کو راز رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ وہ دونوں جرم کر کے نہیں بھاگے... ان

کے درمیان بات ہوئی ہوگی کہ کہاں جائیں گے اور کیا کریں گے۔ اگر تم نگی کی کسی جاننے والی سے پوچھو جس کے ساتھ اس کا ملنا ہو تو شاید کوئی بات معلوم ہو جائے۔ پتا چل جائے وہ کدھر گئے ہیں۔"

نور محمد کچھ مایوس اور دلبرداشتہ نظر آنے لگا۔ شاید میری جرح سے وہ سمجھ رہا تھا کہ اس کی حاصل کردہ معلومات میرے لیے غیر اہم ہیں اور اسے کوئی انعام نہیں ملے گا۔ "وہ لاہور یا ملتان گئے ہوں گے جی... ہو سکتا ہے وہ شادی بھی کر لیں۔"

"نور محمد! مجھے ان کی شادی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اندازہ میں بھی کر سکتا ہوں کہ یہی دو شہر قریب ہیں جہاں وہ جا سکتے ہیں لیکن ٹرین میں بیٹھ کے کوئی بھی کراچی جا سکتا ہے۔ مجھے فکر ہے فاطمہ کی۔ نگی ایک بدکردار عورت ہے اور ساون خان بھی جرائم پیشہ ہے۔ یہ نہ ہو کہ وہ فاطمہ کو پیسے کے لالچ میں بیچ ڈالیں۔ وہ خوب صورت لڑکی ہے اور اسے ابھی اچھے بُرے کی تمیز بھی نہیں۔ وہ کسی سے بھاری رقم اینٹھ کے فاطمہ کی اس سے شادی کر سکتے ہیں۔"

نور محمد اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔"

"مجھے یقین ہے کہ تم معلوم کر لو گے۔" میں نے جیب میں سے کچھ نوٹ نکالے جو دو ہزار سے اوپر رقم تھی۔ "یہ تمہارا انعام... تم نے بڑی دلچسپی اور ذمے داری کا مظاہرہ کیا... کوشش کرتے رہو... اگلی بار دگنی رقم ملے گی اگر کام کی بات معلوم کر کے آئے... چائے پیو گے؟"

اس نے للچائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ رقم جیب میں رکھی اور نفی میں سر ہلا دیا۔ اس کے لیے یہ بہت بڑی دولت تھی۔ اس کے جانے کے بعد مجھے مایوسی اور اضطراب نے گھیر لیا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ وہ فاطمہ نہیں نورین ہی تھی اور ساون خان نے اسے نہر سے ایسے ہی ڈوبنے سے بچایا تھا جیسے ریشم نے مجھے... لیکن صدمے یا بے ہوشی میں ہونے والے نقصان کے باعث اس کی یادداشت متاثر ہوئی تھی۔ یہ کوئی ماہر ڈاکٹر ہی بتا سکتا تھا کہ یہ نقصان عارضی ہے اور اس کا علاج ممکن ہے یا نہیں۔ یہ قسمت کی بات تھی جس نے مجھے بابا رحیم بخش کے گھر میں اور پھر اس حویلی میں پہنچا دیا تھا اور فاطمہ ایک بدکردار آدمی کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ ساون کے لیے وہ راہ چلتے مل جانے والا لاٹری کا ٹکٹ بن گئی تھی۔ بدقسمت لڑکی ایک ظالم چچا اور زبردستی شوہر بن جانے والے پاگل چچا زاد کے چنگل سے نکلی تو سلمان خان جیسے دھوکے باز عاشق کے ہتھے چڑھ گئی۔ اس کی موت آج بھی ایک معما تھی لیکن شک کی کوئی بات تھی کہ وہ لالچ میں غلط کام کرنے اور کرانے والوں کے ہاتھوں میں مارا گیا تھا۔ وہ کوئی کام نہیں کرتا تھا مگر مجھے اس کے قبضے سے دس لاکھ ملے تھے جو آج تک میرے کام آ رہے تھے۔ بدقسمتی نورین کے پیچھے سائے کی طرح لگ گئی تھی۔ اس نے ایک محفوظ اور خوشیوں سے معمور ازدواجی مستقبل کا جو خواب دیکھا تھا، وہ سلمان خان کی وجہ سے بے تعبیر ثابت ہوا تھا۔ شاید آج بھی اسے معلوم نہ ہو کہ اس کا وہ عاشقِ صادق اسے دنیا میں بے یار و مددگار چھوڑ کے کسی بے نشان مدفن میں جا سویا ہے۔ دوسرا خواب میں نے دیکھا تھا کہ نورین بالآخر میری ہو جائے گی اور میں اس کا دل جیتنے میں کامیاب بھی ہو جاتا کہ ایک حادثے نے پھر اسے اور مجھے جدا کر دیا۔

نورین کے خیال نے مجھے رات تک مضطرب رکھا۔ مجھے انور سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ صبح سے عجیب پُراسرار نحوست نے حویلی کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ چودھری صاحب ہر روز ڈاکٹر جلالی کے ساتھ ہی کھانا کھاتے تھے۔ پتا چلا کہ انور نے اپنا کھانا ریشم کے کمرے میں منگوا لیا تھا۔ یہی میں نے بھی کیا۔ میں کسی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر تھا۔ نورین ایک جھلک دکھا کے پھر گم ہو گئی تھی اور اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو... اس کی تلاش میں جاؤں بھی تو کدھر... اسے نقشِ ماضی سمجھ کے بھلا دوں... یہ بھی ممکن نہ تھا۔

نہ جانے رات کا کتنا حصہ ان تصویروں کو پھر تصور میں متحرک دیکھتے گزر گیا جو یادوں کے البم میں قبر پر لگے کتبوں کی طرح تھیں کہ گزرا ہوا ہر لمحہ جیسے ماضی سے حال کا حصہ بن گیا تھا۔ پھر معلوم نہیں کب نیند نے رحم کھا کے مجھے اپنی مہرباں آغوش میں لے لیا۔

خلافِ معمول میں دن چڑھے تک سوتا رہا۔ میں جاگا بھی اس وقت جب سلونی نے دروازے پر دستک دی اور اندر آ گئی۔

"اٹھیے... کب تک سوئے پڑے رہیں گے۔" وہ بولی۔

میں اس کی طرف دیکھے بغیر آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ "کل رات نیند بہت دیر سے آئی۔"

اس نے متانت سے کہا۔ "آپ کو جگانا ضروری ہو گیا تھا، ایک خبر تھی آپ کے لیے۔"

اب میں نے اس کے متفکر چہرے اور پُرتشویش لہجے پر غور کیا۔ "سلونی! سب ٹھیک ہے نا؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "صبح صبح ایک بُری خبر لے کر آنا پڑا ہے۔ اب آپ فوراً تیار ہو کے ناشتا وغیرہ کر لیں۔"

"پہلے بتاؤ خبر کیا ہے؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"وہ... ریشم... اسے اسپتال لے گئے ہیں۔"

میں یوں اٹھ کھڑا ہوا جیسے مجھے الیکٹرک شاک لگ گیا ہو۔ "ریشم کو اسپتال لے گئے ہیں... کیوں؟ کیا ہوا ہے اسے؟"

"پریشان نہ ہوں سر... غالباً گولیاں کھا لی تھیں اس نے۔"

میں چلایا۔ "کون سی گولیاں... نیند کی؟"

سلونی نے نفی میں سر ہلایا۔ "دوسری... ابارشن کے لیے۔"

میری نظر سلونی پر جم گئی۔ "ابارشن... او مائی گاڈ... یہ گولیاں وہ کہاں سے لائی... مجھے پوری بات بتاؤ۔"

اس نے حوصلہ افزا طریقے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے بٹھا دیا۔ "یہ تو میں نے آپ کو کل ہی بتا دیا تھا کہ ریشم خطرہ مول لے رہی ہے۔"

"جو میں پوچھ رہا ہوں، وہ بتاؤ۔" میں نے سختی سے کہا۔

"وہ خود تو کہیں بھی نہیں گئی اور یہاں یہ گولیاں ملتی ہیں مگر صرف حویلی میں رہنے والے مردوں کے پاس... کبھی ضرورت پڑ جاتی ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے... انور نے یہ کام کیا؟"

"میں ایسا نہیں کہہ سکتی... کسی ثبوت کے بغیر... ہو سکتا ہے ریشم نے اپنی مشکل کا ذکر بھابی سے کیا ہو... اور اس نے لا دی ہوں۔ اسے معلوم ہوگا کہ یہ گولیاں کس کی الماری میں مل سکتی ہیں۔"

میں نے غصے کی آگ کو اپنے لہو میں بھڑکتا محسوس کیا۔ "خواہ مخواہ انور کا دفاع مت کرو۔ اس کے سوا کون کر سکتا تھا ایسی حرکت... ریشم پہلے بھابی کو کیوں بتائے گی... وہ تم سے ذکر کرتی۔"

"آج کل وہ کچھ کھنچی کھنچی سی رہتی ہے مجھ سے..."

"اصل مجرم تو انور ہے... اس نے انور کو سب سے پہلے بتایا ہوگا اور اس نے روایتی عیاش وڈیرے کی طرح کہا ہوگا کہ اتنی سی بات پر گھبراتی کیوں ہو... یہ تو ہوتا رہتا ہے لڑکیوں کے ساتھ... ابھی تو ابتدا ہے... فکر کی بات ہی نہیں... اور لے آیا ہوگا گولیاں... کئی سال گزارے ہیں ولایت میں۔ اسے تو عادت ہوگی ان مسائل سے نمٹنے کی... لیکن ریشم کو اسپتال کیوں لے جانا پڑا؟ ایسے معاملات سے تو تم بھی نمٹ سکتی ہو... اور یہاں کی کسی تجربہ کار دائی کے علاوہ ڈاکٹر جلالی تھا... یہ کب کی بات ہے؟"

"ابھی انور کا اسپتال سے فون آیا تھا۔ ریشم ٹھیک ہے۔ اب وہ سو رہی ہے۔ دو چار دن میں واپس آ جائے گی۔ مجھ سے تو بات نہیں ہوئی میرے پوچھنے پر بھابی شاہینہ نے بتایا کہ رات کو ساڑھے تین بجے ریشم کی طبیعت خراب ہوئی تو انور مجھے لے گیا تھا۔ انور نے خود ہی بتا دیا کہ کیا معاملہ ہے۔ وہ نہ بتاتا تب بھی مجھے پتا چل جاتا۔"

میں ایک دم اٹھ کے باہر نکل گیا اور سیدھا شاہینہ کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ نہا کے نکلی تھی اور اس نے خود کو ایک تولیے میں لپیٹ رکھا تھا۔ مجھے بڑی شرمندگی ہوئی کہ ناراضی اور پریشانی میں دروازے پر ناک نہیں کیا۔ عورت کیا، کسی لڑکے کے کمرے میں بھی یوں بیل کی طرح گھس جانا بدتمیزی ہے۔

میں نے گھبراہٹ میں کہا۔ "آئی... ایم سوری۔" اور واپس جانے کے لیے پلٹا۔

میرے کانوں میں بھابی کی غصے بھری آواز کے بجائے شوخ لہجے کی ناراضی سنائی دی۔ "اوہو دیور جی... چلو ہو گئی غلطی... اب بھاگنے سے کیا فائدہ۔"

میں رک گیا۔ "آپ کپڑے بدل لیں۔"

"ہاں بدلتی ہوں۔ تم بیٹھو... مجھے پتا ہے تمہارے دل کا حال... تم پریشانی میں بوکھلائے ہوئے ہو۔" وہ ہنسی۔

میں آہستہ سے پلٹا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ شاہینہ کا رویّہ مجھے بہت عجیب لگا۔ پریشان وہ کیا ہوتی، ایسا لگتا تھا کہ وہ خوش ہے۔ کپڑے بدلنے کے لیے وہ واش روم میں جا چکی تھی لیکن پہلی نظر میں جو میں نے دیکھ لیا تھا، وہ اس کے مجازی خدا کے سوا ہر مرد کی نظر کے لیے جرم کی حد تک ممنوعہ نظارہ تھا۔ وہ ایک بھرپور بدن رکھنے والی حسین عورت تھی۔ ایک تولیا کہاں تک اس کی پردہ پوشی کر سکتا تھا۔ پہلے مجھے اس کے پشت پر پھیلے ہوئے گیلے بال ہی نظر آئے تھے لیکن آہٹ پر اس نے پلٹ کے دیکھا تو اس کے جوان جسم کی ساری رعنائی میرے سامنے آ گئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے وہ بھی مبہوت ہو گئی تھی۔ پھر بے اختیار اس نے تولیے کو اپنے وجود پر لپیٹ لیا تھا جو گیلے بال صرف اس کے شانوں پر پڑا

ہوا تھا۔ اس نے میری غلطی کو کیوں معاف کر دیا تھا جو ایک سنگین جرم سے کم نہ تھی؟ اس سوال کا کوئی جواب تلاش کرنا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ میں ہرگز ایسا نہیں سوچ سکتا تھا کہ شاہینہ نے دعوتِ گناہ کا سوچا تھا یا میری حوصلہ افزائی کی تھی۔ وہ تنہائی اور فرسٹریشن کا شکار تھی مگر حویلی کے ماحول میں گھر کی بڑی بہو کے دل میں کوئی غلط خیال آ ہی نہیں سکتا تھا۔

تاہم عورت کے معاملے میں میرا تجربہ انتہائی محدود تھا۔ اس کی فطرت کائنات کا سب سے پیچیدہ معما سمجھی جاتی تھی تو یہ بات بے سبب نہ تھی۔ شاہینہ میرے سامنے آ کے بیٹھی تو پھر وہی تھی۔ پل بھر کے لیے اس کا بدلا ہوا چونکا دینے والا روپ اندھیرے میں نظر کو خیرہ کرنے والی بجلی کی طرح تھا جو پھر بادلوں میں گم ہو جائے۔ وہ سپاٹ چہرے والی وہی خاندانی بہو تھی جس کے اندازِ بے رخی میں حاکمانہ احساسِ تفاخر صاف نظر آتا تھا۔

اس نے تند لہجے میں کہا۔ ''تم جیسے پڑھے لکھے آدمی سے اس بدتمیزی کی توقع نہیں تھی مجھے... پتا ہے یہ بڑے چودھری صاحب کو معلوم ہو تو کیا ہوگا؟''

''کیا ہوگا؟ میرا قتل ہو جائے گا۔ میں دستک دینا بھول گیا تھا تو آپ کو بھی اندر سے کنڈی لگانا یاد نہیں رہا تھا۔ میری جگہ کوئی اور بھی آسکتا تھا۔ پھر بھی میں دوبارہ معافی مانگتا ہوں آپ سے۔''

''ایسی کیا آفت آ گئی تھی آخر؟''

میں نے کہا۔ ''پہلے میں یہ دروازہ کھول دوں تاکہ بند دروازے کے پیچھے کی ملاقات پر کسی کو اعتراض نہ ہو... ریشم کو کیا ہوا تھا؟''

وہ مجھے دیکھتی رہی۔ ''وہی جو حویلی میں ہوتا رہتا ہے، بدکردار کم ذات لڑکیوں کے ساتھ۔''

میں نے برہمی سے کہا۔ ''ریشم بدکردار نہیں تھی۔''

وہ طنز سے بولی۔ ''اچھا، پھر یہ سب کیسے ہو گیا؟ اتنا اعلیٰ کردار تھا اس کا تو وہ کیوں اٹھ اٹھ کے جاتی رہی رات کو انور کے کمرے میں... انور خود تو نہیں گیا کبھی اس کے پاس... اور نہ وہ اسے اٹھا کے لے جاتا تھا۔''

''بھابی... وہ ناتجربہ کار جذباتی لڑکی بے وقوف بھی ہے۔''

بھابی چمک کر بولی۔ ''بے وقوف ہرگز نہیں ہے وہ... وہ تو حد سے زیادہ چالاک اور بے شرم ہے۔ اس نے پھانسا انور کو اور پھر وہی حربہ استعمال کیا جو ہر کم حیثیت لڑکی کسی مرد کو بلیک میل کرنے کے لیے استعمال کرتی ہے۔''

میں نے احتجاج کیا۔ ''آپ انور کو بالکل بری الذمہ قرار دے رہی ہیں۔''

''انور کی بات مت کرو۔ وہ مرد ہے۔ کسی کم ذات لڑکی نے آج تک ہمت نہیں کی کہ بچے کے نام پر کسی کو بلیک میل کر سکے مگر وہ موری کی اینٹ چوبارے چڑھنے کے خواب دیکھ رہی تھی۔ شادی کرنا چاہتی تھی انور سے۔''

''شادی کا اصرار انور کی طرف سے تھا۔''

بھابی تلخی سے ہنسی۔ ''ہاں، یہ ریشم کہتی ہوگی نا۔ پوچھنا اپنے دوست سے کہ کیا واقعی وہ روزینہ جیسی خاندانی لڑکی پر ریشم کو ترجیح دے سکتا ہے؟''

مجھ پر ایک بجلی سی گری۔ ''انور... شادی کرے گا روزینہ سے؟''

''اور کس سے کرے گا... اس میں شک کی کون سی بات ہے۔ یہ رشتہ تو طے تھا اور ہے۔''

یکلخت ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ ریشم نے یہ قدم کیوں اٹھایا تھا۔ ضرور انور نے اس کے سامنے اپنے ارادے کا اظہار کیا ہوگا اور بہت سی عقل کی دلیلوں کے ساتھ روزینہ سے شادی کی ضرورت اور اہمیت کو واضح کیا ہوگا۔ شاید اس نے کہا ہوگا کہ محبت تو وہ ریشم سے ہی کرتا ہے اور کرتا رہے گا۔ روزینہ ایک ضرورت ہے اور بہت سے مسائل کا حل... اس شادی سے کتنے جھگڑے ختم ہوتے ہیں اور سب کا مستقبل کتنا محفوظ ہوتا ہے۔ مستقبل سب کا سوائے ریشم کے... جو بڑے غرور میں تھی کہ اس نے روزینہ کو شکست دے دی ہے۔ اس کی محبت پر اجارہ داری قائم ہے اور انور لاکھ وڈیرا سہی... اس کی محبت میں ایک بندۂ بے دام ہے۔ نادان لڑکی محبت کی پہلی اڑان میں ہی ذلت و رسوائی کے اندھے کنوئیں میں جا گری۔ اس کی خوش فہمی کا سارا غرور کسی آسیب کی طرح تحلیل ہو گیا، بے وجود ہو گیا۔

اب میں انور کو جانتا تھا۔ اس انور کو نہیں جو مجھے ایک قید خانے میں ملا تھا اور جو باہر ساری دنیا گھوم کے اور تعمیرات میں ڈگری لے کر آیا تھا۔ میں اس انور کو جانتا تھا جس کی رگوں میں صدیوں سے اپنے جاگیردار... مغرور اور خود پرست انسان کا خون تھا۔

شاید اس نے ریشم کے سامنے یہ متبادل بھی رکھا ہو کہ... ضرورت کے تحت روزینہ سے شادی کر لے گا مگر محبت صرف ریشم سے ہی کرے گا۔ یہ دوسرے درجے کی حیثیت ریشم کے منہ پر طمانچہ تھی کہ اس جیسی کم حیثیت لڑکی

سے محبت ضرور کی جا سکتی ہے لیکن اسے وہ عزت نہیں دی جا سکتی جو روزینہ جیسی خاندانی لڑکی کو ہمیشہ حاصل تھی اور رہے گی۔ شاید اس کے بعد صدمے کی شدید جذباتی کیفیت میں ریشم نے یہ بھی کہا ہو کہ اب تو وہ اس کے بچے کی ماں بننے جا رہی ہے... اور انور نے اس کا وہی جواب دیا ہوگا جو حویلی میں دیا جا سکتا تھا۔ بچے کو روکا جا سکتا ہے ابھی اس کی آمد نا وقت ہے۔ شادی کے بعد آنا چاہیے اسے اور شادی ابھی نہ سہی مگر بالآخر ہوگی۔ ہر کام اپنے وقت پر اچھا لگتا ہے۔ خوامخواہ کی بدنامی اور ایک غلطی کا ڈھنڈورا پیٹنے سے کیا فائدہ...

اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ ''بھابی! ریشم نے اپنی جان لینے کی کوشش تو نہیں کی تھی؟''

شاہینہ تلخی سے مسکرائی۔ ''کاش وہ اتنی غیرت مند ہوتی۔ اگر اپنی عزت کا خیال ہوتا تو وہ خود کو ایسے انور کے قدموں میں نہ ڈالتی۔''

''آپ عزت اور غیرت کے اپنے تصورات کو سنبھال کے رکھیں... مجھے بتائیں ہوا کیا تھا؟'' میں نے خفگی سے کہا۔

''ہونا کیا تھا۔ رات کو انور میرے پاس مجرم بنا آیا تھا اور اس نے مجھے شریکِ راز کر لیا تھا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا اور پریشان تھا۔ میں نے تسلی دی اسے کہ یہ ایسا کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔ یہ مردوں کا معاشرہ ہے۔ یہاں عورتوں ہی کو سب بھگتنا پڑتا ہے، ریشم جیسی عورتوں کو... وہ ڈرا ہوا تھا کہ بدنامی ہوگی اور ایسا نہ ہو کہ ریشم اسے بلیک میل کرے۔ میں نے اسے غیرت دلائی کہ کیسے مرد ہو... ڈرنا اسے چاہیے۔ پھر میں نے اس کا مسئلہ حل کر دیا... میں گھر کی مالکن ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ ضرورت کی کون سی چیز کب کام آتی ہے اور کہاں رکھی ہے۔''

''وہ... اس پر تیار ہو گئی تھی یا انور نے اسے بے خبر رکھا تھا کہ اس کے درد کی دوا کیا ہے؟''

''یہ مجھے نہیں معلوم... میں اس کے ساتھ نہیں تھی۔ ویسے تو محفوظ دوا تھی... اور بے ضرر... ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ معلوم نہیں کیوں اس کی حالت بگڑ گئی اور انور کو اسے لے کر اسپتال بھاگنا پڑا۔''

''کسی نے مجھے جگا کے بتانا ضروری نہیں سمجھا؟''

''یہ بھی انور سے پوچھنا۔ ویسے تم کیا ہو ریشم کے آخر کہ تمہیں بتانا ضروری تھا؟ اور زیادہ شور شرابا کرنے کی ضرورت نہیں... وہ بچ گئی ہے، وہاں ڈاکٹروں نے اس کا معدہ واش کر دیا ہے۔''

''تم تو کہہ رہی تھیں کہ بے ضرر دوا تھی؟''

''ہاں، میں نے تو استعمال نہیں کی مگر اکبر نے لا کے دی تھی مجھے... ساتھ والے گاؤں کی ایک لڑکی تھی... لڑکی بھی کیا شادی شدہ عورت تھی مگر تھی جوان اور مست... شوہر خود چھوڑ کے گیا تھا چودھریوں کی خدمت کے لیے... وہ پلٹ کے گئی ہی نہیں... شوہر کو بھی مال ملتا رہا... کتے کے آگے ہڈی ڈال دو تو وہ بھونکنا بھی بھول جاتا ہے... لیکن وہ تھا بہت بدمعاش... پتا چل جاتا تو نہ جانے کیا کرتا... چھوٹی موٹی چوریاں کرتا رہتا تھا اور جیل بھی کاٹ آیا تھا خیر سے۔''

میرے کان کھڑے ہوئے۔ ''تم ساون خان کی بات کر رہی ہو؟''

شاہینہ چونکی۔ ''تم کیسے جانتے ہو ساون خان کو؟''

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ''سب کو جان چکا ہوں میں بہت کم وقت میں۔ مجھے شک ہے کہ تم نے اسے اور کچھ دے دیا ہوگا تاکہ اس کا قصہ ہی پاک ہو جائے۔ اپنی بہن کے لیے ریشم کو قربان کر دینا بہت آسان ہوگا تمہارے لیے۔ لیکن شاہینہ! اگر وہ مر جاتی تو تمہیں اس سوال کا جواب مل جاتا کہ آخر میں اس کا کیا لگتا ہوں۔''

میرے پیچھے بھابی نے ناراضی سے کہا۔ ''ملک صاحب! اچھا تھا پتا چل جاتا کہ تم کتنے پانی میں ہو... ہمت ہے تو کچھ کر کے دکھاؤ۔ مجھے افسوس ہے کہ اس بے حیا کا قصہ پاک نہیں ہوا۔ میں نے تو اسے پرانی گولیاں دے دی تھیں جن کے استعمال کی تاریخ گزر چکی تھی۔ جاؤ پرچہ کٹوا دو میرے خلاف بھی۔''

بھابی شاہینہ کے کمرے سے نکلتے وقت میں جتنا دکھی تھا، اس سے زیادہ مشتعل تھا لیکن ایک شکست خوردہ لشکر کے سپہ سالار کی طرح میں اپنا غصہ بھی اپنے آپ پر ہی نکال سکتا تھا۔ بھابی فاتح بھی اور حاکم... تقدیر کا پانسا اس کے حق میں پلٹ چکا تھا۔ بلاشبہ یہ سارا منصوبہ اس کے باپ اظہر علی شاہ کے شاطر ذہن نے تیار کیا تھا اور اس پر عمل درآمد کی ابتدا بھی اس نے میرے اغوا سے کی تھی۔ اغوا کا مقصد صرف میرے ذریعے اپنے پلان کو انور تک پہنچانا نہیں تھا، وہ مجھے اپنی طاقت کے مظاہرے سے دہشت زدہ بھی کرنا چاہتا تھا۔ اس کا پلان بہت واضح اور دوٹوک تھا۔ ریشم کے ساتھ نکل جاؤ کیونکہ ریشم کی وجہ سے ہی انور کی روزینہ سے شادی کا معاملہ اٹکا ہوا ہے۔ جب تک وہ لڑکی انور کے

سامنے رہے گی اسے راہِ راست پر لانے کی کوشش بھی کامیاب نہیں ہوگی۔

بالواسطہ طور پر پیر صاحب نے مجھے دو طرف سے محصور کیا تھا۔ ایک میرا ماضی تھا جس کے بارے میں ابھی تک پیر صاحب نے اپنے وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے کوئی تفتیش نہیں کی تھی لیکن میں کون ہوں اور اس حویلی میں کیسے آیا، یہ معاملات شک پیدا کرتے تھے اور میری حقیقت کا پتا چلایا جا سکتا تھا۔ یہ دھمکی مجھے پیچھے ہٹ کے دفاعی پوزیشن میں لانے کے لیے بہت کافی تھی۔ اب میں دوبارہ پولیس یا نادر شاہ کے ہاتھوں گرفتار ہو کے پھر عمر جیل میں پھانسی کے تختے پر کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ معاملہ اتنا پرانا ہو گیا تھا کہ میں سب کچھ بھول چکا تھا اور ایک نئی زندگی کے سفر میں بہت آگے بڑھ گیا تھا لیکن پولیس کے ریکارڈ میں سب کچھ موجود تھا اور میرا سب سے بڑا دشمن نادر شاہ بھی زندہ تھا۔

دوسری دھمکی واضح نہیں تھی۔ پیر صاحب نے نورین کو خود فاطمہ بنا کے میرے مقابل کیا تھا تا کہ مجھے کمزور کیا جا سکے۔ یا یہ اتفاق کے سوا کچھ نہ تھا۔ مفروضات کی حد کوئی نہ تھی۔ میں فرض کر سکتا تھا کہ فاطمہ اب پیر صاحب کی تحویل میں ہے۔ حقیقت کچھ بھی ہو لیکن اب میں ذہنی انتشار میں مبتلا ہو گیا تھا اور حویلی میں رہنے سے زیادہ نورین کی تلاش میں نکل جانے کے خبط میں مبتلا تھا۔

پیر صاحب کی امن تجاویز پر لب کشائی کا قصوروار میں ہی تھا۔ مجھے بتانا پڑا کہ پیر صاحب نے زبردستی مجھے مہمان رکھا تھا تو کیوں اور مجھ سے کیا کہا تھا۔ یہ خیال تو کہیں شاہینہ یا بڑے چودھری صاحب کے دل کی گہرائی میں بھی موجود تھا۔ اثر صرف میری بات سے نہیں ہوا، اس خیال پر عمل درآمد کی راہ میں ایک رکاوٹ ریشم محسوس ہوتی تھی تو دوسری اس سے بھی بڑی رکاوٹ مراد تھا۔ پیر صاحب کا انجان بنے رہنا اپنی عزت کا بھرم رکھنے کے لیے ضروری تھا۔ شاید مناسب وقت پر وہ مناسب قدم اٹھاتے مگر مراد نے انہیں یہ موقع خود ہی فراہم کر دیا تھا۔ ریشم کو منظر سے ہٹانے کی ذمے داری مجھے سونپی گئی تھی۔ مراد راہِ وفا میں اپنی جاں نثاری پر قربان ہوا۔

اور اس وقت بھابی نے موقع سے پورا فائدہ اٹھایا۔ یہ ٹھیک ہے کہ انور کی رضامندی نہ ہوتی تو شاہینہ کچھ نہ کر پاتی لیکن انور کا ذہن پھر بدل گیا۔ جو کل تک ناقابلِ قبول اور ناممکن تھا، وہ مصلحت کے تحت قابلِ عمل ہو گیا۔ میرے لیے ایسا خود غرضی کا، مفاد پرستی کا اور بے رحم فیصلہ ممکن نہ ہوتا جو انور نے کر لیا۔ اس نے کسی شرم کے بغیر نظریہ ضرورت ریشم کو سمجھانے کی کوشش کی۔ محبت اور ضرورت کا فرق اس کے سامنے رکھا اور کہا کہ ایک دفاع کا فیصلہ ہے، ایک دل کا۔۔۔ روزینہ کے حق میں دفاع کی دلیل ہے چنانچہ وہ پہلے آتی ہے۔۔۔ ریشم کے لیے دل کی گواہی ہے چنانچہ زیادہ اہم ہونے کے باوجود وہ بعد میں آئے گی۔

انور کی دلیل شاہینہ کی جیت تھی۔ اس نے ریشم کی محبت کا آئینہ چکنا چور کر دیا۔ وہ سب جن کو اپنی انا، اپنے مفادات اور اپنے خاندانی غرور پر ناز تھا، جیت گئے کیونکہ وہ ہمیشہ اسی طرح جیت کو اپنا حق سمجھتے آئے تھے۔ ریشم خود ان کے درمیان سے نکل گئی کیونکہ وہ ان میں سے نہیں تھی اور صرف محبت نہ انور کے لیے مجبوری بنی نہ کسی اور کے لیے۔۔۔ رہا میں تو مجھے حالات نے زبردستی انور کے ساتھ دوستی کے رشتے میں باندھ دیا تھا۔ اس کی زندگی میں دوستی یا محبت جیسے جذبات کی ثانوی حیثیت تھی چنانچہ اب یہ ریشم کا فیصلہ ہوگا کہ اسے خاندانی بیوی سے ایک درجہ کم پر سوشل وائف بن کے رہنا قبول کرتی ہے یا نہیں۔ میرا مسئلہ مختلف تھا۔ پہلے میں فریدالدین تھا۔ پھر خاور ہوا اور اب ملک سلیم اختر۔۔۔ تو یہاں سے جا کے کسی بھی چوتھے نام سے گمنامی کا یہ سفر جاری رکھ سکتا تھا، جب تک نورین نہیں مل جاتی۔ اس کے بعد شاید مجھے پھر خاور بن کے رہنا تھا۔

اسپتال شادمان میں تھا۔ چودھری صاحب کی فیملی کے مالکوں سے پرانے مراسم تھے چنانچہ یہاں انہیں ڈاکٹروں سے بھی خصوصی توجہ ملتی تھی۔ ڈیڑھ گھنٹے کا یہ سفر میرے لیے بہت اعصاب شکن تھا۔ بھابی نے یہ بتا دیا تھا کہ ریشم بچ گئی ہے مگر بچ جانے کے بعد کیا وہ دوسری زندگی کے لیے اپنے آپ سے کمپرومائز کر لے گی؟ کیا میرے کہنے سے انور اپنا ارادہ بدل دے گا؟ ان سوالوں کا جواب بہت جلد آنے والا وقت دے گا۔ لاہور پہنچنے تک میرے خیالوں کی آتش فشانی بہت کم ہو گئی تھی۔ مجھے سوچنے سمجھنے کے لیے وقت مل گیا تھا۔ مجھے اپنی اور ریشم کی پوزیشن کو سمجھنے کی ضرورت تھی۔ اس حویلی میں میری حیثیت یا اہمیت صرف اور صرف انور کی وجہ سے تھی ورنہ میں باہر کا وہ آدمی تھا جس کے حسب نسب پر بھی سوال اٹھایا جاتا۔ یہی صورتِ حال ریشم کے ساتھ تھی۔ انور کی نظر سے گر جانے کے بعد وہ اسی گاؤں کی ایک غریب اور کم ذات لڑکی رہ جاتی تھی۔ شاید اب وقت آ گیا تھا کہ میں اپنی منزل کا تعین پھر کروں۔ ریشم اپنے معاملات میں بہر حال خود مختار تھی۔

اسپتال کے لاؤنج میں میرا واسطہ استقبالیہ پر بیٹھی ہوئی ایک ایسی لڑکی سے پڑ گیا جو اپنی پی آر یا مارکیٹنگ کے لیے اپنی پوزیشن کا پورا استعمال کر رہی تھی۔ اس کی صورت تو واجبی تھی لیکن جوانی یقیناً دیوانی تھی۔ کچھ اس کا لباس چھپاتا کم تھا دکھاتا زیادہ تھا۔ باقی کسر وہ اپنی کوشش سے پوری کر دیتی تھی۔ اس کا انداز بھی ایسا ہی شوخ اور اشتہار دینے والا تھا۔ اسی وجہ سے وہ مالک یا انتظامیہ کی منظورِ نظر بنی ہوگی۔

فون پر باتیں کرتے کرتے اس نے میری طرف نظر اٹھائی۔ ”ریشم؟ کون ریشم... پورا نام بتاؤ۔“

”ریشم جان... گزشتہ رات بلکہ صبح سے پہلے یہاں آئی تھی۔“

اس نے ایک رجسٹر اٹھایا پھر دوسرا... ”کیس کیا ہے؟“

”یہ سب تمہارے ریکارڈ میں نہیں تو ڈاکٹر آن ڈیوٹی سے پوچھو۔“

اس نے ناگواری سے مجھے دیکھا۔ ”کس کے ساتھ آئی تھی... اور تم کون ہو اس کے؟ ہاں، یہ ہے ریشم... تمہاری کیا لگتی ہے؟“

”کیا اس سے فرق پڑتا ہے؟“ میں نے برہمی سے کہا۔

”ایسے ہر ایک منہ اٹھا کے کسی سے بھی ملنے نہیں جا سکتا... اور اس کیس میں تو آرڈر تھے کہ کسی غیر متعلقہ شخص کو نہ آنے دیا جائے۔“

”غیر متعلقہ شخص۔“ میں اپنے ردِعمل کو نہ روک سکا۔ ”کون کہتا ہے؟“

”مجھ سے بحث مت کرو... آرڈر مالک یا انتظامیہ کرتی ہے اور یہ اسپتال ہے جہاں کسی کی زبردستی نہیں چلتی۔“ وہ بولی۔

میں نے غصے کو ایک گہری سانس لے کر خارج کیا۔ ”اوکے... کیا تم اس کے ساتھ آنے والے چودھری انور کو بلا سکتی ہو یا میری اس سے بات کرا سکتی ہو... آئی ایم سوری... میں ملک سلیم اختر ہوں۔“

اس نے مجھے غور سے دیکھا اور پھر فون اٹھالیا۔ ”سر! کوئی آپ کی وائف کا نام لے کر آنا چاہتا تھا، میں نے روک دیا۔ اب آپ سے ملنا یا بات کرنا چاہتا ہے... ملک سلیم اختر... رائٹ سر۔“ اس نے فون رکھ کے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”بیٹھ جاؤ... وہ آ رہے ہیں۔“

مجھے اس انتظار میں بڑی بے قدری محسوس ہوئی۔ انور نے یہاں ریشم کو اپنی وائف بتا کے داخل کرایا تھا اور میں یہاں ایک اجنبی تھا۔ خون کا گھونٹ پی کے میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ انور چند منٹ بعد نمودار ہوا تو اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔

”سوری یار! صبح موقع نہیں ملا تھا کچھ بتانے کا۔“

میں نے تلخی سے کہا۔ ”ہاں... معاملہ تھا تمہاری مسز کا... میں کون سا سالا ہوں تمہارا۔“

”تیرا خفا ہونا بھی جائز ہے... دراصل...“

”مجھے شاہینہ بھابی نے سب بتا دیا ہے... اور وہ جھوٹ نہیں ہو سکتا انور۔“

”میرا خیال ہے کہ یہ جگہ ایسے معاملات کو ڈسکس کرنے کے لیے بالکل مناسب نہیں۔“

”مجھے ریشم کو دیکھنے سے بھی روکا گیا... یہ کیا ہے؟“

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”چل میرے ساتھ... لیکن خود پر قابو رکھنا۔“

میں نے ضبط سے کام لیا اور انور کے ساتھ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گیا۔ وہ سیدھے ہاتھ کے دوسرے کمرے میں تھی۔ یہ پرائیویٹ اور وی آئی پی قسم کا کمرا تھا جس میں ریشم گردن تک سفید چادر سے ڈھکی ہوئی کسی لاش کی طرح آنکھیں بند کیے ساکت پڑی تھی۔ یہ مدھم روشنی اور سفید بے داغ چادر بھی اس کے چہرے کو زیادہ بیمار اور کمزور بنا رہی تھی۔ لگتا تھا اس کے گلابی چہرے سے رنگ نچوڑ لیا گیا ہو۔ میں ریشم کے پیروں کی طرف کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ وہاں مجھے صرف ایک چارٹ نظر آیا جس پر نرس نے ٹمپریچر اور بلڈ پریشر وغیرہ ریکارڈ کیا تھا۔

”بھابی نے مجھ سے کہا تھا کہ ریشم بچ گئی ہے... شاید اسے افسوس تھا۔“ میں نے کہا۔

”یہ اتنا سنگین مسئلہ نہیں تھا۔“ وہ خفگی سے بولا۔

”کس کے لیے... تمہارے لیے یا ریشم کے لیے... اور جذباتی طور پر یا جسمانی طور پر...“

انور نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”میں سمجھ سکتا ہوں تیرے جذبات کیا ہیں لیکن یہ جگہ نہیں ہے ایسی باتوں کے لیے۔“

”جو باتیں مجھے شاہینہ بھابی نے بتائی ہیں، اس کے بعد کوئی گنجائش نظر نہیں آتی کسی بات کی۔“

”بھابی کی بات چھوڑ... میں تیری ناراضی دور کر دوں گا۔“

”یار انور! میری ناراضی کی کیا اہمیت ہے اس معاملے میں؟“

اس نے اصرار کیا۔ ”ہے... بس ایک دو دن میں ریشم لوٹ کے گھر آ جائے گی۔ اس کی غلط فہمی اور تیری ناراضی کی اہمیت میرے لیے ہے۔ ہم بیٹھ کے بات کریں گے، یہ کوئی کشمیر کا مسئلہ نہیں۔“

میں خاموش ہو گیا اور انور آہستہ آہستہ میرے ساتھ باہر آ گیا۔ نیچے یہاں انتظار کرنے والوں کے لیے دیوار کے ساتھ ساتھ کرسیاں لگا دی گئی تھیں۔ اس وقت کوئی اور نہیں تھا۔ یہی جگہ شام کو او پی ڈی میں آنے والوں کے لیے تھی۔ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ یہ بہت مہنگا اسپتال ایک مخصوص دولت مند کلاس کے مریض ہی افورڈ کر سکتے ہیں۔

انور میرے ساتھ تھا لیکن نیچے پہنچتے ہی اس کے سامنے ایک لیڈی ڈاکٹر اندر آئی۔ ”ہیلو چودھری صاحب... ہاؤ از یور وائف ناؤ...“ اس نے خوش دلی سے کہا اور مجھ سے بھی ہاتھ ملایا۔

”بیٹر ناؤ آئی تھنک... ڈاکٹر عذرا۔“ انور بولا اور مجھ سے ایکسکیوز کر کے ڈاکٹر کے ساتھ پھر اوپر چلا گیا۔ ڈاکٹر عذرا گائنی اسپیشلسٹ سے زیادہ ریمپ پر کیٹ واک کرنے والی کوئی ماڈل لگتی تھی۔ اس کی عمر چالیس سال تو ضرور ہوگی لیکن اس کا جسم قدرتی طور پر سلم نہیں تھا تو اسے کریڈٹ جانا چاہیے کہ جم کی پابندی سے وہ اس عمر کو بہ آسانی دس بارہ سال کم دکھانے میں پوری طرح کامیاب تھی۔ باقی کسر اس نے لباس... میک اپ اور اندازِ دلربائی سے پوری کی تھی۔ اب وہ چوبیس پچیس سال کی نوآموز لڑکی لگتی تھی۔

اب دوپہر ہونے کو تھی۔ میں نے صبح ناشتا بھی نہیں کیا تھا اور چائے پیے بغیر حویلی سے نکل آیا تھا۔ اب مجھے کسلمندی محسوس ہو رہی تھی چنانچہ میں نے ایک کوریڈور کے آخر میں کیفے ٹیریا دریافت کیا۔ کافی کے ساتھ میں نے ایک سینڈوچ لیا مگر میرے دماغ میں جو بے یقینی کا جالا تھا، وہ دور نہ ہوا۔ انور سے یہاں فیصلہ کن بات نہیں ہو سکتی تھی اور اسپتال کے ماحول سے اندازہ ہوتا تھا کہ مجھے ریشم کی علالت کے بارے میں بھی کوئی کچھ نہیں بتائے گا۔ یہاں خاندانی راز کو راز رکھنے والے لوگ تھے جن سے کچھ معلوم بھی ہو جاتا تو ان کے خلاف کسی قسم کی قانونی چارہ جوئی ناممکن ہوتی۔ ریشم جیسے کیس یہاں آتے ہوں گے اور ان کی کیس فائل میں ”کلائنٹ“ کی مرضی کے مطابق بیماری کی نوعیت لکھی جاتی ہوگی۔ اسے غلط کون ثابت کر سکتا تھا۔ یہاں سارے ہی ماہر ڈاکٹر تھے اور ان کی پشت پناہی کرنے والے ہاتھ اتنے مضبوط تھے کہ مستند تھا ان کا فرمایا ہوا... ویسے بھی ایک ڈاکٹر کی رائے کو دوسرے بڑے ڈاکٹر کے سامنے ہی چیلنج کیا جا سکتا ہے اور وہ اپنے ہم پیشہ کو سپورٹ کرتا ہے کیونکہ ضرورت پڑنے پر ہم پیشہ اسے سپورٹ کریں گے۔

میں بے بسی کی کیفیت میں کسی نتیجے پر پہنچنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا کہ میری آنکھوں نے شاہینہ کو اپنے باپ کے ساتھ اندر آتا دیکھا۔ اس وقت میں نے افسوس کیا کہ میں پڑھ لکھ کے مصلحت اندیش اور بزدل ہو گیا ہوں ورنہ خاموشی اختیار نہ کرتا اور جو میرے دل میں تھا سب کہہ دیتا... لیکن یہاں کسی قسم کی ہنگامہ آرائی کا انجام یہ ہوتا کہ اسپتال میں ہنگامہ آرائی کے جرم میں میری آج کی رات حوالات میں گزرتی۔ میری بزدلی یا بے غیرتی کا سبب پولیس تھی جس کے سائے سے بھی میں یوں ڈرتا تھا کہ لوگ فرشتۂ اجل سے نہیں ڈرتے تھے۔

پیر صاحب اپنے روایتی پُرتقدس ملبوس میں شان اور وقار کے ساتھ نمودار ہوئے تو ان کے جلو میں محافظوں یا مریدوں کا حلقہ تھا۔ وہ بڑی متانت سے آگے آئے اور میرے قریب آ کے رک گئے۔

ان کی آنکھوں میں عیاری کی چمک تھی جو ان کی زیرِلب مسکراہٹ کے ساتھ بہت میچ کرتی تھی۔ ”ملک صاحب! تمہارا کام آسان ہو گیا... تم دونوں کا...“

میں سمجھ گیا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ جلد از جلد ریشم کے ساتھ حویلی سے نکل جاؤ۔ میں نے اتنی ہی سادگی سے کہا۔ ”کام تو آپ کا بھی آسان ہو گیا... آپ دونوں کا۔“

”ہمارے کام وہ ربِ کریم خود آسان کرتا ہے۔“

”وہ تو سب کے کام آسان کرتا ہے لیکن اب دیکھیے کیسے مناسب وقت پر اس نے مراد کو اپنے پاس بلا لیا۔“

”یہ کیا فضول بات ہے؟“

”میں نے سنا تھا کہ وہ بھی آپ کا داماد کہلانے کا شرف حاصل کرنا چاہتا تھا۔ آپ کے سالے کا بیٹا تھا۔ آپ کی بیوی کو تو بہت صدمہ ہوگا بھتیجے کی موت کا...“

پیر صاحب کی آنکھوں میں چمکنے والی غیظ و غضب کی چنگاری ایک دم بھڑک اٹھی۔ ”معلوم ہوتا ہے تم ہوش میں نہیں ہو۔“ اس کی آواز کچھ بلند ہوئی اور اس نے سختی سے میرے کندھے کو گرفت میں لے لیا۔ اس نے دانت بھینچ کے کچھ کہا اور پھر ایک دم پلٹ گیا۔ اس کے مریدوں نے سنا

تو کچھ بھی نہیں تھا مگر پیر صاحب کے چہرے پر جلالی آثار دیکھ کے وہ بھی مشتعل تھے اور اشارہ ہو جاتا تو مجھے وہیں اس گستاخی کی سزا مل جاتی۔ اس کا ریشم کی عیادت کے لیے آنا مجھے خالی از علت نہیں لگا۔ اسے ریشم سے کیا ہمدردی ہو سکتی تھی؟ اسے تو افسوس ہوگا کہ ڈاکٹرز نے اس کی جان کیوں بچالی، قصہ یہیں پاک ہو جاتا۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ ڈاکٹروں کو خبردار کرنے آیا ہو کہ چلو جو غلطی تم سے ہوئی سو ہوئی، معاملات تمہارے ہاتھ میں ہیں۔ جب تک لڑکی اسپتال میں ہے، ہم چاہتے ہیں کہ یہاں سے ایمبولینس میں اس کی میت ہی نکلے۔

پیر صاحب نے مریدوں کو باہر بھیج دیا تھا کیونکہ لاؤنج میں صفائی کی جا رہی تھی اور وہ دروازے کے سامنے صف بستہ ہو گئے تھے۔ کاؤنٹر والی شوخ حسینہ جو مجھے آرڈر کا حوالہ دے کر روکنے میں کامیاب رہی تھی، اس روحانی لشکر کو نہیں روک سکتی تھی۔ اس نے پیر صاحب اور ان کی دختر نیک اختر کو اوپر جاتا دیکھا تھا مگر پوچھ نہ سکی تھی کہ وہ کس کی بیمار پرسی کے لیے آئے تھے اور ان کا مریض سے کیا رشتہ ہے۔

پیر صاحب کا قافلہ دس منٹ بعد ہی چلا گیا۔ جاتے وقت پیر صاحب کے ماتھے پر ناراضی سے زیادہ تشویش اور پریشانی کی گہری شکنیں یقیناً میری گستاخی کا نتیجہ ہی ہو سکتا تھا۔ جاتے وقت انہوں نے پلٹ کے میری طرف نہیں دیکھا۔ واپسی پر نہ جانے کیوں بیٹی ان کے ساتھ نہیں تھی۔ شاہینہ چند منٹ کے بعد اتری۔ اس کی نظر نے مجھے تلاش کیا پھر وہ آخری دیوار کے ساتھ میرے پاس آ گئی جہاں میں فرش کو فینائل سے صاف کرنے والوں کو جگہ دینے کے لیے کھڑا تھا۔

وہ میرے سامنے آ کے ٹھہر گئی۔ وہ بلاشبہ بے حد حسین عورت تھی۔ شادی کے بعد اس کا جسم بھر گیا تھا اور حسن کے خدوخال میں نوجوانی کے الھڑپن کی جگہ بھرپور نسوانیت آ گئی تھی۔ جیسے چودھویں شب کے چاند کی آب و تاب کے مقابلے میں تکمیل کے بعد کا حسن... شاید مرد کے لیے بھی حسن کی کشش کا وہ بھرپور زمانہ ہوتا ہے جس کے سامنے اس کی عقل اور مردانگی مفلوج ہو جاتی ہے۔ آج صبح میں نے اتفاق سے اس کے شعلۂ حسن کو غیر مستور دیکھ لیا تھا اور وہ منظر میری یاد میں نقش ہو کے رہ گیا تھا۔ ایک ایسی تصویر کی طرح جو میں چھپا بھی نہیں سکتا تھا اور دکھا بھی نہیں سکتا تھا۔

اب وہ پوری تمکنت کے ساتھ مجھ سے ایک ہاتھ کے فاصلے پر موجود تھی۔ یوں کہ میں اس کے ملبوس سے اٹھتی اس کے وجود کی مہک اور تپش کو بھی محسوس کر سکتا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں پیچھے ہٹتا، اس نے اپنا ایک مرمریں ہاتھ میرے کندھے پر رکھ دیا۔ "سلیم! یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔"

میں نے نرمی سے خود کو دور کیا۔ "میں نے کچھ بھی برا نہیں کیا۔"

"تمہیں کیا ضرورت تھی اباجی کے سامنے مراد کا حوالہ دینے کی؟"

"انہیں کیا ضرورت تھی یہاں مجھ سے اس طرح بات کرنے کی؟"

اب کرسیاں پھر ترتیب سے لگائی جا رہی تھیں۔ وہ میرے ساتھ سب سے پیچھے والی قطار کی آخری کرسی پر بیٹھ گئی۔ "دیکھو، میں جانتی ہوں کہ دل کے اچھے ہو تم... کسی کا برا چاہنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے تم میں... ریشم کو بھی تم ہمدردی اور مدد کے خیال سے سپورٹ کر رہے تھے اور دل سے اس کا بھلا ہی چاہتے تھے۔ اس کے اور انور کے تعلق میں نہ تمہاری خواہش کو دخل تھا اور نہ تمہاری کوشش شامل تھی لیکن جو ہوا، اچھا نہیں ہوا۔"

"کس کے حق میں؟" میں نے تلخی سے کہا۔ "کیا اچھا ہے کیا برا... حالات کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے۔ میری صاف گوئی کا برا مانو گی تم... لیکن تم اسے جھٹلاؤ گی کیسے... تمہاری شادی انور سے طے تھی۔ اس وقت یہی اچھا تھا سب کے لیے اور تمہارے لیے بھی... جب انور کا آسرا نہ رہا تو تم نے اکبر کو قبول کر لیا تو یہ اچھا ہو گیا۔ میں ریشم کی غلطی مانتا ہوں لیکن انور کو بے قصور نہیں سمجھ سکتا۔ ریشم نادان تھی یا ناتجربہ کار... محبت میں اعتماد کی آخری حد کو بھی عبور کر گئی لیکن بدلی وہ نہیں... بدلا ہے انور کیونکہ اس کے حالات بدل گئے ہیں۔ مگر اس کی سزا مل رہی ہے ریشم کو... انور نے زندگی کے سات سال یورپ میں گزارے تھے جہاں کی معاشرتی قدریں کچھ اور ہیں۔ وہاں محبت ایک ضرورت ہے، جذبات کا مسئلہ نہیں ہے۔"

"تمہاری باتوں سے تو لگتا ہے کہ تم سنی سنائی باتیں نہیں کر رہے ہو، یہ تمہارا مشاہدہ اور تجربہ ہے۔" شاہینہ مسکرائی۔

"یہ حقیقت ہے شاہینہ... اور تم بھی واقف ہو اس سے کہ وہاں محبت میں وفا اور جذبات کی اس دیوانگی کا تصور ہی نہیں جن پر ہمارا اعتقاد ہے کہ محبت زندگی میں صرف ایک بار ہوتی ہے اور کی نہیں جاتی۔ یہ جنم جنم کا ساتھ ہوتا ہے اور ہم انارکلی کی محبت کو مثالی مانتے ہیں جو زندہ دیوار میں چن دی جاتی ہے، محبت پر زندگی قربان کر دیتی ہے۔ یہ سب وہاں کہاں... جاب کی طرح محبت بھی بدلتی جاتی ہے۔ انور نے غلط سمجھا ریشم کو اور اس کے ساتھ غلط کیا۔ وہ اس کے جذبات کی شدت کو سمجھ ہی نہیں سکا مگر اس نے جذباتی کمزوری سے پورا فائدہ اٹھا لیا۔"

ہمارے درمیان خاموشی کا ایک بوجھل وقفہ آیا۔ پھر شاہینہ نے کہا۔ "چلو جو ہو گیا سو ہو گیا۔ انور کے لیے روزینہ سے شادی کرنا ضروری ہے۔ ورنہ ریشم اچھی لڑکی تھی۔ اگر انور نے مصلحت اور ضرورت کے تقاضوں کو سمجھ لیا ہے تو پھر مجبوری ہے، قربانی ریشم ہی کو دینا ہوگی۔"

میں نے ایک گہری سانس لی۔ "ٹھیک ہے مسز اکبر... میں اسے ساتھ لے کر چلا جاؤں گا یہاں سے۔"

"وہ چاہے تو رہ سکتی ہے انور کے ساتھ... بعد میں وہ ریشم سے شادی کر لے گا۔"

"ہاں... وہ افورڈ کر سکتا ہے اور شرع میں تو چار کی گنجائش ہے مگر شاید ریشم دوسرے درجے کی یہ زوجیت قبول نہ کرے۔ اور ہے تو وہ بھی رئیس زادہ... کل کو مجبوری کا یہ طوق بھی اتار پھینکے... ریشم کو بخش دے کسی کو... انعام میں یا سزا کے طور پر... کیا تم بھول گئی ہو کہ تمہارا شوہر اکبر اس کے لیے دیوانہ تھا... اگر وہ حویلی میں رہے گی تو صرف ایک عورت ہوگی، کسی کی بیوی نہیں جو اس کی غیرت بھی ہوتی ہے۔"

اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ "یہی ہوتا ہے جب کوئی گھر کا بھیدی بن جاتا ہے۔ جو باتیں آج تک اس حویلی کی چار دیواری سے نہیں نکلی تھیں، وہ تمہاری زبان پر آ گئی ہیں۔ اب خیریت اسی میں ہے کہ ریشم کے ساتھ نکل جاؤ حویلی سے۔"

وہ سخت غصے میں جانے کے لیے اٹھی تو میں نے کہا۔ "خوش فہمی ہے تمہاری شاہینہ کہ کوئی کچھ نہیں جانتا اور کچھ نہیں سمجھتا۔ کان تو دیواروں کے بھی ہوتے ہیں۔"

وہ پھر بیٹھ گئی۔ "اوہو... جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے نہیں یہاں آئے اور تم نے سب جان لیا... مجھے بھی تو بتاؤ۔"

"جانے دو بڑی بہو... یہ جو ہم جیسے کمی کمین ہوتے ہیں آپ جیسے خاندانی شرفا کی خدمت پر مامور... یہ ہر وقت سب سن سکتے ہیں اور اندر لگے کیمروں کی طرح ہر گوشے پر ان کی نظر رہتی ہے۔ انہیں محلات میں رہنے والوں کی زندگی بڑی پراسرار لگتی ہے اور وہ جاننا چاہتے ہیں

کہ یہ اشرف المخلوقات کیسے رہتے ہیں... کیا کرتے ہیں... کیا سوچتے ہیں... پھر انہیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ ایسی زرق برق زندگی گزارنے والوں کا وجود اندر سے کتنا متعفن اور گندا ہے۔"

شاہینہ کا تجسس جاگ اٹھا تھا۔ "ایسی کیا بات سنی تم نے یا دیکھی... چلو نام مت لو۔ مجھے بتاؤ تو سہی کہ ہمارے بارے میں کیا کہا جاتا ہے؟"

میں مشکل میں پڑ گیا۔ "نہ کوئی بات سو فیصد سچ ہوتی ہے اور نہ سو فیصد جھوٹ... انگریزی میں کہتے ہیں کہ دھواں وہیں سے اٹھے گا جہاں آگ ہوگی۔ ہر بات کی وجہ ضرور ہوتی ہے۔ اکبر کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ ہوس اور لالچ میں اندھا ہو جاتا ہے۔ تمام جائداد کا مالک بننے کے لیے وہ باپ کو بھی ٹھکانے لگا دیتا اور بھائی کو بھی۔ ایک عورت نے اسے روک لیا جو ماں بھی تھی اور بیوی بھی... مگر اس ایک عورت کے سوا کسے بخشا اکبر نے... زندگی تمہاری بھی داؤ پر تھی۔"

وہ کچھ کنفیوز نظر آنے لگی۔ "کب تھی؟ کس کی وجہ سے؟"

میں نے کہا۔ "اگر میں کہوں... تمہاری اپنی بہن کی وجہ سے؟"

"اس سے زیادہ بے سروپا بات کیا ہوگی۔"

میں نے ایک گہری سانس لی۔ "دیکھو شاہینہ... تم خیر خواہ نہیں تھیں تو بدخواہ بھی نہیں سمجھا میں نے تمہیں... ریشم کے ساتھ جو ہوا، بہت برا ہوا۔ پہلے ایک بھائی اسے ایک خوب صورت کھلونا بنا کے رکھنے کے درپے تھا۔ دوسرے نے بھی ایسا ہی کیا۔ اب وہ یہاں کیسے رہ سکتی ہے... اس نے میری جان بچائی تھی۔ اب جان بچانے کی ذمے داری مجھ پر آئی ہے تو میں اسے چھوڑ کے نہیں جا سکتا۔"

"کہاں لے جاؤ گے تم اسے؟"

"ابھی میں نے سوچا نہیں۔ جیسی ریشم کی مرضی... اس کا گھر بھی ہے یہاں۔"

"تم شادی کر لو گے اس سے؟"

"میں اس کے لیے ایک بھائی کی طرح محسوس کرتا ہوں اور وہ ہمیشہ میری ذمے داری رہے گی۔ یہ اس کی بدقسمتی ہے کہ انور نے اپنے جذبات کا رخ یوں موڑ لیا جیسے کوئی اسٹیئرنگ وہیل گھما کے گاڑی کو کسی یوٹرن سے واپس موڑ لیتا ہے۔ اکبر کامیاب ہو جاتا تو باپ کی جائداد کے

ساتھ تایا کی جاگیر اور گدی بھی چھین لیتا۔"

"ان کی ایک وارث میں ہوں مگر دوسری روزینہ ہے۔"

"کیا وہ روزینہ سے شادی نہیں کر سکتا تھا؟"

شاہینہ نے کہا۔ "میرے ہوتے ہوئے...؟"

"تمہارا ہونا نہ ہونا کس کے اختیار کی بات ہے؟ خدا کے بعد... حویلی میں کوئی عورت اپنی مرضی سے جینے کا حق حاصل کر سکتی ہے، اگر خود اس کا شوہر یہ حق دینے پر راضی نہ ہو... ایک بیوی کے مقابلے میں دوسری جو اتنی ہی جائداد لے کر آئے، کہیں زیادہ اہم ہو جاتی ہے اور عین اس اصول کے مطابق کہ گھر کی لڑکی اور زمین کو گھر سے باہر نہیں جانا چاہیے۔"

شاہینہ کا رنگ احساسِ ذلت سے زرد پڑ گیا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ انور شادی نہ کرتا تو اکبر مجھے مروا کے روزینہ کو لے آتا؟"

"مشکل خاندانی معاملات کا آسان حل۔"

"جھوٹ بولتے ہو، بکواس کرتے ہو تم۔" وہ ایک دم اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ اس نے یہ بات اتنی اونچی آواز میں کہی تھی کہ کچھ نہ سمجھنے والے بھی متوجہ ہو گئے تھے۔ وہ سب او پی ڈی کے مریض تھے جواب آنے لگے تھے۔ کسی حوالے کے بغیر وہ کیسے جان سکتے تھے کہ ایک خوب صورت عورت نے ایک مرد کو ایسا کیوں کہا تھا۔

شاہینہ کے جانے کے بعد نہ جانے کیوں میں نے بہتر محسوس کیا۔ مجھے احساس تھا کہ اپنے ساتھ اور ریشم کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کے خلاف یہ میرا انتقامی ردِعمل تھا، ایک احتجاج تھا۔ اس خاندان نے میرے خلوص کی اور ریشم کی محبت کے جذبات کی توہین اور تذلیل کی تھی۔ بدلہ لینا کوئی اعلیٰ صفت نہیں مگر میں نہ ولی تھا نہ فرشتہ... اس متعصب خاندان کی ایک مغرور بہو کو حقائق کا آئینہ دکھا کے مجھے سکون ملا تھا۔

نہ جانے کتنی دیر بعد میں نے انور کو اپنے قریب پایا۔ وہ پریشان تو تھا مگر خفت اور الجھن میں بھی مبتلا نظر آتا تھا۔ معاملات اس کے ایک فیصلے سے بدلے تھے یا خراب ہوئے تھے مگر اب وہ اس جاگیردارانہ سوچ سے مغلوب تھا جو اس کے خاندان کا طرۂ امتیاز تھی۔ وہ مرد تھا اور پچھتانا نہ جانتا تھا۔ اس کے نزدیک ایک لڑکی کے دل سے زیادہ خاندان، جاگیر اہم ہو گئی تھی۔ اس پر ایک کیا دس لڑکیاں قربان کی جا سکتی تھیں۔ اس کے جذبات اس شاک کو برداشت کرنے کے بعد واضح ہو گئے تھے۔ اب مجھے اس سے بات کرنا بھی بے سود لگتا تھا۔

انور نے پوچھا۔ "یہاں اکیلا کیوں بیٹھا ہے تو؟"

"پتا نہیں۔" میں نے سپاٹ لہجے میں رکھائی سے کہا۔ "چلا جاتا ہوں۔"

"وہ... ریشم بلا رہی ہے تجھے... اور دیکھ ملک! سیلاب کا ریلا گزر جائے تو آبادکاری کی کوشش کرنی چاہیے... اسی کو نہیں روتے رہنا چاہیے کہ سیلاب کیوں آیا تھا۔"

میں نے تلخی سے کہا۔ "بہت اچھا کیا یہ بھی سمجھا دیا۔" اور اس کی طرف دیکھے بغیر اوپر چلا گیا۔ زینے کے موڑ سے دیکھا تو وہ میری جگہ بیٹھا ہوا تھا۔ شاید یہی ایک آس تھی جس نے مجھے جانے نہ دیا تھا کہ ہوش میں آتے ہی ریشم مجھے یاد کرے گی۔ انور وہاں موجود رہنا نہیں چاہتا تھا یا خود ریشم ایسا چاہتی تھی۔ اکیلے میں وہ مجھ سے دل کی بات کہہ سکتی تھی۔

وہ بے داغ بستر پر چادر کے نیچے آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا تو آہٹ پر اس نے آنکھیں کھولیں۔ میں قریب جا کے اس کرسی پر بیٹھ گیا جو اسی مقصد کے لیے وہاں رکھی گئی تھی۔ مجھ سے پہلے شاید انور وہاں بیٹھا ہوگا۔

میں نے ریشم کا نازک، کمزور اور سرد ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے دیکھتا رہا۔ "کیسی ہو اب؟"

اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ "زندہ ہوں۔ اسی کا دکھ ہے۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو۔ حادثات، زندگی کا حصہ ہوتے ہیں ریشم... تمہاری زندگی کیا اتنی سستی ہے؟"

"پھر کیا قیمت ہے اس کی... بولو...؟"

میں نے اس کے ہاتھ کو تھپکا۔ "حالات کا دھارا کسی کو بھی بے بس کر دیتا ہے۔ یہ ہماری غلطی بن جاتی ہے لیکن ایک غلطی پر زندگی تو قربان نہیں کی جا سکتی۔ اب مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ انور تمہارے لائق نہیں تھا۔"

"نہیں سلیم... میں اس کے لائق نہیں تھی۔ یہ احساس دلانے والے دوسرے لوگ تھے جن کے نزدیک روزینہ کو مجھ پر فوقیت حاصل تھی۔"

میں نے ناراضی سے کہا۔ "کس بات کی فوقیت... صرف یہ کہ وہ آئے گی تو باپ کی دولت، جائداد، جاگیر سب لائے گی ورنہ وہ کس طرح بہتر ہو سکتی ہے تم سے... نہ صورت میں نہ سیرت میں... ترجیح خود انور نے بدلی۔"

"ایسا نہیں ہے سلیم... وہ پہلے مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس نے کہا کہ روزینہ میری مجبوری بن گئی ہے۔ اگر مجھے شادی کرنی پڑی اس سے، تب بھی میرے لیے اہم تم ہی رہو گی۔"

میں نے حیرانی سے کہا۔ "یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"انور نے یہی کہا تھا۔ دوسری وہ ہوگی۔ اس سے وہ محبت نہیں کر سکتا... جو اسے مجھ سے ہے۔"

مجھے اس بے وقوف لڑکی پر غصہ آنے لگا۔ "اور تم نے یقین کر لیا تھا؟ لیکن ایسا ہی تھا... تو پھر یہ حرکت کیوں کی تھی تم نے؟"

"میں نے تو کچھ نہیں کیا ملک... تم کس حرکت کی بات کر رہے ہو؟"

میں نے بڑی مشکل سے کہا۔ "یہ... یہ جو... اپنی ایک غلطی کو دنیا سے چھپانے کے لیے کی تھی... اس سے تمہاری جان جا سکتی تھی۔"

وہ بے چینی سے اٹھ بیٹھی۔ "سلیم! کس غلطی کی بات کر رہے ہو تم؟ تم سمجھتے ہو کہ میں نے خود اپنی جان لینے کی کوشش کی تھی... خودکشی کرنا چاہتی تھی؟"

"اسے اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ اس سے تو اچھا ہوتا تم اس ذلیل آدمی کو بلیک میل کرتیں جس نے تمہاری سادگی اور معصومیت سے... تمہارے جذبات سے فائدہ اٹھایا تھا۔"

"مجھے تمہاری کوئی بات سمجھ نہیں آ رہی ہے... کیا بلیک میل کرتی میں انور کو... میں نے تو کبھی یہ لفظ نہیں سنا۔"

میں نے اسے لٹا دیا۔ "ذرا پُرسکون رہو۔ اگر ایسا تھا... تو تم اس سے کہہ سکتی تھیں کہ اس بچے کی ذمے داری صرف تمہاری ہے۔"

وہ تڑپ کے اٹھ بیٹھی۔ "بچہ... کون سا بچہ؟ کس کا بچہ...؟"

میں نے گھبرا کے کہا۔ "وہی تمہارا... ہونے والا..."

"تم پاگل تو نہیں ہو گئے سلیم... بچہ ہوتا اگر شادی ہوتی۔ ابھی کون سے ہونے والے بچے کی بات کر رہے ہو تم؟" وہ چلّائی۔

میں نے اسے پکڑ لیا۔ "خدا کے لیے آہستہ بولو۔ یہ اسپتال ہے، ابھی کوئی آ جائے گا۔ وہ تمہیں پھر سلا دیں گے۔"

"نہیں... میں سونا نہیں چاہتی۔" اس نے خود کو کنٹرول کیا۔ "تم بتاؤ مجھے کہ یہ کس ہونے والے بچے کا ذکر تھا؟"

میں نے بڑی مشکل سے کہا۔ "جس کا اب وجود نہیں رہا۔ ختم کر دیا تم نے اور ساتھ ہی مرنا چاہا تاکہ اس کے لیے راستہ بالکل صاف ہو جائے۔"

اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا اور ہچکیاں لینے لگی۔ "تم کہہ رہے ہو... میں نے پہلے ایک گناہ کیا تھا... خود کو انور کے حوالے کر دیا... اور جب اس کے نتیجے میں... تو میں نے... میں نے..."

"کیا ایسا نہیں ہوا تھا؟ مجھے خود سلونی بتا چکی تھی اور پھر شاہینہ نے بتایا۔"

وہ پھر چلّائی۔ "کیا وہ مجھ سے زیادہ قابلِ اعتبار ہیں تمہارے لیے...؟"

میں چکرا گیا۔ "کسی کو ایسا جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"ضرورت تھی سلیم... ایک سازش تھی میرے خلاف جو کامیاب ہو گئی۔ سلونی کو بڑے چودھری صاحب نے مجھے بدنام کرنے پر مامور کیا تھا۔ انہی کی نمک خوار تھی وہ پہلے... درمیان میں وہ دربدر بھٹکتی رہی تو کون سا کام نہیں کیا اس نے؟ پیسا اس کی بھی کمزوری ہے۔"

"وہ کہتی تھی... اس نے خود دیکھا تھا۔"

"وہ ایسا ہی کہے گی لیکن تم شاہینہ کی بات کرتے ہو؟ اس عورت کی جو میری دشمن تھی... جس نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔"

میں چونکا۔ "قتل...؟"

"یہ بکواس جو تم میرے سامنے بیٹھ کے کر رہے ہو... اس پر یقین کیسے کیا تم نے... وہ مجھے ہر قیمت پر اپنے راستے سے ہٹانا چاہتی تھی تاکہ اس کی بہن کا راستہ صاف ہو، اس کے شوہر کی رہائی ہو۔ اسے سب کچھ واپس مل جائے جو اس کا تھا۔ اس نے ہی یہ منصوبہ بڑی ہوشیاری سے بنایا تھا کہ انور کسی طرح روزینہ کو اپنا لے تو پیر صاحب اسے اپنا وارث بنا دیں۔ سب اسے مل جائے۔ ایک بھائی ادھر... دوسرا اُدھر... مگر میرے ہوتے یہ ناممکن تھا۔ انور کو یہ کب منظور ہوگا۔ وہ بن سکتا ہے پیر صاحب کا وارث؟ ہاں اکبر بن سکتا ہے۔ وہ شاہینہ کے باپ جیسے سارے دھندے کر سکتا تھا۔ فراڈ کر سکتا ہے اور اس کے لیے کچھ بھی خلافِ اخلاق نہیں۔"

میں نے سر ہلایا۔ "میرا دماغ خراب ہو جائے گا... تم آخر کیوں انور کی حمایت کر رہی ہو ابھی تک؟"

''حمایت نہیں... میں وہی کہہ رہی ہوں جو ہے... شاہینہ سر توڑ کوشش کر چکی تھی کہ انور مان جائے۔''

''انور مان گیا تھا۔''

''یہی تو سارا فساد تھا۔ انور جانتا تھا کہ یہ ناممکن ہے۔ خاندانی لڑکی پہلی ہوتی ہے اور فوقیت رکھتی ہے۔ نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔ نہ روزینہ مانے گی، نہ اس کی بہن اور نہ باپ... دوسری میں ہو جاؤں تو کسی کو کوئی اعتراض نہیں... وہ بہت الجھن اور پریشانی میں تھا۔ میں نے ہی اس سے کہا کہ جائداد کے جھگڑے ایسے ختم ہوتے ہیں تو چلو روزینہ سے کرلو شادی۔''

''تم بالکل پاگل ہو نا... اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری۔''

''وہ نہیں مانا... ٹالنے کے لیے اس نے پہلی کی شرط رکھ دی۔ شاہینہ کہاں ماننے والی تھی۔''

''مگر انور تمہارے کہنے سے راضی ہو گیا تھا؟''

اس کی نظر جھک گئی۔ ''میں اس کا خیال کیسے نہ کرتی۔ بڑے جھگڑے تھے جو خون خرابے کا سبب بن جاتے۔ وہ بھی حل کرنا چاہتا تھا۔ مجھے اس پر ترس آتا تھا۔ بے چارہ ہر طرف سے پھنسا ہوا تھا۔ اسے بھی پُرسکون زندگی کی ضرورت تھی جو وہ میرے ساتھ گزار سکتا تھا۔ خاندانی بیوی بیٹھی رہتی گاؤں کی حویلی میں۔''

''حد درجہ بے وقوف ہو تم واقعی... سب پہلے سے فرض کرلیا تھا۔''

''لیکن شاہینہ نے پہلی، دوسری کا جھگڑا یوں ختم کیا کہ مجھے زہر دے دیا۔''

میں اچھل پڑا۔ ''تمہیں... شاہینہ نے زہر دیا؟''

''تم سمجھ رہے ہو میں نے خود کھایا؟'' وہ خفگی سے بولی۔ ''میں مر جاتی تو راستہ صاف ہو جاتا... انور کب تک روتا... ساری عمر تو میری قبر پر مجاور بن کے نہ بیٹھا رہتا۔''

''ریشم! اس نے زہر دیا اور تم نے کھا لیا... کیسے؟''

''مجھے نہیں معلوم... تم معلوم کرو ڈاکٹروں سے... انور نے ایک دفعہ تو مان لیا تھا کہ مجھے زہر دیا گیا جس سے میری جان چلی جاتی... مگر بعد میں پلٹ گیا۔ کہنے لگا کہ کھانا خراب تھا یا پانی صاف نہیں تھا۔ پیٹ خراب ہو گیا تھا۔ ڈاکٹروں کو پہلے غلط فہمی ہو گئی تھی۔ مجھے شک ہے کہ وہ شاہینہ کو بچا رہا ہے۔ اپنی فیملی کی بدنامی نہیں چاہتا۔ یہاں سارے ڈاکٹر، نرسیں سب ان کے رازدار ہیں... آج پیر صاحب بھی آئے تھے۔''

''ان کے آنے کا مقصد میری سمجھ میں نہیں آیا۔''

''وہ آئے تھے انور کو سمجھانے... معاملہ ان کی بڑی بیٹی کا ہے نا۔ لیکن وہ اسپتال کے مالک سے بھی مل کر گئے۔ وہ شاید مرید ہے ان کا... یہاں مجھ سے کوئی بات ہی نہیں کرتا۔''

''میں معلوم کرنے کی کوشش کروں گا لیکن مجھے کامیابی کی امید بہت کم ہے۔ انہوں نے سب کور کرلیا ہوگا۔ پولیس کیس بننے سے سب ہی ڈرتے ہیں مگر یہاں کیا ہو سکتا ہے۔ اسپتال ان کا اپنا ہے اور میں بھی اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ کسی ثبوت کے بغیر تھانہ کچہری کروں اور خود پھنس جاؤں۔ جب انور ہی کچھ کرنا نہیں چاہتا تو میں کیا کروں۔ مگر اب تم کیا کرو گی... اسپتال سے وہیں جاؤ گی؟''

''اور کہاں جا سکتی ہوں؟''

''تمہارا اپنا بھی ایک گھر ہے... بھول گئیں... مگر وہ حویلی نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں نے ساری عمر گزاری ہے وہاں... لیکن اب کس کے ساتھ رہوں جب باپ نہیں ہے؟'' وہ اداس ہو کے بولی۔

''بھائی بھی تو ساتھ رہ سکتے ہیں۔''

اس نے نظر اٹھا کے مجھے دیکھا اور مسکرائی۔ ''دنیا جذبات کو نہیں خون کے رشتے کو مانتی ہے... لیکن اب مجھے واقعی ایسا یقین ہے کہ میرا بھائی ہوتا کوئی... تو تم جیسا ہی ہوتا اور بہت فخر کرتی میں اس پر... اسی طرح حفاظت کرتا وہ میری اور خیال رکھتا میرا۔'' اس کی آنکھوں سے پھر آنسو چھلک پڑے۔

میں نے نرمی سے اس کے آنسو صاف کیے۔ ''میں کبھی تمہیں احساس نہیں ہونے دوں گا ریشم کہ تمہارا بھائی کوئی نہیں۔''

میرے مزید کچھ کہنے سے پہلے دروازے پر ہلکا سا ناک کر کے سفید کپڑوں میں ملبوس ایک نازک سی لڑکی اندر آ گئی۔ ''دوا دینی ہے سر۔''

میں پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے ٹمپریچر اور بلڈ پریشر وغیرہ لے کر پیروں کی طرف لگے چارٹ میں اندراج کیا۔ پھر اپنی ٹرے میں سے کچھ دوائیں دے کر چلی گئی۔ ریشم کا بی پی اس وقت بھی کم تھا، نرس کے جاتے ہی شام کی چائے آ گئی۔ نیلی یونیفارم میں ٹرے لانے والا وہ کم عمر لڑکا بے حد متجسس نظر آتا تھا۔ میں نے اسے غور سے دیکھ کے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ ''چائے مجھے بھی مل سکتی ہے؟ میں مریض تو نہیں ہوں۔''

وہ مستعدی سے دروازے کے قریب پلٹا۔ ''میں لا دیتا ہوں سر... کیفے ٹیریا سے... وہاں کافی بھی ہے اور شام کو سینڈوچ بھی ہوتے ہیں۔''

''یہ تو میرے دل کی بات کی تم نے... وہی لا دو۔'' میں نے کہا۔

وہ دس منٹ کے بعد آیا تو میں نے بات کا سلسلہ آگے بڑھایا۔ ''کب سے کام کر رہے ہو... پڑھتے نہیں؟''

وہ سر جھکا کے بولا۔ ''مجبوری ہے سر... ایک بہن بیٹھی ہے، ماں بیمار ہے لیکن کتنی ناانصافی ہے کہ میں اس کا علاج یہاں نہیں کرا سکتا۔ مجھ سے کہتے ہیں کہ میو اسپتال لے جاؤ، داخل کرا دو۔ داخل تو میں کرا دوں لیکن گھر پر کون رہے گا بہن کے پاس... اور اسے بھی اسپتال میں چھوڑ دوں تو آپ کو اندازہ نہیں سر کہ وہاں کیا ہوتا ہے۔ بیماروں کے ساتھ آنے والے اسپتال کے نچلے اسٹاف سے ڈاکٹر تک سب اسے ہر طرف سے گھیر لیں گے۔ غائب ہو جائے گی وہ... ہم تو یہاں دیکھتے ہیں...'' وہ اچانک خاموش ہو گیا جیسے اسے خیال آ گیا ہو کہ وہ زیادہ بول گیا۔

''باپ نہیں ہے کمانے والا؟''

''ہے سر! لیکن بہت چھوٹا تھا میں جب اس نے ماں کو چھوڑ دیا تھا۔ کچھ زکوٰۃ خیرات ملتی ہے، نہ لیں تو کیا کریں... میں صبح سے رات تک یہاں کام کرتا ہوں۔ رات کا کھانا دے کر جاتا ہوں تو گیارہ بجے گھر پہنچتا ہوں۔''

''ہوں۔'' میں نے غور کر کے کہا۔ ''گزارہ نہیں ہوتا اس آمدنی میں... تو کوئی اور کام کرو۔''

''اور کیا کام سر! پڑھا لکھا بھی نہیں۔ ابھی میٹرک کیا ہے پرائیویٹ اور کیا نوکری ملے گی مجھے۔''

''اگر پڑھنا جاری رکھو گے تو ترقی کر جاؤ گے۔''

وہ اداسی سے مسکرایا۔ ''پڑھنا تو جاری رکھوں گا میں۔ یہ طے ہے کہ بی اے کے بعد میں ایم اے بھی کروں گا لیکن کام تو نہیں چھوڑ سکتا۔ اور سر! آج کل بی اے، ایم اے کو بھی کون پوچھتا ہے؟''

''کبھی کوئی کام کرنے کا نہیں سوچا؟''

''بہت سوچا سر... مگر سوچنے سے تو کام نہیں ہوتا۔ ایک رکشا مل جاتا قسطوں پر تو دو سال میں قسطیں بھی ادا ہو جاتیں۔ بہت بہتر ہو جاتے ہمارے حالات... دو سال تو

میں دن رات لگاتا... خوب پیسا کماتا... تیسرا سال لگاتا میں بہن کی شادی کرنے کے لیے... رکشا میں آمدنی بہت ہے سر... ایک سال میں بہن چلی جاتی۔ ماں کا علاج بھی ہو جاتا... جب تک بی اے بھی کر لیتا میں... اس کے بعد شادی کرتا۔"

"شادی؟ اتنی جلدی ہے تمہیں...؟"

"جلدی ہے ماں کے لیے سر... اس کی خدمت کرنے والا کوئی نہیں۔ عمر زیادہ ہوگی تو اسے زیادہ آرام کی ضرورت ہوگی۔"

"اچھا... اور ایسی لڑکی آج کل کہاں ملتی ہے جو آئے اور بیمار ماں کو سنبھال لے؟" ریشم نے کہا۔

"ملتی ہے جناب۔" اس کی آنکھوں میں خواب سے اتر آئے۔

"یہ کہو نا کہ تم نے تلاش کرلی ہے۔" میں نے کہا۔ وہ کچھ شرما کے باہر نکل گیا۔

میں نے محسوس کیا کہ لڑکا اچھا تھا اور اس کی مجبوری کو کیش کرانا مشکل نہیں ہوگا۔ یہ بڑی خود غرضانہ سوچ تھی۔ میں ایک ناتجربہ کار نوجوان کی ذہنی اور معاشی مجبوری کا استحصال کرنے کا سوچ رہا تھا۔ عام حالات میں یہ یقیناً قابلِ مذمت ہوتا لیکن یہاں میری اپنی مجبوری اس سے بڑی تھی۔ میں محسوس کرتا تھا کہ ریشم کی زندگی محفوظ نہیں۔ آنے والے خطرے کا سدِباب بھی اتنا ہی ضروری تھا جتنا یہ جاننا کہ پہلے اس کی جان لینے کی کوشش کیسے کی گئی تھی۔ اگر میرے ہاتھ کوئی ثبوت لگ جاتا تو شاید اسے میں ریشم کے اور اپنے دفاع کے لیے استعمال کرسکتا تھا۔ ابھی تو میرے ہاتھ میں بھی کچھ نہیں تھا۔

ریشم کی پلکیں بوجھل ہونے لگی تھیں۔ غالباً نرس کی دی ہوئی دواؤں میں نیند لانے والی دوا بھی شامل تھی۔ چند منٹ میں وہ پُرسکون ہو کے سوگئی تو میں آہستہ سے دروازہ بند کر کے باہر نکل آیا۔ نیچے جا کے مجھے انور کہیں بھی نظر نہ آیا۔ لاؤنج میں اب اتنا رش تھا کہ بیٹھنے کی جگہ نہ تھی۔ میں باہر نکل آیا۔ عین سامنے ایک خاصا کشادہ لان تھا جس کے وسط میں فوارہ پانی اچھال رہا تھا۔ اس کے آس پاس کہیں کہیں کرسیاں ڈالے وہ مریض بیٹھے تھے جو یہاں داخل تھے اور جن کو ڈاکٹرز نے باہر تک جانے کی اجازت دے دی تھی۔ گاڑیاں دائیں طرف والے گیٹ سے اندر آکے پیچھے کہیں پارکنگ ایریا میں چلی جاتی تھیں۔

میں ایک بینچ پر بیٹھا۔ میرا خیال تھا کہ انور مجھے اندر نہیں پائے گا تو مجھے تلاش کرتا ہوا ضرور آئے گا لیکن وہ نہیں آیا۔ ریشم سے مل کر میرے خیالات بہت بدل چکے تھے۔ میں نے جان لیا تھا کہ شاہینہ کس حد تک سفاک اور خود غرض ہوسکتی ہے۔ آج تو شاید اس کی خصوصی نظرِ عنایت کا مقصد ہی کچھ اور تھا۔ کیا وہ اپنی لگاوٹ کی باتوں سے مجھے اپنے پیچھے لگانا چاہتی تھی؟ عورت کا حسن و شباب اس کا سب سے بڑا اور خطرناک ہتھیار ہوتا ہے۔ جب ایک مقصد سامنے ہو تو اس کے لیے جائز ناجائز یا اخلاقی اور غیر اخلاقی کچھ نہیں رہتا۔ کیا وہ ایسا مرد سمجھتی ہے مجھے کہ اپنے جوبن کی ایک جھلک دکھا کے مجھے دیوانہ بنا لے گی اور پھر جو چاہے گی کرے گی...؟ میں اپنی کمزوری کا شکار ہو جاتا تو وہ مجھے بلیک میل بھی کرسکتی تھی۔

ریشم اب بھی انور کے لیے جذباتی کمزوری کا شکار تھی۔ وہ خود اسے اجازت دے رہی تھی کہ روزینہ سے شادی کرلے۔ اسے انور کی پریشانی کا احساس تھا اور وہ بے وقوف یہ سمجھتی تھی کہ اس کی محبت کا جادو ہمیشہ انور کے سر چڑھ کے بولے گا۔ روزینہ گھر میں قید روایتی بیوی بن کے رہ جائے گی۔ سب اس کی خام خیالی تھی۔ ان دو بہنوں کا ریشم کے خلاف متحد ہو جانا ہی ریشم کی موت تھا۔ آج وہ بچ گئی مگر کب تک بچے گی۔ یہی انور ہوگا جس کا جاگیردار ذہن روزینہ کو عزت دے گا اور اگر ریشم کسی کو بخشی نہ گئی تو دوسری سلونی بن جائے گی۔

وقتی طور پر میں نے نورین کو بھلا دیا تھا۔ مجھے اس کا خیال آیا تو میں یہ سوچنے پر مجبور ہوا کہ آخر کب تک میں یہاں ریشم کی پہرے داری کرسکتا ہوں۔ ابھی چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے کہ خود پیر صاحب ایک چکر لگا گئے تھے۔ یہ سب سازشی لوگ ایک ہی مقصد کے حصول پر ریشم کو قربان کر دینا چاہتے تھے۔ ریشم بہت کمزور ہے اور میں جو اس کا محافظ بن رہا ہوں... میری کیا اوقات ہے؟

رات ہوگئی۔ اسپتال میں مریض اور ان کے وزیٹرز نہ رہے۔ لاؤنج خالی ہوگیا اور وہاں صرف ایک لائٹ کاؤنٹر کے اوپر روشن رہ گئی۔ کاؤنٹر پر دوبارہ وہی بداخلاق اور بدکردار حسینہ آگئی لیکن انور کا ابھی تک کوئی پتا نہ تھا۔ آخری بار میں نے رات نو بجے ریشم کو دیکھا تو وہ جاگ رہی تھی اور کھانا کھا رہی تھی۔ کمرے میں مریض کے ساتھ رہنے والے کے لیے بھی بیڈ فراہم کیا گیا تھا۔ اچھے اسپتالوں میں تو صرف کرسی دی جاتی ہے یا زیادہ سے زیادہ ایک بینچ۔ خدا ہے جو مریض کے ساتھ رہتا ہے، اس کا یہاں سونے کا کیا

کام۔ سب کام ایک اشارے پر نرسنگ اسٹاف کرلیتا ہے لیکن یہ وی آئی پی روم تھا جس میں قیام فرمانے والے اٹینڈنٹ کو بھی آرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ مریض کا بیڈ بھی لگژری کا نمونہ تھا اور کمرے کے دیگر لوازمات بھی۔

ریشم نے مجھے مدعو کیا تھا کہ میں اس کے ساتھ کھانا شیئر کرلوں جو اس کی ضرورت سے بہت زیادہ تھا لیکن ایک تو ابھی مجھے بھوک نہیں تھی، دوسرے مجھے یہ اچھا نہیں لگا۔

بالآخر اس نے انور کے بارے میں پوچھا۔ "وہ کہاں ہے؟"

میں نے لاعلمی کا اظہار سر ہلا کے کیا۔ "میں نے تو نیچے جانے کے بعد اسے نہیں دیکھا۔ پتا نہیں بن بتائے اچانک کہاں چلا گیا۔"

اسے کچھ صدمہ ہوا۔ "تم نے معلوم بھی نہیں کیا؟"

"کس سے معلوم کرتا... حویلی میں فون کر کے یہ پوچھ سکتا ہوں لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ تمہیں اکیلا چھوڑ کے خود حویلی چلا جائے؟"

اس نے کہا۔ "اکیلی کہاں ہوں میں... تم ہو میرے ساتھ... لیکن میرا خیال ہے کہ جاؤ تم بھی... رات کو ٹھہرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"ضرورت مجھے ہے۔" میں نے کہا۔

"میری طبیعت تو ٹھیک ہے۔ رات کو کال بیل پر نرس آجاتی ہے فوراً... میں سوتی ہی رہوں گی۔"

میں نے کہا۔ "جب میں نے کہہ دیا کہ میں رہوں گا تو بحث کیسی؟"

"اچھا... تم اس دوسرے بیڈ پر سوجاؤ۔"

میں نے صاف انکار کردیا۔ "یہ کسی طرح مناسب نہیں... وہی بیٹھی ہے کاؤنٹر پر جو کہہ رہی تھی کہ آرڈر نہیں غیر متعلقہ افراد کے مریض کے پاس جانے کا... وہ مجھے اسی کمرے میں سونے دے گی... تم میری فکر نہ کرو، میں اپنا بندوبست کرلوں گا۔"

نیچے آجانے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ رات بھر ان کرسیوں پر اکیلے بیکار بیٹھنا آسان نہ ہوگا۔ میں نے کیفے ٹیریا میں جا کے دیکھا جو اب بند ہو رہا تھا۔ مجھے وہی لڑکا نظر آیا جو رکشا بھی چلانا چاہتا تھا اور ایم اے بھی کرنا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے پہچان لیا اور سیدھا میرے پاس آگیا۔

"کچن میں کام کرنے والا تو چلا گیا ہے سر... صفائی ختم کر کے میں بھی چلا جاؤں گا۔"

"یعنی اب کھانے کے لیے کچھ نہیں مل سکتا؟"

"کھانے کے لیے تو بہت کچھ ہے۔ آپ کے لیے کافی میں بنالاتا ہوں۔ الیکٹرک کیٹل ہے... دو منٹ لگیں گے۔" وہ چٹکی بجا کے بولا۔

وہ ایک ٹرے میں بسکٹ اور کنفیکشنری کا بہت سا اسباب اٹھا لایا اور کافی لے کر میرے سامنے بیٹھ گیا۔ "مجھے بھی بُری عادت پڑگئی ہے یہاں... مفت کی ملتی ہے نا۔"

میں نے محسوس کیا کہ اس نے مجھ سے کچھ توقعات وابستہ کرلی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ہر سپورٹ کا مستحق ثابت ہوتا تھا لیکن میں بھی اس کی مدد کسی غرض کے بغیر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ شاید یہی وقت تھا کہ میں اس سے صاف بات کرسکتا تھا۔ دنیا کے کام اسی طرح چلتے ہیں۔ اس ہاتھ دے، اس ہاتھ لے۔ امید بہت کم تھی لیکن ہر جواری کو صرف آس کا سہارا ہوتا ہے۔

میں نے کہا۔ "اس وقت تم مدد نہ کرتے تو مجھے کھانے کے لیے باہر جانا پڑتا... نام کیا ہے تمہارا؟"

"ناصر حسین سر۔"

"ناصر حسین... میں رکشا دلوا سکتا ہوں تمہیں۔"

اس کی نظر مجھ پر جم گئی۔ "سر! میں آپ کا قرض بھی ادا کر دوں گا۔"

"یہ قرض نہیں ہوگا۔ تمہیں ایک کام کرنا ہوگا میرا۔"

وہ کچھ مایوس نظر آنے لگا۔ "کام... آپ بتائیں... اگر میرے بس میں ہوا تو ضرور کروں گا۔"

"تم کوشش کرسکتے ہو... لیکن رکشا تمہاری کوشش کامیاب ہونے سے مشروط نہیں ہے۔ ہر شخص کوشش ہی کر سکتا ہے۔"

اس کا چہرہ چمک اٹھا۔ "آپ کام بتائیں سر۔"

میں نے سوچ کے کہا۔ "میں جس مریض کے ساتھ ہوں، اس کو زہر دے کر مارنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس کا نام ریشم ہے۔"

ناصر کو جیسے شاک لگا۔ "وہ... وہ تو بہت اچھی ہیں۔ ان کو مارنے کی کوشش کس نے کی تھی؟"

میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "کل رات... یعنی آج صبح تین چار بجے ریشم کو یہاں لایا گیا تھا۔ جیسا کہ طریقہ ہے۔ ڈاکٹرز نے اس .... کا معدہ واش کیا اور اسے بچا لیا۔ مجھے بتاؤ... جب اس قسم کا کوئی کیس آتا ہے تو کیا ہوتا ہے؟"

"پہلے تو ریسپشن پر انٹری ہوتی ہے۔ وہاں جو بھی ہو، وہ نئی فائل بناتی ہے۔ اس پر رجسٹریشن نمبر وغیرہ ڈالا

جاتا ہے۔ پھر ایمرجنسی میں کوئی ڈاکٹر مریض کو دیکھتا ہے اور فائل میں لکھ دیتا ہے کہ اس نے کیا دیکھا اور علامات کیا ہیں... اور کیا کرنا چاہیے۔ زیادہ سیریس کیس ہو تو گھر سے کسی تجربہ کار ڈاکٹر کو بھی بلا لیتے ہیں... جیسے کہ ہارٹ اٹیک ہو۔"

"کیا اس کیس میں کسی کو بلایا گیا ہوگا؟"

ناصر نے نفی میں سر ہلایا۔ "میرا تجربہ تو کہتا ہے کہ ڈیوٹی ڈاکٹر نے خود ہی سب کرلیا ہوگا۔"

میں نے مسکرا کے کہا۔ "تم بھی تجربہ کار ہو۔"

"دو سال سے یہاں ہوں سر... دیکھ کے اور سن کے بہت کچھ سیکھ لیا ہے۔"

"ریشم کی فائل کہاں ہے؟"

"ان کی فائل... ہوگی آفس میں... آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"مجھے وہ فائل چاہیے... یہاں اس کیس کو دبا دیا گیا ہے۔"

ناصر بولا۔ "یہ تو ہوتا ہے سر... ہر کیس دبا دیا جاتا ہے۔ پولیس کا یہاں کیا کام... لیکن فائل رہتی ہے، اس میں سب لکھا ہوتا ہے۔"

"تم مجھے وہ فائل لا کے دے سکتے ہو یا دکھا سکتے ہو؟"

"میں آفس میں نہیں جاسکتا۔ آپ کو فائل کیوں چاہیے سر... کیا آپ پولیس کیس کرنا چاہتے ہیں؟"

"ضروری نہیں... میں چاہتا ہوں کہ میرے پاس ثبوت ہو۔"

"میری نوکری چلی جائے گی سر... کسی کو معلوم ہوا تو..."

"کوئی بات نہیں۔ یہ تمہارے لیے فائدے کا سودا ہے۔ فائل دو مجھے اور اس کے ساتھ ہی استعفا۔ ایک ہفتے بعد کسی کا تم پر شک نہیں جاسکتا، اس وقت تم رکشا چلا رہے ہو گے۔" میں نے کہا۔

وہ اپنے ہونٹ کاٹتا رہا اور سوچتا رہا۔ "بہت مشکل ہے یہ کام۔"

"مشکل یا ناممکن؟" میں نے کہا۔

"رکشا کے علاوہ بھی اگر آپ کو کچھ پیسے خرچ کرنے پڑیں تو؟"

میں نے کہا۔ "میں تیار ہوں... کتنے؟"

"زیادہ سے زیادہ دس ہزار۔" وہ بولا۔

"کوئی مسئلہ نہیں... کام پکا ہونا ضروری ہے۔"

اس نے سر ہلایا اور کھڑا ہو گیا۔ "میں یہ کینٹین بند کر دوں پھر آتا ہوں۔"

کینٹین کا باورچی اور مالک سب جاچکے تھے۔ ناصر کو صفائی کر کے شٹر گرانے تھے۔ میں باہر نکل کے پارکنگ ایریا میں ٹہلتا رہا جہاں اب صرف ایک گاڑی اور ایک ایمبولینس کھڑی تھی۔ ناصر تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد نمودار ہوا تو کچھ نروس تھا۔

"سر! مجھے امید ہے اب آپ کا کام ہو جائے گا... ایک رکشا میری زندگی بدل دے گا اس لیے میں مجبور ہو گیا۔"

"تم سمجھتے ہو کہ میں نے تمہاری مجبوری سے فائدہ اٹھایا ہے؟"

وہ رک گیا۔ "فائدہ اٹھانا اور ہوتا ہے سر... یہ اتنا بڑا کام نہیں تھا۔ کوئی اور دس ہزار میں کر دیتا... اور وہ دس ہزار میں نہیں کرے گی۔"

"وہ کون؟"

"جو کاؤنٹر پر بیٹھی ہے مس جولی... آپ نے میرے مستقبل کے بارے میں سوچا... صرف پیسا نہیں پھینکا۔ میں واقعی مجبور تھا۔ میرے ساتھ ایک ماں اور ایک بہن کی زندگی جڑی ہوئی ہے۔ یہ مس جولی مجبور نہیں۔ میں صاف کہتا ہوں اسے لالچ ہے... اور اس کی کمائی کے ایسے ہی دھندے ہیں... مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ تمہیں کتنے ملے... کمینی... اس میں سے بھی مانگتی... میں نے ٹال دیا کہ تم اپنی بات کرو۔"

"تم نے اس سے سودا کیا فائل کا؟"

"فائل کیبنٹ کی ایک چابی اسی کے پاس ہوتی ہے سر... اگر کوئی کیس آجائے آج رات کو تو ضرورت پڑے گی۔ وہ اچھی عورت نہیں ہے سر۔ میں تو ڈر رہا تھا کہ کہیں الٹا میرے گلے نہ پڑ جائے لیکن اس کو تو پیسا چاہیے۔ میں نے جوا کھیلا تھا۔ اپنی نوکری داؤ پر لگا دی تھی، اگر میں ہار جاتا..."

"ہر جواری جیتنا ہی چاہتا ہے... تم ہارے تو نہیں۔"

"تقدیر آج مہربان ہے سر... اور جرأت مانے گا سر... آپ کا پیسا تھا جس سے میں نے بازی لگائی۔ اس نے پانچ ہزار ہی مانگے تھے۔ میں نے کام پکا کرنے کے لیے کہا کہ پانچ نہیں دس ملیں گے مگر کام ہو جانے کے بعد۔"

"بہت اچھا کیا تم نے۔ آج میرا کام بن گیا تو کل

پرسوں تمہارا کام بھی بن جائے گا... تمہیں اعتبار ہے نا مجھ پر؟"

"اعتبار آپ کی ضرورت ہے سر... اور میری بھی... اب آپ جا کے لاؤنج میں بیٹھ جائیں۔"

"لاؤنج میں... اکیلا..."

"یہ اکیلے میں ہونے والی بات ہے سر... دن میں تو نہیں ہو سکتی تھی۔"

میں نے اس نوجوان کے مقابلے میں خود کو احمق تصور کیا۔ اس کے کندھے پر تھپکی دی اور واپس چل پڑا۔ وہ مجھے دیکھتا رہا۔ اپنے تصور میں وہ خود کو رکشا ڈرائیو کی جگہ دیکھ رہا ہو گا۔ اس کے کان رکشا کا شور سن رہے ہوں گے۔ شاید اسے یقین کرنا مشکل ہو گا کہ یوں اچانک راہ چلتے بھی کسی کو اللہ دین کے چراغ کی طرح خواب کی تعبیر مل سکتی ہے۔

مس جولی نے نظر اٹھا کے مجھے دیکھا اور مسکرائی۔ اب اس کے اور میرے درمیان بیگانگی کا رشتہ نہیں رہا تھا... ایک جیسی ضرورت نے ہمیں ملا دیا تھا۔ ضرورت نہ میری جائز تھی نہ اس کی... میں ایک الگ کرسی پر آخر میں جا بیٹھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور میرے پاس آگئی۔

"سر! آپ مس ریشم کے ساتھ ہیں؟" اس نے تمہید باندھی۔

"ہاں... کل رات بھی تم ڈیوٹی پر تھیں؟"

"یس سر! میں نائٹ ڈیوٹی دینا پسند کرتی ہوں... صبح آٹھ بجے تک... آپ کیا رات بھر یہاں بیٹھے رہیں گے؟"

"مجبوری ہے۔"

"کمرے خالی ہیں۔ اگر آپ آرام کرنا چاہیں تو میں کھول دوں؟"

"کرایہ کتنا ہوگا مس جولی؟"

اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔

"دس ہزار سر۔"

میں نے سر ہلا دیا۔ "مجھے منظور ہے۔"

جولی مجھے کوریڈور کے شروع میں ہی ایک کمرے میں لے گئی۔ یہ کمرا کسی مریض کے لیے نہیں رکھا گیا ہو گا۔ شاید یہاں رات کی ڈیوٹی دینے والا ڈاکٹر ہوتا ہو گا۔ رات کو ہر روز تو کیس نہیں آتے۔ اس وقت مجھے ڈیوٹی ڈاکٹر کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ "آپ یہاں آرام کریں۔"

میں کرسی پر بیٹھ گیا اور جوتے اتارنے لگا۔ "آج مجھے نائٹ ڈیوٹی پر کوئی ڈاکٹر نظر نہیں آرہا ہے... نہ کوئی نرس؟"

"ڈاکٹر اوپر ہے جہاں وارڈ ہیں۔ نرس بھی اس کے ساتھ ہو گی۔ میرا مطلب ہے ڈیوٹی پر۔ ایمرجنسی میں وہ اوپر سے نیچے آجاتا ہے۔"

"کل رات بھی یہی ڈاکٹر تھا جب ریشم کو لایا گیا تھا؟"

"یس سر! نرس بھی یہی تھی۔ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

میں نے ٹال دیا۔ "ایسے ہی... سب کام اس نے کیا ہو گا... تجربہ کار ڈاکٹر ہو گا۔"

جولی باقاعدہ کال گرل تھی۔ غالباً اس کی ہر رات یہاں ڈبل ڈیوٹی بن جاتی ہو گی، کبھی مریض کے ساتھ تو کبھی تیماردار کے ساتھ۔ ضرورت مند بھی مریض بن کے آجاتے ہوں گے۔ اس کے جسم کی ہر ادا میں فحاشی تھی جس میں اب اس کے لیے شرم کی بات ہی نہ رہی تھی۔ یہ ایک کام ہو گیا تھا جیسے بھیک مانگنا۔

میں بہت تھکا ہوا تھا۔ کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹا تو انتظار میں چھت کو گھورتے گھورتے سو گیا۔ پھر آنکھ کھلی تو جولی میرے ساتھ تھی اور کمرے میں اندھیرا تھا۔ وہ پھر ڈیوٹی پر گئی تو میں نے لائٹ جلا کے وہ فائل دیکھی جو ٹیبل پر رکھی تھی۔ کمرے میں ابھی تک جولی کے وجود سے پھوٹنے والی تیز خوشبو بھری ہوئی تھی۔ بے اختیار مجھے وہ خوشبو یاد آئی جو نورین کے پاکیزہ وجود کی علامت بن گئی تھی۔ ایک لطیف روحانی احساس کی طرح... یہ دنیا کی کثافت سے آلودہ خود اپنا اشتہار بن جانے والی خوشبو تھی۔

میں نے فائل اٹھا کے دیکھی۔ اس میں بہت کچھ میری سمجھ میں آنے والا نہیں تھا۔ ڈاکٹر کی تحریر اور ڈاکٹری زبان سمجھنا دشوار تھا۔ مجھے خیال آیا کہ شاید یہ... جولی مجھے سمجھا سکے۔ میں نے اسے پھر بلا لیا۔ جو بات اس نے کمرے میں آکے کی، وہ خالص کاروباری اور بے شرمی کی انتہا تھی۔ اس نے اپنی اور اپنے وقت کی قیمت مانگی مگر میں نے اسے مایوس کیا۔

"آج نہیں مس جولی... پھر کبھی سہی۔"

اس امید افزا بات نے اسے خفا نہیں کیا۔ "آپ میرا نمبر لے لیں۔"

"نمبر کی کیا ضرورت ہے۔ جب یاد آئے گی تمہاری تو آجاؤں گا۔ تم یہیں ملو گی۔ ابھی مجھے اس فائل میں لکھا ہوا سمجھاؤ... یہ کیا ہے؟"

اس نے فائل دیکھی اور کسی حد تک مطلب سمجھا دیا۔

"تم یہ فائل لے جاؤ گے اپنے ساتھ؟"
"ظاہر ہے صرف اسے یا تمہیں دیکھنے کے تو دس ہزار نہیں دیے تھے میں نے۔"
اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "فائل نہ ملی تو کل کو تو میری نوکری بھی جائے گی... تم اس کی فوٹو اسٹیٹ کاپی بنوالو۔"
اسے میرے واپس آنے کا یقین ہوگا۔ میں باہر گیا اور مجھے آدھی رات کے بعد فوٹو اسٹیٹ بنانے والی مشین کی تلاش میں بہت دور جانا پڑا۔ جب میں واپس لوٹا تو وہ کچھ پریشان تھی۔ اصل فائل مجھ سے لے کر اس نے فوراً واپس اپنی جگہ رکھ دی۔ صبح تک ہمارے درمیان پھر اجنبیت کا رشتہ آگیا تھا جو گزر جانے والی رات کا رازدار تھا۔ میں ضرورت کے لیے کچھ رقم لے کر آیا تھا مگر اب میرے پاس اتنی رقم بھی نہ تھی کہ میں ٹیکسی کر کے واپس جاسکوں۔ جو گاڑی میں لایا تھا، وہ میرے پاس تھی۔
رات کا باقی حصہ میں نے اندر باہر گھومتے پھرتے، سوتے جاگتے گزارا حالانکہ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو صبح تک اس کمرے میں عیش کرتا جس کا ایک رات کا کرایہ دس ہزار روپے تھا۔ رات کے دوران ایک بار میں نے اوپر جا کے ریشم کو بھی دیکھا۔ اس کے کمرے میں مدھم روشنی تھی اور وہ سکون سے سو رہی تھی۔ رپورٹ سے ریشم کے موقف کی تصدیق بھی ہوگئی تھی کہ اس نے نہ خودکشی کی کوشش کی تھی اور نہ اپنے جرم محبت کا نقش مٹانے کی... یہ سارا پروپیگنڈے کا زہر تھا جو بھابی نے اگلا تھا۔
انور مجھے بتائے بغیر چلا گیا تھا اور اس کی گاڑی نہیں تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ واپس ہی گیا ہوگا۔ اس کی لاتعلقی، بے رخی یا بے حسی میرے نزدیک افسوسناک تھی لیکن اب اس نے نظریں پھیر لی تھیں اور اس کے جذبات کا رخ بدل گیا تھا۔ یہ شرمندگی ہی تھی کہ اس نے مجھ سے بھی بات کرنے سے گریز کیا تھا۔ وہ ریشم کو میرے حوالے کر کے بھاگ گیا تھا۔ میں اسے فون کر کے پوچھتا تو جواب شاید کسی بہانے کی صورت میں سامنے آتا۔ میری طبیعت خراب ہو رہی تھی۔ اباجی نے بلا لیا تھا۔ تم تھے اس کی دیکھ بھال کے لیے تو میں واپس آگیا۔
ریشم ابھی تک اس کا دفاع کر رہی تھی۔ اس کا موقف یہی تھا کہ انور اسے چھوڑنے والا نہیں۔ وہ بعد میں روزینہ سے مجبوری میں شادی کرے تو اس کی کوئی اہمیت نہیں کیونکہ محبت تو انور اسی سے کرتا ہے۔ یہ خود فریبی کا طلسم تھا ورنہ اس کی حقیقت وہی تھی جو میری نظر بھی دیکھ رہی تھی اور دنیا بھی جانتی تھی۔ یہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا تھا ورنہ حقیقت ایک ہی تھی جو ریشم دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔
ان حالات نے مجھے بڑے مخمصے میں ڈال دیا تھا۔ اب میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ریشم میرے کہنے سے حویلی چھوڑ دے گی۔ میری تو یہ منزل ہی نہیں تھی۔ ایک خیال مجھے یہ بھی آتا تھا کہ کہیں ریشم نے محبت میں بھی سودا تو نہیں کرلیا ہے۔ وہ پہلی سے دوسری پوزیشن پر رہنا قبول کرلے؟ تمام عمر غربت و ذلت میں گزارنے والی لڑکی اچانک حویلی کی مکین بن گئی تھی اور اب مالکن بننا چاہتی تھی۔ یہ ٹھاٹ باٹ اور عیش و آرام اس نے خواب میں بھی نہیں دیکھے تھے۔ اب اس سب کو ٹھکرا کے واپس اپنی پرانی کسمپرسی کی زندگی میں لوٹ جانا بھی اس کے لیے ایک ڈراؤنا خواب ہوگا۔
حویلی میں آنے والی عورتوں کو عزت و عصمت کی روایتی قدروں کو بھلانا اس لیے آسان ہو جاتا تھا کہ انہیں یہ زندگی راس آجاتی تھی۔ جتنا ملتا تھا، وہ سب کچھ گنوا دینے کا احساس مٹا دیتا تھا۔ یوں بھی ان کے لیے عزت آبرو ایک بے معنی دولت تھی جس کی حفاظت نہ وہ خود کرسکتی تھیں اور نہ ان کے باپ، شوہر یا بھائی... وہ جبر کے آگے سر جھکانے پر مجبور تھے تو عورت کس پر ناز کرے۔ حویلی کے مردان کے اپنے مردوں سے تو بہتر ہی سلوک کرتے تھے اور ان کی ذلت کا سودا بھی کرلیتے تھے۔ ان کا وہی تھا جو تن کو لگے۔ اچھا کھانا... اچھا کپڑا...
کہیں ریشم بھی ایسا ہی تو نہیں سوچنے لگی ہے؟ اس کا باپ کے سوا ہے بھی کون جو ہاتھ تھام کے لے جائے۔ وہ حویلی میں اپنی جگہ بنانے کے لیے اب بھی پُرامید ہے اور اس کے لیے کوشش بھی کر رہی ہے۔ وہ انور کو روکے گی۔ اپنی تمام نسوانیت کی جادوئی طاقت کے ساتھ اور محبت کا منتر پھونک کے۔ وہ آسانی سے دوسری عورت سے ہار نہیں مانے گی۔ ریشم سماجی فرق کے باوجود اتنی ہی عورت ہے جتنی روزینہ... شاید اس سے بہتر پوزیشن میں ہے کیونکہ ریشم کے لیے انور پہلا مرضی کا انتخاب ہے جبکہ روزینہ کے لیے دوسرا مجبوری کا۔
مجھے لگتا تھا کہ اِدھر اُدھر کی سوچ سوچ کر میرا دماغ خراب ہو جائے گا۔ اسپتال کے کیفے ٹیریا کے جلدی کھلنے کا امکان کم تھا۔ میں نے باہر جا کے عوامی ہوٹلوں کی گندی میلوں اور جھولتی کرسیوں پر بیٹھ کے ٹوٹے کنارے والے کپوں میں ابلتی ہوئی گاڑھی میٹھی چائے پی۔ اس وقت وہاں

بھی دستیاب تھی اور طلب میں مجھے برازیل کی کافی سے زیادہ اچھی لگی۔
آہستہ آہستہ لاہور انگڑائی لے کر اٹھا اور کاروبارِ حیات کا رکا ہوا دریا بہاؤ پر آگیا۔ واپس جاتے ہوئے میں نے اردو کا ایک اخبار خرید لیا۔ سڑک پر چلتے ہوئے پڑھنے کے بجائے میں نے اسے رول کر کے ہاتھ میں رکھا اور اسپتال کے صحن میں ایک بینچ پر بیٹھ کے کھولا۔ پہلے صفحے کی سرخیاں اور ذیلی خبریں بڑے بڑے شہروں کی سیاسی سرگرمیوں کی ترجمان تھیں۔ حکومتی ارکان اپنا راگ گا رہے تھے۔ اپوزیشن والوں نے آنے والے الیکشن کے لیے اپنی ڈفلی بجانے کا آغاز کر دیا تھا۔
خبر میں کتنی خبر ہوتی ہے؟ شاید اتنی ہی جتنی بنائی جائے۔ ایک سرسری نظر ڈالتا میں اندر کے صفحے پر چلا گیا جو ڈسٹرکٹ پیج تھا۔ وہاں ایک خبر نے مجھے متوجہ کیا جو بہت نمایاں تو نہ تھی لیکن اس میں سنسنی خیزی تھی چنانچہ لگ گئی تھی۔ نمائندۂ خصوصی نے زیبِ داستاں کے لیے بہت کچھ شامل کیا ہوگا جو ایڈٹ کر دیا گیا تھا۔
خبر کی دو کالمی سرخی تھی "پیر اظہر علی شاہ کے خلاف قتل کا مقدمہ" اس کے بعد تھوڑی سی تفصیل تھی۔ "ملتان کے نامور بلڈر علی شاہ نے الزام عائد کیا ہے کہ ان کے بیٹے مراد سکندر کو پیر اظہر علی شاہ نے قتل کرایا تھا لیکن مقامی پولیس اس کے خلاف قتلِ عمد کا مقدمہ درج نہیں کر رہی ہے چنانچہ وہ تمام ثبوت اور شہادتوں کے ساتھ ہائی کورٹ سے رجوع کریں گے اور اس معاملے میں انہوں نے صمد بخاری کو اپنا وکیل مقرر کیا ہے۔ پولیس کے بااختیار افسران اس معاملے میں خاموشی اختیار کیے ہوئے ہیں، ہمارے نمائندے کو بیان دیتے ہوئے اظہر علی شاہ نے اس الزام کو بے بنیاد اور انہیں بدنام کرنے کی سازش قرار دیا۔ واضح ہو کہ سکندر علی شاہ کی اظہر علی شاہ سے قرابت داری ہے۔"
یہ ایک سنسنی خیز انکشاف تھا۔ اندر کی خبریں پیر صاحب پر لگائے گئے الزام کی تصدیق کرتی تھیں۔ شاید مراد کے ساتھ مارے جانے والے جاں نثاروں میں سے کسی نے مراد کے باپ کو سب بتا دیا تھا یا اس نے اپنے ذرائع سے معلوم کرلیا تھا کہ اس رات کیا ہوا تھا۔ مراد کی لاش اس کے گھر کے قریب پانی کے ایک جوہڑ میں تیرتی پائی گئی تھی۔ شاید یہی غلطی پیر صاحب کے گلے پڑ گئی تھی۔ اس نے نشانِ عبرت بنانے کے لیے مراد کی لاش اس کے گھر کے سامنے پھنکوا دی تھی۔ اگر مراد کے ساتھیوں کی طرح وہ بھی غائب ہو جاتا تو شاید کسی کو کچھ معلوم نہ ہوتا۔
کہنے کو میں بھی ان گواہوں میں شامل تھا جو اس رات پیر صاحب کے آستانے پر موجود تھے۔ میں نے دیکھا نہیں تھا مگر سنا بہت کچھ تھا۔ پھر بھی میں عزت داروں کی اس خاندانی لڑائی میں فریق بنتا تو میرا حال وہی ہوتا جو سانڈوں کی لڑائی میں مینڈک کا ہوتا ہے۔ محاورے کے مطابق... اظہر علی اگر اثر رسوخ رکھتا تھا تو اس کا حریف بھی یقیناً کم نہ ہوگا جس نے اعلانیہ طبلِ جنگ بجا دیا تھا۔ ظاہر ہے اس کے پاس ایک باپ کا دکھ ہی نہیں، اس الزام کی صداقت کو ثابت کرنے کے لیے بہت کچھ ہوگا۔ اب تک وہ قرابت دار تھے تو اب دشمن ہوگئے تھے۔
یہ خبر میرے لیے ایک طرف باعثِ مسرت تھی کہ پیر صاحب بھی اپنی تمام روحانی طاقت کے باوجود ملزم ہوگئے تھے۔ اب آیا اونٹ پہاڑ کے نیچے۔ کوئی تو اس کی ساری بدمعاشی کی طاقت سے ٹکرایا۔ یہ ابتدا تھی۔ اس کے بعد قانونی جنگ سے زیادہ اثر رسوخ کی جنگ اہم ہوگی۔ دونوں طرف سے پیسا پانی کی طرح بہایا جائے گا۔ گواہ خریدے یا ختم کیے جائیں گے۔ شہادت بدلی جائے گی۔ ضمانتوں کا چکر ہوگا۔ فیصلہ تو بڑی دور کی بات ہے۔ اس سے پہلے نہ جانے کتنے سیشن جج دونوں طرف کے دباؤ کا شکار ہوں گے۔ کچھ مقابلے کی تاب نہ لا کے خود بھاگ جائیں گے تو کچھ ہٹا دیے جائیں گے۔ ایک قتل کا فیصلہ ہونے سے پہلے نہ جانے اور کتنے قتل ہوں گے۔ پھر اپیلوں کے بعد اپیلوں کا سلسلہ۔
لیکن عدالتی معاملات سے الگ جو معاملہ سب سے زیادہ اہمیت اختیار کرے گا، وہ عزت کا ہوگا۔ شاعر نے کہا تھا۔ وقت کرتا ہے پرورش برسوں... حادثہ بے سبب نہیں ہوتا۔ پولیس کہتی ہے قتل بھی بے سبب نہیں ہوتا اور عقل بھی ایسا ہی مانتی ہے۔ پہلا سوال یہ اٹھے گا کہ قتل ہوا تو کیوں؟ دھواں وہیں سے اٹھتا ہے جہاں آگ ہو تو یہ آگ کہاں تھی۔ آتشِ عشق کا دھواں بھی نظر آتا ہے۔ اس کیس میں نام آئے گا روزینہ کا تو پیر صاحب کی خاندانی عزت کا جنازہ تو پہلے اٹھ جائے گا۔
اور بلاشبہ اس کے ساتھ ہی ان کی روحانیت اور پیری مریدی کا...
صفائی کرنے والے ایک لڑکے نے میرے قریب آ کے کہا۔ "آپ کو اندر بلایا ہے سر۔" تو میں چونکا۔ اس نے میرے آس پاس کی صفائی کرلی تھی۔ مجھے بروقت بلاوا

آنے سے اس کا کام آسان ہو گیا۔ میں نے اخبار کو رول کر کے پکڑا اور اندر چلا گیا۔ ڈیسک پر اب جولی نہیں تھی۔ دوسری قدرے مہذب خاتون نے مجھے پیغام دیا۔ ”آپ مس ریشم کے ساتھ ہیں... اوپر آپ کو ڈاکٹر عذرا نے بلایا ہے۔“

اس ڈاکٹر کو میں گزشتہ روز بھی دیکھ چکا تھا۔ اس نے پھر سوال کیا۔ ”اچھا آپ ہیں ان کے ساتھ... کیا نام ہے آپ کا؟“

”ملک سلیم اختر۔“

”ملک صاحب! یہ اب بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ انہیں لے جا سکتے ہیں۔“

فائل کی کاپی میری بغل میں دبی ہوئی تھی مگر میں نے انجان بن کے سوال کیا۔ ”اسے کیا ہوا تھا ڈاکٹر صاحب؟“

”کوئی خاص بات نہیں۔ فوڈ پوائزننگ ہو جاتی ہے کبھی تو بعض اوقات پولوشن ہوتا ہے پانی میں، پتا نہیں چلتا۔“ اس نے سرسری انداز میں بیان دیا۔

اس کے جانے کے بعد میرے سامنے صرف ریشم رہ گئی اور یہ سوال رہ گیا کہ اب اسپتال سے وہ کہاں جائے گی؟ انور کے رویّے سے وہ کچھ دل شکستہ تھی۔ ”وہ آیا نہیں؟“ ریشم نے مایوسی سے پوچھا۔ ”فون بھی نہیں کیا؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہ مجھے بھی کچھ بتائے بغیر اچانک چلا گیا۔ اس سے شک ہوتا ہے کہ اس کے نہ آنے کی کوئی غیر معمولی وجہ ہو گی۔ شاید اسے تسلی تھی کہ میں ہوں یہاں...“

”ایسی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟“ اس نے ناراضی سے کہا۔

پوری وجہ میری بغل میں دبے ہوئے اخبار میں ڈسٹرکٹ پیج پر ایک خبر کی صورت میں موجود تھی لیکن اس وقت میں کوئی دھماکا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ خود مجھے بھی معاملات کو سمجھنے اور سوچنے کی ضرورت تھی۔ ظاہر ہے یہ کام یہاں اسپتال میں نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک دم میں بھی کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ ریشم کو واپسی پر حویلی چھوڑوں یا اس کے گھر لے جاؤں۔ ریشم خود اس معاملے میں ڈانواں ڈول تھی۔ اس نے ابھی دوسری عورت کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔ ابھی اس کے خوابوں کا سفر جاری تھا۔

ابھی ضابطے کی کارروائی جاری تھی کہ انور آ گیا۔ ”آئی ایم سوری ریشم! تم سمجھ رہی ہو گی میں بھاگ گیا؟“

ریشم برہم ہو گئی۔ ”اور کیا سمجھوں کہ تمہیں جن اٹھا کر لے گیا تھا؟“

اس نے ریشم کو منانے کے لیے کہا۔ ”سب معلوم ہو جائے گا تمہیں... گھر تو چلو... یہاں لڑنا ضروری ہے؟“

انور کے رویّے اور لہجے میں جو تبدیلی آئی تھی، وہ بہت نمایاں تھی۔ عدم دلچسپی یا بے رخی کا وہ انداز جو چھپائے نہ چھپتا تھا، باقی نہ رہا تھا۔ وہ پرانا انور تھا۔ جوشیلا... پُراعتماد... میرا ماتھا کیسے نہ ٹھنکتا لیکن میں عجلت میں کسی نتیجے پر پہنچنا نہیں چاہتا تھا۔

”یہ کیسی فائل ہے؟“ انور نے پوچھا۔

میں نے اسے ٹال دیا۔ ”کوئی خاص نہیں۔ کچھ ذاتی کاغذات ہیں۔“

یہ جواب انور کو مطمئن کرنے والا نہیں ہو سکتا تھا۔ گزشتہ رات میرے پاس پرسنل کاغذات والی کوئی فائل نہیں تھی۔ رات کو ذاتی کاغذات کہاں سے آ گئے؟ تاہم اس نے میرے جواب کو قبول کر لیا۔

”کوئی خاص بات ہے اخبار میں؟“ وہ بولا۔

اب اس کی بے نیازی کے انداز میں مجھے تشویش محسوس ہوئی جو میرا وہم بھی ہو سکتا تھا۔ میں نے کہا۔ ”ایسے ہی وقت گزاری کے لیے خریدا تھا صبح۔“ اور اسے ردّی کی طرح ٹوکری میں ڈال دیا تاکہ اس کا شک رفع ہو جائے۔ یہ آج کا اخبار تھا جو میں پھر خرید سکتا تھا اور میں نے ایسا ہی کیا۔ دوسرا کام میں نے یہ کیا کہ فائل کور میں سے کاغذات نکال کے اپنی جیب میں ڈال لیے۔ ریشم اب انور کے ساتھ اس کی گاڑی میں تھی۔ پیچھے دوسری گاڑی میں مجھے کافی وقت ملا۔

مجھے کچھ حیرانی ہوئی جب حویلی میں گاڑی سے اترتے ہی انور نے مجھ سے پوچھا۔ ”تیری وہ پرسنل پیپرز والی فائل کہاں گئی؟“

میں نے سر پر ہاتھ مارا۔ ”اوہ... فائل تو اسپتال ہی میں رہ گئی۔“

اگرچہ انور کا ظاہری رویّہ پُرسکون تھا لیکن مجھے یوں لگتا تھا جیسے یہ سکون مصنوعی ہے اور اس کے نارمل رویّے کے پیچھے ایک اضطرابی ہیجان ہے جسے وہ مجھ پر اور ریشم پر ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا۔ یہ میرا وہم نہیں تھا، وقت گزرنے کے ساتھ اس طوفان کے آثار حویلی کے اندر محسوس ہونے لگے جس کی آمد کے آثار عیاں تھے۔ گھر کی کھڑکیاں دروازے بند کرنے سے طوفان ختم نہیں ہو سکتا تھا۔

ریشم کو اس کے کمرے میں چھوڑ کے انور نے کچھ

محسوس نہ ہونے والی احتیاطی تدابیر اختیار کرنا ضروری سمجھا تھا۔ ریشم کے لیے آرام کے نام پر پابندی لگا دی گئی تھی اور گیٹ پر موجود سیکیورٹی گارڈ کو سختی سے سمجھا دیا گیا تھا کہ بی بی جی کی اجازت کے بغیر اندر کوئی نہیں جا سکتا۔ اور کوئی کا مطلب ہے کوئی بھی... اس کے کھانے پینے کا ذمے دار سلونی کو بنا دیا گیا تھا۔ ابھی ریشم پر بھی نقل و حرکت کی پابندی تھی۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ احتیاط شفایابی سے زیادہ اسے پھر کسی نقصان کے احتمال سے محفوظ رکھنے کے لیے تھی۔

اندر کے حالات میں کشیدگی بڑھ گئی تھی۔ اگر ریشم کے بجائے اس کی ڈیڈ باڈی ایمبولینس سے اتاری جاتی تو یہ شاہینہ کے لیے زیادہ اطمینان بلکہ خوشی کی بات ہوتی کہ اس کے پلان کی کامیابی یقینی ہو گئی۔ پہلا مرحلہ ریشم کو راہ سے ہٹانے کا تھا۔ وہ ہٹ جاتی تو روزینہ کا راستہ خود ہی صاف ہو جاتا مگر ریشم بڑی ڈھٹائی سے زندہ لوٹ آئی تھی۔ انور نے اسے اسپتال لے جانے میں غیر ضروری عجلت کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ مر جاتی تو انور احتجاج کرتا اور سوگ مناتا لیکن اس کا کوئی امکان نہ تھا کہ ریشم کی ”فوڈ پوائزننگ“ کو قتل بنا کے اپنے خاندان کی عزت کو عدالت کے کٹہرے میں لے جائے۔

شام تک میں بھی اپنے کمرے میں بند رہا اور سوچتا رہا کہ اس صورت حال کو کب تک برقرار رکھا جا سکے گا۔ ایک طرف اکیلی ریشم تھی جس کے مستقبل کا دارومدار انور کے رویّے پر تھا۔ دوسری طرف حویلی کے باقی لوگ تھے۔ شاہینہ، بڑے چودھری صاحب اور ان کی بیگم... سب ایک ہی مؤقف رکھتے تھے کہ خاندانی تنازعات کا حل صرف ایک ہے جو پیر صاحب نے دیا تھا کہ انور سب کی بہتری کے لیے روزینہ کو قبول کر لے۔ اس کے بعد چاہے تو ریشم کو بھی رکھے۔ برابری نہ ہونے کے باوجود اس کو برابری کا درجہ دیا جائے گا۔ معلوم نہیں خوف سے یا بے وقوفی میں خود ریشم نے یہ منظور کر لیا تھا اور انور ایک دفاعی نیم رضامندی کی پوزیشن میں تھا۔

مجھے اس ماحول میں ریشم کا مستقبل قطعی غیر محفوظ نظر آ رہا تھا۔ میری سپورٹ کوئی معنی نہیں رکھتی تھی اور انور کے جذبات میں فرق آ گیا تھا۔ مجھے نظر آ رہا تھا کہ روزینہ اس گھر میں آ گئی تو ریشم کا ٹھکانا یہاں نہیں رہے گا۔ حالات خود اسے نکلنے پر مجبور کر دیں گے اور وہ زیادہ برا ہو گا۔ اخبار میں جو خبر میں نے دیکھی تھی، وہ زلزلہ برپا کرنے والی تھی لیکن ابھی کچھ کہنا مشکل تھا کہ اس سے انور کا مستقبل کس حد تک متاثر ہو گا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ قانونی معاملے کا خاندانی فیصلوں پر اثر نہ پڑنے دیا جائے۔

حویلی کے اندر کی صورت حال بہت عجیب ہو گئی تھی۔ اس کے ہر کمرے کا مکین اپنی بقا کی جنگ الگ لڑ رہا تھا۔ پہلے کمرے میں چودھری اپنے کمرے میں بیماری اور معزولی کے دن ایسے ہی گزار رہا تھا جیسے کہ اورنگ زیب کے تخت پر قبضہ کر لینے کے بعد اس کے باپ شاہجہاں نے اپنی اسیری کے دن قلعے میں پورے کیے تھے۔

نیچے اکبر کی حیثیت اورنگ زیب کے بھائی جیسی تھی جس کی زندگی کا ہر لمحہ بے یقینی میں گزر رہا تھا۔ اوپر اس کی بیوی شاہینہ اپنا کھویا ہوا اقتدار واپس حاصل کرنے کی پوری کوشش کر رہی تھی اور اب اسے ایک سازشی باپ کی حمایت بھی حاصل تھی۔ انور کی روزینہ سے شادی کی صورت میں اس کا پلان کامیاب ہو جاتا مگر راہ میں ایک معمولی عورت حائل تھی۔ اس نے کسی خوف کے بغیر اسے زہر دے دیا تھا۔ اس یقین کے ساتھ کہ کسی کو کچھ معلوم نہ ہو گا اور کامیابی کا راستہ صاف ہو جائے گا۔ کیا اب وہ اپنی ناکامی پر پہلے سے زیادہ خونی جذبے کے ساتھ عمل نہیں کرے گی؟

اس کے ساتھ والے کمرے میں ریشم تھی جس نے مرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ ارمانوں کی خواب نگری میں جی رہی تھی اور یہاں سے نکلنا نہیں چاہتی تھی کیونکہ باہر زندگی کی بہت بدصورتی اور بے رحمی تھی۔ اسے انور پر بھروسا تھا اور وہ دل سے سمجھتی تھی کہ یہ جذبہ بے بدل ہے۔ اس کی جگہ کوئی اور لڑکی کیسے لے سکتی ہے۔ جو محبت انور کو اس سے ہے، وہ اپنا رخ کیسے بدل سکتی ہے۔ شاید اس کا اندھا اعتماد ایک خوش فہمی بھی تھی۔ وہ روزینہ کے ساتھ کمپرومائز تک کرنے پر تیار ہو گئی تھی۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ اس کی حیثیت میں فرق نہیں پڑتا۔

پھر انور تھا جو ساری عمر بھٹکتا پھرا تھا۔ پہلے دنیا میں اپنی مرضی سے... لیکن اب اپنی ہی زندگی کی بھول بھلیوں میں سرگرداں تھا۔ وہ بھی دوسروں کی مرضی سے... اب وہ دل اور دماغ کی خانہ جنگی کا شکار تھا۔ ایک طرف اس کے ریشم کے لیے جذبات تھے تو دوسری طرف مصلحت کے تقاضے اور وہ نہ ریشم کو چھوڑنا چاہتا تھا، نہ اپنی دنیا کو... ابھی تک وہ درمیان کا راستہ تلاش کرنے میں ناکام تھا جس میں دنیا بھی مل جائے اور جنت بھی... اس کے لیے وقت کم تھا۔ حالات ہر روز اس کے گرد گھیرا تنگ کرتے جا رہے تھے۔

شاہینہ کے ہاتھوں ریشم کے قتل کی کوشش نے اسے جھنجوڑ کے رکھ دیا تھا۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس حویلی میں وہ ریشم کو پورا تحفظ فراہم نہیں کر سکے گا جہاں وہ کسی کے لیے بھی قابلِ قبول نہیں۔ معلوم نہیں اس کے ذہن میں آخری حل کیا تھا لیکن ابھی تو پوری حویلی پر اس خبر کا آسیب سوار تھا جو میں نے اخبار میں پڑھی تھی۔ مگر سب یہ سمجھ رہے تھے کہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔

یہ چھپی رہنے والی بات نہ تھی۔ جب بات نکلے گی تو پھر دور تلک جائے گی۔ بظاہر اس پریشانی کے آثار دکھائی نہ دیتے تھے۔ غالباً وہ سب اس مسئلے پر گزشتہ رات ہی ڈسکس کر چکے تھے جب گھر میں باہر والا کوئی نہ تھا۔ نہ میں نہ ریشم۔ سہ پہر کے بعد ایکشن پلان کی صورت واضح ہونے لگی۔ اچانک پیر صاحب قبلہ کی سواری اپنے تمام روحانی جاہ و جلال کے ساتھ نمودار ہوئی اور وہ اپنا نورانی جبہ و دستار سنبھالتے بھائی کے کمرے میں چلے گئے۔ دروازہ بند ہو گیا۔

میں ایک نظر ریشم کو دیکھنے گیا تو انور وہاں پہلے سے موجود تھا۔ ریشم جاگ رہی تھی اور سیدھی بیٹھی تھی۔ وہ دونوں خاموش اور بے حد سنجیدہ چہرے لیے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر بھی کسی نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ میرے پوچھنے پر ریشم نے سر ہلا دیا۔ ”ٹھیک ہوں۔“

”کھانا کھایا تم نے؟“

”ہاں، میں نے اصرار کر کے کھلایا ہے۔ اس کی تمام ضروریات کی دیکھ بھال سلونی کے ذمے ہے۔“ انور بولا۔ ”تو نے کچھ کھایا؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”بھوک نہیں ہے۔“

”بھوک تو مجھے بھی نہیں ہے مگر کھانا تو ہے... میں یہیں منگوا لیتا ہوں... مجھے بڑی ضروری بات کرنی تھی تجھ سے۔“

”یار، مجھے معاف رکھ۔ میں پہلے ہی بہت دباؤ میں ہوں... نہ میں تیری طرح سوچ سکتا ہوں اور نہ کسی کی مدد کر سکتا ہوں۔ مجھے تو اسی میں عافیت نظر آتی ہے کہ خود کو تمام معاملات سے الگ کر لوں۔“

”تو جا سکتا ہے۔“ وہ شکایتی لہجے میں بولا۔ ”ہر طرف سے میں پھنس گیا ہوں اور بھگتنا مجھے ہی ہے۔ میں ایسا نہیں کر سکتا کہ ریشم کا ہاتھ پکڑوں اور نکل جاؤں... ہم فلمی خوابوں کی رومانی دنیا کے کسی رنگین ماحول میں اپنا خوابوں کا گھر بسا لیں اور محبت کے گیت گاتے زندگی گزاریں۔ میں نے بہت عیش و آرام، اختیار و اقتدار والی زندگی گزاری ہے ملک... شہزادوں کی طرح دنیا گھومی ہے... جوگیوں کی طرح نہیں۔“

میں نے ہمدردی سے کہا۔ ”مسئلہ تیرا ہے تو حل بھی تیرے پاس ہے۔“

”مسئلہ کوئی نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ وراثت کا تھا۔ وہ ختم ہو جاتا لیکن حالات اچانک میرے خلاف ہو گئے ہیں۔ مجھے ہر طرف سے محصور کیا جا رہا ہے۔ اور ایسا لگتا ہے کہ سب کی یہی ضد ہے کہ ریشم کو چھوڑ دو... مجھے شک ہے کہ ریشم کی جان لینے کی کوشش کی گئی تھی۔“

”صرف شک؟“ میں نے برہمی سے کہا۔ ”تو جانتا ہے کہ اس میں شک کی کوئی بات نہیں... ریشم کو زہر دینے والی شاہینہ تھی اور اس نے جھوٹ بولا مجھ سے... ریشم کو بدنام کرنے کے لیے۔“

انور کا رنگ اڑ گیا۔ ”ملک... شک کی بات میں اس لیے کرتا ہوں کہ دیکھا کسی نے بھی نہیں تھا۔ تو بتا کیا دیکھا؟ اپنی بات سے مکرنا شاہینہ کے لیے کیا مشکل ہوگا، وہ تجھے جھوٹا بنا دے گی۔ وہ خود گولی چلا کے بھی ریشم کو قتل کر دے تو اس پر انگلی کوئی نہیں اٹھائے گا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ سارے چشم دید گواہ تیرے خلاف عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہو جائیں اور حلف اٹھا کے گواہی دیں کہ انہوں نے تجھے قتل کرتے دیکھا تھا۔ وہ اکبر کی بیوی... چودھری صاحب کی بڑی بہو اور پیر اظہر علی شاہ کی بیٹی ہے۔ پورا خاندان اس کے ساتھ ہے۔“

میں نے تلخی سے کہا۔ ”یعنی جو آج نہیں ہوا... کل ہو گا... اور تو کچھ نہیں کرے گا۔“

”میں نے ایسا نہیں کہا۔ جو کرنا ہے مجھے ہی کرنا ہے۔ میرے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ یا ریشم کے سوا سب کچھ چھوڑ دوں... سب کو چھوڑ دوں... راج پاٹ... زمین جائیداد چھوڑ کے خالی ہاتھ محل سے نکل جاؤں گوتم بدھ کی طرح۔ پھر کہاں جاؤں؟ کیا کروں؟ بدھ کی طرح ”گیا“ میں کسی برگد کے نیچے دھونی دے کے بیٹھ جاؤں... دوسرا راستہ یہ ہے کہ ریشم کو چھوڑ دوں اور شادی کر لوں روزینہ سے... نہر کے ایک طرف میری حکومت ہو... دوسری طرف میرے بھائی کی... ایک میں شاہینہ مہارانی ہو دوسری میں روزینہ... بڑی آزمائش سے گزر کے اور سخت عذاب جھیل کے میں نے تیسرا راستہ نکالا تھا جو آسان نہ تھا اور میں اعتراف کرتا ہوں کہ میری مشکل ریشم نے آسان کی تھی۔“

”ریشم بے وقوف ہے۔“

”نہیں... ریشم بہت پریکٹیکل ہے۔ اس نے میرے عذاب کا بوجھ کم کیا ورنہ میں پاگل ہو جاتا... تاہم عذاب ختم نہیں ہوا۔ اس طرح ریشم کی زندگی اور میرا مستقبل محفوظ ہو جاتے۔“

”اور حل اس مشکل کا یہ نظر آیا کہ تُو دونوں سے شادی کر لے۔“

”اس کے سوا کوئی صورت نہیں۔ تُو بھی جانتا ہے اور ریشم بھی کہ روزینہ سے مجھے محبت نہیں ہو سکتی جو مجھ پر تھوپی جا رہی ہے کیونکہ حویلی میں ریشم کو جگہ دینے پر کوئی راضی نہیں۔ او کے... تم رکھو حویلی میں روزینہ کو... میں ریشم کے ساتھ شہر میں رہوں گا... اس کا حق اسے ضرور ملے گا... میری محبت کے علاوہ۔“

”اور عزت؟“ میں نے تلخی سے کہا۔

”عزت میں دوں گا۔“ وہ گرم ہو گیا۔ ”محبت کے ساتھ... جو روزینہ کو نہیں ملے گی۔ اب ریشم چاہے تو اڑ جائے کہ نہیں مجھے بھی وہی مقام چاہیے جو روزینہ کو ملے گا۔ یا روزینہ شرط لگا دے کہ پہلے ریشم کو چھوڑ دو... جو ناممکن ہے، وہ ناممکن ہے... اور خود ریشم سے پوچھ لے تو۔“

”پہلے اور دوسرے درجے کا مسئلہ تو ہے۔“

”اس میں کوئی شک نہیں ہونا چاہیے ریشم کو یا تجھے... پہلے میں نے ریشم سے ہی شادی کا فیصلہ کر لیا تھا۔“

”اور سب کو بتا بھی دیا تھا۔“

”یہ ضروری نہیں تھا۔ وقت آنے پر سب کو پتا چل جاتا... قبل از وقت نزاع کا معاملہ اٹھانے سے فائدہ؟ لیکن اب ایک نئی مصیبت نازل ہو گئی ہے جو میرے حق میں تو رحمت ہی ہے۔ تُو نے دیکھا ہوگا کہ پیر صاحب آئے ہیں بڑی افراتفری میں۔“

”دیکھا تھا میں نے۔“

انور نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”ان پر ایک کیس بن گیا ہے... قتل کا۔“

”کس کے قتل کا؟ کتنے بے گناہوں کا لہو ہے ان کے دامن پر... اس کا پتا تو میدانِ حشر میں چلے گا۔“

”یہ خاندانی معاملہ ہے... تو مراد کو جانتا ہے؟“

میں نے بہتر سمجھا کہ انجان بن جاؤں اور پوری بات انور سے سنوں... لیکن دو دن پہلے یہ حویلی میں موضوعِ بحث بن چکا تھا۔

امریکن، فرنچ اور انگلش

جنگِ عظیم دوم کے زمانے میں ایک امریکن سپاہی فرانس کے ریلوے اسٹیشن پر ریل میں بیٹھنے کی جگہ ڈھونڈ رہا تھا مگر ٹرین بھری ہوئی تھی سوائے ایک ڈبے میں جہاں ایک فرانسیسی بڑھیا بیٹھی تھی اور برابر کی سیٹ پر اس کا چھوٹا سا کتا بیٹھا تھا۔ امریکن سپاہی، جنگ کے میدان سے واپس آیا تھا اور کافی تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔ اس نے بڑھیا سے بہت ہی اخلاق سے درخواست کی۔

”مجھے اس سیٹ پر بیٹھنے کی اجازت دیں گی؟“

فرنچ عورت نے سپاہی کو دیکھا اور کہا۔

”تم امریکن بہت ہی بدتمیز ہوتے ہو، کیا تم نہیں دیکھ رہے اس پر میری پیاری کتیا بیٹھی ہے۔“

سپاہی کچھ کہے بغیر آگے بڑھ گیا مگر پوری ٹرین کا چکر لگانے کے بعد کوئی بھی خالی سیٹ تلاش نہ کر سکا۔ وہ واپس پھر بڑی بی کے سامنے موجود تھا۔ اس نے ایک بار پھر درخواست کی کہ اسے وہاں بیٹھنے کی اجازت دی جائے۔ اس پر بڑی بی نے پھر امریکن کی بے عزتی کی۔ اس پر امریکن سپاہی نے نہایت سکون اور خاموشی سے جھک کر چھوٹے کتے کو اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا اور خالی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس پر بڑی بی نے شور مچانا شروع کر دیا۔ کچھ فاصلے پر ایک انگریز بیٹھا تھا اور یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس نے امریکن سپاہی سے کہا۔

”تم کو پتا ہونا چاہیے کہ تم امریکن ہر کام غلط کرتے ہو۔ کھانا کھانے کے وقت FORK غلط ہاتھ میں پکڑتے ہو، گاڑی داہنی طرف بالکل غلط چلاتے ہو اور اب دیکھو تم کو بڑی بی کو باہر پھینکنا تھا اس کی جگہ تم نے بے چارے کتے کو باہر پھینک دیا۔“

”نئی معلومات“

عدالت میں فیصلے کا دن آ گیا اور جج صاحب ملزم کے خلاف فیصلہ دینے والے تھے کہ ملزم کا وکیل جج کے کمرے میں داخل ہوا اور کہا۔ ”عالی جناب آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اس کیس کو پھر سے کھولیں۔ مجھے پتا چلا ہے کہ کچھ نئی معلومات سامنے آئی ہیں جن سے میرے موکل کے بچاؤ میں مدد ملے گی۔“

جج نے پوچھا۔ ”تمہارے پاس کیا نئی معلومات ہیں اس کیس کے سلسلے میں؟“

”جناب والا! میرے موکل کے پاس پچاس لاکھ روپے اور ہیں۔ مجھے ابھی ابھی یہ اطلاع ملی ہے۔“ وکیل نے جواب دیا۔

کراچی سے جاوید کاظمی کے چٹکلے

''مراد تھا روزینہ کا ماموں زاد بھائی... اور مجھے معلوم نہیں اس میں حقیقت کتنی ہے۔ مراد چاہتا تھا کہ روزینہ سے شادی کرلے۔ اس میں قباحت بھی کوئی نہ تھی۔ مراد پڑھا لکھا اور ہینڈسم تھا۔ شاہینہ کے مقابلے میں روزینہ نے بھی زیادہ تعلیم حاصل کی تھی۔ لیکن پیر صاحب کے اپنے سالے کے ساتھ تعلقات کشیدہ تھے۔ اس کا سبب پہلے تو یہ تھا کہ جب سالے نے بلڈر بننے کا فیصلہ کیا تو اس نے بہت دور کی سوچی تھی۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ لاہور، ملتان موٹروے کا بائی پاس اس کی زمین کے سامنے ہو گا۔ ابھی تک یہ منصوبہ کاغذوں میں ہے لیکن اصولی طور پر اس کی منظوری دی جا چکی ہے اور یہ ہے بھی ناگزیر... بالآخر موٹروے اسلام آباد بلکہ پشاور سے کراچی تک بنے گی۔ زمین سالے کی تھی۔ اس نے کنسٹرکشن میں بہنوئی سے پیسا لگانے کو کہا۔ پیر صاحب نے انکار کیا تو اس نے زمین گروی رکھ کے بینک سے لون لے لیا۔ اس پر پیر صاحب نے فتویٰ جاری کر دیا کہ بینک لون پر سود ہوتا ہے اور سود کی کمائی حرام ہے۔''

''اور وہ سب جائز ہے جو پیر صاحب کرتے ہیں یا کراتے ہیں؟''

''یہ دوغلا پن تو جاری ہے۔ پیر صاحب کے لیے اپنی مذہبی ظاہرداری ضروری ہے۔ ان کے فتوے سے رنجش پیدا ہوئی اور سالے نے بہنوئی کی پیری مریدی کے خلاف بیان داغ دیا کہ یہ سارا فراڈ ہے۔ بس اس کے بعد دونوں طرف سے توپوں کے منہ کھل گئے۔ کچھ عرصے بعد یہ فساد تو ختم ہو گیا لیکن دونوں گھروں کے درمیان جیسے دشمنی کی بنیاد پڑ گئی۔ یہ رشتے کا معاملہ تو ابھی اٹھا ہے۔ اس سے پہلے بھی بھائی اپنی بہن کے گھر خود چل کے آ گیا تھا اور اس نے پیر صاحب کو بھی منانے کی کوشش کی تھی لیکن پیر صاحب ایک گمراہ ہو جانے والے سالے کو کیسے معاف کر دیتے جو ان کی پیری مریدی کا مذاق اڑاتا تھا۔ یہ بھی ناممکن تھا کہ وہ پیر صاحب کے ہاتھ پر بیعت کر لے اور ان کے مریدوں کے حلقے میں شامل ہو جائے۔ نتیجہ یہ کہ بہن بھائی میں تو صلح ہو گئی اور وہ ایک دوسرے کے گھر آنے جانے بھی لگے۔''

''پیر صاحب نے اس کی اجازت کیسے دی؟''

''میں نے سنا ہے کہ بیوی نے بغاوت کر دی تھی۔ اس کا ایک ہی بھائی تھا اور جھوٹ سچ خدا جانے... اس نے کہا کہ بھائی کا رشتہ تم سے پہلے تھا۔ میں تمہیں چھوڑ سکتی ہوں اسے نہیں... پیر صاحب کیا کرتے، جوان بیٹیوں کی ماں کے ہاتھ میں طلاق نامہ تھما دیتے... اسی آنے جانے میں مراد نے روزینہ کو پسند کر لیا۔''

''صرف مراد نے؟'' میں نے کہا۔

''روزینہ کی طرف سے میں کیا کہوں... وہ گھر میں بھی سخت پہرے میں رہتی تھی۔ کسی کے ساتھ سوہنی مہینوال والا کھیل تو نہیں کھیل سکتی تھی۔ ویسے کوئی وجہ نہیں کہ روزینہ اسے پسند نہ کرتی لیکن خاندانی رنجش کی وجہ سے یہ ناممکن تھا۔ اگر یہ رومانس تھا تو مجھے اس کے بیک گراؤنڈ کا کوئی علم نہیں۔ ہو سکتا ہے ان میں خط و کتابت ہو یا کوئی ملاقات ہوئی ہو۔ ماں کی مدد کے بغیر یہ ناممکن تھا۔ اس کے قتل کو کسی نے بھی روزینہ سے منسوب نہیں کیا تھا۔ خیال یہی تھا کہ یہ ڈاکوؤں کی کارروائی ہے مگر ڈاکو صرف لوٹتے ہیں۔ مار کے لاش کو گھر کے سامنے نہیں پھینکتے... اس کی کسی سے دشمنی تھی تو مجھے نہیں معلوم... لیکن کل اچانک پیر صاحب کے تیکھے دار سالے نے ایک ایٹم بم پھینک دیا۔ اس نے الزام لگایا کہ اس کے بیٹے کو پیر صاحب نے خود قتل کیا۔''

''اس کے پاس کوئی ثبوت ہو گا۔''

''ایک خبر آ گئی ہے آج اخبار میں...'' انور نے پیچھے پڑا ہوا اخبار اٹھا لیا۔ ''یہ ابھی میں نے ریشم کو دکھائی... تو بھی دیکھ لے۔''

وہ خبر جو مجھے ازبر تھی، میں نے پھر پڑھی۔ ''وجہ ہے دشمنی یا کچھ اور۔''

''مجھے تو کل رات کو ہی معلوم ہو گیا تھا اس لیے میں ریشم کے پاس تجھے چھوڑ کے واپس آ گیا تھا۔ کچھ بتائے بغیر... اور اس کے بعد اسی معاملے میں ایسا الجھا کہ فون بھی نہ کر سکا... شاہینہ نے تو مجھے کچھ نہیں بتایا۔ میں نے خود معلوم کیا۔ مراد کے باپ کے گھر میں ایک عورت اندر کے کام کرتی ہے، کھانا پکانا بھی... ہو گی پچاس سال کی۔ اس کا شوہر ساٹھ سال کا ہے، باہر کے کام کرتا ہے لیکن نشئی ہے۔ ہیروئن پیتا ہے۔ میں نے اس کا پتا چلایا۔ اتفاق سے وہ نظر آ گیا۔ میں نے اسے گاڑی میں بٹھا لیا۔ نشے کی وجہ سے اسے پیسے کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے اور پیسا اسے کوئی نہیں دیتا کہ پھر نشہ کرے گا۔ میں نے اسے سو سو کے دس نوٹ دکھائے تو اس نے بہت کچھ بتا دیا۔ اس نے بتایا کہ مراد گیا تھا روزینہ سے ملنے اور پکڑا گیا۔ کچھ یار دوست اس کے ساتھ تھے۔ پیر صاحب کے مریدوں نے ان سب کو مار دیا پیر صاحب کے حکم پر... مراد کو گولی مارنے والے خود پیر صاحب تھے۔''

''یہ کیسے معلوم ہوا... کس نے بتایا؟''

''ان لڑکوں میں سے ایک فرار ہو گیا تھا۔ وہ باہر تھا۔ اس پر فائرنگ ہوئی اور گولیاں بھی لگیں اسے مگر وہ کسی نہ کسی طرح نکل گیا۔ نہ جانے کس نے اسے دیکھا اور اسپتال پہنچا دیا جہاں وہ اسی رات مر گیا۔ لیکن اس نے اپنا بیان دے دیا۔''

میں چونکا۔ ''تو نے دیکھا وہ بیان؟''

''میں کیسے دیکھتا... مجھے تو اس بڈھے نے بتایا تھا۔''

''یہ تو بہت سنگین معاملہ ہے۔ مرنے سے پہلے نزع کی حالت میں کوئی بیان دے تو قانون میں اس کی حیثیت سچ کی ہو جاتی ہے۔ تجھے یقین ہے کہ وہ بڈھا سب کچھ بقائمی ہوش و حواس بتا رہا تھا... نشے میں نہیں تھا؟''

انور نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس وقت وہ نشے کی طلب سے پریشان تھا۔ میں نے کئی بار چیک کیا۔ اس سے ایسے سوال کیے کہ اس پر نشہ غالب ہوتا تو وہ گڑبڑا جاتا۔ صحیح جواب نہ دے پاتا یا جھوٹ بولتا لیکن وہ پوری طرح ہوش میں تھا۔ میں نے پوچھا کہ یہ بات تم کیسے جانتے ہو کہ مراد اس رات پیر صاحب کی بیٹی سے ملنے گیا تھا اور وہ روزینہ سے محبت کرتا تھا؟ اس نے کہا کہ یہ بات تو گھر میں ہوتی تھی، مراد کی روزینہ سے شادی کی... اس کی ماں بھی چاہتی تھی کہ بھائی کی بیٹی لائے۔ مجھ سے تو کوئی بات نہیں کرتا تھا لیکن میری بیوی چوبیس گھنٹے گھر میں رہتی ہے۔ مراد کی ماں اس سے بات کر کے دل ہلکا کرتی تھی۔ سب کو بھروسا ہے اس پر... بڈھے نے بتایا کہ اس رشتے کے لیے کوشش بھی ہوئی تھی جب آپ ولایت میں تھے۔ یہ بھی معلوم تھا اس بڈھے کو اور یاد تھا۔ اس نے کہا کہ پیر سائیں نے اچھا نہیں کیا۔ اس نے مراد کے گھر والوں کو انکار کر دیا اور بہت بے عزت کیا۔ اس کے بعد معاملہ خراب ہو گیا۔ مراد کے باپ نے بہن کے گھر آنا جانا تو شروع کر دیا تھا لیکن وہ پھر رشتے کی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ میں نے بات ڈال دی۔ اب وہ مان جائیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ یہ معاملہ ایسے ہی چل رہا تھا۔ ماں تھی بیٹے کے ساتھ اور دوسری طرف بھی سگا بھائی تھا۔ لیکن دونوں طرف مردوں کی دشمنی تھی۔ بڈھے نے بتایا کہ باپ کی مرضی نہیں اور تھی لیکن بیٹے کے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ملتے رہے۔''

میں نے کہا۔ ''کیا ماں باپ کو روزینہ اور مراد کی چوری چھپے ان ملاقاتوں کا علم تھا؟''

''میں نے پوچھا تھا بڈھے سے۔ اس نے کہا کہ اس کا تو پتا نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ اس میں ضرور شاہینہ کی مدد شامل ہو گی۔ درگاہ میں ہی پیر صاحب کی رہائش ہے اور وہاں ہر وقت مریدوں کا پہرا رہتا ہے۔ روزینہ کی وجہ سے نہیں... وہاں اور جو غیر قانونی اور غیر اخلاقی دھندے ہوتے ہیں... روزینہ کبھی کبھار اپنی بہن سے ملنے آتی تھی، یہاں رک بھی جاتی تھی۔ دراصل میرے انکار سے وہ سخت دل برداشتہ تھی۔ اب تجھ سے کیا پردہ... وہ دشمن ہے میری... ایک احساس یہ تھا اسے کہ میرے انکار کے بعد اسے اکبر کے حوالے کر دیا گیا۔ پہلے انکار سے اس کی انا کو سخت ٹھیس لگی ہو گی۔ جب میں نے ٹھکرا دیا تو وہ اکبر کو بخش دی گئی، یہ ملال ہمیشہ سے اس کے دل میں ہے۔''

''کبھی اکبر نے اسے کچھ کہا؟''

''میں نے خود کچھ نہیں سنا۔ ایک بار سلونی نے سنا تھا۔ وہ نشے میں تھا اور شاہینہ سے کہہ رہا تھا کہ شکر کر میں نے تجھے قبول کر لیا... ٹھکرائی ہوئی عورت کو۔ تجھ میں کوئی خوبی ہوتی ایسی تو انور سات سمندر پار نہیں جاتا اور گیا تھا تو لوٹ آتا... میں پھنس گیا... اباجی نے مروا دیا۔''

میں نے کہا۔ ''نشے میں آدمی کچھ بھی بول جاتا ہے۔''

''لیکن وہ جھوٹ نہیں ہوتا۔ یہ تو مشہور ہے کہ شراب کے نشے میں آدمی سچ بول دیتا ہے۔ شاہینہ نے بہت بے عزتی محسوس کیا ہو گا۔ ان کے درمیان لڑائی ہوتی تھی تو وہ بھی کہتی تھی کہ میرے نصیب جو تمہارے پلے باندھ دی گئی۔ روزینہ کا معاملہ دوسرا ہو گیا، جب میں نے پھر انکار کر دیا۔ اس کے بعد ریشم آ گئی۔ روزینہ نے بھی بہن سے کہا ہو گا کہ اس کی زندگی تو خراب ہوئی... اس کی نہ خراب ہو... روزینہ کے ساتھ شاہینہ بھی چاہتی ہو گی کہ اس کی شادی مراد سے ہو جائے... پھر یہ مشکل ہو گیا۔''

''مراد اس چکر میں مارا گیا۔''

''بڈھے سے صرف اتنا پتا چلا تھا کہ وہ پیر صاحب کی درگاہ کی طرف گیا تھا۔ باقی میرا اندازہ ہے... سب جانتے ہیں کہ مراد کو پیر صاحب نے انکار کر دیا تھا اور اب دوبارہ کوشش کی جا رہی تھی کہ اسے میں قبول کر لوں۔ زمین کا معاملہ شاید بیٹیوں کی زندگی کے معاملے سے زیادہ اہم سمجھا جاتا ہے۔ مراد کو انکار کی وجہ یہ ہو گی کہ خاندانی زمین کسی اور کے پاس چلی جاتی۔ میرے ابا کو بھی یہی فکر کھائے جا رہی ہے۔ میرا ہر طرف سے گھیراؤ کر لیا گیا تھا اور وہ لوگ پُرامید ہو گئے تھے کہ یہ سانحہ ہو گیا۔ مراد کے ادھر جانے کی وجہ بھی

معلوم ہوجائے گی۔"

"نہیں ایسا تو نہیں کہ وہ روزینہ کو نکال لے جانا چاہتا ہو؟" میں نے کریدنے کی غرض سے پوچھا۔

"ہوش و حواس میں وہ ایسا کرتا تو خودکشی ہوتی... روزینہ نکل نہیں سکتی تھی اور بفرضِ محال نکل جاتی تو پیر صاحب دونوں کو زندہ کہاں چھوڑتے۔ وہ بھاگ کے کہیں بھی چلے جاتے جس دن ان کا سراغ ملتا، انہیں مار دیا جاتا۔ یہ غیرت کے نام پر قتل بھائی یا چچا بھی کرسکتا تھا اور پیر صاحب اپنے مرید کو اجازت دیتے کہ یہ کارِ ثواب وہ کرے۔"

"اس کے باوجود شاید اپنی مرضی سے زندگی ساتھ گزارنے کی خواہش رکھنے والوں میں کمی تو نہیں آئی۔ شاید آج یہ جرم کرنے والے زیادہ ہیں۔"

انور نے مجھ سے اتفاق کیا۔ "بالکل ہیں اور میں اس امکان کو مسترد نہیں کرتا کہ روزینہ اور مراد نے ایسا کوئی فیصلہ نہیں کیا ہوگا۔ عشق تو بے خطر آتشِ نمرود میں کود پڑتا ہے لیکن میں کسی ثبوت شہادت کے بغیر کسی پر بہتان لگانا نہیں چاہتا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ ایک خاندانی اور بہت شریف لڑکی ہے۔ اگر انہوں نے کوشش کی تھی کہ نکل جائیں تو وہ ناکام ہوئی اور اس کے نتیجے میں مراد مارا گیا۔ اس کے ساتھ کون تھے؟ یہ بھی صحیح طور پر کسی کو معلوم نہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ کرائے کے محافظ یا باڈی گارڈ تھے جو منظم ہو کے گئے تھے اور یہ بھی کہ وہ دوست تھے۔ ان میں سے ایک زخمی ہونے کے باوجود فرار ہوا اور کسی طرح اسپتال پہنچ گیا۔ وہاں ڈاکٹروں نے اس کی جان بچانے کی پوری کوشش کی مگر اس کا بہت خون بہہ گیا ہوگا۔ اس نے اپنے گھر والوں کے بارے میں بتایا اور وہ پہنچ گئے۔ مرنے سے پہلے اس نے پورا بیان دیا۔ مجسٹریٹ تو کوئی نہیں تھا وہاں لیکن ڈاکٹرز نے اس پر گواہ بن کے دستخط کیے اور ایک ڈی ایس پی تھا' میڈیکولیگل آفیسر آن ڈیوٹی... اس نے بھی سائن کر کے مہر لگا دی۔ وہ لڑکا مر گیا لیکن اس کا بیان مراد کے باپ کو مل گیا۔ اسی کی بنیاد پر وہ پیر صاحب کے خلاف ایف آئی آر لکھوانا چاہتا تھا مگر یہاں یہ ممکن نہ تھا۔ پیر صاحب کا بہت اثر رسوخ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ تھانے دار بھی ان کا معتقد اور مرید ہو۔ انہوں نے خبر اخبارات کو دے دی اور اب وہ ہائی کورٹ جائیں گے۔ ظاہر ہے مقدمہ درج ہوگا اور اس پر قتلِ عمد کی پوری کارروائی ہوگی۔"

"اس مرنے والے لڑکے نے روزینہ کا نام بھی لیا ہے؟"

"نام تو نہیں لیا لیکن پیر صاحب کی بیٹی کا حوالہ... ظاہر ہے ان کی صرف ایک بیٹی ہے تو روزینہ ہے۔ اس... کہ مراد باعزت اور شریفانہ طریقے سے شادی کرنا چاہتا تھا... اپنے والدین کے ذریعے کئی بار کوشش کر چکا تھا۔ مجبور ہو... اس نے یہ طے کیا تھا کہ روزینہ اور وہ اپنی مرضی سے شادی... لیں۔ روزینہ اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار تھی۔"

میں نے کہا۔ "اس کا نام آگیا قتلِ عمد کے... مقدمے میں' اب پیر صاحب کیا کریں گے؟"

"وہ جھٹلائیں گے۔ کہیں گے کہ یہ انہیں بدنام کر... کی سازش ہے۔ ممکن ہے تفتیش میں رکاوٹ ڈالیں۔... کے ساتھ مرنے والے اس کے دوست تھے تو ان کی... بھی ہوگی۔ کسی کی لاش نہ ملے پھر بھی دو قتل تو ہوئے... اور اس بیان دے کر مرنے والے کا... پیر صاحب کی... عزتی اور بدنامی بہت ہوگی۔"

"اس وقت پیر صاحب اس معاملے میں بھائی... لینے آئے ہوں گے؟" میں نے خیال ظاہر کیا۔

وہ کچھ دیر چپ رہا۔ "مجھے ایک اور سازش کا... ہے۔ شاید ثابت یہ کیا جائے گا کہ روزینہ اس روز باپ کے گھر میں ہی نہیں تھی۔"

"پھر کہاں تھی؟"

"یہاں... میرے ساتھ... گزشتہ تاریخ کا... نکاح نامہ بنا لیا جائے گا جس سے ثابت ہو کہ روزینہ کی شادی تو پہلے ہی مجھ سے ہو چکی تھی اور وہ رخصت ہو کے یہاں آگئی تھی۔ یہ ساری کہانی جھوٹی ہے اور انہیں بدنام کرنے کی ایک مکروہ سازش..."

کسی نے دروازے پر آہستہ سے ناک کیا۔ ایک خادمہ نے اندر آ کے چودھری صاحب کا پیغام دیا۔ "بڑے چودھری صاحب نے آپ کو بلایا ہے... اور آپ کو بھی..." اس نے میری طرف دیکھا۔

انور اٹھ کھڑا ہوا۔ "اگر انہوں نے مجھ سے نکاح نامے پر دستخط کرائے... تو گواہی تیری ہوگی۔"

"انور... کیا تو دستخط کردے گا؟" میں نے کہا۔

وہ بے بسی سے میری طرف دیکھتا رہا۔ خاموشی سے سب سننے والی ریشم کی آنکھیں امید اور مایوسی کے مخالف جذبوں کی عکاسی کر رہی تھیں۔

هر محاذ پر ایک نئے داؤ کی منتظر
جواری کی تدبیریں اگلے ماہ پڑھیے

دھندا

تنویر ریاض

زرمعاش انسانی رویوں میں تبدیلیوں کا ایک اہم محرک ہے... لوگوں کی بھلائی و استحکام کرنے والے کرداروں کا احاطہ کرتی ایک دل گداز تحریر... معصوم و شیرخوار بچوں کو پرسکون و گھریلو ماحول فراہم کرنا ان کی پہلی ترجیح تھی... مگر وقت گزرتے گزرتے ان کی نیکی میں بدی کا غبار شامل ہونا شروع ہو گیا...

سنسنی و تجسس کے ساتھ انسان کی دوستی اور دشمنی کا پل پل بدلتا رنگ...

نو ایم ایم کے سائلنسر لگے ریوالور کے فائر کی آواز ایسی تھی جیسے اس کے قریب برف کا ٹکڑا گرا ہو۔ یو ایس بارڈر ایجنٹ بیٹن کوٹ تیزی سے اپنے بائیں جانب گھومی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کا کندھا صنوبر کے درخت سے ٹکرایا ہو۔ وہ کچھوے کی طرح رینگتی برف میں سے جگہ بناتی ہوئی آگے بڑھی اور درخت کے تنے کے ساتھ مضبوطی سے کمر ٹکا دی۔ ایک پرندہ اڑتا ہوا آیا تو درخت کی شاخوں پر جمی ہوئی برف اس کے چاروں طرف زمین پر گرنے لگی۔ بہت ہی

دہشت ناک ماحول تھا۔ گہری خاموشی، ہلکی ہلکی برف باری اور اس کے بیچ فائر کی آواز۔ سردی کے باوجود اس کا کوٹ پسینے سے بھیگ گیا تھا اور وزنی بلٹ پروف جیکٹ کی وجہ سے اسے نقل و حرکت میں دشواری پیش آرہی تھی۔ اس نے معمول کی چیکنگ کے دوران ایک کار کو روک کر ڈرائیور سے لائسنس اور رجسٹریشن بک مانگی تھی۔ ڈرائیور نے دونوں چیزیں اسے تھما دیں لیکن جیسے ہی وہ اپنی گاڑی کے قریب پہنچی تو اس نے فائر کردیا۔ خوش قسمتی سے گولی اس کی کار کے ونڈ اسکرین کے قریب سے گزر گئی تھی۔

ایک بار پھر درخت کی شاخوں میں حرکت ہوئی۔ لکڑی کا ایک بڑا ٹکڑا فضا میں لہراتا ہوا نیچے کی طرف آیا اور برف میں دھنس گیا۔ اس نے اپنی نظریں اس جانب کیں جہاں سے فائر ہوا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ تعداد میں تین ہیں اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اسے ان لوگوں کو کم از کم ساٹھ فٹ کے فاصلے پر رکھنا ہے۔ وہ پیشہ ور نشانے باز نہیں لگ رہے تھے اور ان کے لیے اتنے زیادہ فاصلے سے پستول سے صحیح نشانہ لینا ممکن نہیں تھا۔

سورج کی روشنی بتدریج کم ہوتی جارہی تھی۔ سردیوں میں ساڑھے تین بجے ہی اندھیرا پھیلنا شروع ہوجاتا ہے۔ بیٹن نے درخت سے ٹیک لگائے گھوم کر دیکھا۔ ایک سایہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ گویا وہ حرکت میں آچکے تھے اور اسے گھیرنے کی کوشش کررہے تھے۔ اس نے یکے بعد دیگرے دو فائر کیے اور درخت کے پیچھے چھپ گئی۔ اس کا سانس زور زور سے چل رہا تھا۔

''مارٹی!'' کوئی زور سے چلایا۔ ''اوہ خدایا! کتنا خون بہہ رہا ہے۔ مارٹی، کچھ تو بولو۔'' پھر اس نے اپنے ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''ٹامی! دیکھو مارٹی کو کیا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ...''

جس شخص کو اس نے گولی ماری تھی، وہ شدید زخمی ہوا تھا اور غالباً مرچکا تھا۔ بدحواس شخص کی پیش قدمی رک گئی تھی لیکن تیسرا نظر نہیں آرہا تھا۔ اگر وہ آگے بڑھنے کی کوشش کرتا تو وہ اسے بھی گولی مار سکتی تھی کیونکہ صورتِ حال قابو سے باہر ہوتی جارہی تھی۔

''ہم اسے یہاں نہیں چھوڑ سکتے۔'' تیسرے آدمی نے چلاتے ہوئے کہا۔ ''اسے معلوم ہوگیا ہے لہٰذا ہمیں ہر قیمت پر اس سے نمٹنا ہوگا۔''

فضا میں ایک بار پھر سناٹا چھا گیا تھا اس لیے ہلکی سی آواز بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ اسے برف کی دبیز سطح پر بھاری قدموں کی دھمک سنائی دی۔ وہ دوبارہ اس کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ ''وہ سب جان گئی ہے۔''

دوسرا غضب ناک لہجے میں بولا۔ ''اس نے میرے بھائی کو مارا ہے۔ میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔''

وہ دائیں بائیں جھولتا اور بڑبڑاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ ممکن تھا کہ وہ نشے میں ہو۔ بیٹن نے اپنے بائیں گھٹنے پر بندھے ہوئے ریوالور کو ٹٹولا اور اس پر اپنی گرفت مضبوط کرلی۔ اچانک ہی وہ شخص پیچھے کی جانب لڑکھڑایا جیسے کسی گھوڑے نے اسے لات ماری ہو۔ اس کی یہ حرکت ناقابلِ فہم تھی۔ وہ نصف دائرے میں گھوما اور کمر کے بل برف پر لیٹ گیا۔ اس کی زوردار چیخ فضا میں ابھری۔

وہ ابھی تک تیسرے آدمی کو نہیں دیکھ پائی تھی اس لیے بے اختیار درخت کے عقب میں ہوتے ہوئے نیچے کی جانب جھک گئی۔ اب اسے اپنے ہی سانسوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے ریوالور تھام رکھا تھا اور اس کی نال کا رخ سیدھا کرلیا تھا۔ اب اسے کسی نہ کسی طرح یہاں سے نکل کر اپنے بیٹے ٹومی کے پاس پہنچنا تھا۔ وہ ایک نو سالہ بیٹے کی ماں تھی جس کا باپ اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا اور اب ٹومی ہی اس کے لیے سب کچھ تھا۔

ایک بار پھر گہری خاموشی چھا گئی۔ کیا وہ شخص اس کے بہت قریب آکر رک گیا تھا اور اس پر چھپ کر حملہ کرنے کی تیاری کررہا تھا؟ بیٹن نے ایک گہری سانس لی اور ٹومی کے خیال کو ذہن سے جھٹک کر پوری توجہ اس تیسرے آدمی پر مرکوز کرلی۔ اس نے ایک بار پھر جھانک کر دیکھا۔ اسے بیس فٹ کے فاصلے پر ایک سایہ نظر آیا پھر اس کے ریوالور سے ایک نارنجی شعلہ نکلا۔ وہ فوراً ہی جھکی اور اس کے دائیں جانب برف کے ذرات فضا میں رقص کرنے لگے۔

اس نے سانس روک کر قدموں کی آواز سننے کی کوشش کی۔ وہ اسے قریب آنے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ وہ سیدھا ہاتھ استعمال کرتی تھی اور اس نے سبھی فائر درخت کے دائیں جانب سے کیے تھے۔ اسی لیے اس آدمی نے بھی دائیں جانب کا ہی نشانہ لیا تھا۔ اب ضروری تھا کہ وہ اپنا بایاں ہاتھ استعمال کرتی لیکن اس طرح وہ صحیح نشانہ نہیں لے سکتی تھی اور الٹا اسے ہی نقصان پہنچ سکتا تھا۔ اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ باہر آئے بغیر درخت کی اوٹ سے فائر کرے۔ وہ شخص مزید قریب آگیا اور اب

ان کے درمیان بمشکل دس فٹ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ وہ بائیں جانب جھکی اور اس نے فائر کردیا۔ عین اسی وقت اس آدمی کے ریوالور نے بھی شعلہ اگلا۔ اس کے گرم چھرے اس کی چھاتی سے ٹکرائے لیکن بلٹ پروف جیکٹ کی وجہ سے اس کی جان بچ گئی۔

☆☆☆

اس کی آنکھ کھلی تو اس نے پٹرول ایجنٹ انچارج مائیک ہیوٹ کو اپنے پاس بیٹھے ہوئے پایا۔ وہ اس وقت اسپتال کے بستر پر لیٹی ہوئی تھی اور اس کی بلٹ پروف جیکٹ اس کے سرہانے رکھی ہوئی تھی۔ ہیوٹ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''خدا کا شکر ہے کہ تم نے جیکٹ پہن رکھی تھی۔'' اس نے جیکٹ میں ہوئے چھوٹے سے سوراخ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''جب میں نے جلن محسوس کی تو بھول ہی گئی کہ میرے جسم پر جیکٹ ہے۔ میں سمجھی کہ مجھے گولی لگی ہے۔ اس وقت میں ٹومی کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ میرے بعد اس کا کیا بنے گا۔''

''تمہیں نہیں معلوم کہ وہ کس کے بارے میں باتیں کررہے تھے؟''

''نہیں، میرا خیال ہے کہ ان کی کار میں کچھ نہیں تھا، اگر کچھ ہوتا تو وہ میرے پیچھے آنے کے بجائے فرار ہوجاتے۔''

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا خیال غلط ہے۔ ان کی گاڑی میں ایک شیرخوار بچی تھی۔''

☆☆☆

''کتنی پیاری بچی ہے۔'' مارگریٹ نے بیٹن کو کافی کی پیالی تھماتے ہوئے کہا۔

وہ سوموار کی سہ پہر تھی اور بیٹن اس بچی کو گود میں لیے کچن ٹیبل پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے سینے میں اب بھی ہلکا ہلکا درد ہورہا تھا، گوکہ زخم کافی حد تک بھر چکا تھا۔ پیدائش کے سرٹیفکیٹ کے مطابق اس بچی کا نام آئم رینڈ ولف اور عمر چار ماہ تھی لیکن ابھی اس سرٹیفکیٹ کی توثیق ہونا باقی تھی۔

''سرٹیفکیٹ کے مطابق یہ لڑکی نارتھ کیرولینا کے علاقے کارلوٹ میں پیدا ہوئی ہے۔'' مارگریٹ نے کہا۔ اس کی عمر چھیاسٹھ سال تھی اور وہ تین جوان لڑکیوں کی ماں تھی جن میں سے دو بیٹن کے ساتھ گیرٹ ہائی اسکول میں پڑھ چکی تھیں۔ مارگریٹ اور اس کا شوہر مورس ریکارڈ رضاعی والدین کے طور پر گزشتہ تیس برس سے بیس سے زیادہ بچوں کو پال رہے تھے۔

''میرا خیال ہے کہ میں نے پہلے کبھی اس گھر میں اتنی خاموشی نہیں دیکھی۔'' بیٹن نے کہا۔

''ہاں، دراصل ہمارے پاس گزشتہ پانچ سال سے کوئی لے پالک بچہ نہیں ہے۔''

''واقعی، یہ تو بڑی حیران کن بات ہے۔''

''ہاں، وہ ہماری زندگی کا بڑا حصہ تھے۔'' مارگریٹ نے اداسی سے کہا۔ ''یہ اچھا ہوا کہ تم واپس شہر چلی آئیں۔ ایلیا سو کیسی جگہ ہے؟''

''ایک ایجنٹ کے لیے تو ٹھیک ہے لیکن مجھ جیسی تنہا ماں کے لیے مناسب نہیں۔''

''میری خواہش ہے کہ تمام والدین اپنے بچوں کو پہلے ترجیح دیں۔''

''تم نے رضاعی والدین کی حیثیت سے کئی افسوسناک واقعات دیکھے ہوں گے۔''

''ہمیں ایک نہ ایک ایسے بچے سے ضرور واسطہ پڑتا ہے جو نیندیں اڑا دیتا ہے اور ہم مزید بچے لینے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔'' مارگریٹ نے کافی کا گھونٹ لیا اور اسے آہستہ سے میز پر رکھ دیا۔ پھر وہ آگے کی طرف جھکی اور بچی کا گال چھوتے ہوئے بولی۔ ''اس کا نام سامنتھا اسمتھ تھا۔ اس کی ماں نشے کی عادی تھی چنانچہ ہم نے اسے گود لے لیا۔ ہم نے پانچ سال تک اس کی پرورش کی اور اس سے بے حد مانوس ہوگئے لیکن جب اس کی ماں صحت یاب ہوئی تو وہ بچی کو اپنے ساتھ لے گئی لیکن اس کی حفاظت نہ کرسکی۔ تمہیں معلوم ہے کہ اس بچی کے ساتھ کیا ہوا؟ اس کی ماں کے بوائے فرینڈ نے اس کے ساتھ جنسی تشدد کیا اور وہ مرگئی۔''

''اوہ میرے خدا۔'' بیٹن کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

''وہ بھی اس معصوم بچی کی مدد نہ کرسکا۔'' مارگریٹ تلخی سے بولی۔

وہ دونوں خاموشی سے کافی پیتی رہیں پھر سامنے کا دروازہ کھلا اور مورس اندر داخل ہوا۔

بیٹن اسے دیکھتے ہی بولی۔ ''تم بالکل بھی نہیں بدلے۔ آج بھی ویسے ہی نظر آرہے ہو جیسے اس وقت تھے جب میں ہائی اسکول کی جونیئر کلاس میں پڑھا کرتی تھی۔''

''تمہاری بڑی مہربانی۔'' مورس بولا۔ ''یہاں کیسے آنا ہوا؟'' یہ کہہ کر وہ کافی میکر کی طرف بڑھا اور اپنے لیے

ایک کپ کافی بنا کر کاؤنٹر کے پاس کھڑا ہو گیا۔

"تم آج بھی سین کوزی کی طرح نظر آ رہے ہو۔ مجھے تمہاری کلاس اتنی پسند تھی کہ میں نے خود بھی تاریخ کی ٹیچر بننے کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔"

"شکریہ۔ تم نے بتایا نہیں کہ کیسے آنا ہوا؟"

"میں تمہیں یہ بچی دکھانا چاہ رہی تھی۔ کیا یہ ہسپانوی نسل سے ہے؟"

"تم دیکھ سکتی ہو کہ یہ محفوظ ہاتھوں میں ہے۔"

"مجھے اس بارے میں کوئی شبہ نہیں۔" بیٹن نے کہا۔

"کیا تم اس کی قومیت کے بارے میں بتا سکتے ہو؟"

"یہ بات میرے ذہن میں نہیں آئی۔ تم یہاں کس لیے آئی ہو؟" موریس نے اپنا سوال دہرایا۔

"یہ میرا کیس ہے اور میں اسے یہاں چھوڑنے آئی ہوں۔"

موریس لیونگ روم میں جا کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ بیٹن نے بچی مارگریٹ کے حوالے کی اور خود اس کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔

"مسٹر موریس!"

"تم اب میری شاگرد نہیں ہو۔ اس لیے مجھے موریس کہہ کر مخاطب کر سکتی ہو۔"

"موریس!" اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "مجھے اعتراف کر لینا چاہیے کہ میں یہاں اپنی کلاس ری یونین کمیٹی کی جانب سے آئی ہوں۔ ہمارا خیال ہے کہ تم مہمانِ خصوصی کے لیے مناسب شخص ہو۔ کیا تم اس موقع پر تقریر کرنا پسند کرو گے؟"

مارگریٹ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔ "موریس یتیم خانے کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کا ممبر تھا۔ اس نے ہمیشہ یتیم بچوں کی بھلائی کے لیے کام کیا۔ ان کے ساتھ اس کا خصوصی تعلق ہے۔"

"مجھے اس موقع پر تقریر کر کے خوشی ہوگی۔"

☆☆☆

بیٹن سیڑھیاں اتر رہی تھی کہ برف باری شروع ہو گئی۔ بے دھیانی میں اس کا پیر پھسلا لیکن اس نے خود کو سنبھال لیا۔ برف کے طوفان کی آمد آمد تھی اور بارہ سے سولہ انچ برف گرنے کی پیش گوئی کی گئی تھی۔ اسے اطمینان تھا کہ اس کے پاس سواری کے لیے گیارہ سال پرانی جیپ ہے جس میں بیٹھ کر وہ برفانی موسم میں سفر کر سکتی ہے۔ جیسے ہی وہ جیپ تک پہنچی، ایک ٹرک وہاں آ کر رکا اور اس کا ڈرائیور باہر آ گیا لیکن وہ کوئی مرد نہیں بلکہ ایک سنہری بالوں والی عورت تھی جس کی عمر بمشکل اکیس سال ہوگی۔ بیٹن نے جیپ اسٹارٹ کرتے ہوئے اسے دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ عورت سیڑھیاں چڑھ چکی تھی اور جیسے ہی اس نے پلٹ کر بیٹن کو دیکھنا چاہا، سامنے والا دروازہ کھلا اور موریس نے اسے کلائی سے پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔

☆☆☆

"بچی کے پیدائشی سرٹیفکیٹ کی تصدیق ہو گئی ہے۔" ہیوٹ نے اسے بتایا۔ بیٹن اس کے دفتر میں بیٹھی ہوئی تھی اور وہ اسی رات والے واقعے کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔

"اس روز بارڈر پر کسٹم آفس میں جن لوگوں کی ڈیوٹی تھی، وہ کیا کہتے ہیں؟"

"نہیں، میں چاہتا ہوں کہ تم اس معاملے کو دیکھو۔" ہیوٹ نے کہا۔

اگلے روز سہ پہر کو وہ بارڈر پر واقع کسٹم آفس پہنچ گئی لیکن کسٹم آفیسر ٹموتھی نے اس کا سرد مہری سے استقبال کیا اور بے رخی سے بولا۔ "میں تمہارا سوال سمجھ نہیں سکا۔"

"میں تمہارا طریقۂ کار جاننا چاہتی ہوں۔" بیٹن نے کہا۔

"ہم تمام گاڑیوں کو ایک ہی طریقۂ کار کے تحت چیک کرتے ہیں۔ جس کار کی تم بات کر رہی ہو، ہم نے اس کی بھی پوری طرح تلاشی لی تھی۔"

"یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تم بااصول شخص ہو۔"

"کیا یہ کوئی طنز ہے؟" آفیسر نے جھلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔" وہ چہرے پر دلکش مسکراہٹ لاتے ہوئے بولی۔ "کافی ملے گی؟"

"خود ہی بنا لو۔" اس نے کافی میکر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اس نے کافی بنائی اور جب واپس آئی تو دیکھا کہ کسٹم آفیسر اخبار پڑھ رہا ہے۔ شاید وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ سب کچھ اس کی نااہلی کی وجہ سے ہوا تھا۔ اس واقعے میں تین آدمی مارے گئے تھے اور کار سے ایک بچی برآمد ہوئی تھی اور اب اسے بارڈر پٹرول ایجنٹ کے سوالات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

"تم نے اس گاڑی کو چیک کیا تھا؟" بیٹن بولی۔

"میں پوری تفصیل جاننا چاہتی ہوں۔"

"میں پہلے ہی سب کچھ بتا چکا ہوں لیکن تم سمجھ رہی ہو کہ میں نے کچھ چھپایا ہے۔"

"تین مسلح افراد ایک شیرخوار بچی کے ساتھ بارڈر کراس کر رہے تھے۔" بیٹن بولی۔ "اس وجہ سے کسی پر بھی شک کیا جا سکتا ہے۔"

"دفع ہو جاؤ۔" وہ جھنجلاتے ہوئے بولا۔

"کیا تم نے ان سے پوچھ گچھ کی تھی؟"

"میں نے کار کی تلاشی کے دوران کسی بچی کو نہیں دیکھا۔"

"تم نے کار کی سیٹ کے نیچے دیکھا تھا؟"

"ہاں، وہاں کوئی بچی نہیں تھی۔"

"کیا تمہیں یقین ہے؟"

"ہاں، نگرانی کرنے والے کیمرے چھ زاویوں سے ویڈیو بناتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ کچھ بھی میری نظر سے اوجھل نہیں رہا تھا۔"

بیٹن نے اپنی کمر کرسی کی پشت سے لگائی تو وہ بولا۔ "تم ہی وہ ایجنٹ ہو جس نے انہیں مارا؟"

"ہاں، کیونکہ وہ مجھے مارنا چاہ رہے تھے۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ جانتا ہوں کہ تم نے اپنے دفاع میں گولی چلائی ہوگی۔ تمہیں دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ ایسا بھی کر سکتی ہو۔"

"بہرحال، تم کہہ رہے ہو کہ کار میں کوئی بچی نہیں تھی؟"

"ہاں۔"

"کیا تم نے کار کی ڈکی دیکھی تھی؟" بیٹن نے پوچھا۔

"تمہارا مطلب ہے کہ وہ بچی کار کی ڈکی میں تھی؟"

"ہاں، ایسا ایک واقعہ ٹیکساس میں پیش آ چکا ہے۔ میں نے کار کی ڈکی میں ایک ماہ کی مردہ بچی دیکھی تھی۔"

"میں اب بھی یہی سمجھتا ہوں کہ وہ بچی انہیں دریا پار کرنے کے بعد ملی ہوگی۔"

"ممکن ہے تمہارا خیال درست ہو۔" بیٹن نے کہا اور اپنی کرسی سے اٹھ گئی۔

☆☆☆

بیٹن کچن میں اپنے اور ٹومی کے لیے کھانا بنا رہی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ اس نے دروازہ کھولا تو سامنے پیٹر ڈائی کھڑا ہوا تھا۔

"میں نے تمہیں کالج کے بعد کبھی نہیں دیکھا۔" وہ اس سے مصافحہ کرتے ہوئے بولی۔

"ہاں، کافی وقت گزر گیا۔" اس نے کہا اور اندر چلا آیا۔ اس کے کندھوں پر برف جمی ہوئی تھی۔ وہ اسے جھاڑتے ہوئے بولا۔ "تمہاری بہن سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ اسی لیے یہاں آیا ہوں۔"

"ایلس سے ملنے کے لیے؟"

"نہیں، ایلس نے بتایا تھا کہ تم تنہا ہو۔ ہم اسکول کے زمانے میں بہت قریب رہ چکے ہیں۔ اس لیے میں نے سوچا کہ کیوں نہ ہم باہر چلیں۔ میں بھی آج کل کسی سے ڈیٹنگ نہیں کر رہا۔"

"اوہ۔" اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں... میرا مطلب ہے... تم سمجھ رہے ہو نا؟"

"مجھے افسوس ہے کہ تمہیں بلاوجہ پریشان کیا۔" وہ مایوس ہوتے ہوئے بولا۔

"مجھے تم سے مل کر خوشی ہوئی۔" وہ بولی۔ "اسکول کیسا چل رہا ہے؟"

"بہت تبدیلی آ گئی ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ یہ پیشہ چھوڑ دوں۔"

"کیوں؟"

"تم جانتی ہو گزشتہ دس سالوں میں حاملہ ہونے والی لڑکیوں کی تعداد میں تین سو پچاس فیصد اضافہ ہوا ہے۔"

"کیا؟" وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔ "یہ تو ایک وبا کی صورت اختیار کرتی جا رہی ہے۔"

☆☆☆

جب اس نے یہ بات ہیوٹ کو بتائی تو اسے بھی یقین نہیں آیا۔ اس وقت وہ بیٹن کے کچن میں بیٹھا بیئر کے گھونٹ لے رہا تھا۔ اس نے زیرِ لب دہراتے ہوئے کہا۔ "ساڑھے تین سو فیصد؟"

"ہاں، اس نے یہی کہا تھا۔"

"وہ یہاں کیوں آیا تھا؟" ہیوٹ نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

بیٹن اس وقت ٹماٹر کاٹ رہی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم واقعی جاننا چاہتے ہو؟"

"ہاں۔"

"وہ مجھے اپنے ساتھ باہر لے جانا چاہ رہا تھا۔"

"پھر تم نے کیا جواب دیا؟"

"میں نے اس سے کہہ دیا کہ کسی اور کے ساتھ ڈیٹنگ کر رہی ہوں۔"

"اوہ۔" ہیوٹ کے چہرے پر اطمینان کی جھلک نظر آنے لگی۔

☆☆☆

"تین سو فیصد بہت زیادہ ہے۔ مجھے تو یہ مبالغہ آرائی معلوم ہوتی ہے۔" ہائی اسکول کونسلر سوسن پیٹر نے کہا۔ "میرے خیال میں یہ اس اسکول اور خاص طور سے مجھ پر

ایک الزام ہے۔"
"نہیں۔" بیٹن نے کہا۔ "کچھ لوگ اس کا الزام علاقے کے والدین کو دیں گے۔"
"مگر تمہارا تعلق اس شعبے سے ہوتا تو پتا چلتا کہ والدین کی اکثریت اس تعلیمی نظام کے بارے میں کیا بکواس کرتی ہے۔"
بیٹن کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ اس عورت کی بھڑاس سن سکتی۔ وہ اس سے بحث بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے صرف اتنا ہی کہا۔ "ان حاملہ لڑکیوں کو دیکھنا بہت مشکل ہوتا ہوگا۔"
"بہت زیادہ... ان میں سے بیشتر اپنا مستقبل تباہ کرلیتی ہیں۔ کالج میں جانے یا کسی مضبوط مرد کی زندگی میں داخل ہونے کی امید دم توڑ دیتی ہے۔"
"کیا تم مجھے ان لڑکیوں کی فہرست دے سکتی ہو جنہوں نے گزشتہ بہار میں کسی بچے کو جنم دیا ہو؟"
"صرف ایک ہی ایسی لڑکی تھی۔" سوسن نے کہا۔ "ایک اور افسوس ناک بات یہ ہے کہ بہت سی لڑکیوں نے ابارشن کروالیا تھا۔"
"اس کے باوجود کہ یہاں زیادہ تر لوگ فرنچ کیتھولک ہیں۔"
"ہاں، میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ یہ افسوس ناک معاملہ ہے۔"
"اس لڑکی کا نام کیا تھا؟" بیٹن نے پوچھا۔
"ایرن ڈوون۔"
"کیا اس نے بچی کسی بے اولاد جوڑے کو دے دی تھی؟"
"مجھے نہیں معلوم۔ اس نے اسکول چھوڑ دیا تھا۔ پھر میں نے اسے دو تین مرتبہ دیکھا لیکن وہ بچی کے بغیر ہی نظر آئی۔"
بیٹن کے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے جب سوسن نے اسے بتایا کہ اس نے ایرن کو بچی کے بغیر دیکھا۔ وہ اسکول سے نکلی اور ایرن سے ملنے اس علاقے میں پہنچ گئی جہاں ایرن کا ٹریلر کھڑا ہوا تھا۔ سترہ سالہ لڑکی نے ٹریلر کا دروازہ کھولا اور اپنے سامنے وردی میں ملبوس ایجنٹ کو دیکھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
"میرا نام ایجنٹ بیٹن کوٹ ہے۔ میں تم سے کچھ سوالات کرنا چاہتی ہوں۔"
لڑکی بُری طرح کانپ رہی تھی۔ اس نے پرانی جینز اور ڈھیلی ڈھالی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور یہ لباس اس عمر کی لڑکی کے لیے بالکل غیر مناسب تھا۔ یہ ٹریلر کو کس ہل کے علاقے میں کھڑا تھا جو اسٹیشن سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا اور اس مقام سے بہت قریب تھا جہاں سے بچی ملی تھی۔
"کیا میں کسی مشکل میں ہوں؟" لڑکی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔
"میں اندر آسکتی ہوں؟" بیٹن نے پوچھا۔
"اندر کافی سامان بکھرا پڑا ہے۔ تمہیں پریشانی ہوگی۔"
"کیا تمہارے والدین گھر پر ہیں؟"
"وہ یہاں نہیں رہتے۔"
اس جواب سے معاملہ پیچیدہ ہوگیا۔ بیٹن نے سخت لہجے میں کہا۔ "میں اندر آنا چاہتی ہوں۔" اس کے پاس عام پولیس والوں کی نسبت زیادہ اختیارات تھے اور یہ بات اس سرحدی قصبے کے لوگوں کو اچھی طرح معلوم تھی۔ ایرن نے دروازہ کھول دیا۔ اندر فرش پر کپڑے اور دوسرا سامان بکھرا ہوا تھا جس کی وجہ سے ٹریلر کا اندرونی حصہ اور بھی چھوٹا لگ رہا تھا۔ بیٹن نے کچن سنک کے قریب بیئر کے ڈبے پڑے ہوئے دیکھے جبکہ سنک بھی کھانے کے چھوٹے برتنوں سے بھرا ہوا تھا۔ لڑکی کے چہرے پر خفت کے آثار نمودار ہونے لگے جب اس نے بیٹن کو ٹریلر کے اندرونی حصے کا بغور جائزہ لیتے ہوئے دیکھا۔
"کیا تم یہاں اکیلی رہتی ہو؟"
"نہیں، یہ جمی مورگن کی جگہ ہے۔ میں اس کے ساتھ ٹھہری ہوئی ہوں۔"
"باہر سرخ رنگ کی کار اسی کی ہے؟ کیا وہ اس وقت یہاں موجود ہے؟"
ایرن نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "یہ کار میری ہے۔"
"بہت خوب۔" بیٹن نے کہا۔ "تم مجھے گزشتہ سال کے بارے میں کچھ بتا سکتی ہو؟"
ایرن نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔ "میں کچھ عرصے کے لیے اسکول گئی تھی۔"
"اور تم نے حاملہ ہونے کے بعد اسکول جانا چھوڑ دیا۔"
"تم اس بارے میں کیسے جانتی ہو؟" ایرن نے حیرت سے پوچھا۔
"یہ چھوٹا سا قصبہ ہے۔ ایسی باتیں بہت جلد پھیل جاتی ہیں۔ تمہارا ایک بچہ بھی ہے؟"
"ہاں۔" لڑکی سمجھ گئی تھی کہ بیٹن سے کچھ چھپانا بے سود ہوگا۔
"لڑکا یا لڑکی؟"

"مجھے کام پر جانا ہے۔" ایرن نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں چپس بنانے والی فیکٹری کی نائٹ شفٹ میں کام کرتی ہوں۔"
"شفٹ شروع ہونے میں ابھی دو گھنٹے باقی ہیں۔ میں تمہارے بچے کی جنس کے بارے میں جاننا چاہ رہی ہوں۔"
"لڑکی۔" ایرن نے مختصر سا جواب دیا۔
بیٹن نے آہستہ سے سر ہلایا اور بولی۔ "وہ لڑکی اب کہاں ہے؟"
ایرن نے کوئی جواب نہیں دیا تو بیٹن بولی۔ "ایرن! یہ بہت اہم سوال ہے۔ تم مجھے بتاؤ گی کہ وہ بچی اب کہاں ہے؟"
"نہیں، میں نہیں بتا سکتی۔" اس نے روتے ہوئے کہا۔ "مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے۔"
"مجھے پوری بات بتاؤ۔"

☆☆☆

"اور پھر اس نے دوبارہ اپنی بیٹی کو نہیں دیکھا۔" ہیوٹ بولا۔
بیٹن اس وقت اس سے ایک گیس اسٹیشن کے پارکنگ لاٹ پر کھڑی سیل فون کے ذریعے بات کررہی تھی۔
"ہاں، اس کا یہی کہنا ہے اور مجھے اس کی بات کا یقین ہے۔ وہ لڑکی میرے کندھے پر سر رکھ کر بیس منٹ تک روتی رہی۔ اسے ہماری راہنمائی کی ضرورت ہے۔"
"تم بھول رہی ہو کہ ہم پولیس والے ہیں اور کسی اسکول کے راہنمائی کے مرکز میں نہیں بیٹھے ہوئے۔"
"اس شخص نے ایرن سے جھوٹ بولا اور اسے قائل کرلیا کہ وہ بچی کی ضروریات پوری نہیں کرسکتی اس لیے اسے کسی امیر بے اولاد جوڑے کو دے دیا جائے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ بچی اس سے زیادہ دور نہیں ہوگی اور وہ جب چاہے اسے دیکھ سکتی ہے۔ لیکن یہ ایک دھوکا تھا۔ وہ اپنی بچی کو دوبارہ کبھی نہیں دیکھ سکی۔"
"اور شاید اس آدمی کو بھی دوبارہ نہیں دیکھا ہوگا؟"
"ہاں۔"
"ایرن نے اس کا حلیہ بتایا؟" ہیوٹ نے پوچھا۔
"ہاں... اور میرا خیال ہے کہ میں نے اسی کو گولی ماری تھی۔ اس کا نام مارٹن ہے جسے اس کا ساتھی مارٹی کہہ کر بلا رہا تھا۔"

☆☆☆

بیٹن اپنے دفتر میں بیٹھی ای میلز چیک کررہی تھی لیکن اس کا ذہن ابھی تک بچی میں الجھا ہوا تھا۔ دفتر کا سینئر اہلکار جیک مین کمرے میں داخل ہوا اور اس کے قریب پہنچ کر بولا۔
"میں تمہارے لیے ایک اہم خبر لے کر آیا ہوں۔"
بیٹن اسے دیکھ کر احتراماً کھڑی ہوگئی۔ جیک مین کی عمر ساٹھ سال تھی اور وہ عنقریب ریٹائر ہونے والا تھا۔ دفتر کے سبھی لوگ اس کی بے حد عزت کرتے تھے کیونکہ وہ اپنی عمر اور تجربے کی بدولت مشکل معاملات میں ان کی راہنمائی کیا کرتا تھا۔ بیٹن نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولی۔
"یقیناً کوئی اچھی خبر ہوگی؟"
"ہاں، تم نے جس کار کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے کہا تھا، وہ نئے ماڈل کی ہے اور حال ہی میں خریدی گئی ہے۔"
"تعجب ہے۔ ایرن نئی کار کس طرح خرید سکتی ہے۔ اس نے تو بتایا تھا کہ وہ چپس بنانے والی فیکٹری میں کام کرتی ہے۔ وہاں اسے کتنی تنخواہ ملتی ہوگی؟"
"میری معلومات کے مطابق وہ بارہ ڈالرز فی گھنٹا دیتے ہیں۔"
"اور اس نئی کیمارو کار کی کیا قیمت ہے؟"
"تیس ہزار ڈالرز۔" جیک مین نے اپنی نوٹ بک کھولتے ہوئے کہا۔ "میں نے اس کے بینک اکاؤنٹ کی بھی تفصیلات معلوم کرلی ہیں۔ اس وقت اس کے اکاؤنٹ میں تین سو چالیس ڈالرز ہیں اور گزشتہ بارہ ماہ میں کبھی بھی اس کے اکاؤنٹ میں آٹھ سو ڈالرز سے زیادہ رقم نہیں رہی۔"
"اس کا مطلب ہے کہ یہ کار اس نے نہیں خریدی۔ یہ معلوم کرو کہ یہ کار کہاں سے خریدی گئی اور اس کا اصل خریدار کون ہے؟"
"وہ میں پہلے ہی معلوم کرچکا ہوں۔" جیک مین بولا۔ "یہ کار سونی کیرن نامی شخص نے ہولٹن میں واقع شیورلیٹ کے شوروم سے خریدی تھی۔ وہ نیو برنس وک کے علاقے میں رہتا ہے۔"
"رہتا تھا۔" بیٹن نے تصحیح کی۔ "میں اسے جانتی ہوں۔ یہ بھی ان تین لوگوں میں شامل تھا جنہیں میں نے گولی ماری تھی۔"
جیک مین نے سر ہلا دیا۔ بیٹن چند لمحے سوچتی رہی پھر بولی۔ "سونی کے پاس اتنے پیسے کہاں سے آئے؟ وہ یقیناً کسی کے لیے کام کررہا تھا۔ اب ہمیں اس لائن پر کام

کرنا ہوگا۔“
”میں نے کارروائی شروع کر دی ہے۔ جلد ہی تمہیں رپورٹ دے دوں گا۔“
بیتھن کے پاس کوئی خاص کام نہیں تھا اس لیے وہ دفتر سے جلدی اٹھ گئی۔ اب اس کا رخ جم کی طرف تھا۔ کئی دن سے اس نے ورزش نہیں کی تھی لیکن اس وقت وہ تنہائی میں کچھ سوچنا چاہ رہی تھی۔ وہ جاننا چاہ رہی تھی کہ مارٹی نے سترہ سالہ ایرن کو بچی سے دستبردار ہونے پر کیوں مجبور کیا اور اسے یقین دلایا کہ یہ بچی کے بہتر مستقبل کے لیے مفید ہو گا۔ نیز یہ کہ وہ جب چاہے، بچی سے مل سکے گی۔ کیا سونی نے اس کے عوض ایرن کو نئی کار تحفے میں دی تھی؟ کیونکہ بظاہر پیسوں کا لین دین کہیں نظر نہیں آیا۔ شاید وہ کوئی ثبوت نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔
ایک گھنٹے کی ورزش کے بعد بیتھن نے اپنا پسینا خشک کیا اور شاور لینے چلی گئی۔ اب وہ بالکل تازہ دم ہو چکی تھی اور اس کے پاس ایرن سے پوچھنے کے لیے کئی سوالات جمع ہو چکے تھے جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ اس نے ایک کار کے عوض اپنی بچی کا سودا کیوں کیا؟

☆☆☆

دوسرے روز بیتھن معمول کے مطابق صبح سویرے اٹھ گئی۔ پہلے اس نے کافی بنائی پھر ٹومی کا لنچ پیک کرنے لگی۔ اسی وقت اس کا سیل فون بج اٹھا۔ دوسری طرف جیک مین بول رہا تھا۔ ”بیتھن! صبح سویرے تمہیں ڈسٹرب کرنے پر معذرت چاہتا ہوں۔“
”معذرت کرنے کی ضرورت نہیں۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ میں ایک نو سال کے بیٹے کی ماں ہوں اور اسے علی الصباح اٹھنا ہوتا ہے۔“
”تمہارے لیے ایک بُری خبر ہے۔“
بیتھن کے لیے یہ الفاظ نئے نہیں تھے۔ قانون نافذ کرنے والوں کو اپنی ملازمت کے دوران بارہا اس طرح کے جملے سننے کو ملتے ہیں، تاہم وہ سوچنے لگی کہ بُری خبر کیا ہو سکتی ہے۔ کہیں کوئی قتل ہوا یا ہیوٹ کے ساتھ اس کے تعلقات کا راز طشت از بام ہو گیا۔ اگر ایسا ہے تو اس کا کیا بنے گا؟
”ہماری تحقیقات میں ایک نیا موڑ آیا ہے۔“ جیک مین نے کہا۔
یہ سن کر بیتھن نے سکون کا سانس لیا۔ کم از کم اس خبر کا اس کی ذات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔
”ایرن کو گزشتہ شب گلا گھونٹ کر مار دیا گیا۔“ جیک مین نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
”اوہ۔“ بیتھن کے سینے میں ایک پھانس چبھ گئی۔ اس نے مغموم لہجے میں پوچھا۔ ”کیا اس کے ساتھ زیادتی کی گئی تھی؟“
”نہیں قتل کا محرک یہ نہیں تھا۔ ایسی کوئی علامت نظر نہیں آئی جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ کسی نے زبردستی ٹریلر میں داخل ہونے کی کوشش کی ہو اور نہ ہی ڈکیتی کے آثار ملے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ قاتل کو جانتی تھی۔“

☆☆☆

بیتھن اپنی ڈیوٹی پر پہنچی تو ہیوٹ نے اسے اپنے کمرے میں طلب کیا اور بولا۔ ”اس کیس میں ہماری پوزیشن کیا ہے؟“
”اس قتل کی تحقیقات پولیس کر رہی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اس قتل کا تعلق اس بچی سے بھی ہو سکتا ہے اور انہیں معلوم ہے کہ میں نے ایرن سے پوچھ گچھ کی تھی۔ اس لیے وقتی طور پر میں بھی اس معاملے میں پھنس گئی ہوں۔“
”اب تم کیا کرو گی؟“
”مجھے اس کیس پر نئے سرے سے کام کرنا ہوگا۔“
وہ دونوں گفتگو کر رہے تھے کہ جیک مین نے دروازے میں سے جھانکا اور بولا۔ ”مائیک! میرے پاس تمہارے لیے ایک اطلاع ہے۔ میں نے معلوم کر لیا ہے کہ مارٹی کو کار خریدنے کے لیے کس نے رقم دی تھی۔“
جیک مین نے جو کچھ بتایا، اس کے بعد بیتھن کے لیے وہاں رکنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھی اور تیر کی طرح کمرے سے باہر نکل گئی۔
ساڑھے دس بجے وہ اسکول کے استقبالیہ پر موجود تھی۔ اس نے موریس کے بارے میں پوچھا تو استقبالیہ کلرک نے بتایا کہ یہ اس کا فری پیریڈ ہے۔ بیتھن نے دروازے پر دستک دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ بے دھڑک کلاس روم میں داخل ہوئی اور موریس کی میز کے قریب رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ موریس کے ہاتھ میں ایک سرخ پین تھا اور وہ کاپیاں چیک کر رہا تھا۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا اور بولا۔ ”میں تمہیں یہاں دیکھ کر حیران ہو رہا ہوں... کیسے آنا ہوا؟“
”کوئی خاص بات نہیں۔“ وہ بولی۔ ”میں انتظار کر سکتی تھی لیکن مجھ سے دفتر میں نہیں بیٹھا گیا اس لیے چلی آئی۔“
موریس اس کا اگلا جملہ سننے کا منتظر تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے اِدھر اُدھر

دیکھا اور بولی۔ ”لگتا ہی نہیں کہ مجھے اسکول چھوڑے دس سال ہو گئے ہیں۔“
”بیتھن! مجھے یہ کاپیاں چیک کرنی ہیں۔“ موریس نے اسے ٹالنے کی غرض سے کہا۔
”جانتی ہوں کہ تم بہت مصروف ہو اور پڑھانے کے ساتھ ساتھ لندن میں واقع سینٹ جوزف کے یتیم خانے کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں بھی شامل ہو۔“
”میرے دل میں اس یتیم خانے کے لیے خاص مقام ہے۔“
”میں اس کی وجہ جانتی ہوں۔“
”اس سے تمہاری کیا مراد ہے؟“ اس نے اپنا قلم میز پر رکھ دیا اور کرسی کی پشت سے کمر لگا لی۔
”تمہاری پرورش اسی یتیم خانے میں ہوئی تھی۔“
”یہ تم کیسے جانتی ہو؟“
”کیا یہ بتانا ضروری ہے؟“ بیتھن نے پوچھا۔
”نہیں، میرا خیال ہے کہ اس کی ضرورت نہیں۔“
”میں تو اس سے بھی زیادہ بہت کچھ جانتی ہوں۔ مثلاً مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ سونی کو کار خریدنے کے لیے رقم کس نے دی تھی۔ تم یہ بھی نہیں جاننا چاہو گے کہ میں نے بینک آف نیو برنس وک کی وہ ویڈیو فوٹیج دیکھ لی ہے جس میں تم اور سونی چالیس ہزار کینیڈین ڈالرز کو امریکی کرنسی میں تبدیل کر رہے تھے تاکہ سونی کو کار خریدنے اور بچی کو ائرپورٹ تک پہنچانے کے لیے رقم دے سکو۔“
وہ خاموشی سے اس کی شکل دیکھتا رہا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر بند کر لیا۔
”میں یہ بھی جانتی ہوں کہ بچی کو کہاں لے جایا جا رہا تھا۔ میں تو اس چھوٹی سی بچی سمانتا اسمتھ کے بارے میں بھی جان گئی ہوں...“
”تم سمانتا کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔“ وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ”میں بیس برس تک لاوارث بچوں کو پالتا رہا لیکن عدالت کے حکم پر مجھے بچوں کو واپس ان کے حوالے کرنا پڑا۔ سمانتا بھی انہی بچوں میں شامل تھی جسے کسی ظالم نے زیادتی کا نشانہ بنایا اور وہ مر گئی۔“
”میں جانتی ہوں۔“ بیتھن نے کہا۔ ”اسی لیے تم نے اس معصوم بچی آئم کو بچانے کی کوشش کی۔“
اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
”ہم نے اس کا ڈی این اے کروایا ہے موریس۔“
موریس نے گہری سانس خارج کی اور بولا۔ ”ایسا نہیں ہے جو تم سمجھ رہی ہو۔“
”کیا تم نے یہ کہہ کر ایرن سے بچی نہیں لی تھی کہ وہ دوبارہ بھی اس سے مل سکے گی؟“
”تم نہیں سمجھ سکتیں۔ وہ جانتی تھی کہ اس چھوٹی سی عمر میں وہ بچی کی پرورش نہیں کر سکتی۔ میں ایسے بچوں کی مدد کرتا ہوں اور ان کے غریب والدین سے لے کر ایسے لوگوں کے حوالے کر دیتا ہوں جنہیں ان کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ ان کی پرورش بہتر انداز میں کر سکتے ہیں۔“
”لگتا ہے کہ تم خدا بن گئے ہو۔“ بیتھن نے طنزیہ انداز میں کہا۔
”میں بچوں کو محفوظ، خوش حال اور صحت مند لوگوں

انتقام

ٹریفک پولیس والا اسپتال میں اپنڈکس کے آپریشن کے لیے داخل ہوا۔
آپریشن کے بعد ڈاکٹر نے پولیس آفیسر کو آپریشن کی کامیابی کے بارے میں بتایا اور جلد صحت یابی کے لیے دعا کی۔ پولیس والے کے سینے پر ایک چوڑی پٹی لگی ہوئی تھی جو اس کے سینے کے بالوں کو ہر حرکت کے ساتھ نوچ رہی تھی۔ وہ پریشان تھا کہ کہیں غلطی سے اس کا دوسرا آپریشن تو نہیں کر دیا گیا جس کی وجہ سے تکلیف ہے۔ صبح تک کچھ اس کے جسم میں جان آئی تو اسپتال کے لباس کو ہٹا کر دیکھا کہ کیا چیز اس کو تکلیف دے رہی ہے۔
دیکھنے پر پتا چلا کہ اس کے بالوں والے سینے پر بہت مضبوطی سے تین انچ چوڑی پٹی پر گوند لگا کر چپکا دیا گیا تھا جو سوکھنے کے بعد بہت مضبوط ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سے رقعہ لگا ہوا تھا۔
”میری دعا ہے کہ جلد صحت یاب ہو جاؤ اور تمہاری پٹی اتار دی جائے... نیک خواہشوں کے ساتھ وہی نرس جس کا تم نے پچھلے ہفتے چالان کیا تھا۔“

کراچی سے ج۔ کاظمی کا تعاون

کے حوالے کرتا ہوں۔"
"اب تک کتنے بچوں کو ایسے گھروں میں بھیج چکے ہو؟"
وہ کندھے اچکا کر رہ گیا۔
"آئم کو کہاں بھیج رہے تھے؟"
"یہ اس کا اصلی نام نہیں ہے۔"
"میں جانتی ہوں۔ ہمیں ایرن کے ٹریلر سے اس کا اصلی برتھ سرٹیفکیٹ مل گیا ہے۔"
"اس مرتبہ ہم نے مختلف طریقہ اختیار کیا تھا۔"
"وہ کیا؟"
"اس سے پہلے ہم انگریز بچوں کو بذریعہ جہاز نیو برنس وک لے کر آتے تھے اور انہیں بارڈر کے ذریعے امریکا منتقل کر دیتے تھے جہاں میں ان بچوں کے لیے مناسب خاندانوں کا انتخاب کیا کرتا تھا۔ ہم نے ایرن کی بیٹی کو کچھ عرصے کے لیے کینیڈا میں چھپا دیا تھا۔"
"تم انگریز بچوں کو امریکا اسمگل کر رہے تھے؟"
"تم جانتی ہو کہ آج کل بچوں کو گود لینا کتنا مشکل ہو گیا ہے۔ کتنے لوگ ہیں جو تمہاری طرح اپنے بچوں کو اچھا ماحول دے سکتے ہیں۔ زیادہ تر خاندان بچوں کو گود لینے سے انکار کر دیتے ہیں۔ میں رضاعی باپ رہ چکا ہوں اور اس نظام کی پیچیدگیوں کو سمجھتا ہوں۔"
"شاید تم بھول رہے ہو کہ تم خود بھی یتیم تھے۔"
"وہ بات پرانی ہو گئی کہ ایرن اس بچی کی دیکھ بھال نہیں کر سکتی تھی۔"
"اسے مرنا نہیں چاہیے تھا۔" ہیٹن افسردہ لہجے میں بولی۔
"تم نے تین آدمیوں کو قتل کیا تھا؟" مورس نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔
ہیٹن اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ "وہ صرف سترہ سال کی تھی۔"
"وہ تم سے ملنا چاہ رہی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ تمہارے دفتر جا رہی ہے۔ مجھے مجبوراً اسے روکنا پڑا، آئم کی خاطر۔ اگر تم اسے بچی واپس کر دیتیں تب بھی وہ اس قابل نہیں تھی کہ اچھے طریقے سے اس کی پرورش کر سکے۔ میں نے اس بچی کے لیے سینٹ لوئس میں ایک بہت اچھا بے اولاد جوڑا تلاش کر لیا تھا۔"
"اگر میں یہ کہوں کہ تم نے بچوں کی پرورش کو اپنا دھندا بنا لیا ہے؟"
"اب میں اپنے وکیل کی غیر موجودگی میں ایک لفظ بھی نہیں کہوں گا۔" مورس بولا۔

"تمہیں واقعی ایک وکیل کی ضرورت ہے۔" ہیٹن نے کہا۔

☆☆☆

کھانے کی میز پر ٹومی بھی ان کے ساتھ تھا۔ ڈنر ختم ہوتے ہی وہ ٹی وی دیکھنے لیونگ روم میں چلا گیا۔ ہیٹن نے سامنے بیٹھے ہوئے مائک ہیوٹ کو دیکھا اور بولی۔ "کیا اس نے ایرن کے قتل کا اعتراف کر لیا؟"
"ہاں۔" ہیوٹ بولا۔ "تم نے اس کیس پر بہت محنت کی اور اسی وجہ سے وہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوا۔"
"اس نے آئم سے پہلے سترہ انگریز بچے امریکا اسمگل کیے اور انہیں کھاتے پیتے گھرانوں کے سپرد کر دیا لیکن اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ بچے اب کہاں ہیں اور شاید کبھی نہیں بتا سکے گا۔"
"اس طرح تو یہ بچے واپس یتیم خانے نہیں جا سکیں گے۔" ہیوٹ نے کہا۔
"ہاں اور وہ خود بھی یہی چاہتا ہے۔ اس نے خود یتیم خانے میں پرورش پائی اور زندگی کی آسائشوں سے محروم رہا۔ اسی لیے وہ بچوں کو یتیم خانے سے نکال کر صاحب ثروت لوگوں کے سپرد کر دیا کرتا تھا تاکہ وہ بچے اچھے ماحول میں پروان چڑھ سکیں۔ اس نے نیک نیتی سے یہ کام شروع کیا تھا لیکن بعد میں اسے کاروبار بنا لیا اور بھاری رقم کے عوض امیر اور بے اولاد جوڑوں کو یہ بچے فروخت کرنے لگا۔ میں نے اس کے کمرے میں ایک خفیہ مائکروفون لگا دیا تھا اور اس کی ساری گفتگو ریکارڈ کر لی۔"
"اس نے سترہ بچوں کو پُرآسائش زندگی دے دی لیکن ایک نوجوان لڑکی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔"
"میں آج تک نہیں سمجھ سکی کہ مرد اتنے وحشی کیوں ہو جاتے ہیں؟" ہیٹن نے غصے سے کہا۔
"میں تو صرف اتنا جانتا ہوں۔" ہیوٹ مسکراتے ہوئے بولا۔ "اس وقت تمہاری قربت اور ان مزیدار کھانوں سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔"
"اگر تمہارا تبادلہ ہو گیا تو تم میرے بنائے ہوئے کھانوں سے محروم ہو جاؤ گے۔"
"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" وہ بولا۔ "اسی لیے میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔"
ہیٹن کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ وہ کافی عرصے سے یہ جملہ سننے کی منتظر تھی۔

تفتیش

جمال دستی

سراغرسانی پیچیدہ معمّوں کا کھیل ہے... دوران تفتیش ذہن کے ساتھ ساتھ اعصاب بھی چٹخنا شروع ہو جاتے ہیں... ایک تفتیش کار کا ماجرا جو اپنے کام میں ماہر سمجھا جاتا تھا... مگر جس سے اس کا واسطہ پڑا تھا... وہ اس سے زیادہ مشّاق تھا...

تاریخی داستانوں سے متاثر ایک بدمعاش کی جوابی خوشہ چینی...

میساچوسٹس میں واقع کوپر پولیس ڈیپارٹمنٹ میں سراغ رساں مارٹن اسپنسر کرسی پر بیٹھا ٹی وی اسکرین پر برابر والے کمرائے تفتیش کا اندرونی منظر دیکھ رہا تھا جہاں ایک تنومند شخص پرانی جینز اور ہوڈی ٹی شرٹ پہنے پُرسکون انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔ تین گھنٹے پہلے وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ کون وے جھیل پر واقع ایک کرائے کے کاٹیج میں چھٹیاں منا رہا تھا لیکن کمرائے تفتیش میں بیٹھے ہوئے اس شخص کی وجہ سے اس کی چھٹیاں غارت ہو گئیں اور اسے پہلے روز ہی کام پر واپس آنا پڑ گیا۔
مارٹن کے برابر میں اس کی باس سراغ رساں

سارجنٹ پامیلا تھامسن بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ مارٹن سے چند سال بڑی تھی۔ اس کی جلد سانولی اور بال بھورے تھے جو ہمیشہ ایک پونی ٹیل کی شکل میں بندھے رہتے تھے۔ اس نے سیاہ فریم والا نازک سا چشمہ لگا رکھا تھا۔ وہ بے حد نفاست پسند تھی اور ہمیشہ اپنے لیے اچھے کپڑوں اور جوتوں کا انتخاب کرتی تھی۔ مارٹن کے اس طرح چلے آنے پر اس کی بیوی ناراض ہوگئی تھی جبکہ لڑکیاں بھی پریشان تھیں کہ ان کا باپ انہیں اس کالج میں چھوڑ کر کیوں چلا گیا لیکن دل ہی دل میں وہ اپنے بلائے جانے پر خوش تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ڈپارٹمنٹ کا بہترین سراغ رساں ہے اور یقیناً یہ کوئی اہم معاملہ ہے جس کی تفتیش کے لیے اسے بلایا گیا تھا۔ اپنی اہمیت کا احساس ہوتے ہی اس کی گردن میں تھوڑا سا تناؤ آگیا۔

پامیلا کے ہاتھ میں ایک فولڈر تھا۔ اس نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری یاددہانی کے لیے بتا رہی ہوں کہ کمرے میں موجود یہ شخص ڈیلن مولانی، کلائیو کے گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔ ہم گزشتہ کئی سالوں سے اس گروہ تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن کوئی کامیابی نہیں ہوئی اور ہم ابھی تک اس گروہ کے بارے میں معلومات حاصل کر سکے اور نہ ہی اس کا کوئی فرد ہمارے ہاتھ آیا۔ کلائیو لائیڈ اور اس کا گروہ بڑی ہوشیاری سے اپنا کام کرتے ہیں اور ایسا کوئی سراغ نہیں چھوڑتے جس کے ذریعے ان تک پہنچا جا سکے۔ ان کے جرائم کی فہرست کافی طویل ہے۔ اس میں سود پر قرض دینا، کار ڈکیتی اور قتل و غارت گری شامل ہیں۔ یہ باہر سے آنے والوں کو مار ڈالتے ہیں جو پُرسکون زندگی گزارنے کے لیے اس علاقے میں آنا چاہتے ہیں۔ اس علاقے میں رہنے والوں کی اکثریت کلائیو اور اس کے ساتھیوں کی سرگرمیوں پر زبان بند رکھتی ہے اور اب وہاں گینگ وار شروع ہو چکی ہے۔ کلائیو کے مقابلے پر برازیلین آگئے ہیں جو زمین اور پیسے کے لیے اس سے لڑ رہے ہیں۔

مارٹن اس شخص کو مسلسل دیکھے جا رہا تھا جو بڑے پُرسکون انداز میں دونوں ہاتھ سینے پر باندھے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے کے بجائے دروازے پر نظریں جمائے ہوئے تھا اور اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے کوئی آثار نہیں تھے۔

”ہم اس شخص کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟“ مارٹن نے پوچھا۔

پامیلا بولی۔ ”اس کی عمر تیس سال ہے۔ پیشے کے اعتبار سے چھت بنانے والا ہے لیکن گزشتہ پانچ سال سے کلائیو کے ساتھ کام کر رہا ہے اور اس دوران میں اس نے ایک مرتبہ بھی ہتھوڑے کو ہاتھ نہیں لگایا البتہ بظاہر اس کا ریکارڈ صاف ہے اور یہ آج تک کسی الزام میں نہیں پکڑا گیا۔ اس کے بارے میں بہت کچھ سنا گیا ہے مثلاً یہ کہ یہ ہیمپشائر اور مین میں ہونے والی کچھ بینک ڈکیتیوں میں شامل رہا ہے۔ اس پر نقب زنی اور نشے کی حالت میں گاڑی چلانے کا الزام بھی ہے لیکن یہ کبھی رنگے ہاتھوں نہیں پکڑا گیا لیکن اب اس پر ایک سنگین الزام لگ گیا ہے جس کی مدد سے تم اپنی تفتیش کا آغاز کر سکتے ہو۔“

”یہ کیسے ہوا؟“

پامیلا نے فائل میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”تقریباً چھ گھنٹے پہلے وہ سگنل توڑتے ہوئے پکڑا گیا۔ عام حالات میں یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اس کا چالان کر کے چھوڑ دیا جاتا لیکن پولیس آفیسر کو کچھ شک ہوا۔ جب اس کی کار کی تلاشی لی گئی تو ڈرائیور کی سیٹ کے نیچے سے ایک پستول برآمد ہوا۔“

مارٹن مسکراتے ہوئے بولا۔ ”یقیناً اس کے پاس پستول کا لائسنس نہیں ہوگا۔“

”نہیں۔“ پامیلا بولی۔ ”لہٰذا اس پر آتشیں اسلحہ رکھنے کا جرم عائد ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں اسے جیل کی ہوا کھانا ہوگی۔ تمہارے لیے یہ ایک اچھا موقع ہے۔ اسے ضائع مت کرو۔ اس کے ذریعے ہم کلائیو لائیڈ کے گروہ تک پہنچ سکتے ہیں۔ وقت بہت کم ہے۔ وہ کسی بھی لمحے وکیل کو بلا سکتا ہے یا مطالبہ کر سکتا ہے کہ اسے باقاعدہ گرفتار کیا جائے تاکہ قانونی کارروائی شروع ہو سکے اور اس کے حقوق متاثر نہ ہوں۔“

مارٹن بدستور ٹی وی اسکرین پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ پامیلا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولی۔

”تمہیں ایک اور دلچسپ بات بتاتی ہوں۔ تھوڑی دیر پہلے چیف کو ایف بی آئی کے بوسٹن آفس سے ایک فون کال موصول ہوئی تھی کہ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے بسکٹ بنانے کی ترکیب پر تبادلۂ خیال کیا ہو۔ یہ بہت برا ہوگا اگر یہ شخص ہمارے ہاتھ سے نکل گیا اور ایف بی آئی والے اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ کلائیو اور اس کا گروہ کئی سالوں سے اس شہر کے لیے کینسر بنے ہوئے ہیں کہ ایف بی آئی نہیں بلکہ ہم اس تک رسائی حاصل کریں۔“

مارٹن نے پامیلا کو دیکھا اور بولا۔ ”میں تمہارا مطلب سمجھ گیا۔“

پامیلا نے اسے فائل دیتے ہوئے کہا۔ ”اندر جاؤ اور اسے توڑ کر رکھ دو تاکہ وہ کلائیو کے خلاف سب کچھ بتا دے۔“

اسے ڈیلن کی فائل پڑھنے میں بیس منٹ لگ گئے پھر اس نے کلائیو لائیڈ کی فائل بھی پڑھ لی۔ وہ دونوں فائلیں بغل میں دبائے کمرائے تفتیش کی جانب بڑھا۔ دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور کمرے میں داخل ہوگیا۔ ڈیلن نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔ اس کے دونوں ہاتھ ابھی تک سینے پر بندھے ہوئے تھے۔ مضبوط جسم، چوڑے شانے، موٹی گردن اور چہرے پر ایسی سختی جس سے لگتا تھا کہ اس کی زندگی کا بیشتر حصہ گھر سے باہر گزرا ہے۔ مارٹن نے اسے مسکرا کر دیکھا اور اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے دونوں فائلیں برابر برابر میز پر رکھیں۔ ڈیلن کی آنکھوں میں سرد مہری تھی اور اس کے چہرے سے خود اعتمادی کا اظہار ہو رہا تھا۔ مارٹن نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ”میرا نام مارٹن اسپنسر ہے اور میں کوپر پولیس ڈپارٹمنٹ میں سراغ رساں ہوں۔“

اس شخص نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”تمہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ میرا مطلب ہے ڈرنک، کافی، پانی یا کوک وغیرہ۔“

اس نے آہستہ سے نفی میں گردن ہلائی۔ مارٹن نے اس پر توجہ مرکوز رکھی، وہ جانتا تھا کہ پامیلا اسے دیکھ رہی ہوگی اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ تھوڑی دیر میں آبزرویشن روم پولیس افسروں اور سراغ رسانوں سے بھر جائے گا۔ ممکن ہے کہ چیف بھی یہ کارروائی دیکھنے وہاں آجائے۔

مارٹن نے کندھے اچکائے اور بولا۔ ”تمہیں کھانے پینے کی جو چیز چاہیے، مجھے بتا دینا۔ میں ہر ممکن طریقے سے تمہیں آرام اور سکون پہنچانا چاہتا ہوں۔“

مارٹن نے ایک فائل کھول کر چند صفحات پلٹے اور پھر فائل بند کرتے ہوئے بولا۔ ”میرے خیال میں تم سے ایک احمقانہ غلطی سرزد ہوئی۔ کیا تم ایسا نہیں سمجھتے؟“

ڈیلن بالآخر بول ہی پڑا۔ ”کیسی غلطی؟“

مارٹن نے کہا۔ ”تم میساچوسٹس کے سب سے زیادہ خطرناک اور مشہور گروہ کے رکن ہو۔ تم پر بینک لوٹنے، کاریں چھیننے اور دیگر سنگین نوعیت کے جرائم میں ملوث ہونے کا شبہ ہے اور تمہیں محض سگنل توڑنے کے الزام میں روکا گیا اور تلاشی لینے پر تمہاری گاڑی سے ہتھیار برآمد ہوا۔ تمہارا گروہ بہت مشہور ہے لیکن تم جانتے ہو کہ یہ گروہ کس وجہ سے مشہور ہے؟“

ڈیلن نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

مارٹن پر اس کی خاموشی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی اور بولا۔ ”تم لوگ اپنی وفاداری کے لیے مشہور ہو۔ کئی بار ایسا ہوا کہ ہمیں کسی شراب خانے یا پب میں فائرنگ یا چاقو زنی کی اطلاع ملی اور جب ہم وہاں پہنچے تو ہر شخص نے ایک ہی جواب دیا کہ جس وقت یہ واقعہ پیش آیا، وہ باتھ روم میں تھا۔“

مارٹن کو لگا جیسے ڈیلن کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی ہو لیکن یہ اس کا وہم تھا۔ وہ بدستور پتھر کی مورت بنا بیٹھا تھا۔ مارٹن نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”لوگ کہتے ہیں کہ کلائیو لائیڈ کو سیاسی اور فوجی تاریخ پڑھنے سے دلچسپی ہے تاکہ وہ بادشاہوں کے عروج و زوال اور فوجوں کی فتح و شکست کے بارے میں جان سکے۔ لہٰذا وفاداری، حکم کی تعمیل اور ہتھیاروں کے استعمال کے علاوہ کلائیو اپنے گروہ کے لوگوں سے ہوشیاری کی بھی توقع رکھتا ہے۔ تم لوگ اپنے طور پر کچھ نہیں کرتے جب تک کہ تمہیں اس کا حکم نہ دیا جائے۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟“

ڈیلن اسی طرح خاموش بیٹھا ہوا تھا اور ابھی تک اس کے دونوں بازو سینے پر بندھے ہوئے تھے۔ مارٹن اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے جب کلائیو... کو معلوم ہوگا کہ تم سگنل توڑنے کے الزام میں پکڑے گئے ہو اور تمہارے پاس سے غیر قانونی اسلحہ برآمد ہوا ہے تو وہ اسے ایک احمقانہ حرکت تصور نہیں کرے گا۔ وہ یہ کیسے برداشت کر سکتا ہے کہ اس کا ایک کارندہ پولیس کے ہتھے چڑھ جائے اور تفتیشی افسران اس سے وہ سب کچھ معلوم کر لیں جن پر ابھی تک پردہ پڑا ہوا ہے۔ کیا تم نہیں سمجھتے کہ اس کے نزدیک تمہاری یہ احمقانہ غلطی ایک ناقابلِ معافی جرم ہے اور اب تم اس کے کسی کام کے نہیں رہے۔“

ڈیلن کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ ”یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ہمارے ٹیکس کا پیسا ایک ایسی پولیس فورس پر خرچ ہو رہا ہے جو میرے مستقبل کے بارے میں اتنی حساس اور فکرمند ہے۔“

”حساس تو نہیں البتہ پریشان ضرور ہیں۔“ مارٹن نے کہا۔ ”ہمیں ڈبلن میں ہونے والے جرائم کے بارے میں پریشانی ہے جن کی رپورٹ بھی درج نہیں کروائی جاتی۔

ہمیں نہر سے ملنے والی ان لاشوں کے بارے میں بھی فکر ہے جنہیں کسی غلطی یا نااہلی کی پاداش میں نہر میں پھینک دیا گیا تھا۔ ہمیں ان براز یلین کی بھی فکر ہے جو ایک پُرسکون زندگی کی تلاش میں ڈبلن جل آئے اور ان کی لاشیں بوریوں میں بند کر کے واپس بھیج دی گئیں۔"

ڈیلن کا چہرہ اب بھی بے تاثر تھا۔ مارٹن نے اپنی بات جاری رکھی۔ "تمہارے خیال میں کلائیو کا کیا ردِعمل ہو گا جب وہ سنے گا کہ اس کے گروہ کے ایک رکن نے ایسی احمقانہ حرکت کی ہے۔"

"تم خود اس سے کیوں نہیں پوچھ لیتے؟" ڈیلن نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

"ضرور پوچھوں گا جس دن وہ میرے ہاتھ لگ گیا۔"

ڈیلن بے ہودہ انداز میں مسکرایا۔ تبھی مارٹن نے اس پر دباؤ بڑھانے کا فیصلہ کرلیا اور بولا۔ "کلائیو کے ساتھ کام کرنا کیسا لگتا ہے؟"

لمحہ بھر کے لیے خاموشی رہی پھر ڈیلن نے کہا۔ "کسی اور جگہ جا کر مچھلیاں پکڑو۔ یہ تالاب خالی ہے۔"

مارٹن نے کہا۔ "تم میری بے عزتی نہیں کرسکتے اور نہ ہی میں تمہارے بارے میں ایسا سوچتا ہوں۔ میں یہ توقع نہیں کررہا کہ تم مجھے کلائیو کے بارے میں بتاؤ گے، وہ تمہیں کسی شخص کو قتل کرنے یا بینک لوٹنے کے بارے میں کیا ہدایات دیتا ہے۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ روزمرہ معاملات میں اس کا برتاؤ کیسا ہے؟"

"مثلاً؟"

"ہم جانتے ہیں کہ اسے تاریخ سے دلچسپی ہے۔ وہ نہ صرف آن لائن تاریخی کتابیں منگواتا ہے بلکہ فرصت ملنے پر خود کتابوں کی دکان پر جاتا ہے، میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ کیبل پر بھی وہ ہسٹری چینل ہی دیکھتا ہے، کیا یہ سچ ہے؟"

ڈیلن نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ "ہاں وہ سارا دن ہسٹری چینل ہی دیکھتا رہتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ عقل مند لوگ تاریخ سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ اسے یہ پسند نہیں کہ کوئی اس چینل کی برائی کرے۔ ایک دفعہ ایک لڑکے سے یہ غلطی ہو گئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اسے اپنا منہ بند رکھنا چاہیے تھا۔"

"کیوں؟ اس نے ایسی کیا بات کہہ دی۔"

ڈیلن کچھ دیر خاموش رہا۔ شاید سوچ رہا تھا کہ بات آگے بڑھائے یا نہیں پھر محتاط انداز میں بولا۔ "وہ کلائیو کا قریبی رشتے دار تھا۔ بہت پُرجوش، تندخو اور... وہ کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دینے کا خواہش مند تھا۔ ایک دن اس نے مذاق میں کہہ دیا کہ ہسٹری چینل کا نام ہسٹری چینل... چاہیے کیونکہ یہاں سے بور پروگرام دکھائے جاتے ہیں جنہیں ایسے ہی لوگ پسند کرتے ہیں جو خود بور ہوں۔ کلائیو یہ سن کر مسکرایا لیکن اس نے زبان سے کچھ کہا نہیں۔ وہ ... چلا گیا اور پھر پلٹ کر نہیں آیا۔"

"ممکن ہے کہ اسے کوئی دوسرا کام مل گیا ہو؟" مارٹن نے کہا۔

"تم نے میری بات نہیں سنی۔" ڈیلن بولا۔ "وہ پھر کبھی واپس نہیں آیا، امید ہے کہ تم میرا مطلب سمجھ گئے ہو گے۔ اب مجھ سے کسی دوسری کہانی کی توقع مت کرنا۔"

اس کے بعد مارٹن نے کچھ اور سوالات کیے لیکن ڈیلن خاموش رہا۔ مارٹن مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ اس نے ہمت نہ ہاری اور ڈیلن کی ابتدائی زندگی کو کھنگالنا شروع کر دیا۔ "تم نے بمشکل تمام کوپر ہائی اسکول سے تعلیم مکمل کی۔ کچھ عرصے بیکار پھرتے رہے پھر چھتیں بنانے کا کام شروع کردیا جو کافی مشکل تھا۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟"

ڈیلن نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ تم نے اس مشکل کام کا انتخاب کیوں کیا؟"

"میں نے ایک دفعہ گرمی کی چھٹیوں میں رنگ کا کام کیا تھا۔ اس طرح مجھے سیڑھی پر چڑھنے اترنے کی مشق ہو لی پھر ایک ٹھیکے دار نے مجھے چھت بنانے کے کام پر لگا دیا۔ یہ واقعی مشکل کام تھا۔ اس میں بہت کم پیسے ملتے ہیں۔ صبح سے شام تک گرم سرد موسم میں کھلے آسمان کے نیچے سیڑھی پر کھڑے ہو کر کام کرنا۔ بار بار نیچے اتر کر سیڑھی کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا۔ درمیان میں صرف لنچ کا وقفہ ہوتا تھا لیکن اسکول سے نکلنے کے بعد میرے پاس کوئی اور راستہ نہ تھا اس لیے گزر اوقات کے لیے یہی کام شروع کر دیا۔"

"واقعی یہ بہت سخت کام ہے۔" مارٹن نے فائل بند کرتے ہوئے کہا۔ "میں باتھ روم جا رہا ہوں۔ تمہیں کچھ چاہیے۔"

ایک لمحے کے لیے ایسا لگا کہ ڈیلن کچھ کہنا چاہ رہا ہے لیکن اس نے ایک بار پھر چھت کی جانب دیکھنا شروع کر دیا، اس کے دونوں بازو ابھی تک سینے پر بندھے ہوئے تھے۔

دوسرے کمرے میں کافی لوگ جمع ہو گئے تھے۔ ان میں کچھ سراغ رساں اور پولیس آفیسر بھی شامل تھے۔ پامیلا نے اسے ایک کوک کا ٹن دیا اور بولی۔ "کچھ کامیابی ہوئی؟"

"تھوڑی سی لیکن رفتار بہت سست ہے۔ میں کوشش کررہا ہوں کہ وہ بولنے پر آمادہ ہو جائے۔"

"تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" پامیلا بولی۔ "اگر اس نے وکیل بلانے کا مطالبہ کردیا تو سارا کھیل ختم ہو جائے گا اور تم کچھ نہیں کرسکو گے اور یہ موقع ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔"

مارٹن نے کوک کا ٹن ختم کیا اور دوبارہ کمرائے تفتیش میں چلا گیا۔ ڈیلن کی نظریں سامنے والی دیوار پر جمی ہوئی تھیں۔ مارٹن کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "تمہیں چھتیں بنانا یاد آتا ہے؟"

"کیا؟" ڈیلن اس طرح چونکا جیسے مارٹن نے کوئی بہت مشکل سوال پوچھ لیا ہو۔

"تمہیں معلوم ہے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔" مارٹن نے کہا۔ "تم دوبارہ وہی کام شروع کرنا چاہتے ہو، پچاس فٹ کی بلندی پر کھڑے ہو کر لکڑی کے تختے جوڑنا جس میں ہر وقت سیڑھی سے پھسلنے کا خطرہ رہتا ہے۔"

ڈیلن کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ مارٹن نے دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "کیونکہ یہی تمہارا مستقبل ہے اگر تمہیں غیر قانونی اسلحہ رکھنے کے جرم میں سزا ہو گئی اور تم جیل چلے گئے تو کلائیو تم پر بھروسا کرنا چھوڑ دے گا۔ وہ یہی سمجھے گا کہ کہیں تم دباؤ میں آکر پولیس کو اس کی تنظیم کے بارے میں کچھ بتا نہ دو۔"

ڈیلن اسے گھورتے ہوئے بولا۔ "تم مجھے بھی سمجھانے کی کوشش کررہے ہو، کیا تم نے مجھے احمق سمجھ رکھا ہے؟"

"نہیں، میری رائے کوئی اہمیت نہیں رکھتی بلکہ میں کلائیو.... کی بات کررہا ہوں۔ وہ تمہارے بارے میں ایسا سوچ سکتا ہے۔ اگر تم جیل سے کسی حادثے کے بغیر باہر نکل گئے تو وہ تمہیں دوبارہ قبول نہیں کرے گا لہٰذا تمہیں دوبارہ اپنے کام پر واپس آنا پڑے گا کیونکہ تم صرف چھتیں بنانا ہی جانتے ہو اور میں نہیں سمجھتا کہ کلائیو... تمہیں کوئی نیا کام سونپے گا۔"

ڈیلن کے چہرے پر الجھن کے آثار نمودار ہونے لگے اور وہ بولا۔ "تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

"تمہاری مدد کرنے۔"

ڈیلن کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھ دوبارہ سینے پر باندھتے ہوئے بولا۔ "جہنم میں جاؤ۔ گیٹ آؤٹ۔"

مارٹن واپس دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں پہلے سے زیادہ ہجوم بڑھ گیا تھا۔ اسے ایک اور کوک کا ٹن دیا گیا جسے اس نے فوراً ہی منہ سے لگا لیا۔ سب لوگ دم سادھے اس کی جانب دیکھ رہے تھے لیکن مارٹن کے چہرے سے ناکامی عیاں تھی۔ پامیلا بولی۔ "مجھے تو یہ شخص اونٹ جیسا لگتا ہے۔ اسے سگریٹ کی طلب ہے نہ کولڈ ڈرنک کی اور نہ ہی باتھ روم جانے کی حاجت ہوئی۔"

"یہ بہت ہی ڈھیٹ آدمی ہے۔" مارٹن نے کہا۔

پامیلا نے پوچھا۔ "اب تم کیا کرو گے؟"

"اسے کوئی لالچ دینا ہو گا۔ کوشش کرتا ہوں کہ اس سے کوئی ڈیل ہو جائے۔"

"تمہارے خیال میں یہ طریقہ کامیاب رہے گا؟" پامیلا بولی۔

"امید تو ہے۔" مارٹن نے کہا۔

پامیلا گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ "ٹھیک ہے کوشش کر کے دیکھ لو۔ ہمیں کلائیو... کی سرگرمیوں کے بارے میں مکمل معلومات درکار ہیں۔"

مارٹن دوبارہ کمرائے تفتیش میں چلا گیا۔ ڈیلن نے لمحہ بھر کے لیے اسے دیکھا اور دوبارہ دیوار پر نگاہیں جما دیں۔ مارٹن نے کرسی پر بیٹھ کر دوسری فائل کھولی اور اس میں سے آٹھ رنگین تصویریں نکال کر میز پر پھیلا دیں۔ یہ جائے وقوعہ کی تصویریں تھیں جب چند ماہ پہلے کچھ نوجوان مردوں اور عورتوں کو کوپر اور گردونواح کے قصبوں میں قتل کیا گیا تھا۔

ڈیلن نے ان تصویروں کی طرف دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تو مارٹن بولا۔ "تم اس طرح انہیں نظرانداز نہیں کرسکتے۔ تم کلائیو..... کے گروہ کا حصہ ہو اور تمہارا کہنا ہے کہ ان اموات کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔"

ڈیلن نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "ان واقعات سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔"

"واقعی، کیا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ ان لوگوں نے خودکشی کی تھی؟"

وہ ایک ایک تصویر اٹھا کر مقتول کا نام، پتا اور عمر پڑھنے لگا۔ ان کی عمریں پندرہ سے اکیس سال کے درمیان تھیں۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد مارٹن نے کہا۔ "تم

جانتے ہو۔ ان سب میں کیا بات مشترک تھی۔ ان کا تعلق براز یلین خاندانوں سے تھا اور وہ ڈبلن ہل یا اس کے قرب و جوار میں رہتے تھے۔ ان کے بارے میں شبہ تھا کہ وہ غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث ہیں جس کی وجہ سے کلائیو ..... انہیں اپنا حریف سمجھنے لگا۔"

ڈیلن کی خاموشی برقرار رہی۔ مارٹن نے کہا۔ "کیا بات ہے ڈیلن! تم اس طرح کی تصویریں دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ تم پستول چلانے کے بعد سب کچھ بھول جانا چاہتے ہو اور ڈبلن ہل واپس آکر شراب پیتے اور گندے لطیفے سناتے ہو لیکن لاشیں وہیں پڑی رہتی ہیں اور مرنے والوں کا خون تمہارے ظلم کی داستان سناتا ہے۔"

مارٹن کو کمرے کی فضا میں تبدیلی کا احساس ہوا۔ اسے لگا کہ آگے بڑھنے کا راستہ مل رہا ہے۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ان تصویروں کو غور سے دیکھو۔ انہیں پہچاننے کی کوشش کرو۔ ممکن ہے کہ تم نے ان سے کچھ چھینا ہو یا کچھ دیر کے لیے ان کا ساتھ رہا ہو لیکن تم عجلت میں تھے۔ تمہیں اپنا کام کرنے کی جلدی تھی۔ اس لیے ہمیں جائے وقوعہ پر جانا پڑا۔ وہاں کی تصویریں بنائیں۔ دیگر تفصیلات جمع کیں۔ اس کے بعد ہمیں ان کے والدین یا سرپرستوں کو اطلاع دینے کا ناخوشگوار فریضہ انجام دینا پڑا کہ ان کے پیارے اب کبھی گھر واپس نہیں آئیں گے۔ انہوں نے جن بچوں کو پال پوس کر بڑا کیا اور ان کے بہتر مستقبل کے خواب دیکھے وہ ڈبلن ہل کی کسی گلی یا میدان میں گولیوں کا نشانہ بن گئے۔"

ڈیلن منہ ہی منہ میں بڑبڑایا تو مارٹن نے کہا۔ "معاف کرنا، تم کچھ کہہ رہے ہو؟"

وہ گستاخ لہجے میں بولا۔ "وہ یہاں کے رہنے والے نہیں تھے۔"

"واقعی، کیا انہیں ڈبلن ہل آنے کے لیے کسی پاسپورٹ کی ضرورت تھی۔ کیا کلائیو..... نے تمہیں ان لوگوں کے پاسپورٹ، پیدائش کا سرٹیفکیٹ یا ڈرائیونگ لائسنس چیک کرنے کی ہدایت کی تھی۔"

ڈیلن کے چہرے کا رنگ ایک بار پھر بدل گیا اور وہ بولا۔ "ڈبلن ہل کا علاقہ ہمارا ہے وہ کسی اور جگہ جا سکتے تھے۔"

مارٹن نے تصویروں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ "اس لڑکی کو دیکھو۔ یہ سترہ سال کی بھی نہیں ہے اس سے تمہیں کیا خطرہ تھا۔ وہ کون سا کام کر رہی تھی جس کی وجہ سے اسے قتل کرنا پڑا۔ کیا تم اس پر فخر محسوس کر سکتے ہو۔ واقعی یہ بہت بڑا کارنامہ ہے۔ لوگ برسوں گزر جانے کے بعد بھی تمہارے گروہ کی بہادری کی داستانیں سناتے رہیں گے کہ کس طرح تم نے ایک نوجوان لڑکی کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا اور اس کے سر میں دو سوراخ کر دیے۔"

ڈیلن نے کچھ کہنا چاہا لیکن مارٹن اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے تصویریں میز پر ہی چھوڑ دیں اور بولا۔ "میں ایک فون کر کے آتا ہوں۔ اگر تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو یا باتھ روم جانا چاہو تو بتا دو میں تمہیں سگریٹ ضرور پیش کرتا لیکن یہاں اجازت نہیں ہے۔"

دوسرے کمرے میں مزید کچھ لوگوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ ان میں ایک اسسٹنٹ اٹارنی جنرل اور دوسرا محکمے کا چیف تھا۔ اسے دیکھتے ہی سب خاموش ہو گئے۔ پامیلا نے اسے ایک اور کوک دی۔ وہ اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "تم نے دیکھا۔ وہ ابھی تک اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ نہ ہی کوئی چیز مانگی اور نہ ہی باتھ روم گیا۔ مجھے تو یہ کوئی بہت ہی عجیب شخص لگتا ہے۔"

"اس نے ابھی تک وکیل کا مطالبہ بھی نہیں کیا۔" پامیلا بولی۔ "تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میں بہت قریب پہنچ گیا ہوں۔" مارٹن نے کہا۔ "اگر اسے تعاون نہ کرنا ہوتا تو وہ بہت پہلے وکیل کو بلا سکتا تھا لیکن اس سے کچھ اگلوانے کے لیے مجھے کچھ دوسرے پتے شو کرنا ہوں گے۔ اسے ہلکی سی جھلک دکھانا ہو گی کہ آنے والے چند ہفتوں میں ڈبلن ہل میں کیا ہونے والا ہے۔"

"تمہیں یقین ہے کہ یہ چال کامیاب رہے گی؟" پامیلا نے پوچھا۔

"بالکل سو فیصد۔"

پامیلا نے چشمہ اتار کر آنکھیں صاف کیں اور بولی۔ "ٹھیک ہے۔ یہ بھی کر کے دیکھ لو۔"

ڈیلن تقریباً پہلے والی پوزیشن میں ہی بیٹھا ہوا تھا۔ مارٹن اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "جو کچھ میں کہنے جا رہا ہوں، اسے غور سے سنو۔ میں تمہیں وہ پیشکش کر سکتا ہوں جس کا مجھے اختیار ہے۔ تمہارے اوپر لگائے گئے سارے الزامات ختم ہو جائیں گے کوئی ایسا ثبوت نہیں جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ تم کبھی یہاں آئے تھے۔ تم واپس جا کر اپنے گروہ میں شامل ہو سکتے ہو۔"

اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ "اس کے بدلے مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"تم سمجھ دار آدمی ہو۔" مارٹن نے کہا۔ "ہمیں کچھ معلومات چاہئیں۔ میں بڑے اور وحشیانہ جرائم کی تفصیل جاننا نہیں چاہتا بس تھوڑی بہت معلومات مل جائیں جن سے اندازہ ہو سکے کہ کلائیو..... کیا کرنے والا ہے۔ ہمیں تمہاری یا تمہارے ساتھیوں کی زیادہ پروا نہیں۔ ہم صرف کلائیو لائیڈ اور اس کے خاص مشیروں کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں؟"

ڈیلن ناگواری سے بولا۔ "ٹھیک ہے تم مجھے ایک کاغذ دو۔ میں اس پر سب کچھ لکھ دوں گا لیکن یاد رکھو کہ یہ میرا ڈیتھ سرٹیفکیٹ ہوگا جس کے لیے تم مجھے تیار کر رہے ہو۔"

مارٹن نے مایوسی کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اگر تم تعاون نہیں کرتے تو غیر قانونی اسلحہ رکھنے کا الزام اپنی جگہ رہے گا اور تم کسی صورت بھی اس سے بری نہیں ہو سکو گے۔ تمہیں جیل جانا ہوگا اور ہم دیکھیں گے کہ تم وہاں کتنا عرصہ رہ سکتے ہو کیونکہ کلائیو جیل میں ہی ایسا انتظام کر دے گا کہ تمہاری موت ایک حادثہ معلوم ہو۔"

"میں اس الزام سے بری ہونے کی کوشش کروں گا۔ کلائیو..... اپنے وفاداروں کی قدر کرتا ہے وہ میرے لیے ضرور کسی اچھے وکیل کا بندوبست کرے گا جو مجھے اس مقدمے سے بری کرا سکے۔"

"شاید ایسا ہی ہو۔" مارٹن نے کہا۔ "لیکن تم نہیں جانتے کہ تمہارے یا کلائیو کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔" ڈیلن نے بے یقینی سے کہا۔

مارٹن نے ایک تصویر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ "اس کا نام فلپ سالازار ہے۔ وہ صرف سترہ سال کا تھا۔ اس نے بمشکل اسکول کی تعلیم مکمل کی۔ وہ اپنے خاندان کا واحد کفیل تھا۔ بدقسمتی سے وہ تمہارے ہتھے چڑھ گیا۔ معلوم نہیں تم نے اسے مارا یا تمہارے کسی ساتھی نے لیکن وہ بہت چھوٹا تھا لیکن کلائیو..... کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ وہ تو علاقے پر اپنی حکمرانی چاہتا ہے۔"

"ثابت کرو۔" ڈیلن کاٹ کھانے والے انداز میں بولا۔

"مجھے یقین ہے کہ ایک دن ہم یہ ثابت کر سکیں گے۔ میں نہیں تو ڈیپارٹمنٹ کا کوئی اور سراغ رساں یہ کام ضرور کرے گا لیکن شاید اس وقت تک تم میں سے کوئی بھی گرفتاری کے لیے باقی نہ رہے۔"

یہ سنتے ہی ڈیلن کی پوری توجہ اس کی جانب ہو گئی گو کہ مارٹن نے اپنی بات کی وضاحت نہیں کی لیکن اس کی آنکھوں سے بہت کچھ ظاہر ہو رہا تھا۔ اس نے کچھ دیر توقف کیا پھر بولا۔ "کیا میں اپنی بات جاری رکھوں۔"

"ہاں۔"

مارٹن نے تصویر کو غور سے دیکھا اور بولا۔ "فلپ سالازار کا رہوڈ آئی لینڈ میں رہتا ہے۔ اس کا کاروبار بھی کلائیو..... سے ملتا جلتا ہے وہ بھی ایک چھوٹا سا گروہ چلاتا ہے جس کے سبھی ارکان بے حد وفادار، مضبوط اور طاقتور

ہیں۔ جرائم پیشہ ہونے کے باوجود ہیکٹر اپنے خاندان سے بہت محبت کرتا ہے لہٰذا جب اس کا بھانجا مارا گیا تو تم سوچ سکتے ہو کہ اس کا کیا ردِعمل ہوگا۔“

ڈیلن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تب مارٹن نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں شاید اس کا اندازہ نہیں ہے لیکن ہمیں رہوڈ آئی لینڈ کی پولیس نے بتایا ہے کہ ہیکٹر بہت جلد حساب برابر کرنے کے لیے یہاں آنے والا ہے۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ہیکٹر کا رابطہ برازیل کے سب سے بڑے اور منظم گروہ سے ہے اور جب ان کے خاندان کا کوئی فرد مارا جائے تو وہ صرف بندوقوں کے ساتھ نہیں آتے بلکہ اپنی مدد کے لیے ٹینک اور فضائی مدد بھی حاصل کر سکتے ہیں۔“

ڈیلن اب دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔ اتنی زیادہ مغز ماری، تھکاوٹ اور بہت سا وقت ضائع کرنے کے باوجود مارٹن کو لگا کہ وہ کامیابی کے قریب پہنچ گیا ہے اور ڈیلن زیادہ دیر تک ثابت قدم نہیں رہ سکتا۔ وہ اندر سے ٹوٹ رہا تھا اور مارٹن جانتا تھا کہ آئندہ چند منٹوں میں وہ ڈیلن سے بہت کچھ معلوم کر سکے گا۔

”تم سمجھ رہے ہو نا۔“ مارٹن نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگائی۔ ”کلائیو اور تم لوگ مقامی طور پر چھوٹے موٹے جھگڑے نمٹانے کے عادی ہو لیکن اب ایک طوفان تمہاری طرف بڑھ رہا ہے، جو تمہیں بہا کر لے جائے گا۔“

ڈیلن نے بے چینی سے پہلو بدلا اور بولا۔ ”دوبارہ بتاؤ تمہاری کیا پیشکش ہے؟“

مارٹن کا دل چاہا کہ وہ اٹھ کر ناچنا شروع کر دے۔ اسے بہت بڑی فتح ہوئی تھی۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ کوئی قانون نافذ کرنے والا ادارہ کلائیو..... کے کسی ساتھی سے کچھ اگلوانے میں کامیاب ہو رہا تھا۔

”میں تمہیں بتاتا ہوں کہ کیا کرنا ہوگا۔“ مارٹن نے کہا۔ ”سب سے پہلے ہمیں کچھ کاغذی کارروائی کرنا ہوگی پھر.....“

اس کی بات پوری نہ ہو سکی۔ باہر کچھ شور ہو رہا تھا۔ مارٹن سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی اس موقع پر بھی شور مچا سکتا ہے جب اس کے کیریئر کی سب سے بڑی فتح چند قدم کے فاصلے پر رہ گئی ہے وہ ڈیلن سے اس کے باس کے خلاف اگلوانے جا رہا ہے جو نامی گرامی مجرم ہونے کے باوجود ابھی تک گرفتاری یا مقدمے سے بچا ہوا ہے۔

مارٹن نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔ ”جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ہم ایسا معاہدہ تیار کریں گے جس میں تمہارے تمام حقوق کو تحفظ حاصل ہوگا اور.....“

شور مزید بڑھ گیا۔ مارٹن نے مڑ کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات تھے۔ عین اسی لمحے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہاں پامیلا کھڑی ہوئی نظر آئی۔ اس کے چہرے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔ اس کے پیچھے چیف روسکو کھڑا ہوا تھا جو ثبوتوں کی جانچ پڑتال کیا کرتا تھا۔ مارٹن کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا ماجرا ہے اور یہ سب لوگ دروازے پر کیوں کھڑے ہوئے ہیں۔

پامیلا نے کہا۔ ”مارٹن! مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“

مارٹن بولا۔ ”کیا یہ بات کچھ دیر بعد نہیں ہو سکتی؟“

وہ بولی۔ ”نہیں۔ ابھی اور اسی وقت۔ یہ بہت ضروری ہے۔“

وہ مجبوراً اپنی کرسی سے اٹھا اور ڈیلن پر ایک نظر ڈالی۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ مسکرا رہا تھا۔

کمرے سے باہر آ کر مارٹن نے کہا۔ ”پامیلا! یہ تم نے کیا کیا۔ میں اپنے مقصد سے بہت قریب پہنچ گیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ سب کچھ بتا دیتا۔“

چیف نے پہلے ٹرینٹ روسکو اور پھر پامیلا کی طرف دیکھا۔ اس نے آہستہ سے سر ہلایا اور بولی۔ ”ہمیں اسے چھوڑنا ہوگا۔“

”کیوں؟“ مارٹن حیران ہوتے ہوئے بولا۔

”اس کے پاس سے جو پستول برآمد ہوا ہے وہ اصلی نہیں ہے۔“ روسکو نے کہا۔

مارٹن کو لگا کہ اس نے دورانِ تفتیش جتنا بھی کوک پیا ہے وہ سب باہر آ جائے گا۔ وہ بمشکل اتنا ہی کہہ سکا۔ ”پوری بات بتاؤ۔“

”ہم اسے نقل تو نہیں کہہ سکتے لیکن یہ نقلی جیسا ہی ہے۔ درحقیقت یہ اسمتھ اینڈ ویسن کا نائن ایم ایم پستول ہے لیکن کسی نے بڑی مہارت کے ساتھ اس میں سے فائرنگ پن اور دوسرے اہم اجزا نکال لیے ہیں۔ میرا ارادہ تھا کہ اس کا بعد میں معائنہ کروں گا لیکن جب غور کیا تو وزن میں کم محسوس ہوا پھر میں نے اس کا بغور جائزہ لیا تو یہ بات سامنے آئی۔ قانونی طور پر یہ پستول کے زمرے میں نہیں آتا بلکہ محض اس کا ڈھانچا ہے۔“

پامیلا بولی۔ ”اب ہمارے پاس اسے روکنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ ہمیں اسے چھوڑنا ہوگا۔“

مارٹن نے محسوس کیا کہ راہداری میں کوئی ہے۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ ڈیلن کمرے سے باہر آرہا تھا۔ اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ وہ قریب آتے ہوئے بولا۔ ''میرا اندازہ ہے کہ اب اگر میں ڈرنک یا سگریٹ مانگوں تو مجھے کچھ نہیں ملے گا۔''

مارٹن کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ جواب میں کیا کہے۔

ڈیلن نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کلائیو..... اور امریکن فوج کے جنرل جارج پیٹن کی طرف سے آداب قبول کرو۔''

اس کے جانے کے بعد مارٹن اپنے دفتر میں کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا یہ جاننے کی کوشش کررہا تھا کہ ڈیلن نے جنرل پیٹن کا نام کیوں لیا پھر جب اس نے جنرل کے بارے میں چند مضامین پڑھے تو وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ کاش وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ جھیل پر چھٹیاں منا رہا ہوتا۔ کاش اس کے فون کی بیٹری ختم ہوگئی ہوتی۔ کاش وہ آج یہاں نہ آیا ہوتا۔

ڈیلن خراماں خراماں چلتا ہوا کلائیو..... کے ٹھکانے پر پہنچا اور دستک دیے بغیر اس کے دفتر میں داخل ہوگیا۔ وہ بڑی سی میز کے پیچھے سیاہ سوٹ پہنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے گلے میں بب باندھ رکھا تھا اور چھری کانٹے کی مدد سے بھنی ہوئی جھینگا مچھلی کھا رہا تھا۔ میز پر ہی اس کی پسندیدہ شراب کی بوتل بھی رکھی ہوئی تھی۔ اس کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ تھی لیکن وہ مضبوط تن و توش کا مالک تھا۔ ایک طرف کتابوں کی الماری میں بہت سے کتابیں رکھی ہوئی تھیں جن میں زیادہ تر تاریخ پر تھیں۔ ڈیلن اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کلائیو نے اس پر ایک نظر ڈالی اور بولا۔ ''کیا خبر لائے ہو؟''

''جو آٹھ افراد گزشتہ مہینوں میں مارے گئے، ان کے بارے میں پولیس کے پاس کوئی ثبوت نہیں کہ وہ ہمیں گرفتار کرسکیں۔ انہیں ہم پر شبہ ضرور ہے لیکن ان کے پاس کوئی ٹھوس معلومات نہیں ہیں۔''

''یہ جان کر خوشی ہوئی۔'' کلائیو بدستور کھانے میں مصروف رہا۔ ''اور کچھ؟''

''وہ لڑکا جس نے تمہارے سامنے زبان کھولی تھی۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اس کا ماموں ہیکٹر سلاز ادر ہوڈ آئی لینڈ میں ایک گروہ کا سرغنہ ہے اور اب وہ اپنے لوگوں کے ساتھ ہمارا صفایا کرنے اور ہمیں سبق پڑھانے آرہا ہے۔''

کلائیو نے لمحہ بھر کے لیے سوچا پھر شراب کا بڑا سا گھونٹ لیتے ہوئے بولا۔ ''بہت خوب یہ بتاؤ کہ تمہارا کیا خیال ہے؟ میرا خیال ہے کہ پہل ہماری طرف سے ہونی چاہیے۔ حملے میں پہل کرنے والا ہی جیتتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم اپنے چند ساتھیوں کو لے کر رہوڈ آئی لینڈ چلے جاؤ اور اس کی سرزمین پر ہی ختم کردو۔''

''یہ ٹھیک رہے گا باس۔'' ڈیلن نے ... ہوئے کہا۔

کلائیو نے چھری کانٹا اٹھایا اور بولا۔ ''جب تم نے اس سراغ رساں کے سامنے جنرل پیٹن اور اس کا ذکر کیا تو وہ کیا بولا؟''

''کچھ نہیں۔'' ڈیلن نے کہا۔ ''میں نہیں سمجھتا کہ وہ اس کے بارے میں کچھ جانتا ہوگا لیکن مجھے یقین ہے کہ اب تک ضرور جان گیا ہوگا۔''

کلائیو نے مچھلی کا ایک ٹکڑا کاٹا اور چھری سے کتابوں کی الماری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''پیٹن نے اپنی جنگی چالوں کی وجہ سے جرمنوں کو دھوکے میں رکھا۔ وہ یہی سمجھتے رہے کہ پیٹن فرانس پر حملہ کرنے کی تیاری کررہا ہے اور انہوں نے اپنی فوج سرحد سے ہٹا دی۔ اس طرح پیٹن کو جرمنی میں داخل ہونے اور اسے نازیوں کے قبضے سے آزاد کرانے کا موقع مل گیا۔''

اس نے مسکراتے ہوئے ڈیلن کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''پیٹن کی طرح تمہاری چال بھی کامیاب رہی کہ تم نے یہ گرفتاری اس لیے دی تھی کہ اندر کا حال جان سکو۔ وہ تم سے تو کچھ معلوم نہ کرسکے لیکن ہمیں دشمن کے ارادے سے ضرور باخبر کردیا۔ جہاں جہاں ممکن ہوا، ہم اپنی فتوحات کا سلسلہ جاری رکھیں گے، کیا ایسا نہیں ہے؟''

''ہم یہی کررہے ہیں باس۔''

کلائیو بولا۔ ''کچھ اور کہنا چاہتے ہو؟''

ڈیلن کا حلق خشک ہورہا تھا۔ اس نے للچائے ہوئے انداز میں ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولا۔ ''باس اگر اجازت ہو تو ایک گلاس لے لوں۔''

کلائیو قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ''ایک نہیں تم دو گلاس لے سکتے ہو۔ یہ تمہارا حق ہے۔''

ڈیلن نے پہلا گھونٹ لیا اور اس کی نظروں کے سامنے مارٹن کا چہرہ آگیا۔ اسے مارٹن سے ہمدردی محسوس ہونے لگی۔ بے چارے کی ساری محنت رائگاں گئی۔ کاش وہ جان سکتا کہ اس کا واسطہ کن لوگوں سے پڑا ہے۔

قرض

میمونہ عزیز

ملازمت اور شرافت کے تقاضے ایسی دلدل میں پھنسا دیتے ہیں... جس سے نکلنا انتہائی دشوار ہوتا ہے... وہ دونوں بھی اپنی اپنی جگہ ایسے ہی تقاضوں میں گرفتار تھے... دونوں پر ایک دوسرے کا قرض واجب الادا تھا...

ایک منہ زور شخص کا قصہ جو قانون کے شکنجے سے نکل رہا تھا

اخبار میں آپ کو سب کچھ مل سکتا ہے۔ پرانی کاریں، اپارٹمنٹ، سیل کوپن اور یہاں تک کہ وہ شخص بھی جس نے آپ کے بھائی کو قتل کیا۔ جی ہاں، مجھے اخبار کے ذریعے ہی معلوم ہوا رچی نے اپنے آپ کو کہاں چھپا رکھا ہے۔ مقدمہ ختم ہوئے ایک ہفتہ ہی ہوا تھا کہ میری نظر اخبار میں شائع ہونے والی اس کی تصویر پر گئی۔ مجھے لگا جیسے وہ طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ دیکھ رہا ہے۔

تصویر سے زیادہ اس سرخی نے مجھے اپنی جانب متوجہ کیا جسے پڑھ کر میرا خون ابلنے لگا۔ تصویر کے نیچے لکھا ہوا تھا، الزامات سے بری کردیا گیا۔ گویا یہاں بھی اس کے باپ کا اثر رسوخ کام آیا اور ایڈیٹر نے حقائق جانتے ہوئے بھی غلط بیانی سے کام لیا۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اخبار کا ایڈیٹر بھی میئر کی جیب میں تھا۔ میں یہ تو بتانا بھول ہی گیا کہ میرے بھائی کو قتل کرنے والا رچرڈ جو میئر رہا ہوے کے

میسز رچرڈ سینیٹر کا بیٹا تھا۔

یہ اس لحاظ سے ایک بڑی خبر تھی کہ جب اسے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا تو اس کا باپ صرف میئر ہی نہیں بلکہ شہر کا بے تاج بادشاہ تھا جو گزشتہ تیس سال سے راہوے پر حکمرانی کر رہا تھا۔ اس نے پورے شہر کو اپنی مٹھی میں لے رکھا تھا۔ تمام پولیس والے، فائر مین، ٹیچر، صفائی کرنے والے اور کلرک کسی نہ کسی طریقے سے اس کے احسان مند تھے۔ اس کا واسطہ تمام ٹھیکے داروں، کاروباری افراد، ہنرمندوں وغیرہ سے رہتا تھا۔ اس کے اختیارات لامحدود تھے۔ بہت سے لوگوں کو شک تھا کہ وہ بدعنوان ہے۔ اس کی تنخواہ صرف ستر ہزار ڈالر سالانہ تھی اور وہ کبھی تین سال سے زیادہ پرانی کار نہیں رکھتا تھا۔ اس کے باوجود لوگ ہمیشہ اسے ہی ووٹ دیتے تھے۔

لکھنے والے نے اس کہانی میں ان باتوں کا ذکر نہیں کیا۔ شاید اسے معلوم تھا کہ ایسی باتیں لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں جو لوگ پہلے سے جانتے ہیں۔ اس کہانی میں میرے بھائی کا نام بھی صرف ایک ہی مرتبہ آیا تھا۔ جیسے اب اس کی کوئی اہمیت نہ رہ گئی ہو۔ پولیس آفیسر کرس کریمر کا نام بھی ایک ہی دفعہ آیا تھا جس نے رچی کو گرفتار کیا تھا۔ البتہ جو نام بار بار لیا گیا، وہ مونا پیریز کا تھا۔ وہی پوری کہانی پر چھائی ہوئی تھی۔

میں نے بمشکل تمام وہ کہانی پڑھی لیکن اختتام پر میں غصے سے کانپ رہا تھا۔ اس کی تصویر دیکھ کر تو میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میرے بھائی کا قاتل آزاد فضاؤں میں سانس لے رہا تھا۔ وہ جس مکان کے سامنے کھڑا تھا، اس کے عقب میں دو سائن بورڈ نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک میرے لیے بیکار تھا جبکہ دوسرے بورڈ پر لکھی ہوئی تحریر کو جب میں نے گوگل پر سرچ کیا تو مجھے معلوم ہو گیا کہ رچی کہاں مل سکتا ہے۔

میرے بھائی کے قتل کا مقدمہ شروع ہوئے چار دن ہوئے تھے جب میں نے پہلی بار ایسی شہادت کے بارے میں سنا جس کی بنا پر ملزم کو بری کیا جا سکتا ہے۔ مجھے لگا کہ یہ ہمارے لیے ایک بُری خبر ہے۔ وکیلِ صفائی بار بار اپنی برہمی کا اظہار کر رہا تھا جیسے اسے انصاف ملنے کی توقع نہ ہو۔ اس کا آغاز اس وقت ہوا جب وکیلِ صفائی کی طرف سے مقدمہ خارج کرنے کی درخواست پیش کی گئی۔ اس سے پہلے بھی وہ دو مرتبہ ایسی درخواست کر چکا تھا۔ اس لیے میں نے اسے وکیلوں والا ہتھکنڈا سمجھتے ہوئے زیادہ توجہ نہیں دی۔ پہلی درخواست اس وقت دی گئی جب ابتدائی بیانات ہوئے جسے جج نے فوراً مسترد کر دیا۔ دوسری درخواست اس وقت دی گئی جب استغاثے کے وکیل نے دلائل دیے۔ وکیلِ صفائی کا کہنا تھا کہ استغاثہ اس کے موکل کے خلاف الزام ثابت کرنے میں ناکام رہا ہے لہٰذا یہ مقدمہ خارج کر دیا جائے۔ مجھے یہ سن کر بڑی مایوسی ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ وکیلِ استغاثہ مسٹر بل نے بہت اچھی طرح کیس تیار کیا ہے۔ یہی بات جب میں نے ان سے کہی تو وہ بولے کہ صفائی کا وکیل ہمیشہ ایسے موقع پر مقدمہ خارج کرنے کی درخواست دیتا ہے لہٰذا اس میں پریشانی والی کوئی بات نہیں لیکن تیسری درخواست بالکل مختلف تھی۔ جج پہلے تو تھوڑا سا ناراض ہوا اور اس نے وکیلِ صفائی سے کہا کہ تم پھر یہ درخواست لے آئے، اس پر سی بولڈ کا کہنا تھا۔

”جنابِ والا! مجھے یقین ہے کہ آپ اسے ضرور سننا چاہیں گے۔“

اس کے بعد اس نے طریقۂ کار پر عمل نہ ہونے کی بات کی اور چند ایسی قانونی ضرورتوں اور اصولوں کا حوالہ دیا جن پر عمل کرنا پولیس والوں اور استغاثے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ تبھی میں نے شہادت برائے بے گناہی کے الفاظ سنے لیکن پہلے میں آپ کو جرم کی تفصیل سنا دوں کیونکہ اس پورے معاملے کا تعلق اسی جرم سے ہے۔ میرا چھوٹا بھائی جونی پارس ایک کلب میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ شرفاء کا ایک کلب ہے اور وہاں کوئی ایسی بے ہودہ حرکت دیکھنے میں نہیں آتی جس کی وجہ سے کسی کے کردار پر حرف آئے۔ ویسے بھی میرا بھائی کنوارا تھا، اس کے لیے کلب جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔

بہرحال وہ اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا ڈرنک لے رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس وقت اس کے دوست کہاں چلے گئے تھے جب یہ واقعہ پیش آیا۔ عین اس وقت اس نے رچی کو دیکھا جو وہاں اکثر جاتا رہتا تھا۔ میئر کا بیٹا ہونے کی وجہ سے وہ سمجھتا تھا کہ وہ بھی پورے شہر کا مالک ہے لہٰذا اس کے نزدیک کسی لڑکی کو تنگ کرنا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ یہ واقعہ ایک ڈانس کے دوران پیش آیا۔ رچی کا کہنا تھا کہ یہ ایک ٹکٹ میں دو مزے والا معاملہ تھا جس میں آپ ایک ڈانس کے لیے ادائیگی کر کے دو مرتبہ ڈانس کرتے ہیں لیکن لڑکی کا کہنا تھا کہ جب اس نے رچی کے ساتھ ڈانس شروع کیا تو یہ پیشکش ختم ہو چکی تھی لیکن رچی بدتمیزی پر اتر آیا اور اس نے لڑکی سے دست درازی شروع کر دی۔ اس موقع پر کلب کی انتظامیہ نے کوئی مداخلت نہیں کی کیونکہ میئر کے بیٹے کو روکنے کی ہمت کسی میں تھی لیکن میرے بھائی سے یہ برداشت نہ ہو سکا اور وہ درمیان میں آ گیا۔ اس نے سوچا ہوگا کہ اسے رچی سے ڈرنے یا گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ وہ رچی کے مقابلے میں خاصا طاقت ور اور مضبوط جسم کا مالک تھا۔ اس نے رچی سے کہا کہ وہ لڑکی کو چھوڑ دے اور ساتھ ہی مطالبہ کیا کہ اس سے معافی بھی مانگے۔

رچی کو یہ مداخلت پسند نہیں آئی اور اس نے اپنے زعم میں میرے بھائی کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ میرے بھائی نے اسے چیلنج کیا کہ اگر وہ اتنا ہی بڑا سورما ہے تو اس سے مقابلہ کر کے دیکھ لے۔ رچی جانتا تھا کہ وہ دست بدست لڑائی میں اس سے نہیں جیت سکتا لہٰذا اس نے پستول نکال کر فائر کر دیا۔ گولی بہت قریب سے چلائی گئی تھی۔ وہ ایک معمولی نائن ایم ایم کا سستا ریوالور تھا اور اگر گولی کسی اور جگہ لگتی تو جونی کے بچنے کا امکان تھا لیکن گولی اس کے دل میں لگی اور وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔

جوان اولاد کی موت کا صدمہ بہت شدید تھا۔ میرے ماں باپ نے تو رو دھو کر صبر کر لیا لیکن میں خاموش نہ رہ سکا اور میں نے تہیہ کر لیا کہ رچی کو کیفرِ کردار تک پہنچائے بغیر چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ ویسے بھی کیس میں کچھ جان نہ تھی اور رچی کو سزا ہونا یقینی تھا۔ سب لوگ جانتے تھے کہ اس نے ہی یہ قتل کیا ہے۔ اس مقدمے کا تحقیقاتی افسر کرس کریمر تھا جس کی محکمے میں بہت اچھی ساکھ تھی اور اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ ہر حال میں مجرم کو اس کے انجام تک پہنچا کر ہی دم لیتا ہے۔ سرکاری وکیل مسٹر بل نے بھی یہی بتایا تھا کہ کریمر کسی مجرم کو نہیں چھوڑتا۔

رچی کو اسی روز گرفتار کر لیا گیا اور دوسرے دن پانچ لاکھ ڈالرز کی ضمانت پر اس کی رہائی عمل میں آئی۔ رقم کا انتظام اس کے باپ نے کیا تھا۔ میں حیران ہوں کہ اس کے پاس اتنی رقم کہاں سے آئی جبکہ میئر کی تنخواہ اس کے مقابلے میں بہت کم ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ وہ وکیلوں کو بھی بھاری فیس دے رہا تھا۔ صفائی کے وکلاء کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ وہ مقدمے کو زیادہ سے زیادہ عرصے تک طول دیں۔ وکلاء چاہتے ہیں کہ ان کا موکل زیادہ عرصے تک جیل سے باہر رہے اس لیے وہ ایک ایک نکتے پر لمبی بحث کرتے ہیں۔

بظاہر تو یہ سیدھا سادہ قتل کا مقدمہ تھا لیکن صفائی کے وکلاء اسے غیر ارادی قتل کا رنگ دینے کی کوشش کر رہے تھے اور انہوں نے پہلی پیشی پر ہی یہ موقف اختیار کیا کہ یہ ایک غیر ارادی قتل تھا اور ملزم کی نیت قتل کرنے کی نہیں تھی۔ بل کا کہنا تھا کہ ہمیں اس پہلو کو ذہن میں رکھنا چاہیے کیونکہ مقدمہ کوئی بھی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ اس جرم کی زیادہ سے زیادہ سزا کیا ہو سکتی ہے تو مسٹر بل نے بتایا تھا کہ قانون کے مطابق رچی کو دس سے تیس سال سے زیادہ سزا ہو سکتی ہے۔ رچرڈ کا سابقہ ریکارڈ اچھا ہے اس لیے شاید اسے پندرہ سال سے زیادہ کی سزا نہ ہو۔ اس وقت رچی تیس سال کا تھا، اگر اسے پندرہ سال کی سزا ہوئی تو پینتالیس سال کی عمر میں وہ ایک آزاد شہری کی حیثیت سے زندگی گزار سکے گا جبکہ میرا بھائی جوانی میں ہی اس دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ رچی کے جرم کو دیکھتے ہوئے یہ سزا بہت کم تھی لہٰذا میں نے مسٹر بل سے کہا کہ وہ عدالت سے اسے سخت سے سخت سزا دینے کا مطالبہ کریں۔

پہلے تین دن تک یہی لگ رہا تھا کہ مقدمے کی کارروائی صحیح سمت میں جا رہی ہے۔ کریمر نے بڑی جانفشانی سے تفتیش کی تھی اور اس نے رچی کو مجرم ثابت کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی جبکہ وکیلِ صفائی پورے دن کی جرح کے باوجود اسے غلط نہ ثابت کر سکا۔ اسی طرح فارنسک رپورٹ بھی ملزم کے خلاف تھی۔ اس کے بعد ہمارے گواہوں کی باری آئی لیکن ان کی تعداد اتنی نہیں تھی جتنی کہ ہونی چاہیے تھی۔ کلب میں روشنی کم تھی اس لیے لوگوں کو معلوم ہی نہ ہو سکا کہ ایک کونے میں دو آدمی لڑ رہے ہیں۔ جب گولی چلنے کی آواز آئی تو بہت سے لوگ خوفزدہ ہو کر پولیس کے آنے سے پہلے ہی وہاں سے بھاگ لیے۔ یہ ایک فطری ردِعمل تھا اور اس کے لیے انہیں موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ جو لوگ وہاں موجود تھے، ان میں سے کچھ ایسے بھی ہوں گے جو میئر کے بیٹے کے خلاف گواہی دینا نہیں چاہتے تھے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی بھی رچی کو پسند کرتا ہوگا لیکن میئر کی ناراضی مول لینے کی کسی میں بھی ہمت نہیں تھی۔

ہماری جانب سے صرف تین گواہ پیش ہو سکے۔ ان میں سے ایک وہ ڈانسر تھی جسے رچی نے پریشان کرنے کی کوشش کی تھی۔ بل کو اس سے بہت زیادہ توقع نہیں تھی اور وہ سمجھ رہا تھا کہ یہ عورت جیوری کو متاثر نہیں کر سکے گی۔ اس کے باوجود ہمیں اس کی گواہی کی ضرورت تھی۔ کم از کم وہ اتنا تو کہہ سکتی تھی کہ رچی اسے تنگ کر رہا تھا اور میرے بھائی نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی، البتہ دوسرے گواہ کافی مضبوط تھے۔ ان دونوں نے رچرڈ کو قاتل کے طور پر شناخت کر لیا اور اس میں انہیں کوئی شبہ نہیں تھا۔ ان میں سے ایک وہ ٹرک ڈرائیور تھا جس نے رچی کو گولی چلاتے دیکھا

تھا اور دوسرا اصلاح خانے کا انچارج تھا جہاں رچی نے کچھ وقت گزارا تھا۔ وہ ہمارا سب سے اہم گواہ تھا۔ گو کہ وکیلِ صفائی نے اس پر اعتراض کیا کہ اس کا تعلق سرکاری ادارے سے ہے اس لیے اس کی گواہی قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔

پھر اچانک ہی اس مقدمے نے ایک نیا رخ لیا اور مونا پیریز کمرائے عدالت میں پیش ہو گئی۔ میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا اور سوچنے لگا کہ اس عورت کا میرے بھائی کے قتل کے مقدمے سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ اچانک اس کا نام پکارا گیا اور وہ گواہوں کے کٹہرے میں پہنچ گئی۔ اسے دیکھ کر وکیلِ استغاثہ پریشان ہو گیا اور بولا کہ اس عورت کا نام گواہوں کی فہرست میں نہیں تھا لیکن وکیلِ صفائی نے دلیل دی کہ یہ عورت جائے وقوعہ پر موجود تھی اس لیے اس مقدمے میں اس کی گواہی اہم ہے۔ جج نے اس کا موقف تسلیم کرتے ہوئے بل سے کہا کہ یہ قتل کا مقدمہ ہے اس لیے کسی گواہی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

مونا پیریز نے جو کچھ کہا، وہ میں لفظ بہ لفظ تو بیان نہیں کر سکتا کیونکہ بہت سی باتیں مجھے یاد نہیں رہیں، البتہ اس نے یہ کہہ کر مقدمے کا رخ بدل دیا کہ وہ مقدمے والی شب کلب میں موجود تھی۔ اس نے کریمر کو بتایا کہ گولی چلانے والا کوئی چھوٹے قد کا ہسپانوی شخص تھا۔ اس نے کہا کہ وہ یہ واقعہ تقریباً بھول چکی تھی کہ اچانک اس نے ٹیلی وژن کی خبروں میں اس مقدمے کے بارے میں سنا اور اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ وہ حیران تھی کہ اسے گواہی کے لیے کیوں نہیں بلایا گیا چنانچہ وہ خود ہی عدالت میں حاضر ہو گئی۔ اس کے بیان میں کئی تضادات تھے۔ وہ واضح طور پر یہ بھی نہیں بتا سکی کہ جس وقت فائرنگ ہوئی تو وہ کہاں تھی۔ میں وکیل نہیں ہوں لیکن اتنا ضرور جانتا تھا کہ جرح کر کے اس کی گواہی کو جھٹلایا جا سکتا تھا۔

اس سے پہلے کہ بل اس پر جرح شروع کرتا، وہ سب جج کے کمرے میں چلے گئے اور وہاں تقریباً ایک گھنٹے تک موجود رہے۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ کریمر اس روز کمرائے عدالت میں موجود نہیں تھا۔ اسے فون کر کے بلایا گیا۔ اس طرح مزید ایک گھنٹا گزر گیا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اندر کیا کارروائی ہو رہی ہے تو میں بازار جا کر ایک پستول خریدتا اور اسی وقت رچی کا سینہ گولیوں سے چھلنی کر دیتا لیکن مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔

دو گھنٹے بعد جج کی واپسی ہوئی۔ اس نے جیوری کے ارکان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ وہ یہ مقدمہ خارج کر رہا ہے۔ اس موقع پر عدالت میں موجود سب لوگوں نے ایک ساتھ بولنا شروع کر دیا۔ ان میں سب سے اونچی آواز میری تھی۔ میں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور مجری طرح چلانا شروع کر دیا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ کیا کہہ رہا ہوں۔ بالآخر جج نے بیلف کو حکم دیا کہ مجھے عدالت سے نکال دیا جائے اس لیے میں بقیہ کارروائی نہ سن سکا۔

بل نے مجھے بعد میں بتایا کہ وہاں کیا ہوا تھا۔ کریمر نے تسلیم کیا کہ قتل والی رات اس کی مونا پیریز سے بات ہوئی تھی۔ اس نے بتایا کہ قاتل شاید ہسپانوی تھا لیکن وہ تذبذب کا شکار تھی۔ جس وقت گولی چلائی گئی، اس وقت وہ جائے وقوعہ سے کافی فاصلے پر تھی اور اس کے لیے قاتل کو واضح طور پر دیکھنا ممکن نہ تھا۔ لہٰذا کریمر نے اسے مکمل طور پر نظر انداز کر دیا۔ اس نے مونا کا بیان نہیں لیا اور وہاں سے جانے دیا۔ اس نے سرکاری وکیل کو بھی یہ بات نہیں بتائی کیونکہ اس کے خیال میں اس کی ضرورت نہیں تھی۔

میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ پھر اس عورت کو اتنی اہمیت کیوں دی گئی؟ تب بل نے مجھے بریڈی کے مقدمے کے بارے میں بتایا جس میں سپریم کورٹ نے رولنگ دی تھی کہ پولیس اور استغاثہ ایسی معلومات ظاہر کرنے کے پابند ہیں جن سے مدعا علیہ کی بے گناہی ثابت ہوتی ہو، چاہے وہ معلومات کتنی ہی گمراہ کن کیوں نہ ہوں۔

اس سے بھی زیادہ بری بات یہ ہوئی کہ کریمر اس سے پہلے بھی ایسا کر چکا تھا اور وہ مقدمہ اسی جج نے سنا تھا۔ اس نے برہمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح کے اقدامات سے مقدمے کی ناقص سماعت کا تاثر قائم ہوتا ہے لہٰذا وہ چاہتا تھا کہ اس بار پورے پولیس ڈپارٹمنٹ کو ایک واضح پیغام دیا جائے چنانچہ اس نے پراسیکیوشن پر جانب داری کا الزام عائد کرتے ہوئے مقدمہ خارج کر دیا اور اس طرح رچی باعزت طور پر بری ہو گیا۔

بل کی وضاحت کے بعد کریمر بھی مجھ سے ملنے آیا۔ وہ اپنے کیے پر نادم تھا۔ اس نے مجھ سے معافی بھی مانگی لیکن میری نظر میں اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ میں نے اس پر چلانا شروع کر دیا۔ میرا دل چاہا کہ مکے مار مار کر اس کا چہرہ لہولہان کر دوں لیکن اس پر حملہ کرنا مجھے مہنگا پڑ سکتا تھا چنانچہ میں نے مغلظات پر ہی اکتفا کیا۔ کریمر خاموش کھڑا یہ سب سنتا رہا۔ البتہ اس نے اتنا ضرور کہا کہ شاید اس مقدمے کی وجہ سے اس کی ملازمت ختم ہو جائے۔ میرے خیال میں وہ اسی کا مستحق تھا۔ جیسے جیسے میں اس بارے میں سوچتا گیا،

میرے غصے میں اضافہ ہونے لگا۔ ویسے بھی میرے پاس سوچنے کے لیے بہت وقت تھا۔ میں نے کام سے دو ہفتے کی چھٹی لے رکھی تھی کیونکہ بل نے بتایا تھا کہ مقدمے کی کارروائی اتنے دن ضرور چلے گی۔ میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی اور میرے ذہن میں ایک ہی خیال نے جڑ پکڑ لی تھی کہ صرف کریمر کی نااہلی کی وجہ سے یہ مقدمہ خارج ہو گیا۔ اگر وہ مونا پیریز کا نام گواہوں کی فہرست میں شامل کر لیتا تو یہ صورتِ حال پیش نہ آتی اور جج کو یہ کہنے کا موقع نہ ملتا کہ استغاثے نے جانب داری سے کام لیتے ہوئے مقدمے کی ناقص سماعت کا تاثر قائم کیا ہے۔ بل نے بتایا تھا کہ کریمر نے اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ یہی حرکت کی تھی لہٰذا اس بار اسے محتاط ہو جانا چاہیے تھا لیکن لگتا ہے کہ اس نے ایسا جان بوجھ کر کیا تھا اور اس کی وجہ بڑی واضح تھی۔

میں نے اس بارے میں جتنا سوچا، یہ خیال پختہ ہوتا چلا گیا۔ اس چھوٹے سے قصبے میں جس کی آبادی صرف ستائیس ہزار تھی، میئر کا سکہ چلتا تھا۔ پولیس کا محکمہ بھی پوری طرح اس کے زیرِ اثر تھا۔ وہ پولیس والوں کے ساتھ ایسا سلوک کرتا جیسے وہ اس کے ذاتی محافظ ہوں۔ یہاں تک کہ ایک پولیس افسر مستقل اس کی خدمت پر مامور تھا اور اس کے لیے ڈرائیور کی ڈیوٹی انجام دیتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ کریمر نے بھی حقِ نمک ادا کرتے ہوئے اس مقدمے کو ریت کی دیوار بنانے کے لیے یہ حرکت کی ہو۔ کیا وہ نہیں جانتا تھا کہ ایک اہم گواہ کو نظر انداز کرنے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟ کیا اس طرح اس نے رچی کی رہائی کا راستہ صاف نہیں کیا؟

یقیناً اسے یہ خطرہ ہوگا کہ ایسا کرنے کی صورت میں اس کی ملازمت ختم ہو سکتی ہے لیکن اسے اس کی پروا نہیں تھی۔ ملازمت ختم ہونے کے بعد بھی اسے ایک معقول پنشن ملتی۔ اس کے علاوہ میئر بھی اس خدمت کے عوض ایک بڑی رقم اسے دیتا اور شاید اس کے لیے کسی دوسری ملازمت کا بندوبست بھی کر دیتا۔ میں نے اس بات کا ذکر اپنے والدین سے نہیں کیا کیونکہ کریمر ان سے معافی مانگنے کے لیے ہمارے گھر آنا چاہ رہا تھا۔ اگر میں انہیں اس بارے میں بتا دیتا تو ڈیڈی کبھی اسے گھر میں داخل نہ ہونے دیتے۔

میرے والدین شدید صدمے کی کیفیت میں تھے۔ ان کے لیے مقدمے کا خارج ہونا ایسا ہی تھا جیسے میرے بھائی کو دوبارہ مار دیا گیا ہو۔ ان کے زخم ایک بار پھر ہرے ہو گئے تھے کیونکہ انہیں یقین تھا کہ قاتل کو اس کے کیے کی سزا ضرور ملے گی۔ مقدمہ خارج ہو جانے سے انہیں شدید مایوسی ہوئی۔

گارنٹی

کرائے داری کے تمام تر جھگڑے جھمیلوں کے باوجود قمر لبے دس برس سے پوری مستقل مزاجی سے اسی گھر کے مکین تھے۔ روزمرہ کے استعمال کی اشیا کے علاوہ باقی سب ساز و سامان جوں کا توں اسی جگہ رکھا ہوا تھا جہاں وہ روزِ اول ڈھیر کیا گیا تھا۔

ایک دن انہیں گھر کی صفائی ستھرائی کا خیال آیا تو وہ ہمت کر کے اس عظیم کام میں لگ گئے۔ ڈھیروں کے حساب سے کاٹھ کباڑ نکالتے ہوئے ایک سات سال پرانی رسید ان کے ہاتھ لگی جو ایک کمپنی سے خریدے ہوئے نئے جوتے کی مرمت کے لیے جاری کی گئی تھی۔

وہ بے پروا آدمی تھے۔ قیمتی جوتا دے کر بھول بھال گئے۔ رسید ملی تو انہیں بڑا قلق ہوا۔ جوتا ملنے کی امید نہیں تھی۔ سات برس میں اس پر نہ جانے کیا کچھ گزر چکی ہوگی۔

ایک موہوم سی امید کے سہارے وہ رسید لے کر اگلے دن جوتا کمپنی کی دکان پر پہنچ گئے۔ ملازم نے تاریخ کے بجائے رسید کا نمبر دیکھا اور دکان کے ایک دور افتادہ نیم تاریک گوشے میں گھس گیا۔ کچھ دیر بعد وہ خالی ہاتھ نمودار ہوا تو قمر لبے جوتے کی بازیابی سے مایوس ہو گئے۔

”سر! آپ کو زحمت ہوگی، کام زیادہ تھا۔ آپ کا جوتا تو مل گیا ہے... پرسوں تک مرمت ہو جائے گی۔ اگلے دن آپ آ کر لے جائیں۔“ ملازم کی وہ اطلاع سن کر قمر لبے کا سر چکرا گیا۔ مرمت کے لیے سات سال بھی ناکافی ثابت ہوئے تھے۔ جوتے بیچتے ہوئے جو مستعدی اور پھرتی دکھائی جاتی ہے، مفت کی مرمت میں اس کا عشرِ عشیر بھی نظر نہیں آتا... کیسی گارنٹی اور کہاں کی گارنٹی... غنیمت یہ ہوا کہ ملازم نے رسید کی تاریخ نہیں دیکھی ورنہ وہ کہہ سکتا تھا کہ جوتے کی گارنٹی کی مدت برسوں پہلے ختم ہو گئی... اب مرمت کے پیسے دینے ہوں گے۔

کراچی سے بلال علیم کی مستعدی

ممی بالکل ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی تھیں۔ میں ہر روز ان سے ملنے جاتا۔ وہ ایک روبوٹ کی طرح پورے گھر میں پھرتی رہتی تھیں۔ مجھے شک تھا کہ ان کی ذہنی کیفیت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ کپڑا ہاتھ میں لیے ان چیزوں کو بھی صاف کرتی رہتیں جہاں صفائی کی ضرورت نہیں تھی۔ بلاضرورت کھانا بنا لیتیں۔

ڈیڈی کی حالت اس سے بھی زیادہ خراب تھی۔ وہ ہمیشہ سے ایک مضبوط اور متوازن شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے تیس سال ایک فون کمپنی میں کام کیا اور ساری زندگی کھمبوں پر چڑھتے اترتے رہے۔ چاہے موسم کتنا ہی خراب کیوں نہ ہو، انہوں نے ایک مرتبہ بھی اس کی شکایت نہیں کی۔ پانچ برس پہلے انہیں گلے کا کینسر ہو گیا تھا اور وہ موت کے منہ میں جاتے جاتے بچے۔ اب وہ بہت کمزور ہو گئے تھے اور پہلے جیسی زندگی گزارنے کے قابل نہیں رہے تھے۔

انہوں نے ساری زندگی ہمارا خیال رکھا اور اب میں ان کی امیدوں کا مرکز تھا۔ ان کے بال سفید ہو چکے تھے اور کھال جگہ جگہ سے لٹک رہی تھی۔ وہ خود کچھ کرنے کے قابل نہیں تھے۔ گو کہ انہوں نے اس بارے میں زبان سے کچھ نہیں کہا لیکن جب میں ان کی طرف دیکھتا تو مجھے ان کی آنکھوں میں ایک واضح پیغام نظر آتا جیسے کہہ رہے ہوں۔۔۔ ”تمہیں ہی کچھ کرنا ہوگا کیونکہ تم جانتے ہو کہ میں کسی قابل نہیں رہا۔“

لیکن مجھ جیسا شخص کیا کر سکتا تھا جس نے کبھی ایک پتھر بھی نہ اٹھایا ہو کیونکہ مجھے خود اپنی صلاحیتوں کا علم نہیں تھا۔ میں نے کبھی کسی جنگ میں حصہ نہیں لیا اور نہ ہی کسی ایسے تنازعے میں ملوث ہوا جس سے معلوم ہوتا کہ مجھ میں کتنی صلاحیت ہے۔

مجھے پہلی بار زندگی میں یہ محسوس ہوا کہ اپنے آپ کو آزمانے کا یہی ایک موقع ہے۔ پہلے مجھے رچی سے نمٹنا ہوگا، اس کے بعد شاید کریمر کی بھی باری آجائے۔ رچی کو تلاش کرنا بہت مشکل تھا۔ مسٹر کی رہائش گاہ کے بارے میں تو سب ہی جانتے تھے کہ اس کا مکان شہر کے ایک بہترین علاقے میں ہے لیکن جب سے رچی پر میرے بھائی کے قتل کا الزام عائد ہوا تھا، وہ لوگوں کی نظروں سے تقریباً اوجھل ہو گیا تھا۔ ایک افواہ یہ بھی تھی کہ وہ کسی دوسرے قصبے میں اپنے باپ کے ایسے مکان میں چھپا ہوا ہے جو بظاہر اس کے نام پر نہیں ہے۔

مقدمہ ختم ہونے کے بعد میں نے اس کے باپ کی نگرانی شروع کر دی لیکن مجھے رچی کہیں نظر نہیں آیا۔ میں نے قصبے میں اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مجھے یہ کام بڑی رازداری سے کرنا تھا اور صرف انہی لوگوں سے اس بارے میں بات کر سکتا تھا جو قابلِ بھروسا ہوں۔ میں ہر ایک سے تو یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ مجھے رچی کا پتا بتاؤ تاکہ میں اس کے سینے میں گولی اتار دوں۔

میں بڑی احتیاط سے اسے تلاش کر رہا تھا کہ میری نظر اخبار پر پڑی اور میرا کام آسان ہو گیا۔ اس وقت تک میں اپنے ایک دوست مائیک کی مہربانی سے ایک ریوالور حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اپنا کام ختم کرنے کے بعد اسے کہیں پھینک دوں۔ مجھے بھی ایسی ریوالور اپنے پاس نشانی کے طور پر رکھنے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔

میں نے وہ ریوالور اپنی کار کے گلوو باکس میں رکھا اور منزلِ مقصود کی جانب روانہ ہو گیا۔ میں نے تصویر میں جن سڑکوں کے بورڈ پڑھے تھے، وہ راہ ہوے میں نہیں بلکہ دوسرے قصبے میں تھیں لیکن وہاں تک کا راستہ بالکل صاف تھا۔ میں دس منٹ میں اس جگہ پہنچ گیا۔ میں نے کار میں بیٹھے بیٹھے چوراہے کا جائزہ لیا۔ جنوب مغربی کونے پر سڑک کے بورڈ نظر آ رہے تھے جن سے رچی کی رہائش گاہ کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ وہاں سفید رنگ کے مکانات کی ایک طویل قطار تھی۔ وہ تعداد میں دس یا بارہ ہوں گے۔ ہر ایک مکان کے گراؤنڈ فلور پر کار پورچ اور گیراج تھا جبکہ اس کے اوپر دو منزلیں اور بنی ہوئی تھیں۔

یہ معلوم کرنا آسان نہیں تھا کہ ان میں سے رچی کا مکان کون سا ہے۔ یہ تو ممکن نہیں تھا کہ میں ہر مکان کے دروازے پر دستک دے کر اس کے بارے میں معلوم کرتا۔ میں دوسری طرف چلا گیا جہاں ایک منزلہ مکان بنے ہوئے تھے۔ دوپہر ہو چکی تھی اور یہ بچوں کے اسکول سے آنے کا وقت تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ کتنی دیر انتظار کرنا پڑے گا تاہم مجھے صبر کرنے کی ضرورت تھی۔ میں کئی دنوں سے اس موقع کی تلاش میں تھا اس لیے چند گھنٹے انتظار کرنا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔

یہ تقریباً چھ بجے کا وقت تھا جب میری نظر رچی پر پڑی۔ سورج غروب ہو رہا تھا لیکن اتنی روشنی ضرور تھی کہ مجھے رچی کو پہچاننے میں کوئی مشکل نہیں ہوئی۔ اس نے گاڑی کی رفتار آہستہ کی اور بائیں جانب والی سڑک پر مڑ گیا پھر اس نے تیسرے مکان کا گیٹ کھولا اور گاڑی گیراج میں کھڑی کر دی۔

مجھے رچی کی رہائش گاہ کا پتا چل گیا تھا۔ مجھے اگلا لائحہ

عمل طے کرنا تھا۔ شاید میں رات کے وقت اس کے مکان میں داخل ہونے کی کوشش کرتا یا پہلے کہیں سے ایک سائلنسر حاصل کرتا تاکہ مائیک کے دیے ہوئے ریوالور میں فٹ کر سکوں۔ ابھی میں ان سب باتوں پر غور کر رہا تھا کہ اچانک میری نظر ایک شخص پر گئی۔ وہ کرس کریمر تھا جو پیدل چلتا ہوا رچی کے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ وہ اتنا احمق نہیں ہو سکتا کہ کسی قاتل سے رشوت لینے کے بعد اس سے کوئی تعلق قائم رکھے اور مقدمہ ختم ہونے کے ایک ہفتے بعد ہی اس سے ملنے چلا جائے لیکن وہ کریمر ہی تھا۔ اس نے جینز اور جیکٹ پہن رکھی تھی۔ وہ محتاط انداز میں قدم بڑھاتا ہوا رچی کے مکان کے سامنے رکا، دائیں بائیں دیکھا اور اندر داخل ہو گیا۔

اوہ میرے خدا۔۔۔ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ میں اس سے پہلے کریمر کے بارے میں جو کچھ سوچ رہا تھا، یہ اس سے بھی بدتر معاملہ نکلا۔ بظاہر یہی لگ رہا تھا کہ وہ دونوں دوست تھے لیکن کسی کو یہ بات معلوم نہیں تھی اور بل بھی اس بارے میں کچھ نہیں جان سکا۔ میرے جسم میں آگ بھر گئی۔ بھائی کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔ میں نے اپنی ماں کے بارے میں سوچا جو چلتی پھرتی لاش بن چکی تھی۔ پھر مجھے اپنے باپ کے بوڑھے جسم اور التجا بھری آنکھوں کا خیال آیا جو کہہ رہی تھیں، اب تم ہی کچھ کر سکتے ہو۔

یہی وہ وقت تھا جب میں نے اپنے آپ کو دریافت کیا۔ میں نے کسی جنگ میں حصہ نہیں لیا تھا لیکن اس وقت مجھے معلوم ہو گیا کہ میں وہ شخص ہوں جو لڑنے سے نہیں گھبراتا۔ ریوالور پر میری گرفت مضبوط ہو گئی۔ میں نے ہاتھ سے کار کا دروازہ کھولا اور باہر آگیا۔ اب میرے قدم رچی کے مکان کی جانب بڑھ رہے تھے۔ میں نے کریمر کو دروازے کی گھنٹی بجاتے دیکھا۔ رچی نے دروازہ کھولا، جیسے وہ اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ کریمر نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب میرے قدم تیزی سے مکان کی جانب بڑھ رہے تھے۔

مجھے اپنے پکڑے جانے کا پورا یقین تھا کیونکہ میں نے پہلے سے کوئی منصوبہ بندی نہیں کی تھی۔ کسی ایسے شخص کو تیار نہیں کیا تھا جو جائے وقوعہ سے میری غیر حاضری کا ثبوت دے سکتا اور نہ ہی یہ سوچا کہ ریوالور کو کہاں دفن کروں گا۔ اب ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ میرے پاس منصوبہ بندی کرنے یا تفصیلات کے بارے میں سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ مجھے پورا کھیل تیزی سے نمٹانا تھا۔۔۔ یعنی ایک وار میں دو دشمنوں کا صفایا۔ میرے گھنٹی بجانے پر جو بھی دروازہ کھولتا، پہلے میں اسی کو نشانہ بناتا اور اس کے بعد اندر جا کر دوسرے کو بھی اڑا دیتا۔

میں اس کے گھر سے کچھ فاصلے پر تھا کہ رچی کے گھر سے ایک زوردار آواز آئی۔ پہلے تو لگا جیسے کوئی وزنی چیز گری ہے۔۔۔ لیکن نہیں، وہ گولی چلنے کی آواز تھی۔ میرے قدم زمین میں گڑ گئے پھر بیرونی دروازہ کھلا، وہاں کریمر کھڑا ہوا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ رچی کہاں چلا گیا۔ وہ کریمر کو دروازے تک چھوڑنے کیوں نہیں آیا؟ لیکن وہ کیسے آ سکتا تھا۔ چند سیکنڈ میں سارا منظر واضح ہو گیا۔ رچی ڈیوڑھی کے فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اس کا جسم بے جان ہو چکا تھا۔

کریمر ابھی تک وہاں کھڑا رچی کی لاش کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سائلنسر لگا ہوا پستول یوں تیار تھا جیسے رچی کے جسم میں زندگی کی ذرا سی بھی رمق پاتے ہی وہ دوبارہ گولی چلا دے گا۔ اس نے آخری بار اسے دیکھا جیسے یقین کرنا چاہ رہا ہو کہ اس نے اپنا کام خوش اسلوبی سے کیا ہے۔ پھر وہ مڑا تو اس کی نظر مجھ پر گئی۔ وہ لمحہ بھر کے لیے رک گیا۔ اسے میرے آنے کی توقع نہیں تھی اس لیے اس کا حیران ہونا فطری امر تھا۔ پھر اس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔

اس نے میرے دائیں ہاتھ میں پکڑا ہوا ریوالور دیکھا۔ میرے چہرے پر نظر ڈالی، دوبارہ ریوالور کو دیکھا پھر اس کی سمجھ میں آگیا کہ میں وہاں کیوں آیا تھا۔ اس نے خفیف سے انداز میں سر کو جنبش دی اور مسکرا دیا جیسے کہہ رہا ہو کہ میں نے تمہارا قرض اتار دیا۔ پھر وہ پستول پہلو میں اڑس کر سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے آ گیا۔ میرے پاس آ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا اور ایک بار پھر سر کو ہلکی سی جنبش دی۔ میں کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن اس نے مجھے اس کا موقع ہی نہیں دیا اور میرے پاس سے گزرتا ہوا چلا گیا۔

سرکاری وکیل بل نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ کریمر ہر حال میں مجرم کو اس کے انجام تک پہنچاتا ہے۔ کریمر سے جو کوتاہی ہوئی تھی اور جس کے نتیجے میں رچی کا مقدمہ خارج ہو گیا تھا، اسے اس کا ازالہ تو کرنا ہی تھا۔ میں اس واقعے کا واحد گواہ تھا۔ جج نے ایک گواہ کو نظرانداز کرنے پر کریمر کو سرزنش کی تھی۔ اس بار کسی جج کو یہ موقع نہیں ملتا کیونکہ سرکاری طور پر میں تو سرے سے وہاں موجود ہی نہیں تھا۔ نہ مجھے رچی کی رہائش گاہ کا کوئی علم تھا۔
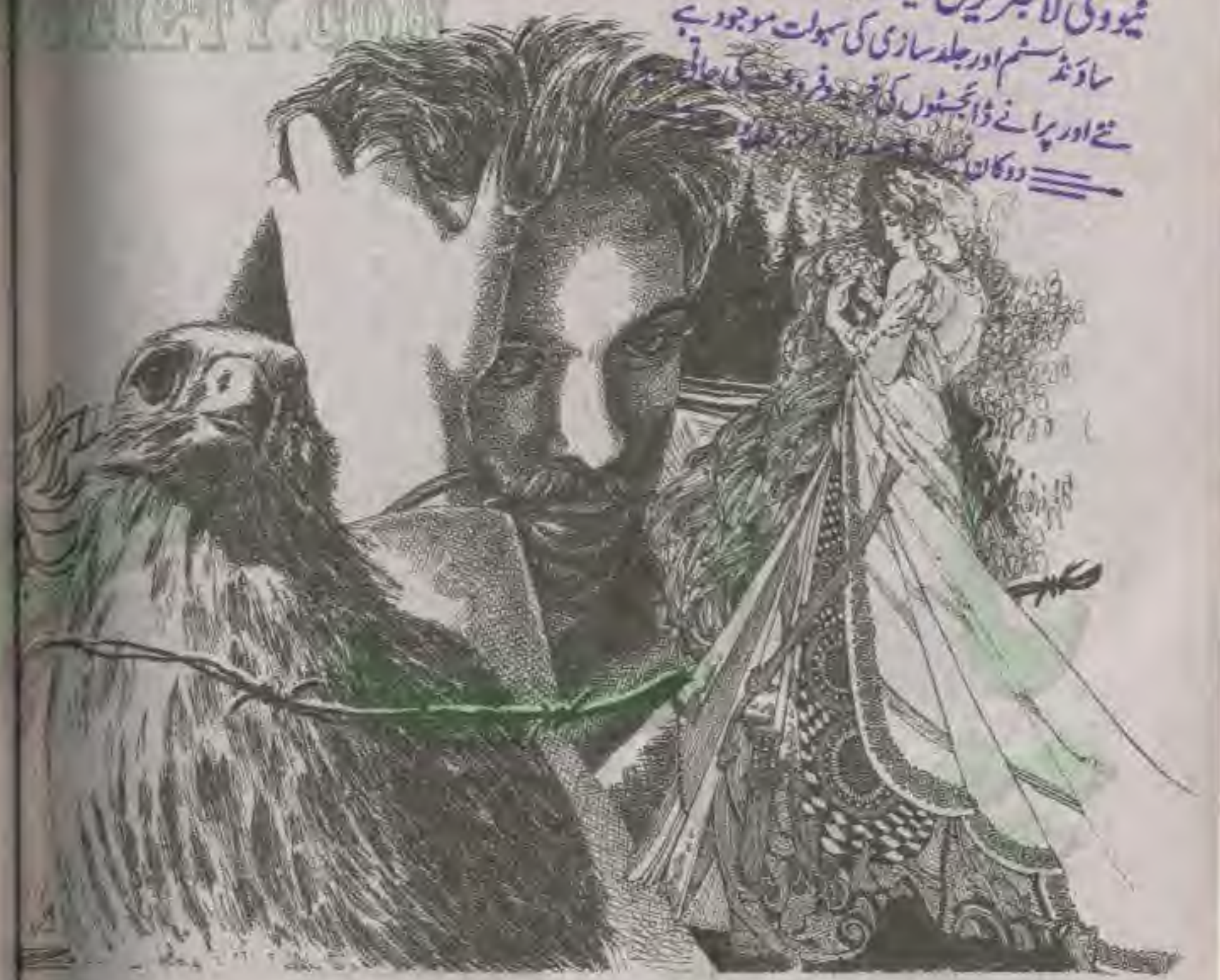
قسط 57:

اسما قادری

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں
لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور بااثر سماج کے
روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ
جاتے ہیں مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ
ہیں، بالاتر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح
ٹھہرتی ہے یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے ... ایسی
روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے
جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے۔
پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔ محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقور
میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہو جاتی
ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ
اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے۔ زندگی کی بساط اور وقت کے
دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں ... کبھی بازی پلٹ
بھی جاتی ہے۔ بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے
... اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا
ہے۔ جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور
کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی
لامتناہی سلسلہ

قسمت کی چالیں
مقدر کا کھیل ملنے اور
بچھڑ جانے والوں کی کہانی

بارسوخ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہریار عادل ایک پرجوش جوان جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیرنگیں ضلع کے ایک شہر پیرآباد کا چودھری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہریار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا اور دونوں کے درمیان مخاصمت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ چودھری کی بیٹی کشور، آفتاب سے خفیہ نکاح کر لیتی ہے۔ ماہ بانو کا تعلق بھی پیرآباد سے ہے۔ چودھری افتخار جب ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر آجاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چودھری کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ گورا جس کا نام ... میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ چودھری کو ماہ بانو کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ ادھر کشور آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ اسلم اور ماہ بانو شادی کے بندھن میں بندھ جاتے ہیں۔ ماریا کرنل توحید کو رجھانے کی کوشش میں پکڑی جاتی ہے تاہم راستے میں را کے ایجنٹوں کی فائرنگ سے گاڑی میں آگ لگنے کے سبب ماریا بری طرح جھلس جاتی ہے اور اسپتال میں دم توڑ دیتی ہے۔ ماریا کی ماں سنتھیا جوزف ورما سے انتقامی کارروائی کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ شہریار اللہ آباد اور نورپور دورے کے لیے نکلتا ہے۔ اس کی گاڑی کو بم سے اڑا دیا جاتا ہے لیکن وہ محفوظ رہتا ہے۔ شہریار کو کرنل توحید اپنی فورس میں شامل ہونے کا کہتے ہیں۔ شہریار فورس میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ شہریار کی شناخت چھپانے اور فورس میں آزادانہ کام کرنے کے لیے شہریار کے فرضی ایکسیڈنٹ کی افواہ پھیلا دی جاتی ہے۔ شہریار، ماہ بانو اور اسلم کو امریکا بھجوا دیتا ہے۔ شہریار انڈرگراؤنڈ ہو جاتا ہے اور اس کی ٹریننگ اور حلیے میں تبدیلی کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ کشور اور آفتاب بھی نیویارک پہنچ جاتے ہیں مگر وہاں ایک شاپنگ سینٹر میں ان کی ملاقات مراد شاہ سے ہو جاتی ہے۔ مراد شاہ، کشور اور آفتاب کو گھر بلاتا ہے۔ وہاں اچانک چودھری سے ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ چودھری کشور اور آفتاب کو ٹھکانے لگانے کے لیے کرائے کے آدمیوں کا سہارا لیتا ہے۔ تاہم وہ بچ جاتے ہیں۔ شہریار کو بھارت ایک اہم مشن پر بھیجنے کا فیصلہ ہوتا ہے جہاں سے اسے ڈاکٹر فرحان کو رہا کرانے کا مشن سونپا جاتا ہے۔ جیل سے نکال کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ سلو کو شہریار کے پاس پہنچا دیا جاتا ہے۔ سلو اور شہریار دہلی پہنچ جاتے ہیں۔ سلو کوئی ایف بی آئی ... میں تھوڑی بہت تبدیلی کرتے ہیں۔ جاوید علی، را کے چیف سے حاصل شدہ معلومات کے مطابق ایک مساج سینٹر میں پہنچتا ہے۔ وہاں ان کے مددگار ان کے ... ہے جو مینہ را کی ایجنٹ ہوتی ہے۔ جاوید علی کے ساتھی وہاں آپریشن کرتے ہیں اور اس عورت کو اٹھا لاتے ہیں۔ ادھر سلو اور شہریار کو گرفتار کر لیا جاتا ہے اور انہیں را کے ایک ٹھکانے پر پہنچا دیا جاتا ہے۔ تاہم جب پوچھ گچھ کا وقت آتا ہے تو سلو اور شہریار انند اور اس کے اہلکاروں پر قابو پا لیتے ہیں۔ وہاں متعدد افراد کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد وہ را کے ٹھکانے کو تباہ کر دیتے ہیں۔ ادھر ماہ بانو چیک اپ کے لیے اسپتال جاتی ہے مگر واپس گھر نہیں پہنچتی۔ اسلم اپنے طور پر ماہ بانو کی تلاش کا کام کرتا ہے۔ شہریار، سلو کو بھائی جی کے آدمی گھیر لیتے ہیں تاہم عبدل سے واقفیت کی بنا پر انہیں رعایت دی جاتی ہے اور انہیں بھائی جی کے پاس پہنچا دیا جاتا ہے۔ شہریار اور سلو ڈاکٹر فرحان کو را کے شکنجے سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تاہم انہیں عارضی طور پر عائشہ نامی عورت کے گھر پناہ لینی پڑتی ہے۔ اسلم، ماہ بانو کو قید کرنے والوں کے خفیہ ٹھکانے تک پہنچ جاتا ہے اور وہ بھی ماہ بانو کے ساتھ قید کر لیا جاتا ہے۔ تاہم وہ ایڈی کی مدد سے قید سے نکل جاتا ہے اور مارک اور دیگر افراد پر قابو پا کے ماہ بانو کو وہاں سے نکال لاتا ہے۔ شہریار، سلو اور ڈاکٹر فرحان ممبئی میں بھائی جی کے ٹھکانے پر پہنچ جاتے ہیں اور اشوک کو مارنے کا پروگرام بناتے ہیں اور اسے ختم کر دیتے ہیں۔ ادھر میجر ذیشان، مشابرم خان کو آرلینڈو بھیجتا ہے تاکہ وہ ماہ بانو اور اسلم کو بازیاب کرا سکے۔ اسلم جنگل میں سفر کے دوران پروفیسر ہنری کی بائیک کی آواز سن کر اس کا تعاقب کرتا ہے اور دونوں لڑائی کے دوران دلدل میں گر جاتے ہیں۔ ماہ بانو ایڈی کی مدد سے جنگل سے نکل کر کشور تک پہنچ جاتی ہے۔ ادھر شہریار کو را والے اٹھا کر لے جاتے ہیں اور تشدد کا ہر حربہ آزماتے ہیں۔ سلو کا ... بارے میں استفسار کرتا ہے تاہم شہریار زبان نہیں کھولتا۔ شہریار کی بے ہوشی کے دوران سلو وہاں پہنچ جاتا ہے اور وہ اور شہریار مل کر را کے تمام اہلکاروں کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ بھٹناگر وہاں پہنچتا ہے تاہم وہ اسے بے بس کر کے وہاں سے فرار ہو جاتے ہیں۔ ادھر ماہ بانو کو آرلینڈو سے نکال کر نیویارک مراد شاہ کے گھر بھیج دیا جاتا ہے۔ شہریار، سلو، ڈاکٹر فرحان اور عائشہ کے ہمراہ سمندری راستے سے انڈیا سے نکلنے کے لیے لانچ پر سوار ہو جاتے ہیں۔ یہ سارا انتظام عبدالرحمان کی بدولت ہوتا ہے۔ انہیں سمندر میں موجود چینی بحری بیڑے تک پہنچنا تھا جو انہیں یہاں سے بحفاظت نکال لیتا۔ لیکن کھلے سمندر میں ان کا ٹکراؤ ایک دوسری لانچ سے ہو جاتا ہے جس سے ان پر راکٹ لانچر فائر کیا جاتا ہے۔ وہ بھی لانچر فائر کرتے ہیں اور تعاقب میں آنے والی لانچ الٹ جاتی ہے۔ مزید آگے جانے کے بعد انہیں لانچ پر لے جانے والا... بوڑھا شخص بتاتا ہے کہ طوفان آنے والا ہے۔ تب ہی انہیں پتا چلتا ہے کہ تین بڑی لانچیں انہیں گھیرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

تاریکی بے تحاشا تھی۔ آسمان پوری طرح بادلوں سے گھر چکا تھا اور یہ بادل اتنے دبیز تھے کہ سورج کی کرنوں کو ان سے گزر کر نیچے آنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ دن میں ہی رات اور وہ بھی بہت گہری سیاہ رات کا سماں پیدا ہو گیا تھا اور ساتھ ہی یہ ہولناک خبر بھی ان تک پہنچ گئی تھی کہ ان کی لانچ کو تین اطراف سے گھیرا جا چکا ہے۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ ساکت منتظر تھے کہ اندھیرے سے کیا ظہور میں آتا ہے۔

لانچ کے کنٹرول روم سے شہریار ذیشان کی بتائی ہوئی فریکوئنسی پر چینی جہاز کو مدد کا پیغام دے چکا تھا لیکن ظاہر ہے وہاں سے مدد آنے میں کچھ وقت لگتا اور اس عرصے میں انہیں اپنا دفاع خود کرنا ہوتا۔ ابھی تو وہ صحیح طور پر یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ انہیں گھیرنے والے کون ہیں؟ بھارتی سمندری حدود سے نکلنے کے بعد بھی زیادہ امکان تو یہی تھا کہ یہ بھارتی ہی ہوں گے جو ان کی بو سونگھتے ہوئے یہاں تک پہنچ گئے ہوں گے۔ چند منٹوں کے اعصاب شکن انتظار

کے بعد آخرکار اس امر کی تصدیق ہو گئی۔ گھیرنے والوں کی طرف سے اعلان کیا جانے لگا۔

"تمہاری لانچ کو گھیر لیا گیا ہے۔ بہتر ہے کہ کوئی غلط حرکت کیے بغیر ہتھیار ڈال دو اور گرفتاری دے دو۔" یہ اعلان تین بار دہرایا گیا لیکن ان کی طرف سے کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ وہ سب ہتھیار سنبھالے خاموشی سے اپنی اپنی پوزیشن پر دبکے رہے۔ ان کی لانچ پر موجود افراد میں سے عائشہ اور ڈاکٹر فرحان لڑنے بھڑنے والے لوگ نہیں تھے لیکن انہوں نے بھی ہلکے ہتھیار سنبھال لیے تھے۔ عائشہ اور ڈاکٹر فرحان دونوں ہی شہریار کی پشت پر تھے۔

"آپ دونوں کو تیرنا آتا ہے؟" کسی خیال کے تحت شہریار نے سرگوشی میں ان دونوں سے دریافت کیا۔

"سوئمنگ پول کی حد تک تجربہ ہے، سمندر میں تیرنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔" عائشہ نے جواب دیا۔

"مجھے تیراکی آتی ہے البتہ اپنے اسٹیمنا کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔" ڈاکٹر فرحان کا جواب بھی زیادہ حوصلہ افزا نہیں تھا۔ ظاہر ہے اتنے برس را کی قید میں گزارنے کے بعد وہ جو اپنی اصل عمر سے کہیں زیادہ عمر رسیدہ لگنے لگے تھے، اپنے اسٹیمنا کے بارے میں کیسے یقین سے کچھ کہہ سکتے تھے۔

"چلیں کوئی بات نہیں، اللہ مدد کرے گا۔ میں نے ایسے ہی احتیاطاً آپ سے پوچھ لیا تھا۔" شہریار نے انہیں تسلی دی اور اگلے اعلان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اعلان کرنے والا لانچ کے مالک سے مخاطب تھا۔

"رنگھاوا... ہماری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ اپنی لانچ پر موجود ہمارے دشمنوں کو ہمارے حوالے کر دو۔ ہم تمہیں اور تمہارے قبیلے والوں کو جانے دیں گے۔" اب شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ وہ را والے تھے جو ایک بار چوٹ کھانے کے بعد دوبارہ پہلے سے زیادہ تیاری کے ساتھ ان کے پیچھے آئے تھے۔

شہریار نے خود سے ذرا آگے کھڑے رنگھاوا کی طرف دیکھا۔ تاریکی میں بوڑھا اسے بس ایک سائے کی طرح ہی نظر آ رہا تھا۔ ایک ایسا سایہ جو بالکل سیدھا اور ساکت کھڑا ہوا تھا۔ لانچ والوں کی طرف سے اعلان ہونے پر بھی اس سائے میں چند سیکنڈ تک کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ وہ اپنی زبان میں زور سے کچھ بولا۔ ردعمل میں اس کے قبیلے کے دو نوجوانوں نے اعلان کرنے والی لانچ کی طرف... بیک وقت دو راکٹ لانچر فائر کیے۔ اندھیرے کے باوجود انہوں نے صرف آواز سے سمت کا تعین کر کے حیرت انگیز نشانہ لیا تھا۔ پل بھر میں ہی وہ لانچ آگ کا گولہ بن گئی۔ جلتی ہوئی لانچ کی روشنی نے ان پر منظر کو کسی قدر واضح کر دیا اور انہیں تباہ ہونے والی لانچ کے علاوہ وہ دونوں لانچیں بھی دکھائی دے گئیں جن میں سے ایک دائیں پہلو پر اور دوسری عقب میں موجود تھی۔ دونوں لانچوں پر موجود افراد اپنی لانچ کو نشانہ بنتے دیکھ کر طیش میں آ گئے اور ان کی لانچ کی سمت بے تحاشا فائرنگ کی جانے لگی جواب میں انہوں نے بھی فائرنگ شروع کر دی۔ فائرنگ کی آوازوں سے فضا گونج اٹھی۔

دونوں طرف سے بھاری ہتھیاروں کا بے دریغ استعمال کیا جا رہا تھا۔ گولیاں سائیں سائیں کی آوازوں کے ساتھ ان کے سروں کے اوپر سے گزر رہی تھیں۔ کچھ اندازہ نہیں تھا کہ کس کا کتنا نقصان ہو رہا ہے۔ سمندر کی سرکش لہروں نے جلتی ہوئی لانچ کی باقیات کو بہت تیزی سے تتر بتر کر دیا تھا اس لیے روشنی غائب ہو چکی تھی۔ را والوں کو ان پر ایک فوقیت حاصل تھی کہ وہ جنگی مقاصد کے لیے استعمال ہونے والی لانچوں پر سوار تھے جبکہ وہ اسلحے سمیت دیگر بہت سی اہم اشیا سے لیس ہونے کے باوجود ایک عام لانچ پر سوار تھے۔

شہریار اور اس کے ساتھیوں کے پاس تو بلٹ پروف جیکٹس بھی تھیں جو انہوں نے لانچ پر سوار ہونے سے قبل ہی حسین کی کھلی پیشکش کے نتیجے میں اسلحے کے ساتھ حاصل کر لی تھیں۔

"لانچ میں کئی سوراخ ہو گئے ہیں اور پانی اندر آ رہا ہے۔" رنگھاوا کے آدمیوں میں سے کسی نے یہ خوفناک اطلاع سنائی۔ لانچ میں پانی آنے کا مطلب تھا کہ لانچ کچھ دیر میں ڈوب جاتی اور ساتھ ہی انہیں بھی لے ڈوبتی۔

"تم اور تمہارے ساتھی لائف جیکٹس پہن لو۔ لانچ پر پانچ چھ لائف جیکٹس موجود ہیں۔" خبر سن کر سراسیمہ ہونے کے بجائے بوڑھے رنگھاوا نے پرسکون لہجے میں شہریار کے قریب آ کر اس سے کہا۔

"تمہارے ساتھیوں کا کیا ہوگا؟" صرف پانچ چھ لائف جیکٹس کی موجودگی کی اطلاع سن کر شہریار نے بے اختیار ہی پوچھا۔ ان کی اس گفتگو کے دوران بھی فائرنگ کا تبادلہ جاری تھا اس لیے انہیں قدرے بلند آواز میں گفتگو کرنی پڑ رہی تھی۔

"ہم سمندر کی لہروں پر کھیل کود کر پلے ہیں۔ ہمیں

سمندر کچھ نہیں کہتا۔ یہ چند لائف جیکٹس بھی بس اس لیے پڑی ہیں کہ مشکل وقت میں کمزور عورتوں یا بچوں کے کام آسکیں۔" رنگھاوا نے بے نیازی سے جواب دیا اور پھر اپنے کسی آدمی کو لائف جیکٹس لانے کا حکم دینے کے بعد ایک بار پھر شہریار کی طرف متوجہ ہوا۔

"ہمارے پاس ایک لانچر بچا ہے۔ لانچ ڈوب گئی تو بیکار ہو جائے گا۔ کہو تو اسے بھی فائر کر کے ایک اور لانچ کا کام تمام کرنے کی کوشش کرتے ہیں؟" شہریار اس سوال کا جواب اثبات میں ہی دے سکتا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ زندہ سلامت اس مصیبت سے نکل سکے گا یا نہیں۔۔۔ لیکن بھارتی جتنی بڑی تعداد میں جہنم رسید ہوتے، اسے اتنی ہی خوشی ہوتی۔ ویسے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ بھارتیوں کی طرف سے کوئی لانچر یا میزائل فائر نہیں کیا گیا تھا حالانکہ ان کے لیے یہ زیادہ آسان تھا۔ ان کے ایسا نہ کرنے کا ایک ہی سبب سمجھ آتا تھا کہ وہ انہیں زندہ گرفتار کرنے کے خواہش مند تھے۔

رنگھاوا اس کی رضامندی پاکر اپنے ایک نوجوان کو لانچر فائر کرنے کے لیے ہدایتیں دے رہا تھا۔ اس دوران لانچ کے اسٹور روم سے لائف جیکٹس لاکر ان پانچوں کے حوالے کر دی گئی تھیں جو انہوں نے پہن لی تھیں۔ سلو لائف جیکٹ پہننے کے بعد رنگھاوا کے برابر میں آ کھڑا ہوا اور واحد بچ جانے والے لانچر کو فائر کرنے کے سلسلے میں اس کی رائے کے ساتھ ساتھ اپنی رائے بھی شامل کرتا گیا۔ رنگھاوا سمندر کا شہزادہ تھا جو اس کی ہواؤں کو سونگھ کر بھی بہت کچھ بتا سکتا تھا جبکہ سلو کو قدرت نے بہترین حسیات سے نوازا تھا اس لیے وہ اس بات کا اہل تھا کہ رنگھاوا کو مشورہ دے سکے۔ اس مشاورت کی ضرورت اس لیے پیش آ رہی تھی کہ مختلف سمتوں سے آنے والے فائرز اور چند مخصوص آوازوں کی وجہ سے وہ جانتے تھے کہ ان کی مقابل لانچیں مسلسل حرکت میں ہیں اور سمت بدل بدل کر ان پر فائر کیے جا رہے ہیں۔ خود وہ بھی ایک جگہ نہیں ٹکے ہوئے تھے لیکن اب لانچ میں بھرتے پانی کی وجہ سے اسے حرکت میں رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ روشنیاں دونوں طرف کی لانچوں ہی کی گل تھیں اس لیے سمندر کے سینے پر وہ اندھا کھیل جاری تھا۔

بہرحال سلو اور رنگھاوا کی مشاورت اختتام کو پہنچی اور رنگھاوا کے آدمی کی جگہ لانچر چلانے کی ذمے داری خود سلو نے سنبھال لی۔ لانچر فائر کرنے سے پہلے اس نے زیرلب کچھ پڑھا اور فائر کر دیا۔ یہ دیکھ کر ان سب نے ایک فلک شگاف نعرہ مارا کہ سلو اپنے مقصد میں ناکام نہیں ہے اور ایک لانچ مزید نشانہ بن چکی ہے۔

"اب ہمیں سمندر میں چھلانگ لگا دینی چاہیے۔ لانچ ڈوبنے میں اب زیادہ دیر نہیں لگے گی اور جب یہ ڈوبے گی تو اطراف کی بہت سی چیزوں کو اپنے ساتھ لے کر ڈوبے گی اس لیے اچھا ہے کہ ہم پہلے ہی اس سے دور ہٹ جائیں۔"

رنگھاوا نے انہیں اطلاع دی تو وہ سب تیزی سے حرکت میں آگئے اور ایک ایک کر کے سمندر میں چھلانگ لگانے لگے۔ کلام تیراکی جانتا تھا لیکن پچھلے دنوں ٹانگ پر لگنے والی گولی نے اسے جو نقصان پہنچایا تھا، علاج ہو جانے کے باوجود اس کا مکمل ازالہ نہیں ہو سکا تھا اور خدشہ تھا کہ اسے تیرنے میں دشواری پیش آئے گی۔ لہٰذا لائف جیکٹ کی موجودگی کے باوجود رنگھاوا کے ایک آدمی کو اس کے آس پاس رہنے کی ہدایت کر دی گئی۔ ڈاکٹر فرحان کے ساتھ خود شہریار تھا جبکہ سلو کو عائشہ کے آس پاس رہنا تھا۔ کھلے سمندر میں چھلانگ لگاتے ہوئے وہ جھجک رہی تھی۔ سلو نے اس کا ہاتھ تھاما اور زبردستی اپنے ساتھ لے کر کود گیا۔

بھارتی خود اپنی لانچ کی تباہی کی وجہ سے افراتفری کا شکار تھے۔ لانچر کا نشانہ بننے والی لانچ پوری طرح تباہ ہوئی تھی اور اس سے لائف بوٹس سمندر میں اتاری جا رہی تھیں۔ تیسری لانچ چکر لگاتے ہوئے ذرا فاصلے پر چلی گئی تھی اور اسے پلٹ کر ان تک واپس آنے میں کچھ وقت لگتا اس لیے اس مہلت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ تیزی سے سمندر میں چھلانگ لگا رہے تھے۔ چھلانگ لگانے کے بعد بھی ان کے لیے حالات غیر یقینی ہی تھے۔ کھلے سمندر میں فرار ہو کر کہاں جا سکتے تھے؟ بس ایک امید تھی کہ چینی ان کی مدد کے لیے پہنچ جائیں گے لیکن ان کی آمد کے بھی فی الحال آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔

آخر کار وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ بچ جانے والی بھارتیوں کی لانچ پلٹ کر واپس آ گئی اور لائف بوٹس نے بھی ان کے گرد گھیرا ڈالنا شروع کر دیا۔ کھلے سمندر میں لانچ سے محروم ہونے کے بعد ان کی پوزیشن ویسے ہی بہت کمزور تھی، اوپر سے وہ اسلحے کے استعمال سے بھی محروم ہو گئے تھے۔ کوئی اپنا اسلحہ لے کر کودا بھی تھا تو پانی میں بھیگنے کے بعد وہ ناکارہ ہو چکا تھا۔ بھارتیوں نے ان کی پوزیشن بھانپ لی تھی اور اب لانچ سے ان پر طاقتور سرچ لائٹوں کی روشنی پھینکی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے بالکل تاریکی میں ڈوبا ماحول روشن ہو گیا تھا۔ موت ان کے گرد چکر لگا رہی تھی۔

"تم سب ہمارے نشانے کی زد پر ہو اور تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ خاموشی سے گرفتاری دے دو۔" بچ جانے والی لانچ سے ہونے والا یہ اعلان خود بھجنا گر کر رہا تھا۔ وہ اسے پہچان چکے تھے۔

"اگر تمہیں یقین نہیں ہے تو میں ثبوت بھی دے سکتا ہوں۔" اعلان کے بعد چند سیکنڈ کا بھی انتظار کیے بغیر بھجنا گر نے سفاک لہجے میں کہا اور اس کے الفاظ ختم ہوتے تک لانچ سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ اس فائرنگ کا نشانہ رنگھاوا کے دو ساتھیوں کو بنایا گیا۔ دونوں نوجوانوں کی بھیانک چیخیں فضا میں گونجیں تو سب کے اعصاب جھنجھنا اٹھے۔ کھلے سمندر میں دشمن کی گولیوں کے آگے نہتے وہ سوائے مرنے کے کچھ نہیں کر سکتے تھے چنانچہ شہریار کو وہ فیصلہ کرنا پڑا جو مصلحت کا تقاضا تھا۔ زندگی بچ جاتی تو بچاؤ کے دوسرے راستے تلاش کیے جا سکتے تھے۔

"ہم گرفتاری دینے کے لیے تیار ہیں۔ تمہاری طرف سے اب کوئی گولی نہیں چلنی چاہیے۔" اس نے بلند آواز میں کہا۔

"ٹھیک ہے، لانچ کی طرف آجاؤ۔ کسی نے گڑبڑ کی تو اپنی موت کا خود ذمے دار ہوگا۔" بھجنا گر نے سپاٹ لہجے میں حکم دیا۔ وہ سب اس کے حکم کی تعمیل میں لانچ کی طرف بڑھنے لگے۔ لانچ کے علاوہ لائف بوٹس سے بھی ان کی نگرانی کی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں انہیں لانچ پر چڑھانے کا کام مکمل کر لیا گیا۔

"رنگھاوا۔۔۔ تو اپنے آدمیوں کے ساتھ ایک طرف کھڑا ہو جا۔" بوڑھے رنگھاوا کو حقارت بھرے انداز میں حکم دیا گیا جس کی اس نے خاموشی سے تعمیل کی لیکن اس کے چہرے کے تاثرات اور چال کی تمکنت سے ظاہر تھا کہ وہ اس صورت حال سے رتی برابر بھی خوف زدہ نہیں ہے۔ اس کے اپنے ساتھیوں سمیت ایک طرف ہو جانے کے باعث شہریار اور اس کے ساتھی خود بہ خود ہی ایک طرف ہو گئے۔

دونوں گروہوں کی اس تقسیم کے بعد بھجنا گر لانچ کے کیبن سے برآمد ہوا۔ اس کے ماتھے پر بینڈ ایج تھی جو زیادہ پرانی نہیں لگتی تھی۔ ظاہر تھا کہ بھجنا گر کو ان کے تعاقب میں ہی کوئی نئی چوٹ لگی ہے۔ شاید یہ چوٹ اس وقت لگی تھی جب پہلی بار سمندر میں ان کا آپس میں ٹکراؤ ہوا تھا اور رنگھاوا کی طرف سے چلائے گئے راکٹ لانچر نے بھارتی لانچ کو الٹ دیا تھا۔ اس وقت شہریار کو اس لانچ پر بھجنا گر کی موجودگی کا گمان ہوا تھا۔

"تو آخر میں نے تمہیں ڈھونڈ ہی نکالا۔" بھجنا گر قدم قدم چلتا سلو کے مقابل آ کھڑا ہوا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے طنز سے بولا۔

"عموماً آدمی اپنی موت کے تعاقب میں خود ہی جاتا ہے۔" سلو نے اسی کے لہجے میں دوبدو جواب دیا۔

"ہماری بلی ہم ہی کو میاؤں۔" اس کے جواب پر بھجنا گر زور سے قہقہہ مار کر ہنسا۔

"تم بھول رہے ہو، تم مجھے اپنا شیر کہا کرتے تھے۔" سلو نے اسے یاد دہانی کروائی۔

"چلو یونہی سہی لیکن تمہیں بھی یاد ہو گا کہ شیر کو سارے گر سکھانے والی بلی کو اس کی خالہ کا درجہ حاصل ہے۔" بھجنا گر جیسے اس سے گفتگو کا لطف اٹھا رہا تھا۔

"تم کچھ بھی کہو، شیر کی حکمرانی مسلّم ہے اور شیر ہی بادشاہ ہوتا ہے۔" سلو کیوں پیچھے رہتا۔

"مزہ آ گیا۔ تو تو سچ مچ آج بھی میرا وہی جی دار ہیرو ہے جس کو میں اپنی سب سے شاندار تخلیق کہتا تھا۔۔۔ پر جانے تو راہ کیسے بھٹک گیا اور ان لوگوں کے ساتھ جا ملا جنہوں نے کبھی تیری پروا نہیں کی۔" بھجنا گر بہت ہلکے پھلکے لہجے میں سلو سے گفتگو کر رہا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں جانچ لینے والی گہرائی تھی۔

"تخلیق میں تیری نہیں اپنے رب کی ہوں جسے تُو نے بھٹکانے کی کوشش کی تھی لیکن اپنی تمام تر مکاری کے باوجود تو میری جڑوں کو اکھاڑنے میں ناکام رہا اور آج پھر میں اسی مٹی کا وفادار ہوں جس مٹی سے میرا خمیر اٹھا ہے۔" سلو کا لہجہ بادلوں کی گھن گرج لیے ہوئے تھا اور برستے بادل کے شور کے باوجود اس کی آواز واضح سنائی دے رہی تھی۔

"تیری تو بڑی زبردست برین واشنگ ہوئی ہے ہیرو۔۔۔ پر کوئی بات نہیں، اب تو میرے پاس آ گیا ہے نا تو میں سب ٹھیک کر دوں گا۔ تیرا علاج ہے میرے پاس۔" بھجنا گر بھی کمال ضبط سے کام لے رہا تھا اور ابھی تک اس کے لہجے میں غصہ نہیں جھلکا تھا۔

"تو نے جو غلاظت میرے ذہن میں بھر دی تھی، اس کا واش ہو جانا ہی بہتر تھا اور یاد رکھ کہ اب تو پہلے کی طرح مجھے میرے لوگوں کے خلاف نہیں بھڑکا سکتا۔ کیا ہوا جو انہوں نے میری پروا نہیں کی لیکن تم لوگوں کی طرح مجھے اپنا آلۂ کار بھی تو نہیں بنایا۔ یہ تو تم تھے جو میرے ہاتھوں میرے اپنوں ہی کو مروانا چاہتے تھے اور جب تمہیں لگا کہ میں تمہارے کام کا نہیں رہا تو میری زندگی بھی چھیننے کی

کوشش کی۔" سلو کے پاس اس کی ہر بات کا جواب تھا۔ اس بار بھٹناگر نے لیے... جواب میں کچھ کہنا ضروری نہیں سمجھا اور اپنے آدمیوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"ان سب کو باندھ کر نیچے ڈال دو اور... ہاں، ڈاکٹر صاحب کا خاص خیال رکھنا۔ یہ بڑے بے ایمان ہیں۔ ہم نے اتنے برسوں ان کی خاطر کی اور یہ اپنوں کی شکل دیکھتے ہی فوراً بھاگ نکلے۔ اب بھاگنے کی کوشش کریں تو بے شک گولی مار دینا۔" اس نے احکامات جاری کیے اور پھر رنگھاوا اور اس کے ساتھیوں کے مقابل جا کھڑا ہوا۔

"تجھے میں نے جاں بخشی کی آفر کی تھی رنگھاوا لیکن تیری سمجھ میں نہیں آئی۔ اب تو اس کا نتیجہ بھگت۔ تجھے بڑا مان ہے نا کہ تُو سمندر کا بیٹا ہے تو چل میں تیری اور تیرے ان سب ساتھیوں کی سمندر میں ہی قبر بنا دیتا ہوں۔" اس نے یکدم ہی اپنے ہولسٹر سے ریوالور نکال کر ان لوگوں کی طرف تان لیا۔

"نہیں، تم ان لوگوں کو گولی نہیں مار سکتے۔" شہریار نے اتنی تیزی سے حرکت کی اور بھٹناگر کے ریوالور کے سامنے سینہ تان کر جا کھڑا ہوا کہ انہیں ہتھیاروں کے حصار میں لیے کھڑے سپاہیوں کو اسے روکنے کا موقع بھی نہیں مل سکا۔ اسی وقت ایک اور غیر متوقع واقعہ پیش آیا۔ ان کی لانچ کے اوپر ایک ہیلی کاپٹر چکر کاٹنے لگا اور دور کہیں سے اعلان کیا جانے لگا کہ لانچ والے ہتھیار ڈال دیں کیونکہ انہیں گھیرے میں لیا جا چکا ہے۔

"یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟" بھٹناگر، شہریار اور رنگھاوا دونوں کو ہی بھول کر بڑبڑایا اور تیزی سے کنٹرول روم کی طرف بڑھا۔ اس کے سپاہی جوان سب کو اپنے نشانے پر لیے کھڑے تھے اور بھی زیادہ چوکس نظر آنے لگے۔

"تم لوگ کون ہو اور ہم سے کیا چاہتے ہو؟" چند سیکنڈوں بعد ہی انہوں نے بھٹناگر کی آواز سنی۔

"ہم تم سے ان پاکستانی قیدیوں کا مطالبہ کرتے ہیں جو اس وقت تمہاری لانچ میں موجود ہیں۔ ہماری بات نہ ماننے کی صورت میں تمہاری لانچ کو تباہ کر دیا جائے گا۔" دوسری طرف سے جواب دیا گیا۔ یہ ساری گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی اور لانچ میں موجود ہر شخص سن اور سمجھ رہا تھا۔

"اس صورت میں وہ پاکستانی قیدی بھی مارے جائیں گے جن کا تم ہم سے مطالبہ کر رہے ہو۔ میں تمہیں وارننگ دیتا ہوں کہ ہم سے دور رہو ورنہ ایک ایک کر کے قیدیوں کو ہلاک کر کے ان کی لاشیں سمندر میں پھینکنا شروع کر دیں گے۔" بھٹناگر نے جواباً سفاک لہجے میں دھمکی دی جس کے جواب میں ہر طرف خاموشی چھا گئی۔

اس گفتگو کے دوران اس کے سپاہی عائشہ، کوسر اور ڈاکٹر فرحان کو بیڑیاں پہنا چکے تھے اور سلو کی طرف بڑھ رہے تھے۔ لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے ہونے والے اعلان نے ان لوگوں کو سمجھا دیا تھا کہ قدرے تاخیر سے ہی کی مدد آ چکی ہے لیکن بدقسمتی سے پوزیشن اب بھی بھٹناگر کی مضبوط تھی۔ اس مضبوط پوزیشن کو ان دو شیروں کی کی داری ہی کمزور کر سکتی تھی جن میں سے ایک کو بیڑیوں میں جکڑنے کے لیے بھارتی سپاہی آگے بڑھ رہے تھے جیسے ہی ان میں سے ایک نے سلو کی طرف ہاتھ بڑھایا، وہ تڑپ کر نیچے گرا اور اپنی پنڈلی کے ساتھ بندھا خنجر کھینچ کر اس سپاہی کے سینے میں دے مارا جو فائرنگ کے لیے پر تول رہا تھا۔ بس پھر اس کے بعد تو وہاں بھونچال ہی آ گیا۔ شہریار، رنگھاوا اور اس کے ساتھی سب حرکت میں آ گئے۔

بھارتی اس اچانک بدلتی صورتِ حال پر بوکھلا گئے اور اندھا دھند فائرنگ کرنے لگے۔ ان گولیوں نے ان کے اپنے ساتھیوں کو بھی نشانہ بنایا اور شہریار کی ٹیم بھی متاثر ہوئی لیکن زخم کھانے کے باوجود وہ مقابلے پر ڈٹے ہوئے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ زندگی بچانے کا یہ آخری موقع ہے اس لیے اپنی پوری جان سے جدوجہد کر رہے تھے۔ انہوں نے کئی بھارتیوں سے ان کے ہتھیار چھین لیے تھے اور اب انہیں نشانہ بنا رہے تھے۔ اس مشکل صورتِ حال میں انہیں چینیوں کی طرف سے بھی مدد ملنا شروع ہو گئی۔ وہ اسٹیمر میں نمودار ہوئے تھے اور دور مار رائفلوں کی مدد سے تاک تاک کر بھارتیوں کو نشانہ بنا رہے تھے۔ اس کام میں انہیں اس لیے کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی کہ بھارتیوں نے نیوی کی مخصوص یونیفارم پہن رکھی تھی اور شہریار اور اس کے ساتھی سادہ لباس میں تھے۔ اس لانچ پر بھٹناگر سمیت دو تین افراد ہی ایسے تھے جنہوں نے یونیفارم نہیں پہن رکھی تھی اور یقیناً ان کا تعلق را سے تھا۔ را نے اپنے وسیع اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے انڈین نیوی سے مدد لی تھی اور اب نیوی والے دونوں طرف سے مار کھا رہے تھے۔

کنٹرول روم میں موجود بھٹناگر نے صورتِ حال کی تبدیلی کو محسوس کر لیا تھا اور خود بھی ہتھیار بدست باہر نکل آیا تھا۔ سلو کی اس پر نظر پڑی تو وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس کی جانب لپکا۔ عین اس وقت جب وہ بھٹناگر کے قریب پہنچ گیا تھا، بھٹناگر نے بھی اسے دیکھ لیا۔ اس نے اپنے ہتھیار کی

نال کا رخ سلو کی طرف کیا۔ اب وہ دونوں ہی ایک دوسرے کے مدِمقابل ایک دوسرے پر ہتھیار تانے کھڑے تھے۔ دونوں نے ہی کچھ لمحوں تک آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے کو جانچا اور پھر بیک وقت ہتھیار دور اچھال دیے۔

اب وہ اپنی اپنی طاقت اور ہنر آزمانے کے لیے ایک دوسرے کے سامنے تھے۔ پہلا حملہ بھٹناگر نے کیا۔ وہ تقریباً اڑتا ہوا سلو کی طرف آیا اور ایسا تاثر دیا کہ اس کے دائیں پہلو پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ سلو کو معلوم تھا کہ یہ ڈاج ہے، وہ دائیں کے بجائے اس کے بائیں پہلو پر حملہ کرے گا اس لیے اسی حساب سے جھکائی دی لیکن بھٹناگر واقعی اس کا استاد تھا۔ وہ اس کے ردِعمل کو جانتا تھا چنانچہ بہت آسانی سے اس کے دائیں پہلو کو نشانہ بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ پہلی زوردار ضرب کھا کر سلو کو احساس ہو گیا کہ اپنے استاد کو وہ ان حربوں اور طریقوں سے زیر نہیں کر سکے گا جو اس سے سیکھ رکھے ہیں کیونکہ استاد ہونے کی حیثیت سے بھٹناگر بہرحال اس کے ردِعمل اور نفسیات سب کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اس نے پہلی کے بعد دوسری ضرب بھی بہت تیزی سے لگائی۔ اس کے بعد سلو ہوشیار ہو گیا اور نہ صرف اس کے حملوں کو کامیابی سے روکنے لگا بلکہ خود بھی کئی کامیاب وار کیے لیکن بہرحال اس لڑائی میں ابھی تک کسی کا پلہ بھاری نہیں تھا۔ سلو کے زوردار پنچ نے بھٹناگر کا جبڑا ہلا ڈالا تھا تو بھٹناگر کا ایک مکا اس کے دائیں کان کو اچھا خاصا معضروب کر چکا تھا۔

وہ دونوں دو وحشی جانوروں کی طرح ایک دوسرے پر غرا غرا کر حملے کر رہے تھے اور اس بات سے قطعی بے نیاز ہو چکے تھے کہ ان کے اردگرد کیا ہو رہا ہے۔ انہیں اس بات کی بھی پروا نہیں رہی تھی کہ کوئی اندھی گولی ان کی زندگی کا چراغ گل کر سکتی ہے۔ بھٹناگر کی ایک زوردار کک نے سلو کو اس کی جگہ سے اٹھا کر دور پھینکا تو یہی بات اس کی زندگی کی ضمانت بن گئی اور ایک گولی سنسناتی ہوئی عین اس جگہ سے گزری جہاں کچھ دیر قبل وہ موجود تھا لیکن اسے اس اتفاق کا احساس بھی نہیں ہوا اور اس نے خود کو سنبھال کر بھٹناگر کو جوابی کک رسید کی۔ بھٹناگر اس کی کک سے تو خود کو نہیں بچا سکا لیکن تیزی سے گھوم کر سلو کے پیٹ میں اتنی زور سے سر سے ٹکر ماری کہ وہ ڈکراتا ہوا پیچھے جا گرا لیکن پیٹ میں اٹھتی درد کی لہروں کو کمال ہمت سے ضبط کر کے تیزی سے اٹھا اور بھٹناگر پر حملہ آور ہوا۔ اس بار بھٹناگر اس سے دھوکا کھا گیا۔ اس کی توقع کے بالکل برخلاف سلو اس کے قریب جا کر جھکا اور اس کے اچھے خاصے ڈیل ڈول والے وجود کو دونوں ٹانگوں سے اٹھا کر دور پھینک دیا۔ بھٹناگر اڑتا ہوا جا کر لانچ کی ریلنگ سے ٹکرایا۔ اور اس سے قبل کہ وہ سنبھلتا، سلو اس کے سر پر جا پہنچا۔ اس نے بھٹناگر کے بال جکڑ کر اس کا سر کئی بار ریلنگ سے ٹکرایا۔ اس کا سر پھٹ گیا اور بہنے والا خون اس کے چہرے کو خوفناک بنانے لگا لیکن اس حال میں بھی اس نے ہمت نہیں ہاری اور سلو کے پیروں کو اپنی ٹانگوں کی قینچی میں جکڑ لیا۔ یہ داؤ ایسا تھا جس سے سلو خود کو نکال نہیں پا رہا تھا لیکن اس نے بھی بھٹناگر کو معاف نہ کرنے کا تہیہ کر لیا تھا اس لیے کسی جونک کی طرح اس کی جان سے چمٹا ہوا تھا اور اپنے آزاد ہاتھوں کا استعمال کرتے ہوئے مسلسل اسے نشانہ بنا رہا تھا۔

بھٹناگر نے دونوں ہاتھوں سے ریلنگ تھام کر خود کو سہارا دیا تھا اس لیے وہ ہاتھوں کا استعمال نہیں کر پا رہا تھا۔ سلو نے پے درپے اس کی کلائیوں کو نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ کھڑی ہتھیلیوں کے وار ایسے تھے کہ بھٹناگر کی کلائیوں کی ہڈیاں چیخ جاتیں لیکن وہ بھی کوئی کم نہیں تھا۔ اپنی ٹانگوں کی قینچی میں سلو کے پیروں کو اس طرح جکڑتا جا رہا تھا کہ اس کی ہڈیاں ٹوٹنے کے قریب ہو گئی تھیں۔ بے پناہ اذیت سہتے ہوئے سلو نے اپنے سر کی ایک زوردار ٹکر بھٹناگر کی ناک پر رسید کی۔ کلائیاں مجروح ہونے کی وجہ سے ریلنگ پر اس کی گرفت ویسے ہی ختم ہو گئی تھی۔ ناک پر اس جان لیوا ضرب نے اس کا خود پر سے کنٹرول مزید ختم کر دیا اور وہ الٹ کر سمندر میں جا گرا اس کی ٹانگوں کی قینچی میں جکڑا سلو بھی اس کے ساتھ ساتھ ہی سمندر میں پہنچا۔ یہ بڑی عجیب صورتِ حال تھی۔ پانی میں گرنے کے باوجود بھٹناگر کے پیروں کی گرفت اس پر کمزور نہیں ہوئی تھی البتہ سلو نے اتنا محسوس کر لیا کہ سمندر میں گر کر ذرا سے ہاتھ پیر مارنے کے بعد بھٹناگر کی جدوجہد ختم ہو گئی تھی اور خود اس کا یہ حال تھا کہ ٹانگیں جکڑی ہونے کے باعث وہ خود بھی پوری طرح جدوجہد کرنے سے محروم تھا۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ بھٹناگر بے ہوش ہے یا ہلاک ہو گیا ہے لیکن اتنا جانتا تھا کہ دونوں صورتوں کے باوجود وہ اس کے داؤ سے خود کو آزاد نہیں کر سکتا تا آنکہ کوئی دوسرا فرد اس کی مدد کرے۔ یہ بڑی خوفناک صورتِ حال تھی۔ بھٹناگر سے بھرپور مقابلہ کر کے اسے تقریباً پچھاڑ دینے کے باوجود وہ اس کی گرفت میں تھا اور کچھ بعید نہیں تھا کہ بھٹناگر اپنے بھاری وجود کے ساتھ اسے لے کر سمندر کی گہرائیوں میں ڈبو

دیتا۔ وہ اپنے جسم کو پوری طرح استعمال کرنے کے قابل نہ ہونے کے باعث آخر کب تک سمندر کی موجوں سے لڑ سکتا تھا۔ اور یہاں تو یہ حال تھا کہ اسے اپنے ساتھ بھجنگا گر کے جسم کا بوجھ بھی اٹھانا تھا۔ پامردی سے اس صورتِ حال کا مقابلہ کرتے ہوئے وہ اپنی زندگی کی جنگ لڑتا رہا۔ لانچ پر لگتا تھا کہ صورتِ حال قابو میں آگئی ہے اور چینی غالب آچکے ہیں کیونکہ فائرنگ کا سلسلہ اب تقریباً رک چکا تھا اور لانچ پر سے لوگوں کے بولنے اور چلنے پھرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

''ہیلپ۔'' غلبے کا یقین ہونے پر اس نے بلند آواز میں مدد کے لیے پکارا۔ موجوں کے شور میں اس کی آواز کہاں تک پہنچی، اسے یہ اندازہ لگانے کی مہلت نہیں ملی کیونکہ اچانک ہی اٹھنے والی ایک موج نے بھجنگا گر سمیت اس کے وجود کو دور لے جا کر پٹخ دیا۔ اس اچانک افتاد پر وہ ذرا سا بوکھلا گیا لیکن یہ حواس کھونے کا وقت نہیں تھا اس لیے تیزی سے خود کو سنبھال کر موجوں سے لڑنے لگا۔ اس کی کوشش تھی کہ لانچ سے اپنا فاصلہ کسی طرح کم کر سکے۔ اس جدوجہد کے دوران اس نے روشنی کی تیز شعاعیں سی اپنی طرف اٹھتے دیکھیں۔ اس نے غور کیا تو اندازہ ہوا کہ ایک لائف بوٹ اس کی طرف بڑھ رہی ہے۔ جوں جوں لائف بوٹ نزدیک آتی گئی، اس میں سوار افراد بھی واضح ہوتے گئے۔ لائف بوٹ پر دو افراد سوار تھے جن میں سے ایک کو اس نے شہریار کے طور پر شناخت کر لیا۔ اس کے ہاتھ میں طاقتور سرچ لائٹ تھی اور وہ اسے مختلف سمتوں میں گھماتا وقفے وقفے سے آوازیں بھی دیتا جا رہا تھا۔ اس کی آواز میں ایک تڑپ سی تھی۔

''میں یہاں ہوں۔'' سلو نے اپنے پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے اسے اپنے بارے میں آگاہ کیا۔ اس کی آواز شہریار تک پہنچی یا نہیں، بہرحال وہ خود روشنی کے دائرے میں آگیا۔ وہ لوگ لائف بوٹ کو اس کے نزدیک لے آئے اور پھر اسے بوٹ میں سوار کروانے کی کوشش کی جانے لگی۔ عام حالات میں سلو کے لیے مشکل نہ ہوتا کہ وہ بغیر کسی سہارے کے خود سے اوپر چڑھ جاتا لیکن کسی عفریت کی طرح اس کی ٹانگوں سے لپٹی بھجنگا گر کی لاش نے اسے مشکل میں ڈال رکھا تھا۔ شہریار اور اس کے ساتھ موجود چینی سپاہی نے اسے بوٹ پر چڑھایا تو اس کی ہیئت کذائی پر حیران رہ گئے۔

''یہ کیا ہے؟'' شہریار نے حیرت سے اس سے پوچھا۔

''یہ وہ کمبل ہے جسے میں تو چھوڑنا چاہتا ہوں لیکن مجھے نہیں چھوڑتا۔'' سلو نے جواب دیا۔ وہ عجیب سی ... میں لانچ کی طرف بڑھتی لائف بوٹ پر پڑا ہوا تھا۔

''یہ خود تو مر چکا ہے پھر تم اس کی ٹانگوں سے اپنی ٹانگیں آزاد کیوں نہیں کروا پا رہے؟''

شاید بھجنگا گر سلو کی لگائی گئی ضرب کی شدت کی وجہ سے بے ہوش ہو گیا تھا اور پھر سمندر میں چہرا غرق ہو جانے کے باعث زندگی کی بازی ہار بیٹھا تھا لیکن بہرحال اس صورت میں بھی اس نے سلو کو گرفت میں لے رکھا تھا۔

''اس نے جس داؤ میں مجھے پھنسایا ہے، اس سے میں تنہا خود کو آزاد نہیں کروا سکوں گا۔ تمہیں میری مدد کرنی پڑے گی۔'' سلو نے ذرا پست آواز میں اسے آگاہ کیا۔ حقیقتاً بھجنگا گر سے مقابلہ کرنے میں اسے دانتوں پسینا آگیا تھا اور پھر سمندر میں گزارے ہوئے وقت نے جسم کی رہی سہی توانائی بھی سلب کر لی تھی۔ جب تک حالات غیر یقینی تھے، وہ ہمت کا مظاہرہ کرتا رہا لیکن اب محفوظ ہونے کے اطمینان نے اسے کچھ ڈھیلا کر دیا تھا۔

''میں دیکھتا ہوں۔'' شہریار اس کی اور بھجنگا گر کی الجھی ہوئی ٹانگوں کو پکڑ کر الگ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ نتیجے میں سلو کے منہ سے ایک زوردار سسکاری نکلی۔ اسی وقت چینی سپاہی نے چیخ کر انگریزی میں کچھ کہا جس کا مفہوم یہ تھا کہ شہریار اس لاک کو توڑنے کی کوشش نہ کرے ورنہ اس کے ساتھی کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ مجبوراً سلو کو اسی حالت میں اسٹیمر پر سوار کروایا گیا۔ اس مقصد کے لیے شہریار اور سپاہی دونوں کو اس کی مدد کرنی پڑی۔ ان کے سوار ہوتے ہی اسٹیمر حرکت میں آگیا۔ یہ وہ وقت تھا جب آسمان پر چھائے بادلوں نے چھٹنا شروع کر دیا تھا اور تاریکی کی دبیز تہ بھی ہوتی جا رہی تھی۔ اسٹیمر سے وہ بحری جہاز میں منتقل کیے گئے۔ اس وقت تک روشنی کافی بہتر ہو چکی تھی اس لیے سلو نے دیکھ لیا کہ کلام زندہ حالت میں جہاز پر منتقل نہیں کیا جا رہا۔

''یہ کلام...؟'' اس نے ادھورا سا سوال کیا۔

''ہاں، کلام فائرنگ کی زد میں آگیا۔ اس کی گردن میں گولی لگی تھی جو جان لیوا ثابت ہوئی۔'' شہریار نے جواب دیا تو اس کے لہجے میں سخت کرب تھا۔ برسوں اپنے خاندان سے کٹ کر بھارت میں اپنے وطن کے لیے جاں نثارانہ فرائض انجام دیتے کلام کے دل میں یقیناً یہ خواہش

خیال تھا کہ ان سب مصائب سے نمٹ کر ایک دن وہ اپنے گھر پہنچے گا اور گھر والوں کے درمیان رہ کر زندگی کی خوشیاں کشید کرے گا لیکن وہ اپنی ساری حسرتیں دل میں ہی لیے اس دنیا سے ناتا توڑ گیا تھا۔

''عائشہ کے بھی بازو میں گولی لگی ہے اور وہ خاصی خوف زدہ ہے۔ڈاکٹر صاحب اللہ کی مہربانی سے محفوظ رہے اور ہمارے لیے خوشی کا مقام ہے کہ ہم نقصان اٹھانے کے باوجود مشن میں کامیاب ہو کر واپس لوٹ رہے ہیں۔'' خاموشی کے چھوٹے سے وقفے کے بعد شہریار نے اسے باقی صورت حال سے بھی آگاہ کیا۔سلو نے بلا تبصرہ اس کی ساری بات سنی۔اصل میں وہ کلام کی موت کے صدمے کے زیر اثر تھا۔مختصر عرصے کے ساتھ کے باوجود اسے اپنے اس ساتھی کی موت پر جھٹکا سا لگا تھا۔

''آری کی مدد سے بھنا گر کی ٹانگوں کو کاٹ کر تمہاری ٹانگوں سے الگ کیا جائے گا۔یہاں موجود ایکسپرٹ کے مطابق اس کے سوا کوئی دوسرا طریقہ موجود نہیں ہے۔'' ان کی جہاز میں منتقلی کے بعد کلام کی لاش سرد خانے میں پہنچا دی گئی۔ڈاکٹر فرحان کو ایک اعلیٰ افسر اپنے ساتھ ایک کیبن میں لے گیا۔شہریار کسی ذمے دار سے گفتگو کرنے لگا اور سلو اور عائشہ کو اس بڑے سے ہال میں منتقل کر دیا گیا جو جدید طبی سہولیات سے لیس چھوٹے موٹے اسپتال کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔وہاں عائشہ کو تو فوری طبی امداد دی گئی اور اس کے بازو سے گولی نکالنے کا انتظام کیا جانے لگا، البتہ سلو کا کیس مختلف تھا اس لیے اسے ایسے ہی ایک بیڈ پر لٹا دیا گیا۔یہ ایک بیڈ بھی دراصل دو بیڈز کو ملا کر بنایا گیا تھا تاکہ بھنا گر کو بھی فٹ کیا جا سکے۔شہریار نے اسی ایمرجنسی اسپتال میں سلو کو فیصلے سے آگاہ کیا تھا۔ذرا دیر میں ایک ڈاکٹر برقی آری کے ساتھ وہاں آپہنچا اور اپنا کام شروع کر دیا۔سلو کی ٹانگوں کو زخمی ہونے سے بچانے کے لیے اسے بہت احتیاط سے کام کرنا پڑ رہا تھا۔تقریباً پینتیس منٹ میں اس نے اپنا کام مکمل کیا تو بھنا گر کی دونوں ٹانگیں کئی حصوں میں تقسیم ہو چکی تھیں۔ٹانگوں کے ان ٹکڑوں اور بھنا گر کے اوپری دھڑ کو سمندر برد کیے جانے کا منظر سلو اور شہریار نے خود اپنی آنکھوں سے عرشے پر جا کر دیکھا۔

یہ وہ وقت تھا جب بادل مکمل طور پر چھٹ چکے تھے اور آسمان ایک بار پھر روشن اور صاف تھا۔اس روشنی میں انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو چہرے سمیت جسم کے کئی حصوں میں چھوٹے بڑے زخم نظر آئے۔کچھ زخم ان کے دلوں پر بھی لگے تھے لیکن یہ تو ہوتا ہی ہے۔بڑے مقاصد کے حصول کے لیے قربانیاں بھی دینی پڑتی ہیں اور وقت کا ایک طے شدہ اصول ہے کہ وہ زخموں کو بھرتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔

☆☆☆

''میں نے تمہیں ایک خاص کام کے لیے بلایا ہے جگو! کام ایسا ہے جس میں تم جیسے جی دار بندے کا ساتھ ہی مناسب رہے گا لیکن میری طرف سے تم پر کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔تم انکار کرنے کا پورا پورا حق رکھتے ہو، میں بالکل بھی برا نہیں مانوں گا اور اگر راضی ہو جاتے ہو تو تمہیں اس کام کا معقول معاوضہ دیا جائے گا۔'' عمیر آفندی نے اپنے سامنے مؤدب بیٹھے جگو سے یہ جملے کہے تو اس کے چہرے کی رنگت بتدریج متغیر ہوتی چلی گئی۔صاف محسوس ہوتا تھا کہ وہ عمیر کی بات کے درمیان مداخلت کی خواہش رکھتا ہے لیکن حدِ ادب کی وجہ سے اس کے بات مکمل کر لینے تک خاموش رہنے پر مجبور ہے۔

''شہریار صاحب مشابرم خان کی صورت میرے پاس ایک اچھا ساتھی چھوڑ کر گئے تھے لیکن حالات نے اسے مجھ سے دور کر دیا۔میرا پی اے عبدالمنان بھی بہت مخلص آدمی ہے لیکن وہ انتظامی مسائل میں تو میری مدد کر سکتا ہے لیکن غیر معمولی حالات میں اس سے مدد مانگنا اس کے ساتھ ظلم ہوگا۔ان حالات میں ایک تم ہی رہ جاتے ہو جس سے میں ساتھ دینے کی امید رکھ سکتا ہوں۔تم پہلے بھی مجھ پر اپنی اہلیت ثابت کر چکے ہو لیکن اب جس معاملے میں تمہاری مدد درکار ہے، اس کی نوعیت ایسی ہے کہ میں تمہاری مکمل رضامندی کے بغیر محض مروت میں تمہیں اس میں شامل نہیں کرنا چاہتا۔''

''آپ کام تو بتائیں سر جی، میری طرف سے انکار کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔شیر کا دل ہے جگو کے سینے میں۔جان لینا اور دینا دونوں بہت چنگی طرح جانتا ہوں میں۔آپ بس مجھے حکم دیں۔مجھے نہ اپنی جان کی پروا ہے نہ پیسے کی۔شہریار صاحب نے میرے پتر کی جان بچا کر مجھے اپنا بے دام غلام بنا لیا تھا اور آپ انہی کے کام کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔سچ پوچھیں تو آپ لوگوں کے ساتھ کام کر کے مجھے جو سچی خوشی ملتی ہے، وہ کسی اور کام میں نہیں ہے۔شہریار صاحب کا احسان اپنی جگہ لیکن جب میں آپ لوگوں کے ساتھ کام کرتا ہوں تو لگتا ہے جگو کی زندگی بھی کسی کام کی ہے۔اپنے آقا کے حکم پر حق ناحق کچھ بھی دیکھے بغیر جان

ہتھیلی پر رکھنے والے کو جب اس دھرتی ماں کی بھلائی کے لیے کچھ کرنے کا موقع ملتا ہے تو سچ پوچھیے دل اتنا خوش ہوتا ہے کہ بس پھر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آپ لوگوں کے ساتھ ہی ہمیشہ کے لیے جڑ جانے کی خواہش ہونے لگتی ہے۔''

وہ ایک بااثر سیاست دان کے مفادات کی حفاظت کرنے والا غنڈا تھا لیکن اس وقت اس نے جس طرح اپنا دل کھول کر عمیر کے سامنے رکھ دیا تھا، اس سے عمیر بہت متاثر ہوا تھا۔سچ یہ تھا کہ اب سے پہلے اس نے جگو کے اس پہلو پر غور ہی نہیں کیا تھا کہ اس کے اندر بھی کہیں نیکی کا جذبہ موجود ہے۔وہ تو بس اسے ایک عام سا غنڈا سمجھتا تھا جو شہریار کا احسان اتارنے کے چکر میں کچھ کرنے کے لیے راضی ہو جاتا تھا۔

''مجھے تمہاری خواہش جان کر خوشی ہوئی ہے۔مجھ سے جہاں تک ہو سکا، اس خواہش کو پورا کرنے کی کوشش بھی کروں گا کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی شخص سیدھی راہ کی طرف آنا چاہے تو اسے یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ اس کی مدد کی جائے اور بہترین مواقع فراہم کیے جائیں۔''

''بہت شکریہ سر جی! آپ نے میری بات سمجھی۔اس کے لیے میں آپ کا احسان مند ہوں کیونکہ سچ پوچھیں تو اب پہلے والی زندگی سے دل بھر گیا ہے۔پتر بڑا ہو رہا ہے، وہ سمجھ دار ہو گیا تو میرے لیے اس کے سامنے کھڑا ہونا مشکل ہو جائے گا۔''

''فکر مت کرو جگو... تم نے نیت کر لی ہے تو سمجھو اللہ خود بخود ہی سب ٹھیک کر دے گا۔'' عمیر نے اسے تسلی دی پھر کچھ خیال آنے پر پوچھا۔''جگو تمہارا اصل نام تو نہیں ہوگا؟''

''جی سر! ماں پیو نے تو جہاں داد نام رکھا تھا، پتا نہیں کیسے بگڑ کر جگو ہو گیا۔'' اس نے بتایا پھر بولا۔''میری چھوڑیے سر جی! آپ بتائیں کہ آپ نے کیسے یاد فرمایا؟''

''میں جنگل میں جانا چاہتا ہوں۔چاندنی اور شاہد کے بیان بدل دینے سے مجھے سخت مایوسی ہوئی ہے۔میں اس کیس میں چودھری کو گھیر کر اس سے دوسرے حقائق بھی اگلوانا چاہتا تھا لیکن یہ امید اب دم توڑ گئی ہے اور میرے لیے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنا ممکن نہیں ہے۔تمہیں معلوم ہوگا کہ جنگل میں میرا کزن اظفر اپنے ساتھیوں سمیت پراسرار طور پر ہلاک ہو گیا تھا۔وہ میرا سب سے عزیز دوست بھی تھا اور جان سے پیارا بھائی بھی۔اس کی موت کا غم مجھے ایک پل سکون سے بیٹھنے نہیں دیتا اور میں جانتا ہوں کہ جب تک اس کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک نہیں پہنچاؤں گا، مجھے سکون نہیں ملے گا۔حالات کے تجزیے سے مجھ پر یہ بھی واضح ہو چکا ہے کہ اس کی موت کے پیچھے کوئی ایسا راز ہے جو جنگل میں ہی چھپا ہوا ہے اور کچھ لوگ ہیں جو اس راز کی حفاظت کے لیے انسانی جانوں کی بھینٹ لینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔اظفر اور اس کے ساتھیوں سے پہلے بھی کچھ لوگ جنگل میں پراسرار طور پر مردہ پائے گئے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کی موت کی بھی وہی وجہ تھی جو اظفر اور اس کے ساتھیوں کی زندگی ختم کرنے کا سبب بنی۔مجھے وہ وجہ تلاش کرنی ہے اور اس کام کے لیے میں تمہارے ساتھ جنگل میں جا کر اپنے طور پر چھان بین کرنا چاہتا ہوں۔'' عمیر نے اسے قدرے تفصیل سے اپنے مقصد سے آگاہ کیا۔

''ٹھیک ہے۔میں آپ کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں لیکن میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی کہ آپ جنگل کے راز اور چودھری کو آپس میں کیوں جوڑ رہے ہیں؟'' جگو جو اس کی بات غور سے سن رہا تھا، نے سوال اٹھایا۔

''اس کے پیچھے دو وجوہ ہیں۔پہلی وجہ تو یہ ہے کہ جنگل کے ساتھ جو گاؤں دیہات متصل ہیں، ان سب میں چودھری افتخار ہی سب سے بارسوخ وڈیرا ہے اور جنگل میں کوئی بھی کارروائی کرنے والوں کے لیے اس کا آشیرباد لینا ضروری ہے۔دوسری اس سے بھی بڑی اور اہم وجہ چودھری کے اس ملازم کے آخری الفاظ ہیں جو اظفر اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ ہی ہلاک ہوا تھا۔مرنے سے پہلے اس نے کچھ ایسے الفاظ ادا کیے تھے جن سے یہ اشارہ ملتا تھا کہ جنگل میں جو کچھ پیش آیا تھا، اس میں چودھری کا ہاتھ تھا یا کم سے کم بھی اس کا کوئی نہ کوئی تعلق ضرور تھا۔اسی لیے پہلے میری کوشش تھی کہ کسی طرح چودھری کو گھیرے میں لیا جائے لیکن اس مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔فی الحال وہ منظر سے بھی غائب ہے اس لیے میں اس کا مزید انتظار کرنے کے بجائے جنگل کا ایک چکر لگا کر دیکھنا چاہتا ہوں۔ساتھ لے جانے کے لیے تمہارا انتخاب کیا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی واضح کر رہا ہوں کہ اس کام میں جان کا خطرہ ہے۔'' عمیر نے بہت وضاحت سے اسے جواب دیا۔

''تو بس ٹھیک ہے، میں آپ کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوں۔آپ یہ بتائیں کہ کب چلنا ہے؟'' جگو نے اسے اپنا حتمی فیصلہ سنایا۔

''ہم کل صبح چلیں گے۔روانگی کے سلسلے میں کچھ تیاریاں رہتی ہیں، وہ میں انشاء اللہ رات تک مکمل کر لوں

گا۔ تم اس دوران جا کر گھر والوں سے ملاقات کر کے آجاؤ۔ مجھے معلوم ہے کہ تم لاہور سے سیدھے یہیں آئے ہو اور ابھی اپنے گھر بھی نہیں گئے۔" عمیر نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس جیسے آدمی کو یہ عزت اس آفس میں ہی ملتی تھی۔ پہلے شہریار تھا اور اب عمیر۔ بلاتے دونوں اپنے کام سے ہی تھے لیکن عزت دے کر جبکہ جس سیاست دان کی وہ ملازمت کرتا تھا، وہ اس کے ساتھ غلاموں کا سا برتاؤ رکھتا تھا۔ چنانچہ اس کے مقابلے میں ان لوگوں کے لیے کام کر کے اسے ہمیشہ خوشی ہوتی تھی۔

☆☆☆

"میں پاکستان واپس جانا چاہتی ہوں۔ وہاں سے میں اور اسلم، شہریار صاحب کے کہنے پر صرف اس لیے یہاں آئے تھے کہ یہاں سکون کی زندگی گزار سکیں لیکن حالات نے ثابت کر دیا ہے کہ جس کے نصیب میں سکھ نہ ہو، وہ دنیا کے کسی بھی خطے میں چلا جائے پریشان ہی رہتا ہے۔ وہاں میں چودھری اور اس کے گرگوں سے بھاگتی پھرتی تھی اور اسلم کو قانون کا خوف تھا۔ اسلم تو رہا ہی نہیں لیکن میرے نصیب کی بھاگ دوڑ جاری ہے۔ یہاں جو لوگ میرے پیچھے لگے ہیں، وہ چودھری سے زیادہ چالاک اور بااختیار ہیں اور مجھے ہر لمحے یہ ڈر رہتا ہے کہ وہ کسی بھی وقت مجھ تک پہنچ جائیں گے۔ ان لوگوں کے خوف سے میں سکون سے سو بھی نہیں سکتی۔"

مشابرم خان کے روبرو ان خیالات کا اظہار کرتی ماہ بانو کی آنکھوں کے گرد گھیرے ہوتے حلقے اس کی بات کی تصدیق کر رہے تھے۔ مشابرم خان نے تاسف سے اس کم عمر لڑکی کو دیکھا جس نے اپنی عمر کے دو عشرے مکمل ہونے سے قبل ہی دنیا کے جانے کون کون سے رنگ دیکھ لیے تھے اور کن کن مصائب سے گزر گئی تھی اور اب بھی مشکل میں ہی پھنسی ہوئی تھی۔ وہ کل رات ہی نیویارک پہنچا تھا اور سیدھا اس اپارٹمنٹ آ گیا تھا جہاں ماہ بانو کو مراد شاہ نے منتقل کیا تھا۔ متوحش اور بے چین ماہ بانو کو مشابرم خان کی یہاں موجودگی سے خاصی تقویت ملی تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ تلوار سر پر لٹکی ہوئی ہے اس لیے اپنی تشویش اور خواہش دونوں کا اس کے سامنے اظہار کر رہی تھی۔

"ہم سب بھی یہی چاہتے ہیں کہ تمہیں دوبارہ پاکستان منتقل کر دیا جائے۔ مصطفیٰ صاحب سے اس سلسلے میں میری خاصی طویل گفتگو ہوئی ہے اور ان کا بھی یہی خیال ہے کہ موجودہ حالات میں تمہارا یہاں کے مقابلے میں پاکستان میں رہنا زیادہ مناسب ہوگا لیکن مسئلہ یہ ہے کہ تمہیں یہاں سے پاکستان منتقل کرنا بھی اتنا آسان کام نہیں ہے۔ یہاں کے خفیہ ادارے کتوں کی طرح تمہاری بو سونگھتے پھر رہے ہیں اور وہ لوگ بھی اس بات کو سمجھتے ہیں کہ تمہاری پہلی کوشش یہی ہوگی کہ کسی طرح امریکا سے نکل جاؤ اس لیے یہاں سے اخراج کے راستوں پر ان کی پوری توجہ ہوگی۔ حالات کو دیکھتے ہوئے مصطفیٰ صاحب امکانات کا جائزہ لے رہے ہیں کہ کس طرح تمہیں یہاں سے نکالا جائے۔ جب تک انہیں کوئی محفوظ راستہ نہیں مل جاتا، تمہارا یہاں رہنا مجبوری ہے لیکن تم گھبراؤ نہیں۔ میں ہوں نا تمہارا بھائی۔ میں تمہاری حفاظت اور مدد کے لیے تمہارے ساتھ ساتھ رہوں گا۔" اس پر حالات کو واضح کرنے کے بعد مشابرم خان نے اسے تسلی بھی دی لیکن وہ جانتی تھی کہ امریکا کے خفیہ اداروں کی طاقت کے مقابلے میں مشابرم خان اپنی تمام تر بہادری کے باوجود کچھ نہیں کر سکتا اس لیے اس کی تسلی پر ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ سجانے کے سوا کچھ نہیں کر سکی۔

"مایوس مت ہو میری بہن۔ جو اللہ ہمیشہ سے مشکل حالات میں تمہاری مدد کرتا رہا ہے، وہ اب بھی تمہیں تنہا نہیں چھوڑے گا۔" اس کا انداز سمجھتے ہوئے مشابرم خان نے اسے سمجھایا تو اس نے سر کو تفہیمی جنبش دی اور پھر موضوعِ گفتگو بدلنے کے لیے اس سے اس کے بارے میں سوال جواب کرنے لگی۔ ان سوال جواب کے نتیجے میں اسے علم ہوا کہ گل مینا کی شادی مشابرم خان سے ہو گئی ہے تو وہ بہت خوش ہوئی۔ اسے خوب صورت اور سادہ مزاج گل مینا بہت اچھی لگتی تھی اور وہ جانتی تھی کہ اپنے منگیتر اکرم خان کی موت نے اس پیاری سی لڑکی کو بہت دکھی کر دیا ہوگا لیکن مشابرم خان سے اس کی شادی کا سن کر اسے اطمینان ہو گیا تھا کہ گل مینا کے دکھوں کا بہترین مداوا ہو گیا ہے۔ مشابرم خان بہت صاف دل اور کھرا آدمی تھا۔ گل مینا جیسی لڑکی اس صاف دل شخص کے ساتھ بہت جلد ایڈجسٹ ہو کر زندگی کی خوشیاں پا سکتی تھی اور مشابرم خان کے لہجے کا سکون بتا رہا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ ایڈجسٹ کر چکے ہیں۔

"یہ تو تم نے بہت بڑی خوش خبری سنائی۔ سن کر میرا دل گل مینا سے ملنے کے لیے بے چین ہو گیا ہے۔ میں پاکستان جا کر پہلی فرصت میں اس سے ملاقات کروں گی۔"

"ضرور۔" مشابرم خان اس کی بے چینی محسوس کر کے مسکرایا۔

"ایک بات پوچھوں خان۔۔۔"

"بالکل پوچھو۔" مشابرم خان کا خیال تھا کہ وہ اس سے گل مینا کی بابت کچھ پوچھنے جا رہی ہے۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد وہ دونوں بہت اطمینان سے بیٹھے بات چیت کر رہے تھے۔ مجاہد کو ماہ بانو نے کچھ دیر قبل ہی فیڈ کروا کر سلا دیا تھا اس لیے اس کی بھی کوئی مصروفیت نہیں تھی۔

"تمہیں شہریار صاحب نے یہاں بھیجا ہے؟" وہ بہت جھجکتے ہوئے اپنا سوال لبوں پر لائی۔ اسلم سے شادی کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ اس کے لبوں پر شہریار کا نام آیا تھا اور اس نے اس کے متعلق کچھ جاننے کی خواہش کی تھی۔ اس کا سوال سن کر مشابرم خان کا چہرہ بجھ سا گیا اور وہ فوری طور پر کچھ کہنے کے قابل نہ رہا۔

"کیا بات ہے خان۔۔۔ تم اچانک اتنے اداس کیوں ہو گئے؟" اس کے تاثرات دیکھ کر ماہ بانو مضطرب ہوئی۔

"تم نے سوال ہی ایسا کر دیا۔" مشابرم خان کے لبوں سے ایک آہ سی نکلی۔

"کیا مطلب؟ میں نے تو بس اتنا ہی پوچھا ہے کہ کیا تمہیں شہریار صاحب نے یہاں بھیجا ہے؟" وہ حیران ہوئی۔

"کاش میں تمہارے اس سوال کا جواب ہاں میں دے سکتا لیکن سچ یہ ہے کہ میں شہریار صاحب کی وجہ سے ہی تمہاری مدد کے لیے آیا ہوں۔" مشابرم خان کے لہجے کی اداسی کسی طور کم نہیں ہو رہی تھی۔

"کیا بات ہے خان۔۔۔ تم اتنی الجھی الجھی باتیں کیوں کر رہے ہو؟" اس کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔

"تمہاری بات سے مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ تم حالات سے واقف نہیں ہو اور میں سوچ رہا ہوں کہ تمہیں آگاہ کر کے تمہارے دکھوں میں مزید اضافہ کیسے کروں؟" وہ بالکل بے بس لگ رہا تھا۔

"کیا ہوا ہے خان، مجھے بتاؤ؟ میرے دکھی ہونے کی پروا مت کرو۔ مجھے تو اب دکھ سہنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔" اس نے اصرار کیا۔

"کئی ماہ پہلے شہریار صاحب کی گاڑی ایک زبردست حادثے کا شکار ہو گئی تھی۔ اس حادثے میں شہریار صاحب کو اتنی زبردست چوٹیں لگیں کہ۔۔۔" مشابرم خان اپنا جملہ مکمل کیے بغیر رک گیا اور ماہ بانو کو ایسا لگا کہ اس کی سانسیں رکنے لگی ہوں۔ وہ مضطرب سی ہو کر کھڑی ہو گئی۔

"نہیں کیا ہوا خان۔۔۔؟" اسے علم نہیں تھا کہ وحشت سے اس کی آواز پھٹ سی گئی ہے۔

"ان کی زندگی بچ تو گئی لیکن ایسے کہ نہ وہ زندوں میں ہیں، نہ مُردوں میں۔ وہ کوما میں چلے گئے ہیں اور کئی ماہ سے اسپتال کے بستر پر مشینوں کے سہارے پڑے ہوئے ہیں۔ ہم سب دن رات بس یہ دعا کرتے ہیں کہ کسی روز معجزہ ہو اور وہ بستر سے اٹھ... کھڑے ہوں، ورنہ ڈاکٹر تو کوئی امید نہیں دلاتے ہیں۔" مشابرم خان نے بھرائی ہوئی آواز میں بتایا تو وہ گرنے کے سے انداز میں دوبارہ بیٹھ گئی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ شہریار اتنی بڑی مشکل سے دوچار ہے اور اس کے دل کو خبر ہی نہیں ہوئی۔ لیکن مشابرم خان بھی تو جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ اس کے چہرے پر ثبت دکھ ہی اس کی سچائی ثابت کرنے کے لیے کافی تھا۔

"حوصلہ کرو ماہ بانو۔ اس طرح دل چھوڑ دینے سے کچھ نہیں ہوگا۔ ان کی صحت اور زندگی کے لیے دعا کرو۔ انہیں ہم سب کی دعاؤں کی شدید ضرورت ہے۔" اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے مشابرم خان نے اسے سمجھایا لیکن وہ اس کی بات کا جواب دیے بغیر اسی حالت میں اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ یوں بیٹھے بیٹھے جانے اسے کتنی دیر گزر گئی، دوبارہ وہ مجاہد کے بے تحاشا رونے پر حواس میں واپس لوٹی۔

مشابرم خان بچے کو گود میں لیے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے روتے ہوئے بچے کو اس کی طرف بڑھایا تو اس نے میکانکی انداز میں بچے کو تھام لیا اور اسے بہلانے کی کوشش کرنے لگی لیکن کچھ دیر میں اس کی ہر تدبیر ناکام ہو گئی۔ نہ تو بچہ فیڈ کر رہا تھا اور نہ ہی کسی اور طریقے سے بہل رہا تھا۔ وہ پریشان سی اس کے پورے جسم کو ٹٹول ٹٹول کر چیک کرنے لگی کہ آخر مسئلہ کیا ہے۔ پیدائش سے لے کر اب تک وہ کبھی اتنی بری طرح نہیں رویا تھا اس لیے اسے زیادہ پریشانی ہو رہی تھی۔ اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے وہ کوئی درست نتیجہ بھی اخذ نہیں کر پا رہی تھی۔

"کیا بات ہے۔۔۔ یہ چپ کیوں نہیں ہو رہا؟" مشابرم خان جو اسے بچہ تھما کر خود واش روم چلا گیا تھا، واپس آنے پر بھی بچے کو اسی شدت سے روتا دیکھ کر تشویش سے پوچھنے لگا۔

"پتا نہیں کیوں چپ نہیں ہو رہا ہے۔ شاید اس کے پیٹ میں درد ہے۔" بچے کے قدرے سخت اور پھولے ہوئے پیٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے ماہ بانو نے اپنا اندازہ بیان کرتے ہوئے پریشانی کا اظہار کیا۔

"اسے ڈاکٹر کے پاس لے چلتے ہیں۔ تم تیاری کرو

جب تک میں کیب کا بندوبست کرتا ہوں۔" مشابرم خان نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ ماہ بانو نے جلدی جلدی بچے کو تیار کیا اور ایک بیگ میں ضرورت کی چند چیزیں رکھنے کے بعد ابھی فارغ ہی ہوئی تھی کہ انٹرکام پر مشابرم خان نے اسے کیب آجانے کی اطلاع دی۔ وہ لفٹ کے ذریعے تیزی سے نیچے پہنچی۔ مشابرم خان کیب میں ڈرائیور کے ساتھ والی نشست پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کے لیے پچھلا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

اس کے بیٹھتے ہی کیب حرکت میں آگئی۔ وہ لوگ کچھ دور ہی نکلے ہوں گے کہ مشابرم خان نے بیک ویو مرر میں ایک پولیس وین کو اپنی اپارٹمنٹ بلڈنگ کے سامنے رکتے دیکھا۔ اس کے چہرے پر تشویش کے تاثرات چھا گئے۔ عام حالات میں شاید وہ پروا بھی نہیں کرتا لیکن ابھی تو انہیں پھونک پھونک کر ہر قدم اٹھانا تھا۔ اسپتال پہنچ کر اس نے ماہ بانو کو تو بچے سمیت ایمرجنسی میں بھیج دیا اور خود ایک پبلک بوتھ سے مراد شاہ سے رابطہ کرنے لگا۔ رابطہ ہونے کے بعد اس نے مختصراً اسے اپنی تشویش سے آگاہ کرنے کے بعد صحیح صورت حال معلوم کرنے کی فرمائش کی۔ مراد شاہ نے اس سے آدھے گھنٹے بعد فون کرنے کا کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔ مشابرم خان دوبارہ ماہ بانو کے پاس پہنچ گیا۔ یہاں ایک لیڈی ڈاکٹر بچے کا معائنہ کر رہی تھی۔

"زیادہ پریشانی کی بات نہیں ہے۔ بچے کے پیٹ میں گیس ہو رہی ہے جس کی وجہ سے اسے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔ ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔" ینگ سی ڈاکٹر نے نرم لہجے میں صورت حال سے آگاہ کر کے تسلی دی۔ اس کے بعد بچے کو ٹریٹمنٹ دی جانے لگی۔ آدھے گھنٹے بعد مشابرم خان کے موبائل پر کال آنے لگی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ حسبِ توقع دوسری طرف مراد شاہ تھا جو اسے فون بوتھ سے کال کر رہا تھا۔ یہ طریقہ کار انہوں نے پہلے ہی طے کر رکھا تھا کہ ایک دوسرے سے رابطے کی ضرورت پڑی تو اپنے ذاتی نمبرز استعمال کرنے کے بجائے پبلک بوتھ کا سہارا لیں گے۔

"تمہارا اندازہ درست تھا۔ پولیس ماہ بانو کی تلاش میں ہی وہاں پہنچی تھی۔ انہوں نے کسی طرح اسے ٹریس کر لیا تھا۔ اس وقت بھی وہ اپارٹمنٹ میں موجود ہیں۔ تم بتاؤ کہ وہاں تم دونوں کی کوئی ایسی چیز تو موجود نہیں ہے نا جس سے بعد میں مشکل کھڑی ہو جائے؟" مراد شاہ نے اس کے اندیشوں کی تصدیق کرتے ہوئے پریشانی سے دریافت کیا۔

"نہیں، مصطفیٰ صاحب کی ہدایت کے مطابق ہم اپنے کاغذات ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ اپارٹمنٹ میں فنگر پرنٹس چھوڑنے کا بھی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ ہدایت کے مطابق ربر کے باریک دستانوں کا استعمال بھی کیا جا رہا ہے۔" مراد شاہ کے مقابلے میں اس کا لہجہ کہیں زیادہ پُرسکون تھا کیونکہ اسے مخدوش حالات سے نمٹتے رہنے کی عادت تھی۔

"تھینک گاڈ۔ اب یہ بتاؤ کہ تم لوگ کیا کرو گے؟ کہاں جاؤ گے؟" مراد شاہ کی تشویش کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔

"اس کے لیے آپ فکرمند نہ ہوں۔ ہم کچھ نہ کچھ بندوبست کر لیں گے۔" مشابرم خان نے اسے واضح جواب دینے سے گریز کیا اور ایک بار پھر ماہ بانو کے پاس جا پہنچا۔ مراد شاہ کی کال سننے کے لیے وہ کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

"کیا ہوا... کوئی مسئلہ ہے کیا؟" بچہ بیڈ پر پُرسکون نیند سو رہا تھا۔ ماہ بانو نے مشابرم خان کو دیکھا تو سوال کیا۔

"ہاں تھوڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اپارٹمنٹ پر پولیس نے ریڈ کیا ہے۔ ہم واپس وہاں نہیں جا سکتے لیکن زیادہ پریشانی کی بات نہیں ہے۔ مصطفیٰ خان نے اپنی ایک رہائش گاہ کی چابیاں مجھے دے رکھی ہیں۔ ہم وہاں شفٹ ہو جائیں گے۔" اس نے جواب دیا۔

"لیکن ہمارے پاس ضرورت کا سامان نہیں ہے، خاص طور پر بچے کے لیے بہت سی چیزیں چاہیے ہوں گی۔" ماہ بانو نے اسے بتایا۔ اس نے حالات کے اتنے سرد و گرم سہے تھے کہ اب عادی سی ہو گئی تھی اور گھبرانے کے بجائے فوری طور پر مسائل کی طرف دھیان دیتی تھی۔

"سامان کا کوئی مسئلہ نہیں۔ ہم بازار سے خریداری کر لیں گے۔ ویسے بھی ہمیں وہاں کھانے پینے کا سامان ساتھ لے کر جانا ہوگا۔ مصطفیٰ صاحب نے بتایا تھا کہ وہ جگہ شہر سے ذرا ہٹ کر ہے لیکن کوئی بھی ٹیکسی والا آرام سے پہنچا دے گا۔" مشابرم خان نے اسے جواب دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ اسپتال سے روانہ ہو رہے تھے۔ بچے کی حالت تسلی بخش تھی اور اسے اسپتال میں داخل رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔ البتہ ڈاکٹر نے ضروری ہدایات کے ساتھ کچھ دوائیں لکھ کر دے دی تھیں۔ بچے کو سینے سے لگائے مشابرم خان کے پیچھے چلتی ماہ بانو سوچ رہی تھی کہ اس کے ساتھ ہی اس کے بچے کے نصیب میں بھی دربدری کا عذاب آیا ہے۔ اس معصوم کو دنیا میں آئے ابھی چند روز ہی تو ہوئے تھے لیکن

ان چند دنوں میں اس کو ماں کے ساتھ ساتھ زندگی کی بقا کے لیے اِدھر سے اُدھر بھاگتا پھرنا پڑ رہا تھا۔ گرداب میں گھری ماں کے بچے کے نصیب میں گرداب کے سوا اور آ بھی کیا سکتا تھا؟

☆☆☆

"کامیابی کے ساتھ اپنی سرزمین پر واپسی مبارک ہو۔" ذیشان نے گرم جوشی کے ساتھ شہریار کو گلے لگایا تو وہ بھی پورے جوش کے ساتھ اس کے ساتھ لپٹ گیا۔ دشمن کی سرزمین پر گزارے دنوں نے اپنوں کی محبت میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔

"کامیابی کے اس سفر میں سلیم میرا برابری سے شریک رہا۔ بلکہ سچ پوچھو تو بعض اوقات صرف اس کی حاضر دماغی اور پھرتی ہی کی وجہ سے ہم بال بال بچ گئے۔" ذیشان سے الگ ہونے کے بعد اس نے اپنے ساتھ موجود سلو کی کھلے دل سے تعریف کی۔

"پھر تو میں مسٹر سلیم کا دل سے شکر گزار ہوں۔ دوست کا محسن ہمارا بھی محسن ہے۔" ذیشان نے سلو سے بھی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ وہ دونوں ابھی ابھی چین سے یہاں پہنچے تھے۔ دوطرفہ انڈر اسٹینڈنگ کی وجہ سے ان کا یہ سفر بہت آسان ثابت ہوا تھا اور وطن کی فضاؤں میں سانس لیتے ہی نظر نے پُرخلوص دوست کو استقبال کے لیے سامنے پایا تو دل مزید خوش ہو گیا۔

"یہ مسٹر عادل کی مہربانی ہے کہ انہوں نے مجھے اس لائق سمجھا ورنہ سچ تو یہ ہے کہ یہ ان کی نظرِ کرم ہی ہے جو آج میں ایک مجرم کے بجائے دوست کی حیثیت سے آپ کے سامنے کھڑا ہوں۔" سلو نے عاجزی کا مظاہرہ کیا۔

"میرا کردار تو صرف اتنا ہے کہ میں نے ہیرے کو ہیرا سمجھا اور ناتراشیدہ حالت میں بھی اسے پہچان لیا اور دیکھو، اس طرح ہم فائدے میں ہی رہے۔" شہریار نے محبت سے سلو کا شانہ تھپتھپایا۔ تھوڑے دنوں کے ساتھ نے اس کے دل میں سلو کے لیے حقیقی محبت پیدا کر دی تھی اور سچ تو یہ تھا کہ اس مختصر عرصے میں سلو کے اندر بھی غیر محسوس انداز میں بہت سی تبدیلیاں آگئی تھیں اور اس کے اندر کا وہ وحشت زدہ سا روپ کہیں غائب ہو گیا تھا جس میں راوالوں نے اسے ڈھال کر پاکستان کی تباہی کے لیے بھیجا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ باقی باتیں بھی ہوتی رہیں گی، پہلے یہاں سے چلتے ہیں۔" ذیشان نے زبردستی شہریار کے ہاتھ سے اس کا سفری بیگ لے لیا۔ اس چھوٹے سے بیگ کا وزن بہت ہی کم تھا۔ اصل میں تو ان کے پاس کوئی سامان تھا ہی نہیں۔ اس بیگ کا اہتمام بھی سفر کے لوازمات پورے کرنے کے لیے کیا گیا تھا جس میں ایک جوڑے اور استعمال کی معمولی چیزوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ذیشان کے ساتھ چلتے ہوئے وہ پارکنگ میں آئے اور اس کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ شہریار نے اس کے ساتھ والی نشست سنبھالی جبکہ سلو پیچھے بیٹھ گیا۔

"میرا تو یہ سوچ کر دل خوش ہو رہا ہے کہ بھارتیوں کو کیسی گہری چوٹ لگی ہے۔ خبیث سارا وقت پاکستان کے خلاف سازشوں میں لگے رہتے ہیں۔ اب انہیں تھوڑا سا سبق ضرور ملا ہوگا کہ ہم پاکستانیوں نے بھی کوئی کلائیوں میں چوڑیاں نہیں پہن رکھی ہیں۔" اسٹیئرنگ سنبھالے ذیشان بہت خوش تھا۔

"چوٹ تو ان کو ضرور لگی ہے لیکن یہ بھول جاؤ کہ انہوں نے کوئی سبق سیکھا ہوگا۔ وہ اپنے اندر بھرے کینے اور بغض سے مجبور ہیں، لاکھوں چوٹیں کھائیں لیکن سازشیں کرنے سے پھر بھی باز نہیں آئیں گے۔" شہریار نے حقیقت بیان کی۔

"کرنے دو انہیں سازشیں۔ اپنی ہر سازش کا انہیں منہ توڑ جواب بھی ملے گا۔ ہمارے پاس ہمت و حوصلہ دکھانے اور قربانیاں دینے والوں کی کمی نہیں ہے۔" اتنے دنوں بعد اسے اپنے سامنے پا کر ذیشان بہت ترنگ میں تھا۔

"یہ تم نے ٹھیک کہا۔ ہمارے لوگوں میں لاکھ برائیاں ہوں لیکن جب وطن کی سلامتی کی بات آتی ہے تو سب قربانی دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ بھارت میں ہمارے ایجنٹ کلام نے جیسے ہر طرح کے حالات میں ہمارا ساتھ دیا، اسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا۔ میری دلی خواہش تھی کہ وہ پاکستان آئے اور اپنوں کے ساتھ زندگی انجوائے کرے لیکن اس کی زندگی ہی نے وفا نہیں کی۔" کلام کو یاد کرتے ہوئے وہ اداس ہو گیا۔ اس کی لاش فی الحال پاکستان نہیں پہنچی تھی اور گراؤنڈ بنایا جا رہا تھا کہ ایسے طریقے سے اسے پاکستان پہنچایا جائے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے کہ وہ اتنے عرصے سے بھارت میں تھا اور بھارت سے فرار ہوتے ہوئے موت کا شکار ہوا۔ فی الحال یہ کہانی زیرِ غور تھی کہ کلام ایک چینی کمپنی میں ملازمت کرتا تھا جہاں وہ حادثے کا شکار ہو گیا اور اس کے سامان کی تلاشی لینے پر اس کا پاکستان کا ایڈریس ملا جس پر اس کے عزیزوں

سے رابطہ کر کے اس کی لاش پاکستان بھجوانے کے انتظامات کیے جا رہے ہیں۔ یہ کہانی اس لیے چل جاتی کہ کلام بھارت جاتے ہوئے کسی کو آگاہ کر کے نہیں گیا تھا اور اپنے عزیز واقارب کے لیے ایک معما بنا ہوا تھا کہ اچانک ہی وہ کہاں غائب ہو گیا۔ یہ کہانی سامنے آتی تو معما حل ہو جاتا لیکن بہر حال یہ حتمی منصوبہ بندی نہیں تھی۔ ہر پہلو کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد ہی کوئی حتمی فیصلہ کیا جا سکتا تھا۔

''وہ تو ہم سے زیادہ خوش نصیب ہے یار! اس کے حصے میں تو ہمیشہ کی زندگی آ گئی۔ اس کی ذات قابلِ افسوس نہیں قابلِ رشک ہے۔'' ذیشان نے گویا اسے تسلی دی۔

''ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو۔ شہادت کی تمنا تو ہم میں سے ہر ایک کے دل میں مچل رہی ہے۔'' شہریار نے اس سے اتفاق کیا پھر موضوعِ گفتگو بدلنے کو بولا۔

''اور سناؤ یہاں میرے پیچھے کیا ہوتا رہا؟ ٹی وی کے ذریعے تھوڑی بہت سن گن تو ملتی رہی لیکن تفصیلی حالات تو تم ہی بتا سکو گے۔''

''یہاں بہت کچھ ہوا اور شکر ہے کہ ہم بڑی بڑی مشکلوں سے نمٹنے میں کامیاب رہے۔'' اس نے اسلحے کی اسمگلنگ کی ناکام کوشش سے لے کر بھارت کی حدود میں اس اسلحے کی تباہی اور ایئربیس پر حملے تک کی ساری کہانی مختصر الفاظ میں کہہ سنائی۔ سنتھیا کی موت کا قصہ بھی زیرِ گفتگو آیا۔

''جاوید علی بہت اچھا جا رہا ہے۔ اس کی خصوصی تربیت کرواؤ۔ آگے چل کر وہ کوہِ نور ہیرا ثابت ہو گا۔'' ساری بات سن کر شہریار نے کمنٹس دیے کیونکہ ان میں سے ہر واقعے میں جاوید علی نے کلیدی کردار ادا کیا تھا۔

''یہ تو ہم میں سے ہر ایک محسوس کر رہا ہے۔ بہت اسپرٹ ہے اس لڑکے میں... بس اس کے جنون کو ذرا کنٹرول کرنے کی ضرورت ہے اور اس کے لیے بھی ہم پُرامید ہیں کہ انشاء اللہ اب وہ سنبھل جائے گا۔'' ذیشان نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

''جنون تو اس کا صحیح ہے۔ انسان جب اپنے کسی پیارے کو دوسرے کے ظلم کی وجہ سے کھوتا ہے تو اس کے اندر الاؤ دہک جاتا ہے۔'' شہریار نے قدرے اداسی سے کہا۔ اسے علم تھا کہ نواب نوازش علی کی کوٹھی پر ہندو خواجہ سراؤں کے گینگ سے نمٹنے والا جاوید علی نواب کی بیٹی شازمین کی محبت میں مبتلا ہو گیا تھا اور یہ محبت ہی اس بے چاری لڑکی کی زندگی چھن جانے کا سبب بن گئی۔ جاوید علی نے اس حادثے کا گہرا اثر لیا تھا۔ شہریار اس کی اس کیفیت کو اچھی طرح سمجھ سکتا تھا کیونکہ اس نے بھی اپنے بھائیوں جیسے کزن سجاد اور اس کی بیٹی شیبا کی موت کا زخم سہا تھا اور ان کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے میدان میں اتر آیا تھا۔ یہ تو اس کی خوش قسمتی رہی کہ ذاتی جنگ بہت جلد وطن کی جنگ میں بدل گئی اور زندگی کو ایک بہتر مقصد مل گیا۔ جاوید علی کے ساتھ بھی بعینہٖ ایسا ہی ہوا تھا کیونکہ اتفاق سے ان کے ذاتی دشمن ہی قومی دشمن بھی تھے۔

''قدرت بڑی منصف مزاج ہے یار۔ انسان دکھ سہتا ہے تو سکھ میں بھی اس کا حصہ ہوتا ہے۔ جاوید کو بھی عالیہ کی شکل میں زندگی کی ایک اچھی ساتھی مل گئی ہے۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ جلد وہ اس سے شادی کرنے والا ہے۔'' ذیشان نے اسے اطلاع دی۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ زندگی میں حوصلہ بڑھانے والے موجود ہوں تو انسان کی کارکردگی مزید نکھر جاتی ہے۔'' اس کے یہ جملہ ادا کرتے ہی سفر تمام ہو گیا۔ ذیشان انہیں اس کوٹھی میں لایا جہاں وہ ایک عرصے تک میجر عمر فاروق کے زیرِ تربیت رہا تھا۔ کوٹھی میں عمر فاروق نے بھی اس کا کھلی بانہوں سے استقبال کیا۔ سلو بھی ان محبتوں میں حصے دار تھا۔

''تم چاہو تو تھوڑا آرام کر کے فریش ہو جاؤ۔ یہاں گاڑی اور ڈرائیور دونوں تیار ہیں۔ جب تم چاہو تمہیں تمہارے والدین سے ملاقات کے لیے لے جایا جا سکتا ہے۔'' آپس میں مل لینے کے بعد میجر عمر فاروق نے سلو کو اطلاع دی۔

''میں فوری طور پر ان کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ میری لیے بہت اداس ہوں گے۔'' سلو نے اپنا فیصلہ سنایا جو بالکل درست تھا۔ ایسے والدین جنہیں برسوں بعد اپنا بیٹا ملا تھا ایک بار پھر اس کے غیاب پر کتنے پریشان ہوں گے، یہ کوئی بھی صاحبِ دل اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔ سلو کو اس کی خواہش پر فوراً روانہ کر دیا گیا۔

''تم نے میرا سر فخر سے بلند کر دیا۔ یہ تمہارا ہی حوصلہ تھا جو ہم چانکا جیسے دوست کو اس کا من چاہا تحفہ دینے میں کامیاب رہے۔ ڈاکٹر فرحان جیسے باصلاحیت انسان کی خدمات پا کر چانکا ہم سے بہت خوش ہو گا اور دوستی کے رشتے کو مزید تقویت ملے گی۔'' شہریار نے آرام کرنے سے انکار کر دیا تھا اس لیے انہوں نے لیونگ روم میں محفل سجائی تھی۔ یہیں عمر فاروق نے اسے محبت پاش نظروں سے دیکھتے

ہوئے یہ تبصرہ کیا تھا۔

”میرے لیے بھی یہ بڑے اطمینان کی بات ہے۔ بھارت کی ریشہ دوانیوں سے بچنے کے لیے ہمیں چین جیسے دوست کی ہمیشہ ضرورت رہے گی اور ابھی تو انہیں بونس میں عائشہ جیسی ذہین عورت بھی مل گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے خود چینی حکام سے مطالبہ کیا تھا کہ عائشہ کی چین میں رہائش کا بندوبست کیا جائے اور اس کی بیٹی کو بھی جلد از جلد اس تک لایا جائے۔ ان کا یہ مطالبہ قبول کرلیا گیا۔ میرے خیال میں یہ بہت اچھا ہوا۔ یہاں کے مقابلے میں عائشہ وہاں زیادہ محفوظ رہے گی۔ اس طرح میرے دل سے یہ بوجھ بھی اتر جائے گا کہ میری وجہ سے اس بے چاری کی اچھی خاصی زندگی خراب ہوگئی۔“ اس نے ان لوگوں کو عائشہ کے کردار کے بارے میں مختصراً آگاہ کیا اور بھارت میں پیش آنے والے چیدہ چیدہ واقعات سناتا رہا۔ اس دوران میں چائے اور ہلکے پھلکے اسنیکس کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ ذیشان اور میجر عمر دلچسپی سے سارے واقعات سنتے رہے۔

”تمہاری اس مہم میں بھائی جی کا کردار بہت زبردست رہا۔ اس کی شخصیت کے منفی پہلو اپنی جگہ لیکن اس کے ساتھ نے تمہارے کام کو خاصا آسان بنا دیا۔“ کہانی میں بھائی جی کے کردار پر تبصرہ کرتے ہوئے عمر فاروق نے کہا۔

”ہاں، عجیب متضاد سی شخصیت کا مالک تھا وہ۔ ایک طرف بڑا انتقلیق اور محبت کے پیچھے زندگی تیاگ دینے والا اور دوسری طرف لالچی اور موقع پرست۔ اگر اس کے رائٹ ہینڈ عبدالرحمان نے آخری لمحات میں ہماری مدد نہ کی ہوتی تو ہمارے لیے بڑی مشکل کھڑی ہو جاتی۔“ ان کی تائید کرتے ہوئے شہریار نے جوابی تبصرہ کیا۔

”جو ہوا سو ہوا۔ ہمارے لیے تو سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ تم اپنے دامن میں کامیابی سمیٹ کر صحیح سلامت ہمارے درمیان واپس آگئے۔“ ذیشان نے محبت سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

”تم لوگوں کی دعائیں ساتھ تھیں یار ورنہ میری کیا اوقات ہے۔“ اس نے عاجزی کا مظاہرہ کیا اور مزید بولا۔ ”میرے پیچھے تم لوگوں نے بھی کم کارنامے انجام نہیں دیے۔ خاص طور پر سنتھیا کے انجام اور ایئربیس سے ایک حملہ آور کی زندہ گرفتاری نے میرا دل بہت خوش کیا ہے۔ یہ بتاؤ کہ اس گرفتار ہونے والے بندے نے کچھ اگلا یا نہیں؟“

”خاصا سخت جان بندہ تھا لیکن ہمارے طریقوں کے آگے ٹھہر نہیں سکا۔ اس نے اگل دیا ہے کہ اس مہم کے پیچھے موساد اور را کا مشترکہ منصوبہ تھا۔ وہ لوگ پاکستان کو نقصان پہنچانے کے ساتھ ساتھ عالمی برادری میں نالائق بھی ثابت کرنا چاہتے تھے۔ ہم نے اس بندے سے یہاں ان کے ٹھکانوں کے بارے میں بھی معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی فراہم کردہ معلومات اس اعتبار سے بیکار ثابت ہوئیں کہ ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی پنچھی گھونسلوں سے اڑ چکے تھے۔ بعد میں وہ بندہ بھی خودکشی کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے باتھ روم کا بلب اتار کر ہولڈر میں سے تار کھینچ کر خود کو الیکٹرک شاک لگایا تھا۔ گیلے فرش اور جسم کی وجہ سے سیکنڈوں میں ہی اس کا قصہ تمام ہوگیا ورنہ ہم ارادہ کررہے تھے کہ اسے عدالت اور میڈیا کے سامنے پیش کر کے دنیا کو بھارت اور اسرائیل دونوں کے کردار سے آگاہ کیا جائے۔“ ذیشان نے بتایا۔

”دنیا ان کے کردار سے پہلے ہی آگاہ ہے لیکن بدقسمتی سے ہم تعصب کے باعث عالمی برادری میں بہت کم دوست رکھتے ہیں۔ اسلامی ممالک یکجا ہو کر سازشوں سے مقابلہ کرسکتے ہیں لیکن یہ اس سے بھی زیادہ بڑی بدقسمتی ہے کہ ہمیں ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونے کی فرصت ہی نہیں ہے۔ اپنے اسلامی تشخص کو بھول کر کچھ ممالک امریکا اور دیگر بڑی طاقتوں کی خوشنودی حاصل کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ کہیں کے حکمران اقتدار سے آگے کسی شے کی خواہش نہیں رکھتے اور کہیں اندرونی حالات اتنے خراب ہیں کہ ان سے نمٹنے میں ہی ساری توانائیاں خرچ ہو جاتی ہیں۔“ اس کے حقیقت پر مبنی اس تبصرے نے سب کے دلوں کو ہی افسردگی میں مبتلا کردیا۔ یہ وہ لوگ تھے جو مسلمانوں کو دنیا میں سربلند دیکھنے کی تمنا رکھتے تھے لیکن اپنے محدود اختیارات کے باعث کچھ بدلنے سے قاصر تھے اور بس اتنا ہی کرسکتے تھے کہ اپنے دائرۂ کار میں ہی اپنی بہترین صلاحیتوں کا استعمال کرتے رہیں۔

”اتنے اداس مت ہو برخوردار، اللہ کبھی نہ کبھی ہماری قوم کو بھی عروج دے گا۔ بس تم جیسے جوانوں کا حوصلہ بلند رہنا چاہیے۔“ آخر عمر فاروق نے ہی انہیں اس یاسیت سے نکالا۔

”انشاءاللہ!“ دونوں نے بیک وقت مسکرا کر کہا تو وہ اپنی جگہ سے کھڑے ہوگئے۔

”او کے، تم دونوں گپ شپ لگاؤ۔ مجھے کچھ کام ہے۔

اب رات کے کھانے پر ہی ملاقات ہوگی۔“ انہوں نے ان کی محفل سے رخصت لی۔

”چودھری کی کیا خبر ہے یار؟“ شہریار کو اپنے سب سے خاص دشمن کی یاد نے ستایا۔

”ابھی تک موصوف پاکستان نہیں آئے ہیں۔ بھارت سے سیدھے دبئی پہنچ گئے ہیں۔“ ذیشان نے اسے آگاہ کیا اور ساتھ ہی طوائف کے قتل والے کیس سے لے کر اس کے ٹیلی فون نمبرز کی نگرانی کے بارے میں بھی بتا ڈالا۔ ”مستقل نگرانی کے باوجود ہمیں شک ہے کہ ہم چودھری کی طرف سے آنے والی خاص کالز کو ریکارڈ کرنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے ہیں جس کی وجہ سے بہت سے حقائق ہمارے علم میں نہیں آرہے۔“ ساری تفصیلات بتاتے ہوئے ذیشان نے اس سے اپنی الجھن کا ذکر کیا۔

”چودھری جن لوگوں کے ساتھ وابستہ ہے، وہ ٹیکنالوجی کے میدان میں ہم سے بہت آگے ہیں اس لیے اس بات کا بہت زیادہ امکان ہے کہ انہوں نے چودھری کو رابطے کا کوئی بہت محفوظ ذریعہ فراہم کر رکھا ہو جس کے باعث ہمیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔“ اس نے فوراً اپنا تجزیہ پیش کیا۔

”میرا بھی یہی اندازہ ہے۔“ ذیشان نے اس کی تائید کی۔

”ٹھیک ہے، اب میں واپس آگیا ہوں تو چودھری سے بھی دو دو ہاتھ کر ہی لیتے ہیں۔ ڈاکٹر فرحان والا معاملہ فوری توجہ کا طالب نہ ہوتا تو میں پہلے ہی اس سے نمٹنے کی کوشش کرتا۔“ اس نے اپنے عزم کا اظہار کیا۔

”اس وقت بھی ہمیں ایک اور توجہ طلب مسئلہ درپیش ہے۔“ ذیشان نے دھیمی آواز میں اسے آگاہ کیا۔

”کیسا مسئلہ؟“ وہ چونکا اور ذیشان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ ذیشان فوری طور پر کوئی جواب نہیں دے سکا۔

”کیا آئرلینڈ میں کوئی گڑبڑ ہوئی ہے؟“ شہریار کو یکدم ہی ادراک ہوا کہ مسئلے کا تعلق ماہ بانو سے ہے لیکن براہِ راست اس کا نام لینے کے بجائے ذرا گھما کر سوال کیا۔

”ہاں، وہاں خاصی گڑبڑ ہو چکی ہے اور ماہ بانو خاصی مشکل میں ہے۔“ وہ اسے دھیرے دھیرے حالات سے آگاہ کرتا چلا گیا۔ اسلم کی موت اور ماہ بانو کے ہاں معذور بچے کی پیدائش کا سن کر وہ تڑپ اٹھا۔ اس سے بھی بڑھ کر پریشانی کی بات یہ تھی کہ اتنا سب کچھ سہہ لینے کے باوجود ماہ بانو محفوظ نہیں تھی اور اسے اپنی اور اپنے بچے کی جان بچانے کی تگ و دو کرنی پڑ رہی تھی۔

”میں امریکا جانا چاہتا ہوں۔ میں ماہ بانو کو ان حالات سے لڑنے کے لیے تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔“ آخرکار اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ذیشان کو بھی اس سے اسی فیصلے کی امید تھی۔

”تمہارے جانے کے انتظامات ہو جائیں گے لیکن تم زیادہ ٹینس مت ہو۔ مشابرم خان ماہ بانو کے ساتھ ہے۔ مصطفیٰ خان بھی ان لوگوں کی ہر ممکن مدد کرے گا۔ جو تمہیں عزیز ہو ہم اس کی پروا نہ کریں، یہ کیسے ممکن ہے۔“ ذیشان نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر دلاسا دیا لیکن اس کے سینے میں دھڑکتا دل اس وقت تک قرار نہیں پا سکتا تھا جب تک اسے ماہ بانو کے محفوظ ہونے کا مکمل یقین نہ ہو جاتا۔ ابھی تو وہ یہ سوچ سوچ کر ہی بے چین ہوا جارہا تھا کہ ماہ بانو نے اسلم جیسے مخلص اور محبت کرنے والے ساتھی کی جدائی کا غم کیونکر سہا ہوگا۔ وہ جانتا تھا کہ اسلم ماہ بانو کی پہلی محبت نہیں ہے لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اسلم کی محبت میں اتنی گہرائی تھی کہ اس نے ماہ بانو کے دل میں اپنی جگہ ضرور بنائی ہوگی۔ ایک بے اماں اور تنہا لڑکی ایسی سچی محبت کی ناقدری کر ہی نہیں سکتی تھی۔ خود اسے اگر اسلم کی محبت پر بھروسا نہ ہوتا تو وہ ماہ بانو کو اس کے حوالے کیسے کرتا۔ اس نے تو یہی سوچا تھا کہ وہ دونوں یہاں سے دور رہ کر اپنی ایک الگ دنیا بسائیں گے اور سارے مسئلے مسائل سے بچ کر ایک دوجے کے ساتھ خوش رہیں گے لیکن قسمت اتنی دور جا کر بھی اپنا وار کرنے سے نہیں چوکی تھی اور اس کی ماہ بانو ایک بار پھر گرداب میں پھنسی ہوئی تھی۔ اسے ہر حال میں ماہ بانو کو اس گرداب سے نکالنا تھا، یہ سوچے بغیر کہ اس بار اس کے سامنے چودھری نہیں امریکا جیسی بڑی طاقت مقابل کھڑی ہے۔

☆☆☆

بہت صبح کا وقت تھا بلکہ سورج طلوع ہونے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا جب عمیر اور جگو نے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ جگو، عمیر کی ہدایت پر گھر والوں سے مل کر اس کے پاس واپس آگیا تھا چنانچہ ان کی اتنی صبح روانگی میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ انہیں جن راستوں پر سفر کرنا تھا، اس کے لیے جیپ ہی سب سے بہترین انتخاب تھی چنانچہ اس وقت عمیر نے جیپ کا ہی اسٹیئرنگ سنبھال رکھا تھا۔

”میں جنگل میں داخل ہونے کے معاملے پر ایک

عرصے سے غور کررہا ہوں اس لیے بہت سے نتائج اخذ کرنے میں کامیاب رہا ہوں۔ جنگل کے ساتھ جو گاؤں دیہات لگتے ہیں، ان میں پیر آباد ہی ایسا گاؤں ہے جہاں سے جنگل تک پہنچنے کا راستہ سب سے آسان ہے۔ ایک راستہ اللہ آباد سے بھی جاتا ہے لیکن خود اللہ آباد پہنچنے کا راستہ بہت خراب ہے اس لیے لوگ اس طرف کا رخ نہیں کرتے۔ دوسری طرف ٹاہلی والاں اور دوسرے چند گاؤں ہیں لیکن وہ جنگل کے سرسبز حصے کے بجائے خشک پہاڑی حصے سے ملے ہوئے ہیں اس لیے وہاں سے بھی آمدورفت شاذونادر ہی ہوتی ہے لیکن بہرحال راستہ موجود ہے۔" اس نے لمحے بھر کو توقف کیا۔

"اب ہم معاملے کو اس زاویے سے دیکھیں کہ کچھ لوگ جنگل میں کوئی غیر قانونی کام جاری رکھے ہوئے ہیں اور وہ نہیں چاہتے کہ لوگ ان کے کام میں مداخلت کریں تو غور کرنا پڑے گا کہ انہوں نے مداخلت کاروں سے بچنے اور آگاہ رہنے کے لیے کیا طریقہ کار اختیار کیا ہوگا؟

"سب سے پہلے تو انہوں نے مروجہ راستوں پر نگرانی کا انتظام کیا ہوگا تاکہ جیسے ہی کوئی جنگل میں داخل ہو، انہیں معلوم ہوجائے۔ چنانچہ نقشے کی مدد سے میں نے بہت سوچ بچار کے بعد ایک ایسے راستے کا انتخاب کیا ہے جو دشوار تو ضرور ہے مگر وہاں نگرانی کا امکان نہیں ہے۔ اس وقت ہم اسی راستے کی طرف جارہے ہیں۔ اب معاملے کا دوسرا پہلو سامنے رکھتے ہیں۔ جنگل میں مختلف وجوہات کی بنا پر مختلف افراد کا آنا جانا لگا رہتا ہے اور وہ سارے افراد وہاں حادثے کا شکار نہیں ہوجاتے۔ خاصی اموات کے باوجود جنگل میں جانے اور سلامت واپس آجانے والوں کی تعداد نسبتاً بہت زیادہ ہے اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ موت صرف انہی کے حصے میں آتی ہوگی جو کسی خاص راز سے واقف ہوجاتے ہوں گے۔ یہاں ہمیں یہ بات مدِنظر رکھنی ہوگی کہ کسی مجرمانہ سرگرمی کے لیے جنگل کو ٹھکانا بنانے والے جنگل کے کسی خاص حصے پر ہی قابض ہوں گے لیکن ظاہر ہے اتنے بڑے جنگل میں ہم کسی خاص مقام کا تعین آسانی سے نہیں کرسکتے، البتہ میں نے کچھ اندازے ضرور لگائے ہیں۔

"اظفر اور اس کے ساتھیوں کی لاشیں ہمیں جہاں سے ملیں، وہ حصہ اچھی طرح چیک کیا گیا تھا اور یہ بات یقینی ہے کہ وہ حصہ بالکل صاف ہے۔ یعنی ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ انہیں مشکوک جگہ سے دور لاکر قتل کیا گیا تھا۔ بظاہر موت کی وجہ جنگلی جانوروں کا حملہ بنی لیکن پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے یہ بھی ثابت کردیا ہے کہ جنگلی جانوروں کے حملے سے قبل وہ سب کے سب بے ہوش تھے۔

"مجھے اظفر کے سامان سے ایک نقشہ ملا تھا جس میں اس نے ایک خاص مقام کو مارک کررکھا تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جنگل کے اس حصے تک جانا چاہتا تھا لیکن حیرت انگیز طور پر ہمیں جو لاشیں ملیں، وہ اس کے بالکل مخالف سمت میں تھیں اور ایسا یقیناً حقائق پر پردہ ڈالنے کے لیے کیا گیا ہوگا۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم جنگل میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے اسی حصے کو چیک کریں گے لیکن پوری احتیاط سے اور ذرا فاصلے پر رہ کر۔ کام پورا ہونے میں چاہے دیر لگ جائے لیکن بے احتیاطی سے مجرموں کو کوئی فائدہ نہیں ہونا چاہیے۔" جیپ کو طے شدہ راستے پر چلاتے ہوئے عمیر، جگو کو بریفنگ دے رہا تھا۔

"ٹھیک ہے سر، میں آپ کی گل چنگی طرح سمجھ گیا۔ آپ جیسا کہیں گے میں ویسا ہی کروں گا۔" اس کی اتنی لمبی تقریر کے جواب میں جگو نے صرف ایک جملہ کہا جو اسے بہت پسند آیا کیونکہ وہ جگو سے یہی چاہتا تھا۔ ذرا سی بے احتیاطی معاملے کو بہت زیادہ بگاڑ بھی سکتی تھی۔

"گڈ! اب تم ایسا کرو کہ پیچھے رکھے بیگز میں سے ٹیلی اسکوپ اور اپنی پسند کا اسلحہ نکال کر پہلے ہی سنبھال لو۔ نیلا بیگ تمہارا اور ہرا میرا ہے۔ یہ بیگ ہمیں اپنی پیٹھ پر لاد کر لے جانے ہوں گے۔ جیپ میں جنگل سے باہر ہی ایک محفوظ جگہ پر چھپا دوں گا کیونکہ اس کو لے جانے کی صورت میں ہم فوراً ہی نظر میں آجائیں گے۔ ویسے بھی میں نے جس راستے کا انتخاب کیا ہے، وہاں سے جیپ کا گزرنا ممکن نہیں ہوگا۔" عمیر نے اس سے کہا تو اس نے جھک کر پچھلی نشست پر رکھا نیلا بیگ اٹھا لیا اور اس میں سے حسب ہدایت اشیا نکالنے لگا۔ اس کے بعد کا سفر جو کہ زیادہ طویل نہیں تھا، خاموشی سے گزرا۔

عمیر نے منزل پر پہنچ کر جیپ روک لی اور پھر ان دونوں نے مل کر اسے ایک ایسی جگہ چھپا دیا جہاں چند بڑے اور پرانے درختوں کی شاخیں زمین کو چھو رہی تھیں۔ تھوڑی بہت کمی شاخیں اور پتے توڑ کر جیپ پر پھیلانے کے بعد پوری ہوگئی۔ جیپ سے اترنے سے قبل انہوں نے ایک ایک واکنگ اسٹک بھی تھام لی تھی۔ ان کے سروں پر ایسی ٹوپیاں تھیں جن کے سامنے کے حصے پر ٹارچیں لگی ہوئی تھیں۔ یہ بالکل ایسی ٹوپیاں تھیں جو کان کنوں کے زیرِ استعمال ہوتی ہیں لیکن فی الحال انہوں نے ان ٹارچوں

کو روشن نہیں کررکھا تھا۔

"اس حصے میں زمین بہت نرم اور قدرے دلدلی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ کسی زمانے میں یہاں ندی ہوتی تھی لیکن ندی سوکھ گئی اور زمین اب تک دلدلی ہے۔ لوگ زمین کی ساخت سے واقف ہونے کی وجہ سے اس حصے کا رخ کرنے کی جرأت نہیں کرتے لیکن مجھے میرے اسٹاف میں شامل ایک لڑکے نے بتایا تھا کہ ایک پتلی سے راہ گزر ایسی ہے جس پر چل کر جنگل کے اندر تک پہنچا جاسکتا ہے۔ میں اس سے وہ راستہ اچھی طرح سمجھ چکا ہوں پھر بھی احتیاطاً اسٹکس لے لی ہیں کہ راستہ چیک کرتے ہوئے آگے بڑھیں۔ راستے پر میں آگے رہوں گا، تم مجھے فالو کرنا۔" قدم بڑھانے سے قبل عمیر نے جگو کو مزید بریفنگ دی۔

"ٹھیک ہے سر جی... لیکن آگے مجھے چلنے دیں ورنہ مجھے لگے گا کہ میں بزدل ہوں اور سارے خطروں کا آپ اکیلے سامنا کررہے ہیں۔" جگو نے سر ہلایا اور ساتھ ہی ایک فرمائش بھی کردی۔

"نہیں یار! یہ بزدلی اور بہادری کا چکر نہیں ہے۔ تمہاری بہادری ثابت شدہ ہے۔ میں آگے صرف اس لیے رہنا چاہتا ہوں کہ مجھے تمہارے مقابلے میں راستہ زیادہ اچھی طرح معلوم ہے۔" عمیر نے ذرا سا ہنس کر اسے سمجھایا تو وہ راضی ہوگیا۔

طلوع ہوتے سورج کی بہت ہلکی روشنی میں سفر کا نازک مرحلہ شروع ہوا۔ یہ راستہ واقعی دشوار تھا۔ واکنگ اسٹکس نے اس راستے پر چلنے میں ان کی بہت مدد کی۔ جہاں بھی زمین ایک حد سے زیادہ نرم تھی، اسٹک کے دھنساؤ نے قبل از وقت آگاہ کردیا لیکن پھر بھی ایک جگہ عمیر پھسل گیا۔ خوش قسمتی سے وہ صرف کیچڑ تھی جس نے دلدل کی شکل اختیار نہیں کی تھی۔ جگو کے سہارے وہ دوبارہ اٹھ کر چلنے کے قابل ہوگیا۔

آخرکار انہوں نے نہایت سست روی سے جنگل کے اندر رسائی کا یہ مشکل راستہ طے کرلیا۔ اب سورج پوری طرح طلوع ہوچکا تھا لیکن گھنے درختوں کی وجہ سے اس کی شعاعیں جنگل کے اندر بھرپور رسائی حاصل کرنے میں ناکام تھیں۔

عمیر نے ایک درخت کے نیچے رک کر نقشہ نکالا اور ٹارچ کی روشنی میں اس کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ کمپاس کی مدد سے اپنی سمت کا تعین کیا۔ جگو پڑھا لکھا بندہ نہیں تھا اس لیے اس قسم کے معاملات میں مدد کرنے سے قاصر صرف ہدایات ملنے کا انتظار کرتا تھا۔ اب بھی عمیر نے سمت کا تعین کرنے کے بعد آگے بڑھنے کی ہدایت کی تو وہ چل پڑا۔ ان کی ٹارچیں ایک بار پھر بند تھیں کیونکہ وہ ان کی روشنی کے باعث کسی کی نظروں میں آنے کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ آگے بڑھنے کے لیے درختوں کے پتوں سے چھن کر آنے والی معمولی روشنی بھی کافی تھی۔

دن کا آغاز ہوتے ہی جنگل میں زندگی بھی جاگ اٹھی تھی۔ وہ مختلف چرند پرند کی آوازوں کے ساتھ ان کی چہل پہل کو بھی اچھی طرح محسوس کرسکتے تھے۔ صبح ہوتے ہی رزق کے حصول کے لیے بھاگ دوڑ شروع ہوگئی تھی۔ حالات کی سنگینی کے باوجود انہیں فطرت کے اس حسن نے متاثر کیا۔ یک دم ہی منظر میں ہرنوں کا ایک جوڑا داخل ہوا۔ شاخ در شاخ سینگوں والے وہ ہرن بہت خوب صورت تھے اور آپس میں اٹکھیلیاں کرتے بہت پیارے لگتے تھے۔ ان دونوں کی توجہ خودبخود ہی ان پر مرکوز ہوگئی اور وہ ایک درخت کے تنے کے ساتھ چپکے انہیں دیکھتے رہے۔ شوخ جوڑا چند لمحوں میں ہی قلانچیں بھرتا ہوا آگے کی طرف بڑھ گیا تو انہوں نے بھی قدم آگے بڑھائے۔ فاصلے کے باوجود انہیں ہرنوں کے متحرک جسم اچھی طرح نظر آرہے تھے۔ اتفاق سے ہرن بھی اسی سمت بھاگ رہے تھے جس سمت انہیں جانا تھا چنانچہ وہ تقریباً ہرنوں کے پیچھے ہی تھے۔ یکایک ان کی نظروں نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔ جوڑے میں سے آگے بھاگتا ہوا ہرن یک دم ہی زور سے پیچھے کی طرف اچھلا اور زمین پر گر کر ساکت ہوگیا۔ یہ منظر بالکل ایسا تھا جیسے بال دیوار سے ٹکرا کر باؤنس ہو لیکن ہرن کی راہ میں کوئی دیوار نہیں تھی۔ نہ جانے وہ کس نادیدہ شے سے ٹکرا کر اس بری طرح اچھلا تھا کہ اس کا ساتھی ہرن بھی دم بخود تھا۔

"درخت پر چڑھ جاؤ۔" عمیر نے سرگوشی میں جگو کو ہدایت کی اور خود بھی ایک قریبی درخت کے تنے پر چڑھنے لگا۔ وہ درخت پر چڑھ رہے تھے تب انہوں نے کہیں کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنیں۔ ان آوازوں پر دم بخود کھڑا ہرن چوکنا ہوا اور مخالف سمت میں بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ دونوں جب تک درختوں کی بلند شاخوں تک پہنچ کر ان پر براجمان ہوئے، کتوں کے بھونکنے کی آوازیں قریب آچکی تھیں۔ انہوں نے آواز کی سمت دیکھا۔ وہ چار پانچ کتوں کا ایک غول تھا جو ہرن کی لاش کے قریب پہنچ چکا تھا۔ منظر کو زیادہ وضاحت سے دیکھنے کے لیے انہوں نے اپنی

دوربینیں آنکھوں سے لگالیں۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے پانچوں کتوں نے مل کر ہرن کی لاش کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔ جنگل کی زندگی میں یہ منظر انوکھا نہیں تھا لیکن انہیں جو بات قابل غور محسوس ہوئی، وہ یہ تھی کہ پانچوں کتوں کے گلے میں پٹے پڑے ہوئے تھے اور وہ کسی طور جنگلی کتے نہیں لگ رہے تھے۔ جنگلی کتوں کے گلے میں پٹوں کی موجودگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کتے یقیناً بہت بھوکے تھے۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے اچھے خاصے صحت مند ہرن کو چٹ کر ڈالا اور ہڈیاں تک چبا گئے۔

اسی وقت جنگل کی فضا میں ایک تیز سیٹی کی آواز گونجی اور کتوں کے جسم ایسے ساکت ہو گئے جیسے ان کے جسموں کو کوئی نادیدہ چابک پڑی ہو۔ انہوں نے اپنے منہ میں دبی ہڈیوں کو بھنبھوڑنا چھوڑا اور بالکل میکانکی انداز میں پلٹ کر واپس اس سمت بھاگے جہاں سے نمودار ہوئے تھے۔ اب شک و شبے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی تھی اور یہ طے ہو گیا تھا کہ وہ تربیت یافتہ سدھائے ہوئے کتے ہیں۔ اظفر اور اس کے ساتھیوں کی موت بھی یقیناً انہی کتوں کی وجہ سے ہوئی تھی۔ اس منظر نے ان پر یہ بھی واضح کر دیا کہ وہ جنگل کے اس حساس حصے میں پہنچنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جو پراسرار سرگرمیوں کا مرکز ہے۔

''اب ہمیں بہت احتیاط کرنی ہو گی جگو۔ ہم ڈینجر زون کے قریب پہنچ چکے ہیں اور ذرا سی بھی غلطی ہمارے لیے موت کا پیغام بن سکتی ہے۔'' اس نے اپنے آپریٹس پر جگو کو مخاطب کیا۔

''جی سر! میں سمجھ گیا ہوں۔'' جگو نے اسے جواب دیا۔ اس کے بعد عمیر اسے بتانے لگا کہ وہ آگے کے لیے کیا ارادہ رکھتا ہے۔

''مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ ہمیں کتنے فاصلے پر رہ کر اپنا کام کرنا ہو گا۔ میں آگے بڑھوں گا اور حقائق جاننے کی کوشش کروں گا۔ تم اپنی جگہ پر رک کر مجھے کور دیتے رہو گے۔ بلاوجہ ہم میں سے کوئی بھی اپنی زندگی کو خطرے میں نہیں ڈالے گا... ٹھیک ہے نا؟'' اپنی بات کے اختتام پر اس نے جگو سے سوال کیا۔

''ٹھیک ہے سر! جیسا آپ کا حکم۔'' وہ اس کی مکمل فرمانبرداری کر رہا تھا۔ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر عمیر درخت سے اترا اور پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا اس سمت بڑھا جہاں اس نے ہرن کو کسی نادیدہ دیوار سے ٹکرا کر اچھلتے دیکھا تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ یہ سائنس کا کوئی کرشمہ تھا اور جنگل کے ایک مخصوص حصے کو کسی بیرونی مداخلت سے محفوظ رکھنے کے لیے ایسا حصار بنایا گیا تھا کہ جیسے ہی کوئی ذی روح اس حصے میں داخل ہونے کی کوشش کرے، اسے الیکٹرک شاک جیسی کسی چیز کا سامنا کرنا پڑے۔ شاک لگنے کے بعد جاندار ... مردہ یا نیم مردہ ہو جاتا تو اسے آخری انجام تک پہنچانے کے لیے اس پر کتوں کو چھوڑ دیا جاتا، یوں قصہ تمام ہو جاتا۔ عمیر نے اپنی نظروں سے اس مقام کا تعین کر لیا تھا جہاں ہرن کو جھٹکا لگا تھا چنانچہ یہ طے تھا کہ اسے اس جگہ کے قریب بھی نہیں جانا ہے۔ وہ بس اس کے آس پاس کسی ایسے درخت کی تلاش میں تھا جو بہت بلند ہو اور اس پر چڑھ کر وہ دور تک جائزہ لے سکے۔ آخر کار اسے ایک ایسا درخت نظر آ گیا۔ اس نے احتیاط سے درخت پر چڑھنا شروع کر دیا۔ درخت بلند ہونے کے ساتھ اس کا تنا بھی خاصا سیدھا تھا اس لیے اس پر چڑھنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ کئی بار وہ پھسلتے پھسلتے بچا لیکن بالآخر اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا۔

ایک بلند شاخ پر پہنچ کر اس نے پہلے اپنی ناہموار سانسوں پر قابو پایا اور بیگ میں سے پانی کی بوتل نکال کر دو گھونٹ بھرے پھر گردن سے لٹکی دوربین کو آنکھوں سے لگا کر اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ جلد ہی اس کی نظریں اس منظر کو پا گئیں جس نے اس پر جنگل کا راز کھول دیا۔ وہاں کچھ ہٹ نما گھر بنے تھے جن کے ساتھ ہی کھیت بھی نظر آ رہے تھے۔ جنگل میں کھیت بڑی عجیب سی بات تھی۔ اس نے لینس کو زوم کیا تاکہ اندازہ ہو سکے کہ یہ کس چیز کے کھیت ہیں لیکن درست اندازہ لگانے سے قاصر رہا۔ دیہاتوں میں اسے جن فصلوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا، نظر آنے والے پودے ان میں سے کسی سے بھی مماثلت نہیں رکھتے تھے۔ یوں بھی کسی کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ چاول، گندم یا کپاس جیسی کسی فصل کو جنگل کے ساتھ اتنی رازداری سے کاشت کرتا۔ فصل کے جائزے کے دوران اس مسئلے پر غور کرتے ہوئے اسے اظفر کے ساتھ مرنے والے چودھری کے ملازم بہرام کے آخری الفاظ یاد آئے۔ اس نے مرتے وقت جو چند الفاظ ادا کیے تھے، ان میں سے ایک لفظ شاید ''افیون'' تھا۔

''او مائی گاڈ! یہ لوگ یہاں افیون کاشت کر رہے ہیں۔'' زیرلب بڑبڑاتے ہوئے وہ شدید حیرت میں مبتلا تھا کیونکہ تمام لوگوں کی طرح وہ بھی یہی جانتا تھا کہ افیون کے پودے ٹھنڈے ماحول میں پہاڑی علاقوں میں لگائے جاتے ہیں۔ ملک کا شمالی حصہ اور افغانستان کا نام اس سلسلے

میں تو اکثر سننے میں آتا تھا لیکن یہاں تو کچھ انوکھی ہی صورت حال تھی۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ سنبھل کر بیٹھ گیا اور باریک بینی سے اس جگہ کا جائزہ لینے لگا۔ دوربین سے جہاں تک کا منظر اسے دکھائی دے رہا تھا، اس میں اسے چند ہی انسانی وجود نظر آئے تھے۔ یہ کھیتوں میں کام کرنے والے کسان تھے۔

''یہ تو بہت خطرناک کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ واپس جا کر میجر ذیشان سے رابطہ کرتا ہوں۔ اس سیٹ اپ کو تباہ کرنے کے لیے تو بہت بڑے پیمانے پر کارروائی کی ضرورت پڑے گی۔'' دل میں سوچتا ہوا وہ واپسی کے ارادے سے درخت سے اترنے ہی لگا تھا کہ اسے چند افراد نظر آئے جنہوں نے اپنے سروں پر لکڑی کی پیٹیاں اٹھائی ہوئی تھیں اور انہیں ایک خالی جگہ پر ایک کے اوپر ایک ترتیب سے رکھتے جا رہے تھے۔ ان پیٹیوں کی موجودگی کا مطلب تھا کہ یہاں سے عنقریب مال لے جایا جانے والا ہے۔ اسے جو کچھ جاننا اور سمجھنا تھا، سمجھ چکا تھا چنانچہ کسی قسم کی مداخلت کا احمقانہ خیال دل میں نہیں لایا۔ اسے معلوم تھا کہ اس قسم کے سیٹ اپ سے نمٹنے کے لیے بڑے پیمانے پر کارروائی کرنا ضروری ہے۔ کوئی تنہا شخص یا چھوٹا موٹا گروپ ان لوگوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ بہت قیمتی معلومات آسانی سے حاصل ہو جانے کی خوشی اور جوش دل میں لیے وہ درخت سے نیچے اترا لیکن زمین پر قدم رکھنے کے بعد ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکا تھا کہ ایک رائفل کی نال اس کی گردن سے آ لگی۔

''ہتھیار پھینک کر دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لو۔'' حکم دینے والے کا لہجہ رائفل کی نال سے بھی زیادہ سرد تھا۔ عمیر کو اس کے حکم کی تعمیل کرنی پڑی۔

''کون ہو تم؟ کیا ڈاکو ہو؟ اگر ڈاکو ہو تو یاد رکھو کہ میرے پاس کوئی مال و دولت نہیں ہے۔ میں ایک شکاری ہوں اور میرے پاس بس شکار کا ہی سامان ہے۔'' اپنے حواس کو قابو میں رکھتے ہوئے اس نے جان بوجھ کر اس شخص کو ڈاکو قرار دیا حالانکہ وہ سمجھ چکا تھا کہ یہ شخص کون ہو سکتا ہے؟ نگرانی کے لیے جدید آلات استعمال کرنے والوں نے اصل میں اپنے آلات پر بھی سو فیصد بھروسا نہیں کیا تھا اور ان کے پہرے دار وقتاً فوقتاً اطراف کا چکر لگاتے رہتے تھے۔ درخت سے اترتے ہوئے وہ ایسے ہی ایک پہرے دار کی نظر میں آ گیا تھا۔

''بکواس بند کرو۔ شکاری تمہاری طرح کے نہیں ہوتے۔ ویسے بھی ہمیں اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اس جنگل میں کب اور کون سا شکاری کس حصے میں آئے گا۔ تم چھپ کر آئے ہو، اس کا مطلب ہے کہ کسی اور چکر میں ہو۔'' اس شخص نے غرا کر جواب دیا جس سے اندازہ ہو گیا کہ انہوں نے اپنی حفاظت کا کتنا معقول انتظام کر رکھا ہے۔ اگر وہ لوگ مروجہ راستوں سے جنگل میں آئے ہوتے تو ابتدا میں دھر لیے جاتے۔ پھنس تو وہ اب بھی گیا تھا لیکن امید تھی کہ جگو کے نظر میں نہ آنے کی وجہ سے بچت کی کوئی صورت نکل آئے گی۔ اس کی یہ امید رائگاں نہیں گئی۔ جگو نے واقعی دیکھ لیا تھا کہ اس کے ساتھ کیا پیش آیا ہے۔ وہ بہت خاموشی سے اس درخت سے نیچے اترا جس پر چھپا ہوا تھا اور احتیاط سے گھومتا ہوا عمیر کو نشانہ بنائے شخص کے عقب میں پہنچ گیا۔ اس آدمی کو بہت تاخیر سے اندازہ ہوا کہ کوئی اس کے پیچھے ہے۔ وہ جب تک بھڑک کر پلٹا، جگو حملہ کر چکا تھا۔ اس کے پستول کا دستہ پوری قوت سے اس شخص کے سر پر پڑا اور وہ چیخ مارتا ہوا نیچے گر گیا۔ اس کی یہ چیخ ان لوگوں کے لیے خطرناک ثابت ہوئی۔ فوراً ہی بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ آوازوں سے اندازہ ہوا کہ وہ کم سے کم بھی دو ہیں۔

''بھاگو... نکلو یہاں سے۔'' عمیر نے جگو سے کہا اور خود بھی اپنی نیچے پڑی رائفل اٹھا کر بگٹٹ بھاگا۔ بھاگتے ہوئے بھی اس نے دھیان رکھا تھا کہ وہ درست سمت میں سفر کریں تاکہ واپسی کے محفوظ راستے تک پہنچ سکیں لیکن ان کا تعاقب کرنے والے ان سے بھی تیز دوڑ رہے تھے اور صاف محسوس ہو رہا تھا کہ جلد وہ انہیں آ لیں گے۔ پھر اچانک ہی ان لوگوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ گولیاں ان کے آس پاس سے سنسناتی ہوئی گزرنے لگیں۔ مجبوراً انہیں بھی رک کر جوابی فائر کرنے پڑے۔ ان فائروں نے خاطر خواہ اثر کیا۔ پیچھے آنے والے محتاط ہو گئے کہ اس طرح اندھا دھند تعاقب کرنا ان کے لیے بھی نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ احتیاط نے ان کی رفتار سست کر دی جس نے عمیر اور جگو کو تیزی سے بھاگنے کا موقع فراہم کیا۔ سرپٹ بھاگتے ہوئے ایک وقت ایسا آیا کہ انہیں لگا ان کے پیچھے کوئی نہیں ہے اور وہ پیچھے آنے والوں سے جان چھڑانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

انہوں نے ذرا رک کر اپنا سانس بحال کیا۔ اب واپسی کا وہ خطرناک راستہ سامنے تھا جس پر سے سنبھل کر گزرنا ضروری تھا۔

دونوں نے اپنے بیگز سے ہک کی مدد سے لٹکائی گئی

فولڈنگ واکنگ اسٹکس نکال کر کھولیں اور قدم آگے بڑھائے۔ اسی پل ایک غراہٹ سنائی دی اور ایک جسیم کتے نے جگو پر حملہ کیا۔ جگو کے سنبھلتے سنبھلتے بھی وہ اسے ساتھ لے کر زمین پر گر گیا۔ عمیر نے تیزی سے اپنی رائفل سیدھی کی لیکن کتا جگو سے اس بری طرح چمٹا ہوا تھا کہ اس پر فائر کرنا خود جگو کے لیے بھی خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ اب یہی صورت تھی کہ وہ رائفل کا بٹ مار کر کتے کو قابو کرنے کی کوشش کرے۔ اس ارادے سے اس نے ابھی حرکت کی ہی تھی کہ ایک اور کتا اس پر حملہ آور ہوا۔ تعاقب کرنے والوں نے چالاکی کی تھی اور خود ناکام ہونے پر ان کتوں کو پیچھے لگا دیا تھا۔ تربیت یافتہ کتوں نے اتنی ہوشیاری سے ان کا تعاقب کیا تھا کہ انہیں بھنک بھی نہیں پڑسکی تھی اور کتے موقع پاتے ہی ان پر حملہ آور ہو گئے تھے۔ عمیر کی البتہ یہ خوش قسمتی رہی کہ کتا پہلے ہی حملے میں جگو کی طرح اسے زمین پر نہ گرا سکا۔ اصل میں اس نے کتے کو خود پر چھلانگ لگاتے ہوئے دیکھ لیا تھا چنانچہ رائفل کو لاٹھی کی طرح چلایا اور کتے کی کمر پر ایک زوردار ضرب لگائی۔ کتا دور جا کر گرا لیکن اسی اثنا میں ایک اور کتا میدان میں اتر چکا تھا۔ اپنے ساتھی کو ضرب کھا کر گرتا دیکھ کر وہ وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ عمیر پر حملہ آور ہوا۔

عمیر نے رائفل کا بٹ آگے کر کے کچھ ایسے انداز میں اس کے حملے کا جواب دیا کہ اس کا جبڑا ٹوٹ گیا۔ کتا غصے اور اذیت سے بہت زور سے چیخا اور دوبارہ حملہ آور ہوا۔ اس بار پہلے گر جانے والے کتے نے بھی اس کا ساتھ دیا اور دونوں نے ایک ساتھ دو مختلف سمتوں سے اس پر چھلانگ لگائی۔ عمیر کو اور کچھ نہ سوجھا تو ایک درخت کی لٹکی ہوئی شاخ تھام کر اس سے جھول گیا۔ دونوں کتے پوری قوت سے ایک دوسرے سے ٹکرائے اور گر گئے لیکن خود عمیر کو بھی یہ نقصان ہوا کہ وہ لٹکنے کے چکر میں اپنی رائفل گنوا بیٹھا۔ اب وہ اوپر درخت کی شاخ سے لٹکا ہوا تھا اور نیچے دونوں کتے کھڑے وحشیانہ انداز میں بھونک رہے تھے۔ ادھر جگو بھی خود پر حملہ آور کتے سے نبرد آزما تھا۔ وہ گاؤں کا پروردہ تھا اور اسے طاقت اور تکنیک کے بل بوتے پر خالی ہاتھ بھی اس قسم کے جانوروں سے نمٹنے کی مشق تھی اس لیے اس نے کسی طرح خود سے چمٹنے والے کتے سے اپنے جسم کو آزاد کروا لیا تھا اور اب اس کے حملوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔

اس کتے سے نمٹنے میں اسے زیادہ دشواری اس لیے پیش آ رہی تھی کہ وہ کوئی عام آوارہ یا جنگلی کتا نہیں تھا بلکہ باقاعدہ تربیت یافتہ تھا اور یقینی طور پر انسانوں پر حملہ کرنے کے لیے ہی تربیت دیا گیا تھا اس لیے کسی خطرناک لڑاکے کی طرح حملے کر رہا تھا لیکن آخر کار جگو نے اس پر اپنی برتری ثابت کر دی۔ کتے نے اس پر چھلانگ لگائی تو وہ عین وقت پر نیچے بیٹھ گیا اور کتا اپنے ہی زور میں آگے جا کر گرا۔ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر جگو نے پتلے پھل والا تیز دھار چاقو نکال لیا اور جب کتا سنبھل کر دوبارہ اس پر حملہ آور ہوا تو یہ چاقو اس کی پسلیوں کو چیرتا ہوا سیدھا دل میں پیوست ہو گیا۔ جسیم اور طاقت ور کتا دھپ سے زمین پر آ رہا۔

اس دوران میں درخت کی شاخ سے لٹکے عمیر نے کسی نہ کسی طرح اپنا پسٹل نکال لیا تھا۔ ایک ہاتھ سے اپنا وزن سنبھالتے ہوئے اس نے دوسرے سے فائر کیا۔ گولی اس کتے کو لگی جس کا جبڑا مجروح تھا۔ دوسرا تیزی اور چالاکی کا مظاہرہ کرتا ہوا ایک جست لگا کر جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔ اپنے مقابل کتے سے نمٹ لینے والے جگو نے آگے بڑھ کر عمیر کی گری ہوئی رائفل اٹھائی اور جھاڑیوں کی سمت پے در پے کئی فائر کیے جو شاید بے نتیجہ ہی ثابت ہوئے۔

”جلدی یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔ آوازوں نے تعاقب کرنے والوں کو ہماری موجودگی کے درست مقام سے آگاہ کر دیا ہوگا۔“ عمیر نے نیچے چھلانگ لگائی اور تیزی سے بولا۔ وہ ایک بار پھر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس سارے ہنگامے میں جگو اپنے پسٹل اور دونوں ہی اپنی واکنگ اسٹکس سے محروم ہو گئے تھے۔ البتہ رائفلیں محفوظ تھیں اور دونوں نے اس بار رائفلیں تھام لی تھیں۔ جیسے ہی انہوں نے کیچڑ زدہ دلدلی زمین والے راستے پر قدم رکھے، عقب سے گولی چلائی گئی اور یہ صرف اور صرف عمیر کی خوش قسمتی تھی کہ گولی اس کے کان کی لو اڑاتی ہوئی گزر گئی۔ اس نے زخمی کان سے بہنے والے خون کی چپچپاہٹ اپنی گردن پر محسوس کی لیکن یہ زخموں پر غور کرنے کا موقع نہیں تھا۔ ایک دوسرے کو کور دیتے ہوئے انہوں نے جوابی فائرنگ کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ اس وقت وہ صرف اندازے اور قسمت کے بھروسے پر آگے بڑھ رہے تھے۔ دیکھ بھال کر راستہ طے کرنے کا کوئی موقع نہیں تھا۔

”تم تھوڑا آگے نکل کر ان پر فائرنگ کرو، میں یہاں رک کر انہیں نشانہ بنانے کی کوشش کرتا ہوں۔“ عمیر نے ایک درخت کی آڑ میں رکتے ہوئے جگو کو ہدایت کی۔ درخت کا تنا زیادہ موٹا نہیں تھا اور اس کے پیچھے چھپنے کی

صورت میں وہ دکھائی بھی دے سکتا تھا لیکن یہ بحث و مباحثے کا وقت نہیں تھا اس لیے جگو نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ ویسے ان کے جسموں پر جو گہرے رنگ کے دھاری دار لباس تھے، وہ انہیں جنگل کے ماحول میں کیموفلاج کر رہے تھے۔ عمیر جنگل میں آتے ہوئے کیچڑ میں پھسل گیا تھا جس کی وجہ سے اس کا لباس جنگل کے ماحول میں چھپنے کے لیے اور بھی مناسب ہو گیا تھا چنانچہ وہ درخت کے پتلے تنے سے لپٹ کر کھڑا ہوا تو مکمل طور پر چھپ گیا۔ پیچھے آنے والے دونوں افراد ان کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس گئے۔ عمیر کی ہدایت پر آگے جا کر فائرنگ کرنے والے جگو کی رائفل گرجی تو وہ دونوں اس کی طرف متوجہ ہو گئے اور خود بھی جوابی فائرنگ کرنے لگے۔

اس جوابی فائرنگ نے عمیر کو ان کی موجودگی کے مقام سے آگاہ کر دیا اور اس نے بہت دیکھ بھال کر اور باقاعدہ گھات لگا کے اس وقت فائر کیا جب ان میں سے ایک اپنا سر درخت کی آڑ سے نکال کر فائر کر رہا تھا۔ عمیر کے کیے ہوئے فائر نے اس کی کھوپڑی اڑا دی۔ دوسرے نے آواز سے سمت کا تعین کر کے اس کی طرف فائر کیا لیکن وہ فوری طور پر نیچے گر گیا تھا اس لیے بچت ہو گئی۔ ایک بار نیچے گرنے کے بعد اس نے دوبارہ کھڑے ہونے کی غلطی نہیں کی اور رینگتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ صورتِ حال کو اچھی طرح سمجھتا جگو اسے بھرپور کور فراہم کر رہا تھا۔

وہ دونوں ہی اس بات کو سمجھ رہے تھے کہ وہ جتنی جلدی یہاں سے نکل جائیں، ان کے حق میں اتنا ہی اچھا ہوگا ورنہ پیچھے سے مزید کمک آ جاتی تو وہ بری طرح گھر جاتے۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ اصل میں قسمت ان پر حد سے زیادہ مہربان ہے۔ چودھری کی حویلی کے تہ خانے کو ہیروئن سازی کی فیکٹری میں تبدیل کرنے کے کام کا آغاز ہو گیا تھا اور اس کام کی نگرانی کے لیے یہاں موجود چند خاص بندوں کو وہاں بھجوا دیا گیا تھا کیونکہ ان کے حساب سے تو وہ جنگل میں ایک محفوظ پناہ گاہ میں موجود تھے جہاں تک کسی کی رسائی ممکن نہیں تھی لیکن دو سرپھروں نے انجانے میں ہی اس موقع سے فائدہ اٹھا لیا تھا اور اب یہاں سے فرار ہونے ہی کو تھے لیکن بہرحال انہیں مشکلات کا سامنا کرنا تھا۔ عمیر کی راہ میں ایک اور مشکل بچ جانے والے کتے کی صورت میں سامنے آ گئی۔ اپنے مالکوں سے وفاداری نبھاتا ہوا وہ وحشی جانور جو انسانی جسم کی مہک پر لپکتا تھا، دھوکا کھائے بغیر اس پر حملہ آور ہوا تو اس نے کروٹ بدل کر اپنے جسم کو اس کے نیچے آنے سے بچایا اور پھر ایک لمحے کا بھی توقف کیے بغیر پوری قوت سے اسے ایک زوردار لات رسید کی۔ کتا اڑتا ہوا کچھ فاصلے پر جا کر گرا اور پھر اسے دوبارہ اٹھنا نصیب نہیں ہوا کیونکہ وہ جس جگہ گرا تھا، وہاں زمین بہت زیادہ نرم اور دلدلی تھی۔ خود کو وہاں سے نکالنے کی کوشش میں وہ بے چارہ جانور مزید دھنستا اور پھنستا چلا گیا لیکن اس سے نمٹنے کے چکر میں عمیر ایک بار پھر منظر پر آ گیا تھا۔

جگو کے ساتھ فائرنگ کا تبادلہ کرتے شخص نے فوراً ہی اسے نشانہ بنانے کی کوشش کی اور اس حد تک کامیاب رہا کہ اس کی چلائی گولی نے عمیر کے دائیں شانے کو نشانہ بنا لیا۔ وہ جھٹکا کھا کر گرا۔ تکلیف شدید تھی اور شانے میں انگارے سے بھر گئے تھے لیکن یہ رکنے یا ہمت ہار دینے کا وقت نہیں تھا اس لیے وہ تکلیف کے عالم میں بھی آگے بڑھتا رہا۔ جگو کی رائفل اسے کور فراہم کرتی رہی۔ آخر کار وہ دونوں ہانپتے کانپتے، زخموں سے چور وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔ جگو کو گولی کا کوئی زخم نہیں آیا تھا لیکن اس نے جس کتے سے مقابلہ کیا تھا، اس نے اسے اچھا خاصا زخمی کر دیا تھا۔

”آپ کا تو بہت زیادہ خون بہہ رہا ہے سرجی۔“ جنگل سے نکل کر جگو نے عمیر کے لباس پر تیزی سے پھیلتی ہوئی سرخی کو دیکھا تو گھبرا گیا۔

”آپ ذرا رکیں تو میں آپ کی مرہم پٹی کر کے خون روکنے کی کوشش کرتا ہوں۔“ پریشانی میں اس نے عمیر سے درخواست کی۔

”نہیں، پہلے ہمارا یہاں سے نکلنا ضروری ہے۔ میری زندگی سے زیادہ اس راز کی اہمیت ہے جو میرے سینے میں محفوظ ہے۔“ عمیر نے رکے بغیر جواب دیا۔ اب وہ اس جگہ پہنچ گئے تھے جہاں انہوں نے اپنی جیپ چھپائی تھی۔ اس بار ڈرائیونگ سیٹ پر جگو بیٹھا جبکہ عمیر اپنا موبائل نکال کر اس پر سگنل چیک کرنے لگا۔ سگنل موجود تھے۔ اس نے سب سے پہلے عبدالمنان سے رابطہ کیا۔

”میری بات غور سے سنو عبدالمنان اور کوئی بھی سوال کیے بغیر ایک ایمبولینس ڈاکٹر سمیت لے کر پیر آباد کی طرف آنے والی روڈ پر لے آؤ۔ میں تمہیں اسی روڈ پر کہیں ملوں گا۔“ اس حکم کو جاری کرنے کے بعد اس نے میجر ذیشان کا نمبر ڈائل کیا اور اس سے رابطہ ہوتے ہی وہ سب بتانے لگا جو اس نے جنگل میں دیکھا تھا۔ ذیشان اس کی بتائی ہوئی ایک ایک بات غور سے سن کر نوٹ کرتا رہا لیکن پھر اسے احساس ہو گیا کہ عمیر کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہے۔

"تم ٹھیک تو ہو نا عمیر! یہ بار بار تمہاری آواز ڈوب کیوں رہی ہے؟" اس نے پریشانی سے دریافت کیا۔

"میں ٹھیک ہوں۔ شاید سگنلز کے پرابلم کی وجہ سے میری آواز صحیح طرح نہیں پہنچ رہی ہے لیکن پلیز آپ وقت ضائع کیے بغیر میری بات غور سے سنیں۔" درد پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے ایک بار پھر تفصیلات نوٹ کروانی شروع کر دیں۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے جگو نے اسے عقیدت سے دیکھا اور ایک عرصے سے خون خرابا دیکھنے اور کروانے والے کی آنکھوں سے بے اختیار آنسوؤں کے دو قطرے لڑھک گئے۔ وہ محسوس کر سکتا تھا کہ وہ جذبہ جو انسان کو اپنی جان کی فکر سے بھی آزاد کر دے، کتنا طاقتور اور محترم ہوتا ہے۔ اس نے جیپ کی رفتار مزید بڑھا دی۔ اپنے پہلو میں بیٹھے ایک بڑا کارنامہ انجام دینے والے شخص کے لیے فی الحال وہ اتنا ہی کر سکتا تھا۔

عبدالمنان ایمبولینس کے ساتھ جس وقت سڑک پر نمودار ہوا، وہ پیر آباد تک آنے والے راستے کو تقریباً طے کر چکا تھا۔ ایمبولینس کو رکوا کر اس نے نڈھال سے عمیر کو اس میں منتقل کروایا تو پریشان عبدالمنان نے اس سے کئی سوال کر ڈالے۔

"ابھی سوال جواب کا وقت نہیں ہے صاحب... پہلے آپ اے سی صاحب کی جان بچانے کی فکر کریں۔" جگو نے اسے صرف اتنا جواب دیا جو عبدالمنان کے دل کو بھی لگا۔

"زخمی تو تم بھی خاصے لگ رہے ہو؟" ایمبولینس میں واپس بیٹھتے ہوئے اس نے جگو کے زخموں کو تشویش سے دیکھا۔

"یہ زیادہ خطرناک زخم نہیں ہیں لیکن اے سی صاحب کا بہت خون بہہ گیا ہے۔" اس نے ایک بار پھر صورتِ حال کی نزاکت باور کروائی تو عبدالمنان بھی مزید بحث میں نہیں پڑا اور ڈرائیور کو گاڑی چلانے کا اشارہ کر دیا۔ ہوٹر بجاتی ایمبولینس تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ جگو بھی دوبارہ ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھانے کے ساتھ ہی اس نے اپنا موبائل نکال لیا۔ وہ بھی ذیشان کا ہی نمبر ڈائل کر رہا تھا تاکہ اسے ان باتوں سے آگاہ کر سکے جو عمیر نے جان بوجھ کر چھپائی تھیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ ذیشان کو عمیر کی حالت سے آگاہ ہونا چاہیے تاکہ وہ اس کے لیے بہترین انتظامات کر سکے۔ اس کی خواہش تھی کہ یہ ضلع شہریار کے بعد خوش قسمتی سے ملنے والے اس دوسرے اے سی سے محروم نہ ہو۔

☆☆☆

"بھاگتے بھاگتے اب تو میں تھکنے سی لگی ہوں۔ زندگی نے عجیب تکلیف دہ شکل اختیار کر لی ہے کہ کہیں ٹک کر رہنا نصیب ہی نہیں ہوتا۔ اس بھاگ دوڑ میں، میں اپنے کتنے ہی پیاروں کو کھو چکی ہوں لیکن مشکلات کا سلسلہ ہے کہ ختم ہی نہیں ہوتا۔" چائے کے ساتھ تیار شدہ سینڈوچز مشابرم خان کے سامنے رکھتے ہوئے وہ بہت دل شکستہ نظر آ رہی تھی۔

"مایوس مت ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ کچھ لوگوں کے حصے میں آزمائشیں ذرا زیادہ ہی آ جاتی ہیں لیکن یہ طے ہے کہ اللہ جنہیں تکلیف دیتا ہے، انہیں حوصلہ بھی دیتا ہے کیونکہ یہ اس کا وعدہ ہے کہ وہ کسی ذی نفس پر اس کی برداشت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ جو آزمائشوں کو سہتے ہیں وہ تو اللہ کے بہت منتخب کردہ لوگ ہوتے ہیں جنہیں آزمائش کی بھٹی میں کندن بنانے کے لیے جھونکا جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری زندگی کا یہ دور جو ابھی بہت تکلیف دہ محسوس ہوتا ہے، تمہاری شخصیت سازی کر رہا ہے اور آگے چل کر تمہیں بہت کچھ کرنا ہے۔" پہاڑوں کا بیٹا خود زندگی سے بہت کچھ سیکھ چکا تھا تب ہی تو ایسے الفاظ میں اسے تسلی دینے کے لائق بنا تھا۔

"پتا نہیں میں کیا کر سکتی ہوں اور کیا کروں گی۔ ابھی تو میرے جسم کا رُواں رُواں شہریار صاحب کے لیے دعا کر رہا ہے۔ ہمارے ملک کو ان جیسے مخلص لوگوں کی ضرورت ہے اس لیے میں دعا کرتی ہوں کہ چاہے میں اور میرا بچہ باقی نہ رہیں لیکن وہ ٹھیک ہو جائیں۔ وہ ایسے آدمی ہیں جن سے بہت سے دوسروں کو زندہ رہنے کا آسرا ملتا ہے۔" وہ اس شخص کو کیسے فراموش کر سکتی تھی جو اس کا اولین محبوب ہی نہیں، محسن بھی تھا۔

"ان کے لیے تو ان سے وابستہ ہر شخص دعا کرتا ہے۔ انہوں نے کتنوں کی زندگی بہترین ڈھب پر ڈالنے کا کارنامہ انجام دیا ہے اور کتنے ہی ہیں جو اب بھی ان کے کیے اقدامات سے فیض اٹھا رہے ہیں۔ ان کے ماموں لیاقت رانا اس عمر میں بھی ان کے شروع کیے گئے پروجیکٹس کی نگرانی کر رہے ہیں اور خوش قسمتی سے ان کی جگہ جو نیا اے سی آیا ہے، وہ بھی ایسا جوان ہے جو ان کے ہی نقشِ قدم پر چل رہا ہے۔" مشابرم خان نے ابھی تک سینڈوچز کو ہاتھ نہیں لگایا تھا حالانکہ وہ دونوں ہی بہت بھوکے تھے۔ صبح کے ہلکے پھلکے ناشتے کے بعد انہوں نے کچھ بھی کھایا پیا نہیں تھا اور کئی گھنٹے بھاگ دوڑ میں گزر گئے تھے۔ اسپتال سے نکلنے کے بعد انہوں نے گھر اور بچے کی ضروریات کے مطابق تھوڑی سی شاپنگ کی تھی اور پھر اچھا خاصا طویل فاصلہ طے کر کے اس گھر تک پہنچے تھے۔ گھر یقیناً بہت زیادہ عرصے سے بند پڑا ہوا تھا اس لیے اسے قابلِ استعمال بنانے کے لیے بھی انہیں خاصی محنت کرنی پڑی تھی۔ درمیان میں کئی بار ماہ بانو کو بچے کو بھی دیکھنا پڑا تھا اور اب کہیں جا کر فریش ہونے کے بعد انہیں یہ موقع ملا تھا کہ سکون سے بیٹھ کر کچھ کھا پی سکیں۔ باقاعدہ کھانا تیار کرنے میں وقت لگتا اس لیے ماہ بانو نے سینڈوچز تیار کر لیے تھے۔

"مصطفیٰ بھائی شہریار صاحب کے گہرے دوست ہیں لیکن انہوں نے کبھی مجھ سے اس بات کا ذکر نہیں کیا کہ شہریار صاحب کو کوئی حادثہ پیش آ چکا ہے۔" اس نے مشابرم خان سے اپنی الجھن بیان کی۔

"انہوں نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہوگا کیونکہ گہرے دوست کی حیثیت سے وہ جانتے ہوں گے کہ صاحب تمہیں تکلیف دہ باتوں سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔" مشابرم خان کے جواب پر ماہ بانو کا دل زور سے دھڑکا۔ شہریار کے بہت قریب رہنے والے ایک شخص کے منہ سے اس جملے کو سننا اسے اپنی اہمیت و وقعت باور کروا گیا تھا۔ دکھوں اور پریشانیوں سے انہیں ہی تو بچایا جاتا ہے جو بہت عزیز ہوں لیکن عجب ستم ظریفی تھی کہ ایک دوسرے کو عزیز رکھنے والے یہ دو لوگ ہمیشہ ایک دوجے سے دور ہی رہے تھے۔ یہاں تک کہ کبھی آپس میں حالِ دل بھی نہیں کہہ سکے تھے۔ دکھ کے احساس سے اس کا دل پگھلنے لگا اور وہ آنکھوں میں امڈتی آنسوؤں کی چمک کو مشابرم خان سے چھپانے کے لیے اپنی پلیٹ پر جھک گئی۔ مشابرم خان نے بھی جان بوجھ کر اس سے نگاہیں چرائیں اور ایک سینڈوچ اٹھا کر دانتوں سے کترنے لگا۔

اسی پل ڈور بیل کی آواز گونجی۔ وہ دونوں ہی چونک گئے۔ عرصے سے خالی پڑے اس مکان کی ڈور بیل بجانے کی زحمت آخر کس نے کی تھی؟ مشابرم خان تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور دبے قدموں چلتا ہوا دروازے تک پہنچا۔ ڈور آئی سے آنکھ لگا کر اس نے باہر جھانکا۔ سادہ سے پینٹ شرٹ میں دو افراد سامنے کھڑے تھے جن میں سے ایک کا بایاں ہاتھ پشت کی طرف تھا جبکہ دوسرے کی قمیص پر موجود ابھار کسی اسلحے کی موجودگی کا پتا دے رہا تھا۔ اس نے پلٹ کر اشارے سے ماہ بانو کو خطرے سے آگاہ کیا اور خود آنے والوں سے مخاطب ہوا۔

"کون ہے؟"

"ہم میونسپل کمیٹی کے آفس سے آئے ہیں اور جاننا چاہتے ہیں کہ عرصے سے خالی پڑے اس مکان میں کون لوگ موجود ہیں۔" وہ شخص جس نے اپنا ہاتھ پشت پر رکھا ہوا تھا جواب میں بولا۔ مشابرم خان کو اندیشہ تھا کہ اس کے اس ہاتھ میں کوئی ہتھیار موجود ہوگا جبکہ خود اس کے پاس کوئی ہتھیار موجود نہیں تھا۔

"اس مکان کا مالک ہمارا دوست ہے اور اس نے خود کچھ عرصے قیام کے لیے ہمیں اپنے مکان کی چابیاں دی ہیں۔ تم دیکھ سکتے ہو کہ ہم تالا توڑ کر یہاں داخل نہیں ہوئے ہیں اس لیے پلیز ہمیں تنگ مت کرو۔" مشابرم خان نے قدرے روکھے لہجے میں اسے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے پھر بھی ہم ایک بار چیک کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ہماری ذمے داری ہے۔" مشابرم خان دیکھ سکتا تھا کہ نرم لہجے کے باوجود اس شخص کے چہرے کے عضلات میں سختی در آئی ہے۔

"بہتر ہے کہ تم مالک سے رابطہ کر کے ہمارے بارے میں تصدیق کر لو۔ اس طرح ہم اور تم دونوں زحمت سے بچ جائیں گے۔" مشابرم خان نے اسے مشورہ دیا جس پر اس کا مزاج مزید بگڑ گیا۔

"ہمیں مشورہ دینے سے بہتر ہے کہ تم سامنے آ کر ہم سے بات کرو۔ ہمیں کیا کرنا ہے، ہم تم سے بہتر جانتے ہیں۔" اس بار اس کے لہجے میں بھی سختی تھی۔

"تم تو اس انداز سے بات کر رہے ہو جیسے ہم مجرم اور تم پولیس والے ہو۔ میونسپل کمیٹی کے کسی ملازم کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ عزت دار شہریوں سے اس طرح کا سلوک کرے۔" انہیں گفتگو میں الجھائے مشابرم خان نے دیکھ لیا تھا کہ ماہ بانو نے بچے اور اس کی ضروری چیزوں کا بیگ سنبھال لیا ہے۔ اس نے ماہ بانو کو مکان کے پچھلے حصے میں موجود کھڑکی سے نکل جانے کا اشارہ کیا۔ ذرا سے تذبذب کے بعد وہ حرکت میں آ گئی۔

"ہم ایف بی آئی سے ہیں اور اگر اب تم دروازہ کھول کر سامنے نہیں آئے تو ہم فائرنگ کر کے اس کا لاک توڑ دیں گے اور تمہیں قانون سے تعاون نہ کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا جائے گا۔" بالآخر بلی تھیلے سے باہر آ گئی۔ اس وقت تک ماہ بانو کھڑکی پھلانگ کر پچھلی طرف اتر چکی تھی۔

"ٹھیک ہے، میں دروازہ کھول رہا ہوں لیکن بعد میں

تمہیں اپنے اس سلوک کی وضاحت کرنی ہوگی۔“ مشابرم خان نے اپنے لہجے میں بے نیازی سموتے ہوئے جواب دیا اور اچانک ہی دروازے کو اَن لاک کر دیا۔ وہ دونوں دندناتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ ایک نے مشابرم خان کو اپنی پسٹل کی زد میں لیا جبکہ دوسرا مکان کی تلاشی لینے لگا۔

”لڑکی نکل گئی ہے۔“ تلاشی لینے والے نے ذرا ہی دیر میں اعلان کر دیا پھر وہ کھڑکی کی طرف متوجہ ہوا۔

”وہ کھڑکی سے نکل کر بھاگی ہے۔“ اس نے فوراً ہی صورتِ حال کو سمجھ لیا۔ باہر سے انہیں مکان کے عقبی حصے میں کھڑکی کی موجودگی کا اس لیے علم نہیں ہوا تھا کہ پوری عقبی دیوار کھڑکی سمیت اس بیل سے ڈھکی ہوئی تھی جو بے شک لگائی تو کسی انسان نے ہی ہوگی لیکن اتنے عرصے دیکھ بھال نہ ہونے کے باوجود بھی قدرتی طور پر ہی پھلتی پھولتی اور بڑھتی رہی تھی۔

”لڑکی کہاں گئی ہے؟“ مشابرم خان پر ہتھیار تانے کھڑے شخص نے اسے ایک زوردار تھپڑ رسید کرتے ہوئے پوچھا جبکہ دوسرا کھڑکی سے دوسری طرف کود کر ماہ بانو کے پیچھے جا چکا تھا۔ بچے کو سینے سے لگا کر بھاگتی ماہ بانو نے اسے اپنے پیچھے آتا دیکھ لیا تھا۔ اس کی صحت اس لائق نہیں تھی کہ وہ ایک جوان اور تومند آدمی کو بھاگنے میں شکست دے سکتی چنانچہ کچھ نہ سوجھا تو ایک مکان کے نیم وا گیٹ سے اندر گھس کر اسے بند کر دیا۔ اس کے پیچھے آنے والا اسے مکان میں داخل ہوتا دیکھ چکا تھا۔

وہ مختصر لان سے گزر کر اندرونی عمارت کی طرف بھاگی۔ اندر سے موسیقی کا بے تحاشا شور باہر آ رہا تھا اور آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ بہت سارے لوگ اندر موجود ہیں۔ شاید وہاں کوئی پارٹی ہو رہی تھی۔ مکان کے باہر اس نے کئی بائیکس اور دو کاریں کھڑی دیکھی تھیں۔ وہ گھبرائی ہوئی اندر داخل ہوئی تو موسیقی کی لے پر ناچتے افراد کی نظر اس پر پڑی۔ موسیقی تو جاری رہی لیکن ناچتے افراد ساکت ہو گئے۔ اس نے دیکھا ان افراد میں زیادہ تر تعداد سیاہ فام مرد و زن کی ہے البتہ دو چار گوری چمڑی والے بھی نظر آ رہے تھے۔

”ہے بے بی! کون ہو تم؟“ آخرکار چھ فٹ سے نکلتے ہوئے قد والے ایک مضبوط جسم کے سیاہ فام نے اسے مخاطب کر کے پوچھا۔ اپنی گہری سیاہ رنگت کے باوجود وہ پُرکشش نقوش کا مالک تھا۔

”پلیز میری مدد کرو۔ کچھ لوگ مجھے اور میرے بچے کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔“ ماہ بانو نے بے ساختہ ہی اس سے التجا کی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ درخواست کرتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسو بھی بہہ رہے ہیں۔

”کم آن ڈارلنگ! یہاں آؤ اور ذرا آرام سے بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا پرابلم ہے۔“ ایک بے حد نازک اور دلکش سفید فام لڑکی اس کے قریب آئی اور اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے نرمی سے بولی۔ اس دوران میں کسی نے میوزک بند کر دیا تھا اور اب وہ سب کے سب اس کی طرف متوجہ تھے۔

”وہ میرے پیچھے ہے۔ وہ ہمیں مار دے گا۔“ ماہ بانو ریلیکس ہونے کے بجائے ہذیانی انداز میں چیخی اور یک دم ہی مرد کے مضبوط جسم کے پیچھے چھپ گئی۔ اصل میں اس نے اپنے پیچھے آنے والے شخص کی جھلک دروازے میں دیکھ لی تھی۔

”پولیس۔۔۔ یہ پولیس کا معاملہ ہے اس لیے بہتر ہے کہ تم میں سے کوئی دخل نہ دے۔“ پسٹل سمیت دروازے میں کھڑے شخص نے اپنا بیج لہراتے ہوئے اعلان کیا۔

”اس لڑکی اور اس کے معصوم بچے نے کیا جرم کیا ہے آفیسر؟“ سیاہ فام جس نے سب سے پہلے ماہ بانو کو مخاطب کیا تھا اور جس کے پیچھے وہ چھپی ہوئی تھی، آفیسر سے پوچھنے لگا۔

”تمہیں یہ بتانا ضروری نہیں ہے۔ تمہارا فرض ہے کہ قانون سے تعاون کرو۔“ سفید فام آفیسر کچھ کنفیوز تھا۔ شاید کالوں کی اس دہشت کے باعث جس کا مقابلہ وہ صرف ایک پسٹل سے نہیں کر سکتا تھا۔

”سوری آفیسر! ہم اس لڑکی کو پناہ دینے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔“ سیاہ فام نے اعلان کیا جس پر پولیس آفیسر کے چہرے کے نقوش بگڑ گئے اور وہ دھمکی دینے والے انداز میں بولا۔

”تمہیں اس حماقت کے نتائج بھگتنے پڑیں گے۔“

”ہمیں تم سے نمٹنا آتا ہے۔ تم جو چاہو کر سکتے ہو۔“ سیاہ فام نے سخت لہجے میں جواب دیا۔ آفیسر نے چند لمحے اسے کینہ توز نظروں سے گھورا اور پھر پیچھے ہٹنے لگا۔ شاید اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ وہ تنہا کچھ نہیں کر سکتا اس لیے اپنے مددگاروں کو بلانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ پیچھے ہٹتے ہوئے اسے اندازہ بھی نہیں ہوا اور لوہے کا ایک گولہ سا آ کر اس کے سر سے ٹکرایا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ چکرا کر نیچے گر گیا۔

”تھینک یو کارلوس۔“ پُرکشش سیاہ فام نے ایک شخص کی طرف رخ کر کے اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر ماہ بانو

کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”او کے بے بی! اب تم بتاؤ کہ تم کیا جرم کر کے بھاگی ہو؟“

”کوئی نہیں۔ اصل میں تو یہ لوگ اپنا جرم چھپانے کے لیے مجھے میرے بچے سمیت نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ میں تمہیں ہر بات تفصیل سے بتا دوں گی لیکن پہلے تم میرے ساتھی کی مدد کرو۔ وہ یہاں سے کچھ دور اس کے ساتھی کے ساتھ ایک مکان میں موجود ہے اور مجھے ڈر ہے کہ وہ مشکل میں ہوگا۔“ اس نے تیزی سے خود کو سنبھال لیا۔ جان بچانے کا ایک موقع ملا تھا جس سے فائدہ اٹھانا ضروری تھا۔

”او کے، تم مکان کا نمبر بتاؤ۔ ہم دیکھ لیتے ہیں۔“ اس شخص نے کہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ مصطفیٰ خان کے اس مکان کی طرف جا رہے تھے جہاں مشابرم خان موجود تھا۔ ان لوگوں نے تیزی سے صورتِ حال کو اپنے قابو میں کر لیا اور جلد مشابرم خان سمیت واپس آ گئے۔ دونوں آفیسرز کو بے ہوشی کی حالت میں وہ اسی مکان کے اندر بند کر آئے تھے۔

”اللہ کا شکر ہے کہ تم خیریت سے ہو۔ وہ آفیسر ذرا زیادہ سخت جان تھا اس لیے میں اس سے جان چھڑا کر فوری طور پر تمہاری مدد کے لیے نہیں نکل سکا تھا۔“ ماہ بانو کو خیریت سے دیکھ کر اس نے سکون کا سانس لیا۔

”بہتر ہوگا دوست کہ پہلے تم ہمیں حالات سے آگاہ کر دو کیونکہ بے شک ہم کسی سے ڈرتے نہیں ہیں لیکن بے وجہ قانون شکنی کر کے خود کو مصیبت میں ڈالنے کو بھی عقل مندی نہیں سمجھتے۔“ سیاہ فام نے مشابرم خان کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس سے کہا۔

”جان ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میرا نام جوڈی ہے اور یہ میرا مکان ہے۔ ہم یہاں جان کی برتھ ڈے کا فنکشن کر رہے تھے۔ آگے چل کر تفتیش ہوگی تو مجھے بھی پولیس کے بہت سے سوالوں کا جواب دینا پڑے گا۔“ نازک اندام سفید فام لڑکی کے چہرے پر تفکر تھا۔

”ہمیں افسوس ہے کہ ہم آپ کے لیے پریشانی کا سبب بنے۔ آپ چاہیں تو ہمیں گرفتار کروا سکتے ہیں لیکن یہ گرفتاری میڈیا اور چند ذمے دار افراد کے سامنے ہونی چاہیے تاکہ ہمارے ساتھ ماورائے قانون سلوک نہ کیا جا سکے۔“ ماہ بانو نے اب خود پر مکمل قابو پا لیا تھا اور مضبوط لہجے میں بول رہی تھی۔

”دلچسپ۔۔۔ ہم تمہاری یہ خواہش پوری کرنے کا

بندوبست کر سکتے ہیں لیکن پہلے تم ہمیں اپنے حالات سے آگاہ کرو۔" سیاہ فام جس کا پورا نام جان میلکم تھا، پُراصرار لہجے میں بولا تو اس نے اسے حالات سے آگاہ کرنے کا فیصلہ کرلیا اور مختصراً اپنے اغوا، تجربے سے گزارنے کی کوشش اور پھر فرار کی داستان سنا ڈالی۔ اس کے علاوہ باقی ماضی بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

"باسٹرڈز... ان کی فطرت ہے انسانوں کو گنی پگ کی طرح استعمال کرنے کی کیونکہ یہ اپنے سوا کسی کو انسان سمجھتے ہی نہیں ہیں۔" سارا قصہ سن کر جان نے نفرت زدہ لہجے میں تبصرہ کیا۔ وہ نفرت کے اس اظہار میں حق بجانب تھا کیونکہ اس کی قوم نے ان سفید فاموں کی صدیوں کی غلامی بھگتائی تھی اور اب بھی امتیازی سلوک کا نشانہ بنتے رہتے تھے۔ انسان دوست راہنماؤں کی جدوجہد کے نتیجے میں اگرچہ معاشرے کی سوچ میں کافی تبدیلی آئی تھی لیکن اب بھی سو فیصد لوگوں کی سوچ نہیں بدلی تھی۔ ردِعمل میں سیاہ فام بھی انہیں حقیر ثابت کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی کارروائی کرتے رہتے تھے جس کے نتیجے میں انہیں اجڈ، جاہل، گنوار اور بدمعاش جیسے القابات سے نوازا جاتا تھا تاہم انہیں پروا نہیں تھی۔ صدیوں کی غلامی جھیلنے کے بعد وہ آزادی کا پورا لطف اٹھانا چاہتے تھے۔

"تم لوگ ہمارے ساتھ ہارلم چلو۔ وہ ہمارا علاقہ ہے اور وہاں تمہارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" بالآخر جان نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق وہ دونوں راضی ہوگئے۔ کچھ ہی دیر میں وہ ایک گاڑی میں سوار وہاں سے روانہ ہو رہے تھے۔ دوسری گاڑی اور موٹر سائیکلوں پر پارٹی کے دوسرے شرکا سوار تھے۔ سڑکوں پر ہلا گلا کرتے اس چھوٹے سے قافلے کو گزرتے دیکھ کر کوئی گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ منچلے اپنے ساتھ ان افراد کو لے کر جا رہے ہیں جو امریکا کے چہیتے اسرائیل کو بڑی شدت سے مطلوب ہیں۔ ماہ بانو اور مشابرم خان کو جس گاڑی میں بٹھایا گیا تھا، اس کی ڈرائیونگ سیٹ جوڈی نے سنبھال رکھی تھی جبکہ جان موٹر سائیکل پر سوار تھا۔ جوڈی نے روانگی کا فیصلہ ہو جانے پر اپنے مکان کو تالا لگا کر ان کے ساتھ چلنا پسند کیا تھا۔

"جان اور میں کلاس فیلو رہے ہیں۔ مالی مشکلات کی وجہ سے وہ اپنی تعلیم جاری نہیں رکھ سکا تھا لیکن ہماری دوستی آج تک برقرار ہے۔ اصل میں ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں لیکن میرے والدین ایک کالے کو اپنا داماد بنانے کے لیے تیار نہیں ہیں اس لیے میں نے ان کا گھر چھوڑ دیا اور اب اس کرائے کے مکان میں رہ کر اپنی تعلیم پوری کر رہی ہوں۔ تعلیمی اخراجات برداشت کرنے کے لیے مجھے پارٹ ٹائم جاب کرنی پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ جان بھی میری مدد کرتا ہے۔ شادی ہم، میری تعلیم مکمل ہونے کے بعد کریں گے۔"

راستے میں جوڈی نے انہیں بتایا تو وہ لوگ حیران رہ گئے۔ نازک سی جوڈی اور بجیم جان کا بظاہر آپس میں کوئی جوڑ نہیں تھا لیکن ان دونوں نے انسانوں سے بھرے اس جہان میں ایک دوسرے کو منتخب کیا تھا تو یقیناً اس کی کوئی وجہ ہوگی۔ ویسے بھی دو انسانوں کے آپس میں ملاپ کے لیے اہم وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کے دل ایک دوسرے کو قبول کرتے ہیں۔ دل کی قبولیت کے بعد باقی ساری باتیں ثانوی ہو جاتی ہیں۔

"جان بہت اچھا انسان ہے۔ دوسرے انسانوں کی پروا کرتا ہے۔ اس کی آواز بہت پیاری ہے۔ ٹرمپٹ تو بالکل لوئی آمسٹرانگ کی طرح بجاتا ہے۔ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔" چہرے پر معصوم سی مسکراہٹ لیے وہ انہیں جان کی خوبیوں سے آگاہ کر رہی تھی۔ محبوب کا ذکر کرنا ہر دور میں دنیا کے ہر فرد کے لیے شاید اپنی زندگی کا سب سے خوش کن فعل رہا ہے اس لیے جوڈی بھی بہت دیر تک انہیں جان کی خوبیوں سے آگاہ کرتی رہی۔ ساتھ ہی وہ ماہ بانو کے ساتھ پیش آنے والے واقعات پر بھی افسوس کر رہی تھی۔ اس کی باتوں سے انہیں اندازہ ہوگیا کہ وہ ہمدرد فطرت رکھنے والی سادہ مزاج لڑکی ہے۔ اس کی باتوں کے دوران انہوں نے طویل فاصلہ تیزی سے طے کرلیا۔ کم از کم محسوس یہی ہوا اور جب وہ براڈ وے اسٹریٹ کے اختتام پر میلکم ایکس بولیوارڈ پر پہنچے تو جوڈی نے کھنکناتی ہوئی آواز میں کہا۔

"ویلکم ٹو بیوٹی فل ہارلم۔" اس کے اس جملے کے بعد انہوں نے اطراف کا جائزہ لیا تو یوں لگا کہ نیویارک سے نکل کر کسی دوسری دنیا میں داخل ہوگئے ہوں۔ وہ علاقہ بقیہ شہر سے بالکل مختلف اور منفرد تھا۔ انہوں نے یہاں بے شمار سیاہ فام مرد و زن کو مختلف اقسام کے شوخ رنگ لبادوں میں گھومتے دیکھا۔ عورتیں حجاب سے لے کر ماڈرن، نیم عریاں اور عریاں ہر حالت میں تھیں۔ یہی حال مردوں کا بھی تھا۔ کوئی اپنے حلیے سے پادری لگتا تھا تو کسی پر ملا کا گمان ہوتا تھا۔ دکانوں اور فٹ پاتھوں پر ہر طرح کا مہنگا سستا، ممنوعہ و غیر ممنوعہ سامان کھلے عام بک رہا تھا۔ مکانات زیادہ تر خستہ حال اور پرانی طرز کے تھے لیکن کچھ جدید طرز کی عمارتیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ اس نیرنگی کو دیکھ کر ماہ بانو حیرت کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکی جس پر جوڈی مسکراتے ہوئے بولی۔

"ہاں، یہ بالکل مختلف دنیا ہے۔ اصل میں اپنی برسوں کی غلامی کے بعد انہوں نے آزادی کی اتنی قدر کی ہے کہ ہر معاملے میں خود کو اور دوسروں کو بالکل آزاد تصور کرتے ہیں اور ہر ایک کو اس کی مرضی سے جینے کا حق دیتے ہیں۔" جوڈی نے ان کی اتنی متنوع طرزِ حیات کی توجیہہ پیش کی جس کا سو فیصد درست ہونا ضروری نہیں تھا۔ یہ اس کے ساجن کی گلیاں تھیں جن کا اسے عزیز ہونا لازمی تھا۔ خود وہ بھی ان سیاہ فاموں سے ایک خاص قسم کی انسیت محسوس کر رہے تھے کہ گوروں کے دیس میں انہیں ان کالوں کے درمیان ہی پناہ ملی تھی۔

☆☆☆

"آخر کون تھے وہ لوگ جو جنگل میں ایک ایسے راستے سے داخل ہوئے جس پر نگرانی کی ضرورت ہی نہیں سمجھی گئی تھی؟ ان کے اس طرح چوری چھپے جنگل میں داخل ہونے کا آخر کیا مقصد تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ تمہارے آدمیوں کی نظروں میں آنے کے باوجود بچ کر نکلنے میں کامیاب کیسے ہوئے؟" جنگل کے سیکیورٹی انچارج کو ڈیوڈ کے سامنے جواب دہی کا مرحلہ درپیش تھا۔ وہ اس بات کا پابند تھا کہ ہر غیر معمولی واقعے کی رپورٹ ڈیوڈ کو ضرور کرے۔ ان کے پاس رابطے کا ایسا محفوظ ذریعہ موجود تھا کہ رپورٹ منظرِ عام پر آئے بغیر دنیا کے کسی بھی خطے میں ڈیوڈ تک پہنچ جاتی تھی جبکہ سیکیورٹی انچارج نہیں جانتا تھا کہ ڈیوڈ کہاں موجود ہے۔

"وہ لوگ جس راستے سے داخل ہوئے، اس کے بارے میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کوئی وہاں سے بھی جنگل تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ سچ یہ ہے کہ مجھے جنگل کے بارے میں معلومات فراہم کرنے والے افراد نے اس راستے کا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا تھا۔ ان لوگوں کے اس طرح چوری چھپے یہاں آنے کا کیا مقصد تھا، یہ بھی مجھے معلوم نہیں ہے لیکن اطمینان کی بات یہ ہے کہ وہ ریڈ زون میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ اگر ہوتے تو مارے جاتے اس لیے آپ بھی اطمینان رکھیے کہ اگر کوئی آ کر واپس جانے میں کامیاب بھی ہوگیا ہے تو ہمارا سیٹ اپ بالکل محفوظ ہے۔" وہ ڈیوڈ کو تسلی دینے لگا۔

"تم نے بتایا کہ آنے والے دونوں افراد کو کتوں کے ذریعے بھی قابو کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن کتے انہیں زخمی کرنے کے باوجود ہلاک کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔"

"یس سر! اس واقعے میں ہمیں اپنے تین قیمتی کتوں سے ہاتھ دھونا پڑا ہے۔" انچارج نے اعتراف کیا۔

"کتوں کے حملے سے زخمی ہونے والوں کو لازمی طور پر کسی اسپتال کا رخ کرنا پڑے گا۔ اس ضلع میں ایک ہی بڑا اسپتال ہے، تم اسپتال میں ایسے مریضوں کے بارے میں معلوم کرو جو کتے کے کاٹے کا علاج کروانے آئے ہوں۔ اس طرح ہمیں ان افراد کے بارے میں معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔" کتوں کے مرنے کی اطلاع پر کوئی ردِعمل ظاہر کیے بغیر ڈیوڈ نے اسے مشورہ دیا۔

"او کے سر! میں یہ کام کرواتا ہوں۔" انچارج نے مستعدی سے جواب دیا۔

"یہ کام فوراً اور بہت ہوشیاری سے ہونا چاہیے۔" ڈیوڈ نے اسے تنبیہ کی۔

"یس سر! کوئی کوتاہی نہیں ہوگی۔ جو ہوا اس پر بھی میں شرمندہ ہوں۔ اگر میرے پاس نفری ہوتی تو وہ لوگ اتنی آسانی سے نکل کر بھاگ جانے میں کامیاب نہیں ہوتے۔" شرمندگی کا اظہار کرتے کرتے بھی وہ اپنی صفائی پیش کرنے سے باز نہیں آیا۔

"سیکیورٹی کے ساتھ دوسرے معاملات بھی اہم ہیں۔ آج رات لازماً مال چودھری کی حویلی میں پہنچ جانا چاہیے۔ وہاں مشینوں کی تنصیب کا کام مکمل ہوگیا ہے۔ دو ماہرین بھی چودھری اور لنڈا کے ساتھ آج رات کی فلائٹ سے پہنچ رہے ہیں اس لیے خیال رکھنا کہ کوئی گڑبڑ نہ ہونے پائے۔ اس پروجیکٹ پر ہمارا بہت کثیر سرمایہ لگا ہوا ہے، اسے ہر حال میں جاری رہنا چاہیے۔" ڈیوڈ کا لہجہ بہت زیادہ سنجیدہ تھا البتہ آواز بلند نہیں تھی۔ وہ خراب حالات میں بھی اپنے اعصاب پُرسکون رکھتا تھا۔

"مجھے پورا احساس ہے سر... عظیم اسرائیل کی سربلندی کے لیے جان بھی دینی پڑی تو آپ مجھے پیچھے رہنے والوں میں سے نہیں پائیں گے۔ اپنی مقدس سرزمین کا مفاد مجھ سمیت ہر اسرائیلی کو دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر عزیز ہے۔" یہ وہی لہجہ تھا جس میں دنیا کا ہر وہ یہودی بات کرتا تھا جو بیت المقدس کو اپنی موروثی جاگیر اور یہودیوں کو خدا کی سب سے پیاری قوم تصور کرتے ہوئے دنیا بھر پر اپنی اجارہ داری کے خواب دیکھتا تھا۔ چاہے اس خواب کی تکمیل کے لیے

اسے کوئی بھی راستہ کیوں نہ اختیار کرنا پڑے۔

’’گڈ!‘‘ ڈیوڈ نے اسے سراہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

ابھی اسے دوسرے اہم کام بھی انجام دینے تھے۔ ہر طرف سے پریشان کن خبریں اس تک پہنچ رہی تھیں۔ وہ مسلسل نقصانات اٹھا رہے تھے۔ ایئربیس پر حملے کے نتیجے میں بھی جزوی فوائد ہی حاصل ہوئے تھے اور کئی قیمتی کمانڈوز کی جانوں کے نقصان کے علاوہ ایک کمانڈو کی زندہ گرفتاری کا بھی یقین تھا۔ اس گرفتاری کی وجہ سے انہیں اپنے ٹھکانے بھی بدلنے پڑے تھے اور اس کا وجدان کہہ رہا تھا کہ ان ساری ناکامیوں اور پریشانیوں کے پیچھے وہی گروپ کارفرما ہے جس کے ڈانڈے کسی نہ کسی طور کرنل توحید سے مل رہے تھے۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس خفیہ ایجنسی یا گروپ جو بھی تھا، اس تک رسائی کے لیے کرنل پر ہاتھ ڈالنا ضروری ہے۔ اس کے آدمیوں نے کرنل کی خفیہ نگرانی کرنی شروع کر دی تھی۔ وہ اس کی مکمل نقل و حرکت سے تو واقف نہیں ہو سکے تھے لیکن اتنا علم ضرور ہو گیا تھا کہ کل کرنل اسلحے کی نمائش میں شرکت کے لیے کراچی پہنچ رہا ہے۔ ان کے لیے کرنل کو گھیرنے کا یہ بہترین موقع تھا اور وہ اس حوالے سے منصوبہ بندی میں مصروف تھا۔

☆☆☆

’’کیا بات ہے، تم کچھ پریشان لگ رہے ہو؟‘‘ شہریار اپنے ماموں لیاقت رانا کی فیملی سے ملاقات کے لیے گیا ہوا تھا۔ وہ ماہ بانو کی مدد کے لیے نیویارک روانگی کا ارادہ رکھتا تھا اس لیے کچھ وقت خاندان والوں کے ساتھ گزارنا ضروری تھا۔ وہ لوگ اس کی طویل جدائی سہنے کے بعد شدت سے اس کے منتظر تھے۔ خصوصاً اس کی ممانی آفرین کا تو اس میں دم ہی اٹکا رہتا تھا۔ انہوں نے سگی اولاد کی طرح اس کی پرورش کی تھی اور اپنے سگے بیٹے سجاد رانا اور پوتی شینا کی موت کے بعد شہریار ہی ان کی محبتوں کا واحد محور و مرکز رہ گیا تھا۔ احتیاط کے تمام تر تقاضوں کے باوجود شہریار کو ان محبتوں کا حق ادا کرنے کے لیے جانا پڑا تھا لیکن دل کو بھی تو قرار نہیں تھا چنانچہ موقع ملتے ہی سی ایف پی کے دفتر پہنچ گیا تھا جہاں ذیشان کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اسے غیر معمولی صورتِ حال کا ادراک ہوا۔

’’عمیر کا فون آیا تھا...‘‘ اس نے بلاکم و کاست اسے سارا قصہ کہہ سنایا۔

’’پھر کیا ایکشن لے رہے ہو؟‘‘ ساری بات غور سے سننے کے بعد اس نے سنجیدگی سے ذیشان سے سوال کیا۔

’’میری کرنل صاحب سے بات ہو گئی ہے۔ جلد از جلد آپریشن کرنا ہے اس لیے تو وہ بھی متفق ہیں۔ فوری طور پر کارروائی شروع کرنے کی بھی یقین دہانی کروائی ہے لیکن ظاہر ہے سب کچھ کھڑے کھڑے نہیں ہو جائے گا۔ بڑے پیمانے پر آپریشن کرنا پڑے گا جس میں اس بات کا بھی دھیان رکھنا ہو گا کہ ہمیں انسانی طاقت کے ساتھ ساتھ جدید ٹیکنالوجی کا بھی مقابلہ کرنا ہے۔ کرنل صاحب اسلحے کی نمائش میں شرکت کے لیے کراچی جا رہے ہیں، اس کے بعد ہی وہ ہمیں کوئی حتمی منصوبہ دیں گے۔‘‘ ذیشان نے اسے فیصلے سے آگاہ کیا۔

وہ جذباتی تھا لیکن خود بھی یہ بات سمجھتا تھا کہ اس قسم کے آپریشن کے لیے وہ فوری طور پر اٹھ کر نہیں جا سکتے تھے۔ اجازت اور انتظامات میں تھوڑا وقت ضرور لگنا تھا۔

’’ایک کام کرو ذیشان... عمیر کو فوری طور پر وہاں سے نکالو۔ وہاں اسے زیادہ اچھی طبی امداد بھی نہیں ملے گی اور ہر وقت سر پر یہ تلوار بھی لٹکتی رہے گی کہ دشمن اس کی بو سونگھتے ہوئے اسپتال تک پہنچ جائیں گے۔ وہ بہت دیانت دار اور پُرجوش لڑکا ہے۔ اس جیسے قیمتی لوگوں کا بچاؤ کرنا بہت ضروری ہے۔‘‘ تھوڑا سا سوچنے کے بعد اس نے ذیشان کو مشورہ دیا۔

’’ٹھیک ہے، میں یہ انتظام کروا دیتا ہوں۔‘‘ ذیشان فوراً حرکت میں آ گیا۔ عمیر کی نورکوٹ سے لاہور منتقلی کے فوری انتظامات کرنے کے بعد اس نے جگنو سے رابطہ کیا۔

’’کہاں ہو اور تمہارا کیا حال ہے؟‘‘ اس نے جگنو سے سوال کیا۔

’’اپنے گھر پر ہوں اور بالکل ٹھیک ہوں۔ دیسی نسخوں سے اچھا علاج ہو رہا ہے۔‘‘ جگنو نے جواب دیا لیکن اس کے لہجے سے کمزوری کا اظہار ہو رہا تھا۔

’’فضول تجربات میں وقت ضائع مت کرو اور فوری طور پر نورکوٹ کے اسپتال پہنچو۔ وہاں سے عمیر کو لاہور شفٹ کیا جا رہا ہے۔ تم بھی اس کے ساتھ ہی یہاں آؤ گے۔‘‘ ذیشان نے تحکمانہ لہجے میں کہہ کر بغیر جگنو کی بات سنے رابطہ منقطع کر دیا۔ جگنو باقاعدہ سی ایف پی کا حصہ نہیں تھا لیکن اس کی خدمات ایسی تھیں کہ وہ اسے کسی صورت نظرانداز نہیں کر سکتے تھے۔

’’یہ کام اچھا ہو گیا ہے۔ یہ لوگ لاہور پہنچ جائیں تو ان کی طرف سے اطمینان ہو جائے گا۔ تم بتاؤ کہ مصطفیٰ یا مشابرم خان کی طرف سے کوئی رابطہ ہوا ہے؟‘‘ اس نے وہ سوال کیا جو دل میں لیے یہاں تک آیا تھا۔

’’مصطفیٰ سے بات ہوئی تھی۔ وہ کسی نہ کسی طرح مشابرم خان سے رابطہ رکھے ہوئے ہے۔ اس کی طرف سے جو اطلاعات ملی ہیں، وہ بھی پریشان کن ہیں۔ ماہ بانو اور مشابرم خان کو اب تک دو رہائش گاہیں تبدیل کرنی پڑی ہیں کیونکہ پولیس ان کے مسلسل پیچھے لگی ہوئی ہے۔ اصل میں وہ لوگ مصطفیٰ اور مراد شاہ کی بھی مسلسل نگرانی کر رہے ہیں اس لیے ان کے لیے معلوم کرنا مشکل نہیں ہوتا کہ ماہ بانو اور مشابرم کہاں موجود ہیں۔ مصطفیٰ کے ایک مکان پر تو انہوں نے ایف بی آئی کے ایجنٹ کی حیثیت سے باقاعدہ ان دونوں کو گھیرنے کی کوشش کی تھی لیکن خوش قسمتی سے وہ دونوں وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے اور اب ہارلم میں ہیں۔ وہاں ایک نوجوان جان میلکم نے انہیں پناہ دے رکھی ہے۔ وہ ایک شریف نوجوان ہے لیکن اس کے بچپن کا ایک دوست اچھا خاصا ڈان ہے اور وہ ضرورت پڑنے پر اس دوستی کا فائدہ اٹھا لیتا ہے۔ نیویارک کی پولیس کو اندازہ ہے کہ اگر اس نے ہارلم کے علاقے میں جا کر کارروائی کرنے کی کوشش کی تو حالات خاصے بگڑ جائیں گے۔ اس لیے وہ لوگ صبر کا مظاہرہ کر رہے ہیں لیکن ظاہر ہے، بالکل ہاتھ پر ہاتھ دھرے تو نہیں بیٹھے ہوں گے۔ ان کی کوئی فول پروف پلاننگ چل رہی ہو گی اور ہمیں اس سے پہلے ہی کچھ کرنا ہو گا۔‘‘ ذیشان نے حالات اس کے سامنے رکھے جو یقینی طور پر خاصے مخدوش تھے۔

’’کیا ہمارے پاس کوئی پلان موجود ہے؟‘‘ شہریار نے دھیرے سے دریافت کیا۔

’’مصطفیٰ نے ایک تجویز پیش کی ہے۔‘‘ ذیشان اسے اس تجویز کے بارے میں بتانے لگا۔

’’آئی ایس آئی کے تعاون کے بغیر اس تجویز پر عمل مشکل ہو گا۔‘‘ پوری بات سن کر اس نے تشویش سے تبصرہ کیا۔

’’اس سلسلے میں میری کرنل صاحب سے بات ہو گئی ہے۔ انہوں نے تعاون کی یقین دہانی کروائی ہے۔ یہ تو تم بھی سمجھتے ہو کہ سی ایف پی فوج کا ہی ایک ذیلی ادارہ ہے جسے بس سیاسی حکمرانوں کی نظر سے پوشیدہ رکھ کر پوری طرح خفیہ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے اور کاغذات میں کہیں اس کا اندراج نہیں ہے لیکن فوج کے سرکردہ افسران اس کی پشت پناہی کرتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم کہیں بھی کچھ بھی کرنے کا اختیار نہیں رکھتے تھے۔ اس کیس میں بھی لازماً آئی ایس آئی کو ہمارے ساتھ تعاون کرنا پڑے گا۔‘‘ ذیشان نے اسے یقین دلایا۔

’’اس کے باوجود میں مطمئن نہیں ہوں کہ ہم کامیابی سے یہ ڈیل کر سکیں گے۔ ہمارا دشمن عیار بھی ہے اور طاقت کے زعم میں ہمیں گھاس ڈالنے کو تیار بھی نہیں ہوتا۔‘‘ اس نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔

’’رسک تو واقعی ہے لیکن ہمیں کوئی نہ کوئی اسٹیپ تو لینا ہی ہو گا۔‘‘

’’ٹھیک ہے لیکن اس سارے معاملے کو مانیٹر کرنے میں خود نیویارک جاؤں گا۔ میرے وہاں پہنچنے کا انتظام ہونے سے پہلے گیم شروع مت کرنا۔ میں ماہ بانو کو اپنی نگرانی میں واپس لاؤں گا۔‘‘ اس نے فیصلہ سنایا۔

’’ٹھیک ہے جیسا تم چاہو۔‘‘ ذیشان اس کی کیفیت کو سمجھتا تھا اس لیے اختلاف نہیں کیا۔

’’مصطفیٰ کو تو وہاں کوئی پریشانی نہیں ہے؟ اس معاملے کی وجہ سے کہیں اس کا برسوں کا بنا سیٹ اپ ختم نہ ہو جائے۔‘‘ مصطفیٰ خان کسی زمانے میں اس کا کلاس فیلو ضرور رہا تھا لیکن اس سے دوبارہ رابطہ سی ایف پی کے توسط سے ہی ہوا تھا۔ وہ یہ جان کر حیران رہ گیا تھا کہ کسی زمانے میں اپنی کلاس کے دیگر جوانوں کی طرح بے حد لاابالی نظر آنے والا مصطفیٰ ایک عرصے سے امریکا میں رہ کر آئی ایس آئی کے لیے کام کر رہا ہے اور اس نے وہاں بہت زیادہ تعلقات بنا رکھے ہیں۔ وہ بہت ہوشیاری سے ہاتھ پیر بچا کر کام کرتا تھا اس لیے اب تک کسی کی نظروں میں نہیں آیا تھا۔ اس کے ساتھ کچھ دوست ممالک کے لوگ بھی شامل تھے اور یہ سب لوگ آپس میں ایک دوسرے سے تعاون کرتے رہتے تھے۔

’’تھوڑی بہت پریشانی کا اسے سامنا تو ہے۔ ماہ بانو اور مشابرم خان سیاہ فام امریکیوں کی مدد سے پولیس کے دو افسران کو اس کے مکان میں ہی بند چھوڑ کر بھاگے تھے اس لیے اسے پولیس کی تفتیش کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس نے یہ موقف اختیار کیا کہ اس کا مکان ایک عرصے سے بند پڑا ہے اور وہ نہیں جانتا کہ کن لوگوں نے اس کی لاعلمی میں مکان استعمال کیا۔ پولیس کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے کہ اس مکان میں ماہ بانو اور مشابرم خان ٹھہرے ہوئے تھے اس لیے وہ مکان استعمال کرنے والوں کا مصطفیٰ سے تعلق نہیں جوڑ سکتے تھے۔ اگر تعلق تلاش بھی کر لیں تو ان کے پاس اس سوال کا جواب نہیں ہے کہ وہ کیوں اتنی شدومد سے ماہ بانو کے متلاشی ہیں کیونکہ اس پر کوئی فردِ جرم تو عائد ہی

نہیں ہوتی۔

"مراد شاہ کو بھی انہوں نے تھوڑا پریشان کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے عقل مندی کا ثبوت دیا اور پہلے ہی اپنے لیے ایک وکیل کا انتظام کرلیا۔ اب امریکی پولیس اپنے امریکی وکیل کو ہی یہ جواب دینے سے قاصر ہے کہ انہیں کس جرم میں ماہ بانو درکار ہے اور کسی شخص سے اگر... ماہ بانو نے ملاقات کی ہے یا اس کے توسط سے کہیں رہائش اختیار کی ہے تو وہ شخص کس طرح قصوروار ثابت ہوتا ہے۔" ذیشان اسے تفصیلات سے آگاہ کرتا جارہا تھا۔

"بالکل ٹھیک جارہے ہیں یہ لوگ لیکن مجھے معلوم ہے کہ زیادہ عرصے ان کی پیش نہیں چلے گی۔ امریکی اپنے لبرل اور قانون پسند ہونے کا جتنا بھی ڈھونگ کریں لیکن ساری دنیا جانتی ہے کہ ان سے بڑھ کر کوئی بدمعاش اور قانون شکن نہیں ہے۔ یہ جو انہوں نے دنیا کے مختلف ملکوں میں جنگ کی آگ بھڑکانے کا سلسلہ شروع کیا ہوا ہے، یہ کس قانون کے تحت ہے؟ قانون تو کمزوروں کے لیے ہوتا ہے اور تم جانتے ہو کہ امریکا کمزور نہیں ہے۔"

"اتنی ٹینشن مت لو یار! کوئی کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو، اللہ کی طاقت کے سامنے تو بے حیثیت ہی ہے اور ہم اپنی بھرپور کوشش کر کے نتیجہ اللہ پر چھوڑ دینے والے لوگ ہیں۔ کیا تمہیں اللہ پر یقین نہیں ہے؟"

"اس کی ذات سے بڑھ کر کس پر یقین ہوسکتا ہے۔ وہی تو ہے جو ہر طرح کے حالات میں ہمیشہ سہارا دیتا رہا ہے۔" ذیشان نے اس سے ایسی بات کہہ دی تھی جس کے سامنے سارے خدشات، دلائل اور حقائق بیکار تھے، سو اس نے بھی اسے تسلیم کیا اور جیسے ہلکا پھلکا ہوگیا۔ کیا ہوا جو راہ میں بہت سی مشکلات تھیں۔ مشکلات سے نکالنے والی ہستی کا ساتھ بھی تو میسر تھا۔

☆☆☆

"آج اسپتال میں کتے کے کاٹنے کے کتنے کیسز آئے ہیں؟" سرگوشی میں کیا گیا یہ سوال بالکل اتفاقاً ہی عبدالمنان کے کانوں میں پڑا تھا۔ وہ ایمبولینس میں عمیر کے ساتھ ہی اسپتال پہنچا تھا اور مستقل یہیں موجود تھا۔ اس کی انتظامی حیثیت کی وجہ سے اسے ہر جگہ بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ یہاں بھی اسے ایم آر او کے کمرے میں بٹھایا گیا تھا اور چائے پانی سے خاطر مدارات کے ساتھ ساتھ عمیر کی حالت سے مستقل باخبر رکھا جارہا تھا۔ عمیر کو لگنے والی گولی نکالی جاچکی تھی۔ دیگر زخموں کی مرہم پٹی بھی ہوگئی تھی لیکن خون کے بہت زیادہ اخراج کی وجہ سے اس کی حالت بہت زیادہ تسلی بخش نہیں تھی۔ اسے ذیشان کی کال موصول ہوچکی تھی جس نے اسے عمیر اور جگنو کو لاہور منتقل کرنے کے فیصلے سے آگاہ کردیا تھا۔

عبدالمنان نے اسپتال انتظامیہ کو اس فیصلے سے آگاہ کردیا تھا اور ہدایت کردی تھی کہ جیسے اب تک عمیر کی یہاں موجودگی کو صیغۂ راز میں رکھا گیا ہے، اسی طرح اس کی یہاں سے منتقلی کا عمل بھی مکمل رازداری کے ساتھ انجام پانا چاہیے۔ وہ وسیع تجربہ رکھنے والا شخص تھا جس نے شہریار کے غیر معمولی اقدامات کا بھی پوری طرح ساتھ دیا تھا اور جانتا تھا کہ عمیر بھی شہریار ہی کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے اس لیے اپنے طور پر ہی فیصلہ کرلیا تھا کہ کسی غیر متعلقہ شخص کو عمیر کے بارے میں خبر نہ ہو۔ اس کی یہ احتیاط پسندی اس وقت کام آگئی تھی۔ بہت دیر سے ایک جگہ بیٹھے بیٹھے اکتانے کے بعد اس نے ذرا ہاتھ پاؤں کھولنے کے خیال سے اسپتال کے باہر تک کا چکر لگانے کا فیصلہ کیا تھا اور استقبالیہ کے قریب سے گزرتے ہوئے یہ سرگوشی سن لی تھی۔ سرگوشی سن کر اس نے کن انکھیوں سے اس طرف دیکھا۔ کاؤنٹر پر جھک کر بات کرتے ہوئے اس شخص نے بے شک دیہاتی طرز کا لباس پہن رکھا تھا لیکن چہرے مہرے اور کھڑے ہونے کے انداز سے وہ دیہاتی نہیں لگتا تھا۔ عبدالمنان نے اس کے ہاتھ میں دبے وہ نوٹ بھی دیکھ لیے تھے جو اس نے استقبالیہ کلرک کو معلومات اگلوانے کے لیے بطور رشوت پیش کیے تھے۔ تاہم وہ صورتِ حال کو مزید جاننے کے لیے وہاں رکے بغیر آگے بڑھ گیا۔ اسے اس بات کی پروا نہیں تھی کہ کلرک اس آدمی کو کیا جواب دیتا ہے کیونکہ اول تو عمیر کی یہاں موجودگی کو صیغۂ راز میں رکھا گیا تھا، دوم وہ کتے کے کاٹنے کے بجائے گولی لگنے کے کیس میں اسپتال آیا تھا۔ جگنو کا بھی اسپتال کا رخ نہ کرنا اس وقت کام آگیا تھا چنانچہ مشکوک آدمی جس حوالے سے تحقیق کررہا تھا، اس سے اسے کچھ حاصل نہیں ہونے والا تھا۔

باہر آکر اس نے اپنے دفتر کی گاڑی کی طرف رخ کیا۔ یہ گاڑی اس نے اسپتال پہنچنے کے بعد کسی فوری ضرورت کے پیشِ نظر منگوالی تھی۔ اس میں بیٹھا ڈرائیور جوان اور قابلِ اعتبار تھا۔ اسے سامنے دیکھ کر ڈرائیور الرٹ ہوگیا۔

"کہاں چلنا ہے سر؟"

"کہیں نہیں جانا۔ ابھی ایک آدمی باہر نکلے گا۔ میں وہاں برگد کے درخت کے پاس کھڑا ہو کر تمہیں اشارے سے اس کے بارے میں بتاؤں گا، تم ہوشیاری سے اس کی نگرانی کرنا اور اس کے بارے میں جو کچھ معلوم کرسکو، معلوم کر کے مجھے بتانا۔" عبدالمنان اسے ہدایات دے کر دور ہٹ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں استقبالیہ پر رشوت کی مدد سے معلومات حاصل کرنے والا شخص باہر آتا نظر آیا۔ اس نے ڈرائیور کو اشارے سے اس آدمی کے بارے میں آگاہ کیا اور خود منظر سے ہٹ گیا۔ وہ آدمی ایک جیپ میں سوار ہو کر روانہ ہوا تو ڈرائیور بھی اس کے پیچھے گاڑی لے کر چل پڑا۔ عبدالمنان واپس اندر چلا گیا۔ اس نے استقبالیہ کلرک کو چھیڑنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ کچھ وقفے سے جگنو بھی وہاں پہنچ گیا اور اس کے پیچھے وہ لوگ بھی چلے آئے جنہوں نے عمیر اور جگنو کو لاہور منتقل کرنا تھا۔ عمیر کی حالت کے پیشِ نظر طبی سہولتوں کے ساتھ سفر کے بھرپور انتظامات کیے گئے تھے اور ایک قابل ڈاکٹر بھی ساتھ جارہا تھا۔ وہ لوگ روانہ ہوگئے تو عبدالمنان نے بھی اپنے دفتر کا رخ کیا۔ دفتر کے عملے کو اس حادثے کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا اور عبدالمنان نے انہیں مطلع کردیا تھا کہ اے سی صاحب اپنی نجی مصروفیات کی وجہ سے آج چھٹی پر ہیں۔ پریشانی کے باوجود اس نے دفتر پہنچ کر اپنے معمول کے کام انجام دینا شروع کردیے۔ کام میں مصروف ہوئے اسے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک مرد کی آمد کی خبر دی گئی جو کسی اہم کام کے سلسلے میں صرف اور صرف اے سی صاحب سے ملنے کا متمنی تھا اور اس اطلاع پر کہ آج اے سی صاحب چھٹی پر ہیں، بہت پریشان ہو کر یہی کہتا رہا تھا کہ اس کا فوری طور پر اے سی صاحب سے ملنا بہت ضروری ہے۔ چنانچہ اب عبدالمنان سے پوچھا جارہا تھا کہ کیا وہ اس شخص سے ملاقات کرنا چاہے گا؟ عبدالمنان نے کچھ سوچتے ہوئے اس آدمی سے ملنے کا فیصلہ کرلیا اور جب وہ اندر آیا تو اسے اپنے فیصلے کی درستگی پر خوشی ہوئی۔ یہ اس عورت کا شوہر تھا جو کبھی کبھی چودھری کی حویلی کے کسی اہم معاملے میں ان کے لیے مخبری کا فریضہ انجام دے دیتی تھی۔

"آؤ بیٹھو اللہ بخش! کہو کیسے آنا ہوا؟" اس نے آنے والے شخص سے پوچھا۔

"اے سی صاحب سے ملنا تھا جناب۔" اللہ بخش نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے درخواست کی۔

"کوئی خاص اطلاع لائے ہو؟" عبدالمنان نے اس کے تاثرات کا جائزہ لیا، جواب میں وہ خاموش رہا۔

"تم مجھ پر بھروسا کرسکتے ہو اللہ بخش کیونکہ اے سی صاحب بھی مجھ پر بھروسا کرتے ہیں اور تمہاری بیوی کے ذریعے حویلی سے ملنے والی ہر خبر میرے ساتھ شیئر کرتے ہیں۔" اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ کوئی خاص خبر لے کر آیا ہے، اس لیے اصرار کرنے لگا۔

"وہ تو ٹھیک ہے جناب لیکن اگر اے سی صاحب سے ملاقات ہوجاتی تو اچھا تھا۔ مجھے ان سے ہی ملنے کا حکم ملا تھا۔" وہ اب بھی تذبذب کا شکار تھا۔

"مجبوری ہے دوست۔ آج تو کیا، آئندہ کئی روز تک تمہاری ان سے ملاقات کا امکان نہیں ہے۔ وہ ضلع سے باہر ہیں اور میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ کب واپس آئیں گے۔" عبدالمنان نے اسے آگاہ کیا۔

"تو پھر ٹھیک ہے، آپ یہ ان تک پہنچا دیجیے گا۔" اللہ بخش نے بہت ہچکچاتے ہوئے ایک لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔ "بی بی کا حکم تھا کہ یہ خبر جلد سے جلد اے سی صاحب تک پہنچنا چاہیے۔ اب آپ دیکھ لیں کہ کیا کرنا ہے۔" اس نے گویا لفافہ جلد از جلد عمیر تک پہنچانے کی تاکید کی اور پھر اجازت لے کر سلام کرتا ہوا وہاں سے رخصت ہوگیا۔

عام حالات میں عبدالمنان یہ لفافہ جوں کا توں عمیر تک پہنچا دیتا لیکن اس وقت مجبوری تھی اس لیے اس نے بہت احتیاط سے بند کیے گئے لفافے کو پیپر نائف کی مدد سے چاک کر کے اس میں موجود تہ شدہ کاغذ باہر نکالا۔ حسبِ توقع یہ چودھری کے ایب نارمل بیٹے بہزاد شاہ کی بیوی فریدہ کی طرف سے بھیجا گیا تھا۔ اس نے کاغذ پر موجود تحریر پڑھی اور مضطرب ہوگیا۔ فوری طور پر اس کا ہاتھ فون کی طرف بڑھا اور اگلے ہی لمحے وہ ذیشان کا نمبر ملا رہا تھا۔

☆☆☆

کرنل توحید ایگزیبیشن ہال سے باہر نکلے تو ان کے ساتھ کچھ غیر ملکی مہمان بھی موجود تھے۔ اسلحے کی یہ نمائش عام لوگوں کے لیے نہیں تھی بلکہ صرف فوجی افسران، حکومت کے اعلیٰ عہدے دار اور غیر ملکی مندوبین و سفرا کے علاوہ کچھ خاص لوگ ہی اس میں شرکت کرسکتے تھے۔ نمائش کی اہمیت کے پیشِ نظر اس میں شرکت کے لیے انہیں یہاں آنا پڑا تھا ورنہ ان کا ذہن ان بہت سے اہم کاموں اور معاملات میں الجھا ہوا تھا جن پر وہ خود نظر رکھنا چاہتے تھے۔

عمارت کی پارکنگ میں پہنچ کر انہوں نے تمکنت کے ساتھ مہمانوں سے الوداعی مصافحہ کیا اور ان کے لیے مخصوص پروٹوکول آفیسر کی نگرانی میں انہیں رخصت کرنے کے بعد اپنی گاڑی کی طرف بڑھے۔ یہ بہت حساس قسم کی نمائش تھی

اس لیے حفاظت کے خصوصی انتظامات کیے گئے تھے۔ ان کے ساتھ ان کا ذاتی گارڈ اور ڈرائیور موجود تھا۔ وہ اپنی گاڑی میں بیٹھے تو گاڑی حرکت میں آگئی۔ انہیں دائیں ہاتھ پر نیپا چورنگی کی طرف جانے والے راستے پر سفر کرنا تھا۔ یونیورسٹی روڈ پر آگے بڑھتے ہوئے ایک شارٹ کٹ سے کینٹ کے علاقے میں جانا تھا جہاں ان کی رہائش کا انتظام کیا گیا تھا۔ نمائش تین دن جاری رہنی تھی لیکن ہنگامی حالات کی وجہ سے انہوں نے اپنی شرکت کو صرف ایک دن تک محدود کر دیا تھا۔ یہاں سے وہ کینٹ جاتے اور پھر دو گھنٹے کے آرام کے بعد انہیں ائرپورٹ کے لیے روانہ ہونا تھا جہاں ان کے لیے لاہور کی ایک فلائٹ میں سیٹ بک تھی۔

نپے تلے انداز میں وقت کے ایک ایک لمحے کا حساب رکھ کر زندگی گزارنے والے کرنل کو اندازہ نہیں تھا کہ آج کی تاریخ اس کے سارے حساب کتاب کو گڑبڑ کرنے والی ہے۔ نیپا چورنگی تک جانے والا راستہ بالکل ہموار تھا۔ اس پورے روڈ پر نیپا سے لے کر حسن اسکوائر تک ٹریفک کی روانی اور وی آئی پیز کی آمدورفت کے لیے خصوصی انتظامات کیے گئے تھے۔ ٹریفک پولیس کے علاوہ رینجرز کے بھی کئی اہلکار روڈ کے دونوں طرف چوکس کھڑے نظر آ رہے تھے۔ ان نظر آنے والے اہلکاروں کے علاوہ کچھ سادہ پوش خفیہ ایجنسی کے اہلکار بھی تھے جنہوں نے ایک ایک شے پر اپنی نظر رکھی ہوئی تھی۔

کرنل توحید کی گاڑی نیپا چورنگی کا پل کراس کرتی ہوئی یونیورسٹی کی طرف جانے والے راستے پر گامزن ہو گئی۔ پل سے نیچے نیپا چورنگی پر ہی راشد منہاس روڈ سے آنے والے ٹریفک کے لیے بائیں ہاتھ پر یونیورسٹی روڈ پر مڑنے کے لیے راستہ تھا۔ جیسے ہی کرنل کی گاڑی نے پل کراس کیا، راشد منہاس روڈ سے ایک گاڑی یونیورسٹی روڈ کی طرف مڑی اور کرنل کی گاڑی کے پیچھے چلنے لگی۔

کرنل بھیڑ بھاڑ کو پسند کرنے والا آدمی نہیں تھا اس لیے اپنی سیکیورٹی کے لیے ایک گارڈ کے سوا کسی کو ساتھ رکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ ورنہ یہاں تو عام پولیس افسران سے لے کر سیاست دان اور بڑے صحافیوں تک کے پیچھے سیکیورٹی اسکواڈ کے نام پر آگے پیچھے گاڑیوں کا پورا قافلہ لے کر چلنے کا رواج تھا۔ کرنل کی گاڑی سبک رفتاری سے چلتی ہوئی ابھی گلشن کالج کے قریب پہنچی ہی تھی کہ کالج کی جانب سے ایک بچہ اسپورٹس سائیکل پر سوار یک دم ہی سڑک پر آ گیا۔ بچے کو بچانے کے لیے کرنل کے ڈرائیور نے زوردار بریک لگائے۔ گاڑی ایک جھٹکے سے رکی۔ فوراً ہی پیچھے آنے والی گاڑی بھی رک گئی اور اس سے دو افراد اتر کر کرنل کی گاڑی کی طرف لپکے۔ ایسے ہی دائیں اور بائیں جانب سے کچھ لوگ اس جانب لپکے۔ یہ بھی مختلف گاڑیوں سے اترے تھے اور سب کے سب مسلح تھے۔ کرنل کی گاڑی رکتے ہی ایک طرف سے فائرنگ کر کے اس کے ٹائروں کو ناکارہ کر دیا گیا تھا۔ گاڑی کے شیشے البتہ بلٹ پروف تھے اس لیے ان پر گولیاں بے اثر تھیں۔

آنے والے ہلاک کرنے کی نیت سے آئے بھی نہیں تھے۔ انہیں کرنل کو زندہ لے کر یہاں سے جانا تھا اس لیے سارا زور ڈرائیور اور گاڑی کی جانب تھا۔ ٹائروں کے ناکارہ ہو جانے کے باعث ڈرائیور گاڑی آگے نہیں لے جا سکتا تھا اور مسلح افراد اپنا گھیرا تنگ کرتے جا رہے تھے۔ ایسے حالات میں گارڈ نے جرأت مندی کا مظاہرہ کیا اور دروازہ کھول کر گن باہر نکالتے ہوئے ان کی بے تحاشا فائرنگ کا جواب دینے لگا۔ پورا علاقہ فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھا۔ اردگرد سے گزرتی گاڑیوں میں سوار لوگوں کے حلق سے چیخیں نکل گئیں۔ اندھی گولیوں نے بھٹک کر کئی راہ گیروں کو بھی نشانہ بنا لیا لیکن حملہ آوروں کو پروا نہیں تھی۔ وہ تیزی سے اپنے ٹارگٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ سب سے پہلے گارڈ ان کا نشانہ بنا اور پھر کھلے دروازے سے گزر کر ایک گولی ڈرائیور کو بھی چاٹ گئی۔ حملہ آوروں کا خیال تھا کہ اس بے تحاشا فائرنگ میں کرنل اپنی بلٹ پروف گاڑی سے نکلنے کی حماقت نہیں کرے گا اور وہ اسے گھیر کر لے جانے میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن ان کی توقع کے بالکل برخلاف کرنل نے اپنی جانب کا شیشہ اتارا اور فائرنگ شروع کر دی۔ اس نے بہت تاک کر نشانہ لیا تھا اور دائیں طرف موجود ان دو مسلح افراد کو نشانہ بنانے میں کامیاب ہو گیا تھا جو گارڈ اور ڈرائیور کی موت کے باوجود بھی مسلسل ہوائی فائرنگ کرتے ہوئے ہر ایک کو وہاں سے دور رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ دونوں افراد گولیاں کھا کر گرے تو ان کے تیسرے ساتھی نے بدحواسی میں یہ سوچے بغیر کہ فائر کرنے والا کرنل ہے، اس کی جانب اپنی کلاشنکوف کا رخ کر دیا۔ برسٹ چلا اور ایک ساتھ کئی اندھی گولیاں لپکتی ہوئی کرنل کی جانب بڑھتی چلی گئیں۔

یہ پُرپیچ وسنسنی خیز داستان جاری ہے
مزید واقعات آیندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

مریم کے خان

جہالت اور ذہنی کج روی انسان کو کچھ سے کچھ بنا دیتی ہے... ہر ایک کو تکلیف پہنچانا اس کا مشغلہ بن جاتا ہے... ایک ایسے ہی بہروپیے کا ماجرا جو ہر ایک کے نزدیک ناپسندیدہ ترین شخص تھا... مسلسل کامیابی کے راستے پر چلتے رہنے کے باوجود وہ بڑے آدمی کے بجائے برا آدمی گردانا جاتا تھا...

قانون کے محافظ کا ناقابلِ یقین کارنامہ... وہ اس کے لیے یادگار لمحہ تھا...

ایڈورڈ ایلڈر نیویارک کے میئر آفس کی کھڑکی میں کھڑا باہر کا منظر دیکھ رہا تھا۔ موسم سرما کی اولین برف باری نے گلیوں کو سفید رنگ کر دیا تھا اور اب فراٹے کی سرد ہوا چل رہی تھی مگر آفس اندر سے گرم تھا۔ آتش دان میں لکڑی جل رہی تھی۔ اس سے پہلے جو میئر تھا، وہ جدت پسند تھا اس لیے اس نے قدیم روایتی آتش دان کے بجائے برقی آتش دان لگوایا تھا مگر ایڈورڈ قدامت پسند تھا اس لیے اس نے دفتر کی تزئین و آرائش میں سب سے پہلے آتش دان سے

برقی ہیٹر نکلوا کر اسے پھر سے لکڑی سے گرمائش دینے والے آتش دان میں تبدیل کرا دیا تھا۔ اس نے خاصی بڑی برتری کے ساتھ میئر شپ جیتی تھی اور آج اس کا دفتر میں پہلا دن تھا۔ دفتر کے باہر میڈیا اور پریس کے نمائندوں کا ایک ہجوم اس کا منتظر تھا۔ اس نے اس غیر رسمی پریس کانفرنس میں اپنے مختصر خطاب میں اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ اپنے ایجنڈے پر عمل کرے گا کیونکہ ووٹرز نے اسی لیے اسے ووٹ دیے تھے۔

ایڈورڈ کا ایجنڈا بہت بھاری بھرکم نہیں تھا مگر اس نے ووٹرز سے چند بہت اہم وعدے کیے تھے۔ ان میں سرفہرست شہر کی انتظامیہ سے بدعنوان عناصر کا خاتمہ، شہر کی قدیم یادگاروں کی بحالی اور نیویارک کی حدود میں بچ جانے والے جنگلوں اور فطری علاقوں کا تحفظ شامل تھا۔ سابق میئر نے رہوڈز آئی لینڈ میں ایک اسکائی اسکریپر علاقے کی منظوری کی مہم چلائی تھی اور اسے تقریباً منظور کرا لیا تھا۔ اس کا مقصد مین ہٹن پر بڑھتے بوجھ کو کم کرنا تھا۔ مگر ملٹی نیشنل کمپنیوں کے ساتھ عام شہریوں نے بھی اس منصوبے کی مخالفت کی تھی۔ سرمایہ دار مین ہٹن سے دور نہیں جانا چاہتے تھے اور شہریوں کے خیال میں مزید علاقوں کو اسکائی اسکریپر کے لیے مخصوص کرنے کا مطلب تھا، آپ شہر میں عمارتوں کا ایک جنگل اور کھڑا کر دیں۔ دوسری طرف یہ بھی حقیقت تھی کہ مین ہٹن میں جو پرانی عمارت گرائی جاتی تھی، اس کی جگہ فوری اس سے کہیں بلند عمارت کی تعمیر شروع ہو جاتی۔ اسکائی اسکریپر کے تعمیراتی قوانین میں مسلسل نرمی لائی جا رہی تھی جس کا فطری نتیجہ یہ نکل رہا تھا کہ زیادہ بلند عمارتیں تعمیر ہونے سے مین ہٹن کے باسیوں کے لیے دھوپ اور ہوا کی فراہمی مسلسل کم ہو رہی تھی۔

ایڈروڈ نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مین ہٹن کے اسکائی اسکریپر جنگل کو مزید گھنا ہونے سے روکے گا اور قوانین میں یہ شق شامل کی جائے گی کہ کسی بھی عمارت کی مسماری کی صورت میں اس سے بلند عمارت تعمیر نہیں کی جائے گی۔ پانی کی فراہمی کے سب سے بڑے منصوبے میں گھپلوں کا انکشاف ہوا تھا۔ اس کے ذمے داروں کو کیفرِ کردار تک پہنچانا تھا۔ میٹرو ٹرین سروس کو اپ گریڈ کرنے کی اشد ضرورت تھی ورنہ آنے والے چند سالوں میں نیویارک کی سڑکوں پر ٹریفک کا سیلاب بے تحاشا بڑھ جانے کا خدشہ تھا۔ شہری ملازمتوں میں مسلسل کمی اور اخراجات میں اضافے سے سروسز پر دباؤ بڑھ رہا تھا اور صفائی ستھرائی کے انتظامات ابتر ہو رہے تھے۔ یہ وہ توجہ طلب مسائل تھے جن کا ایڈورڈ کو میئر آفس میں پہلے دن سے سامنا تھا مگر اس وقت اس کی میز پر جو فائل تھی وہ جان بریڈ نامی پولیس افسر کی تھی۔ اس وقت نیویارک پولیس کے سربراہ کپتان بریم ابراہام کا انتظار کر رہا تھا۔ مقررہ وقت پر اس کی سیکریٹری جولیا... نے دروازہ کھولا اور اعلان کیا۔ "مسٹر میئر! کیپٹن ابراہام آپ سے ملاقات کے لیے آئے ہیں۔"

بریم ابراہام تقریباً پچاس برس کا طویل قامت اور صورت سے مختی نظر آنے والا شخص تھا۔ یہ تاثر درست تھا۔ تیس سال پہلے جب وہ پولیس میں بھرتی ہوا تو روزِ اول سے اس نے یہ تاثر قائم کیا تھا اور آج بھی اسے پولیس فورس کا سب سے مختی اور ایمان دار شخص تصور کیا جاتا تھا۔ تین سال پہلے وہ جب پولیس چیف بنا تو اس نے محکمے میں دور رس اصلاحات کیں۔ اس کے دور میں یقیناً این وائی پی ڈی میں خاصی بہتری آئی تھی۔ خود میئر ایڈورڈ بھی اسے پسند کرتا تھا اور وہ پولیس چیف کے طور پر اس کا واحد انتخاب تھا۔ مگر انتخابی مہم کے دوران جب اس نے پولیس کے محکمے کی چھان بین کی تو اس کے علم میں بعض حیرت انگیز انکشافات آئے اور اتفاق سے وہ سب انکشافات جان بریڈ کے بارے میں تھے۔ وہ جانتا تھا کہ آج کی پولیس چیف سے اس کی ملاقات خوشگوار نہیں ہو گی۔ اس کے باوجود اس نے گرم جوشی سے بریم سے ہاتھ ملایا اور اسے میز کی طرف لے آیا۔

"بیٹھو مسٹر ابراہام، تمہیں اپنے آفس میں دیکھ کر مجھے خوشی ہو رہی ہے۔"

"مجھے بھی۔" بریم نے محتاط انداز میں کہا۔ "بغیر ایجنڈے کے اس ملاقات کے لیے مجھے خاص طور سے وقت نکالنا پڑا۔"

"اس کے لیے میں تمہارا شکر گزار ہوں۔" ایڈورڈ نے مگ میں کافی نکال کر اس کے سامنے رکھی۔ "لیکن اس شہر کے نئے سربراہ کے طور پر یہ ملاقات ضروری تھی۔"

بریم نے شکریہ کہہ کر کافی کا مگ اٹھایا اور گھونٹ لے کر سوالیہ نظروں سے ایڈورڈ کی طرف دیکھا۔ وہ اس سے ذرا دور میز کے کنارے بیٹھا تھا۔ ایڈورڈ نے فائل اٹھائی۔ "مسٹر پولیس چیف... میئر شپ سے پہلے میں نے پولیس کے محکمے کے بارے میں کچھ معلومات جمع کیں تو ایک پولیس افسر جان بریڈ کے بارے میں کچھ حیرت انگیز انکشافات میرے علم میں آئے اور میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ میئر بننے کی صورت میں تم سے اس سلسلے میں لازمی ملاقات

کروں گا۔"

"جان بریڈ..." بریم ابراہام نے گہری سانس لی۔

"مسٹر میئر، میں منتظر ہوں۔"

ایڈورڈ نے فائل کا ایک صفحہ کھولا۔ "جان بریڈ تقریباً تمہارے ساتھ پولیس میں بھرتی ہوا۔"

"ہم ایک ہی بیچ سے تعلق رکھتے تھے اور جوائننگ کے بعد ہم دونوں ساتھی بنے۔"

"اوہ..." ایڈورڈ نے صرف اتنا کہا۔

"درحقیقت ہم چار سال پارٹنر رہے۔"

"اس لیے امید ہے تم اس کے بارے میں مجھ سے کہیں زیادہ جانتے ہو گے۔"

"اس بات کو چھبیس برس گزر چکے ہیں۔"

"اس کے باوجود وہ تمہارے محکمے کا ایک افسر ہے اور یقیناً اس کا شمار سینیارٹی کے لحاظ سے پہلے پانچ چھ افسران میں ہو گا۔"

"ہم دونوں سے سینئر افسران کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے۔" بریم نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میئر ایڈورڈ نے فائل پر نظر ڈالی۔ "ملازمت کے پہلے سال جان بریڈ کو ڈسپلن کی خلاف ورزی، تشدد اور عوامی مقامات پر بے دریغ فائرنگ کے الزامات میں چارج کیا گیا۔"

"لیکن تحقیقاتی کمیٹی نے اسے ان الزامات سے بری کر دیا۔"

"اس پر پریس نے کم سے کم چھ آرٹیکلز میں محکمۂ پولیس کو ملوث کیا تھا۔"

"مسٹر میئر! مجھ سے زیادہ آپ جانتے ہیں کہ پریس کس طرح سے انتظامیہ اور سیاست دانوں کی ٹانگ کھینچتا ہے۔ لیکن ہمیں اپنا کام کرنا ہوتا ہے، تنقید کی پروا کیے بغیر۔"

بظاہر ایڈورڈ غور سے پولیس چیف کی بات سن رہا تھا مگر اس کی نظریں فائل پر مرکوز تھیں۔ "جاب کے تیسرے سال ایک بینک میں ڈکیتی کے دوران جان بریڈ نے مداخلت کی جبکہ وہ اس وقت ڈیوٹی پر نہیں تھا۔ اس نے فائر کر کے دونوں ڈاکوؤں کو ہلاک کر دیا اور اس واقعے میں بینک منیجر شدید زخمی ہوا۔ ایک بار پھر جان بریڈ کو چارج کیا گیا اور تحقیق کاروں نے اسے بری کر دیا۔"

"بینک منیجر بچ گیا تھا۔ اس کی جان خطرے میں نہیں تھی اور وہ صرف دس دن بعد دوبارہ ڈیوٹی پر تھا۔ جہاں تک دونوں ڈاکوؤں کا تعلق ہے، وہ نامی گرامی اور سزا یافتہ بدمعاش تھے۔ ان میں سے ایک قتل کے جرم میں سات سال جیل میں رہا۔ اگر جان بریڈ ان کو نہ مارتا تو یقیناً ان کے ہاتھوں کئی افراد مارے جاتے۔"

"یہ تو آغاز ہے۔" میئر ایڈورڈ نے فائل کا ایک صفحہ اور پلٹا۔ "اسی سال ایک برگر اسٹال پر ڈکیتی کرنے والے شخص کو جان بریڈ نے گولی مار کر ہلاک کر دیا جو نہتا تھا اور اس کے پاس سے کوئی آتشیں ہتھیار برآمد نہیں ہوا تھا۔"

"جب جان اور اس کے ساتھی نے اس ڈاکو کو للکارا تو اس نے برگر کاٹنے والا چاقو اسٹال کے مالک کی گردن پر رکھ دیا اور وہ پولیس والوں کو دھمکی دے رہا تھا اگر انہوں نے اسے نہ جانے دیا تو وہ یرغمالی کو ہلاک کر دے گا۔ بعد میں ڈاکو کا ریکارڈ کہیں زیادہ سنگین نکلا تھا۔ وہ دو عورتوں کو ریپ کرنے اور ان کو چاقو سے زخمی کرنے کا مرتکب ثابت ہوا تھا اور اسے تین بار جیل بھیجا گیا تھا۔"

پولیس چیف کی اس وضاحت نے بھی میئر کو مطمئن نہیں کیا۔ اس نے فائل کی ورق گردانی جاری رکھی۔ "پھر جان بریڈ کی زندگی کا سب سے مشہور کیس ہوا۔ اس کی میڈیا پر بھی مہینوں گونج رہی۔ مجرموں کے ایک گروہ نے میٹرو میں مسافروں کو یرغمال بنا لیا اور انہوں نے سو ملین ڈالرز کا مطالبہ کیا۔ انتظامیہ تاوان کی ادائیگی کے حق میں تھی۔ لیکن جان اور اس کے ساتھیوں نے اپنے طور پر یرغمالیوں کو چھڑانے کا منصوبہ بنایا کیونکہ بقول ان کے مجرم بہر صورت یرغمالیوں کو ہلاک کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔"

"یہ سچ ہے کیونکہ تاوان کا مطالبہ صرف دھوکا دینے اور شہرت حاصل کرنے کے لیے تھا۔ وہ میٹرو کے ڈبے میں بم فکس کر چکے تھے اور جو آخری مجرم جان کی گولی سے ہلاک ہوا، وہ بم کا بٹن تقریباً دبا چکا تھا۔"

"اس لحاظ سے دیکھا جائے تو تمہارا آفیسر بہت لکی ہے۔" میئر کا لہجہ کسی قدر طنزیہ ہو گیا۔ "اس کی احمقانہ کارروائیاں اگر نظر انداز کر بھی دی جائیں تب بھی اس کے بعض افعال کسی صورت نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہیں۔"

اس بار بریم ابراہام خاموش اور ہمہ تن گوش رہا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ میئر کی بات اس کے لیے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ اس کی طرف سے کسی ردِعمل میں مایوسی کے بعد ایڈورڈ نے بات آگے بڑھائی۔ اس بار اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ اصل معاملات کی طرف آ رہا ہے۔ اس نے اب تک جو معاملات اٹھائے تھے، وہ صرف فضا بنانے کے لیے

تھے۔ پھر اس نے فائل کا اگلا صفحہ نکالا۔ ”ٹیوڈی بریستن کا شمار نیویارک کے نامی گرامی بدمعاشوں میں ہوتا تھا کسی مافیا کا حصہ نہ ہوتے ہوئے بھی وہ اپنی ذات میں خود مافیا سے کم نہیں تھا۔ جان بریڈ کی ڈیوٹی اسی کے علاقے میں تھی۔“

”درست ہے۔ جان نے پندرہ سال وہیں گزارے۔“

”ایک صحافی میتھائس گوور نے جان پر الزام لگایا کہ وہ ٹیوڈی سے رقم وصول کرتا تھا اور اس کے بدلے میں وہ اس کے منشیات کے کاروبار کو تحفظ دیتا تھا۔ میتھائس نے کچھ ثبوت بھی پیش کیے، خاص طور سے ٹیوڈی کے ساتھ اسی کے بار میں جان بریڈ کی تصویر خاصی مشہور ہوئی تھی۔“

”وہ صرف ایک تصویر تھی۔“

”مگر ان نشان زدہ نوٹوں کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے جو جان بریڈ کے پاس سے برآمد ہوئے تھے؟“ ایڈورڈ کا لہجہ چبھتا ہوا ہو گیا۔

”وہ ایک سازش تھی... بعد میں ان لوگوں نے اعتراف کیا کہ انہیں ٹیوڈی بریستن کے مخالفوں نے اس سازش پر آمادہ کیا تھا اور انہوں نے جان کی بے خبری میں یہ رقم اس کی جیب میں رکھی تھی۔“

”کیا اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ جان اور ٹیوڈی میں کوئی گٹھ جوڑ تھا... ورنہ اس کے دشمنوں کو جان کے خلاف سازش کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“

بریم کے چہرے پر اب کسی قدر کشمکش کے تاثرات نظر آنے لگے۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”ٹیوڈی بریستن بدمعاش تھا لیکن اس نے کچھ اصول بنا رکھے تھے کہ وہ نوجوانوں کو منشیات فروخت نہیں کرتا تھا۔ اسی طرح اس کے علاقے میں طوائفیں بھی ایک حد میں رہتی تھیں۔ وہ اپنے علاقے کے لوگوں کا خیال رکھتا تھا۔“

”میرا خیال ہے نیویارک کے عوام اسی لیے مجھے ووٹ اور تمہیں تنخواہ دیتے ہیں کہ ہم ان کا خیال رکھیں۔ بدمعاشوں کے سپرد یہ کام کبھی نہیں رہا۔“ ایڈورڈ کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔ بریم کا چہرہ ایک لمحے کو سرخ ہوا مگر اس نے تحمل سے کہا۔

”ٹیوڈی کے مارے جاتے ہی اس علاقے میں منشیات کی بھرمار ہو گئی۔ دس بارہ سال کے لڑکے منشیات استعمال کرنے لگے۔ نئی مافیا کی سرپرستی میں طوائفوں نے لوگوں کا سکون برباد کر دیا۔“

”مسٹر پولیس چیف! میں ایک بار پھر کہوں گا کہ لوگ اس کام کی توقع ہم سے کرتے ہیں۔“

”مسٹر میئر، میں اس وقت کی بات کر رہا ہوں... آپ جانتے ہیں آج سے بیس سال پہلے شہر مافیا کی گرفت میں تھا۔ پھر میئر براؤنی نے جرأت مندانہ اقدامات کیے اور پولیس نے شہر پر گرفت مضبوط کی اور آج صورتِ حال بہت بہتر ہے۔“ بریم نے وضاحت کی۔ ”ہم اپنا کام کر رہے ہیں۔“

”تب اس جیسے پولیس افسران کی محکمے میں کیا ضرورت ہے؟“ میئر ایڈورڈ کسی قدر برہم ہو گیا۔

”جناب! محکمہ صاف ہے... گزشتہ ایک سال سے پولیس کے بارے میں کوئی بڑا اسکینڈل سامنے نہیں آیا۔“

”اس شخص کے ہوتے ہوئے یہ محکمہ صاف ہو ہی نہیں سکتا۔“ میئر کا غصہ بڑھ رہا تھا۔ غالباً اسے توقع نہیں تھی کہ پولیس چیف کی جانب سے جان بریڈ کی اتنی زیادہ حمایت کی جائے گی۔ ”یہ صرف ہیپی ٹریگر ہی نہیں ہے، صرف راشی ہی نہیں ہے... یہ عادی شرابی ہے۔ یہ دیکھو... تمہارے محکمے کی بنائی فائل کے مطابق اسے درجن بار سے زیادہ آفس کی حدود میں شراب نوشی پر وارن کیا گیا لیکن ایک بار بھی اسے سزا نہیں ہوئی۔“

”سزا ہوئی تھی، فائل میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ اسے تین بار آفس کی حدود تک محدود کیا گیا اور اسے پیٹرولنگ سے روک دیا گیا تھا۔“

”لیکن فائل میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ کیا اس لیے کہ پھر یہ سزا اس کے ریکارڈ کا حصہ بن جاتی؟“

ایک وجہ یہ بھی ہے لیکن اصل میں اس کے ساتھیوں کی طرف سے مزاحمت کی گئی تھی۔ کوئی گواہی کے لیے سامنے نہیں آیا اس لیے باضابطہ اور ریکارڈ میں شامل کی جانے والی سزا دینا ممکن نہیں تھا۔ آخری بار میں نے اسے خود سزا دی تھی اور وہ تین دن تک میرے دفتر میں رہا تھا۔“

”جیسے جیسے اس شخص کی عمر اور تجربہ بڑھتا رہا، اس کی حرکتوں میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ اس نے ایک بار نوجوانوں کے ایک گروہ سے مار پیٹ کی۔ ان میں سے دو کو شدید زخمی کیا اور پھر ان سب کو گرفتار کر لیا۔ انہیں اسپتال کے بجائے لاک اپ لے جایا گیا۔ بعد میں عدالت نے ان سب کو رہا کر دیا۔“

”اس لڑکی کی گواہی سے انکار پر جس کی وجہ سے یہ سب شروع ہوا۔ جان اس وقت بھی ڈیوٹی پر نہیں تھا۔“ بریم نے کسی قدر تلخی سے کہا۔ ”وہ لڑکے اسے سرِعام ریپ کا نشانہ بنا رہے تھے۔ وہ ان کی ساتھی تھی۔ کیا یہ قانون کی خلاف

ورزی نہیں تھی؟ جان کو مداخلت نہیں کرنی چاہیے تھی؟ اس نے انہیں روکا تو ان چار بدمعاشوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ جان نے اپنا دفاع کیا۔ اسی وجہ سے عدالت نے اس پر بھی کوئی فردِ جرم عائد نہیں کی۔“

”مسٹر پولیس چیف! یہ کوئی پہلا اور واحد واقعہ نہیں ہے۔“ ایڈورڈ نے فائل پٹخ دی۔ وہ اٹھ کر ٹہلنے لگا جیسے خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہو۔ ”اس واقعے کے صرف تین مہینے بعد وہ ریور سائڈ پر پھر ایک پُرتشدد واقعے میں ملوث پایا گیا اور وہاں اس نے تین افراد کو مارا پیٹا۔ ان میں سے ایک کو گولی مار کر شدید زخمی کیا جو بعد میں اسپتال میں ہلاک ہو گیا۔ انکوائری میں پتا چلا کہ وہ منشیات کی معمولی سی کھیپ لا رہے تھے۔“

”کھیپ معمولی نہیں تھی، ان تینوں کے بقیہ ساتھی اصل کھیپ لے کر فرار ہو گئے تھے اور پولیس نے مزید تحقیق کر کے ایک ہفتے بعد باقی منشیات برآمد کر لی تھی۔“

”اس کا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔“

”بظاہر نہیں تھا لیکن کنکشن ہمیں اسی واقعے سے ملا تھا۔ شاید آپ جانتے ہیں اس سے پہلے نیویارک میں کبھی کوئی نشہ آور چیز ٹن کے حساب سے نہیں پکڑی گئی۔ مجھے یقین ہے یہ کامیابی جان کی وجہ سے حاصل ہوئی تھی۔“

”تب اسے اس کا کریڈٹ کیوں نہیں ملا؟“

”اس نے انکار کیا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ پولیس میں اپنا کام کرنے آیا ہے، کوئی کریڈٹ لینے نہیں آیا۔ وہ جو کرتا ہے، اسے اس کی تنخواہ دی جاتی ہے۔“

”لیکن کچھ چیزوں کا کریڈٹ تو اسے لینا پڑے گا۔“ ایڈورڈ نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”جان نے اپنے ساتھی کے ہمراہ ایک کار کو روکا اور پھر اس میں سوار افراد کو تشدد کا نشانہ بنایا۔ تم جانتے ہو اس کار میں سوار لوگ کون تھے؟“

بریم نے سر ہلایا۔ ”اس میں ایک سینیٹر کا بیٹا جو خود بھی پارٹی ممبر تھا۔ اس کے ساتھ ایک مشہور فلمی اداکارہ اور ایک براڈوے تھیٹر کا مالک تھا۔ جان نے انہیں اوور اسپیڈ پر روکا تھا۔“

”کار ڈرائیور چلا رہا تھا جو کرائے کی تھی۔ جان نے ڈرائیور کو چالان کرنے کے بجائے ان تینوں کو مارا پیٹا... جس میں ایک عورت بھی شامل تھی۔“

”انہوں نے اسے گالیاں دی تھیں اور سینیٹر کے بیٹے نے اسے دھمکی دی تھی کہ وہ اسے نوکری سے نکلوا دے گا۔“

”اگر اس نے ایسی کوئی دھمکی دی بھی تھی تو یہ ان پر تشدد کا جواز نہیں تھا۔ خاص طور سے اس اداکارہ پر... پریس اور میڈیا نے کیا طوفان اٹھایا تھا، اس واقعے پر فلم تک بن چکی ہے۔“

”ان لوگوں کا کام ہی طوفان اٹھانا ہے۔ قانون کی نظر میں سب برابر ہیں، چاہے وہ کوئی عام آدمی ہو یا سلیبریٹی۔“ بریم نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں مانتا ہوں اس بار جان نے زیادتی کی اور اسے سزا بھی ملی۔ اس کی سینیارٹی میں کمی کی گئی تھی اور اسے دو مہینے کی تنخواہ کے برابر جرمانہ ہوا تھا۔ وہ چھ مہینے ایکٹو ڈیوٹی سے دور رہا لیکن سوال یہ ہے اگر اس واقعے کا شکار مشہور لوگ نہ ہوتے تو کیا تب بھی پریس اور میڈیا اس معاملے کو اسی طرح اٹھاتا؟“

”یہ ریٹنگ کا معاملہ بھی ہوتا ہے۔ عام آدمی کو شدید تکلیف ہو تو کوئی نہیں پوچھتا لیکن اگر صدر امریکا کو چھینک آ جائے تو خبر بن جاتی ہے۔“

”آپ نے درست کہا... مگر قانون اور میڈیا الگ الگ ہیں۔ ہمارے لیے سب ایک جیسے ہیں۔“

”مگر اس شخص کو ہمیشہ چھوٹ مل جاتی ہے۔“

”یہ چھوٹ صرف محکمہ نہیں بلکہ انکوائری کمیٹیاں اور عدالت بھی دیتی رہی ہے۔ میڈیا اور پریس جو کہتا رہے لیکن انکوائری میں سب سامنے آ جاتا ہے۔“

”اسی لیے یہ شخص اب تک ملازمت پر برقرار ہے لیکن میں ایسا نہیں سمجھتا۔“ ایڈورڈ نے بدستور ٹہلتے ہوئے کہا۔ ”میں سمجھتا ہوں یہ انتظامیہ اور محکمے کی چھوٹ ہے جو یہ شخص اب تک ملازمت پر برقرار ہے ورنہ کم سے کم سیلی والے واقعے کے بعد تو اسے لات مار کر نکال دینا چاہیے تھا۔“

”سیلی۔“ بریم نے آہستہ سے کہا۔ ”ففتھ ایونیو کی کال گرل۔“

”بے شک وہ کال گرل تھی لیکن جان بریڈ پولیس افسر تھا۔ اسے اپنے مرتبے کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔ ایک کال گرل کے فلیٹ میں رات گزارنا کتنی بڑی خبر تھی۔“

”جان میڈیا میں رہتا تھا۔“

”ہاں کیونکہ وہ میڈیا میں رہنے والے کام کرتا تھا۔“ ایڈورڈ نے برہمی سے کہا۔ ”اس کی وہ تصویر ہر اخبار نے چھاپی جس میں وہ الٹا سیدھا یونیفارم پہنے سیلی کے گھر سے نکل رہا تھا۔ اس کی پتلون کی زپ تک کھلی ہوئی تھی۔ وہ اپنا پستول تک اس کے گھر بھول آیا تھا جو بعد میں سیلی نے میڈیا کو دکھایا۔“

اس خبر نے سچ مچ جان بریڈ کے افسران کو مشکل میں ڈال دیا تھا۔ یہ ڈسپلن اور ضابطۂ اخلاق کی سنگین خلاف ورزی تھی۔ جان بریڈ کی پیٹرول کار ساری رات سیلی کے گھر کے باہر موجود رہی تھی اور وہ اس وقت ڈیوٹی پر تھا۔ اتفاق سے جان اس دن اکیلا تھا کیونکہ اس کا پارٹنر بیوی کی طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے دورانِ ڈیوٹی اسپتال چلا گیا تھا۔ دوسرا کوئی آفیسر جان کے ساتھ آسکتا تھا مگر اس نے ہیڈکوارٹر اطلاع نہیں دی اور اکیلا پیٹرولنگ پر تھا۔ رات دو بجے وہ ففتھ ایونیو پر تھا۔ جان کا کہنا ہے کہ اچانک اس کی طبیعت خراب ہوئی اور وہ کار روک کر نیچے اتر آیا پھر اسے ہوش نہیں رہا۔ اسے ہوش آیا تو وہ سیلی کے گھر میں اس کے لاؤنج میں صوفے پر پڑا تھا اور اس کے جسم پر صرف نیکر تھی۔ مگر اس کا کہنا تھا کہ وہ سیلی کے پاس نہیں گیا تھا۔ ہوش میں آنے پر بھی اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے وہ الٹا سیدھا لباس پہن کر وہاں سے نکل آیا مگر اس وقت تک میڈیا کو اطلاع مل گئی تھی اور سیلی کے گھر کے باہر درجن بھر رپورٹرز اور فوٹوگرافرز موجود تھے۔ انہوں نے جان کی وہ مشہورِ زمانہ تصویر لی جو آج بھی اس کی پہچان تھی اور جب اس کا حوالہ دیا جاتا تو لوگ جان جاتے کہ کس جان بریڈ کی بات ہو رہی ہے۔

"جان کا کہنا ہے کہ اس کی طبیعت خراب تھی۔" بریم نے آہستہ سے کہا۔ وہ جان کی مدافعت میں یہی کہہ سکتا تھا۔

"سیلی نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ وہ ایک دوسرے درجے کی کال گرل تھی مگر اس واقعے کے بعد اس کی مانگ کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ پہلے وہ ایک رات کے دو سو ڈالرز لیتی تھی تو اس کے بعد پانچ سو ڈالرز لینے لگی۔"

"کیونکہ جان بریڈ جیسے مشہور پولیس افسر نے اس کے ساتھ رات گزاری تھی۔" میئر ایڈورڈ کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔

اسی لمحے جولیا نے اندر جھانکا اور بولی۔ "سر! لیٹر تیار ہے۔"

"لے آؤ جولی۔" ایڈورڈ نے خاصی دیر بعد خوشگوار لہجہ اختیار کیا۔ "میں شدت سے منتظر تھا۔"

جولی نے اندر آکر ایک بند لفافہ میئر کے حوالے کیا اور واپس چلی گئی۔ ایڈورڈ نے معنی خیز انداز میں لفافہ کپتان بریم سے ذرا فاصلے پر رکھا۔ مگر اس کے بارے میں کچھ کہنے کے بجائے اس نے جان بریڈ پر بات جاری رکھی۔ "سیلی والے واقعے کے بعد وہ پولیس کی ملازمت کا حق کھو چکا تھا مگر مجھے نہیں معلوم اسے کیوں ملازمت پر برقرار رکھا گیا۔ مگر چھ مہینے پہلے وہ ہر حد پار کر گیا۔" یہ کہتے ہوئے ایڈورڈ کے لہجے کی برہمی لوٹ آئی۔

بریم ابراہام سمجھ رہا تھا کہ میئر کا اشارہ کس واقعے کی طرف ہے۔ منی لانڈرنگ کے ایک کیس میں ایف بی آئی تحقیق کر رہی تھی۔ اس میں نیویارک کے چند نامی گرامی اسٹاک بروکرز کے ساتھ ایک بینک کا صدر پیٹر کرسٹن بھی شاملِ تفتیش تھا۔ حسبِ روایت پولیس ایف بی آئی کے ماتحت اس کیس کی تفتیش میں شامل تھی اور اس کی مدد کر رہی تھی۔ پولیس کی طرف سے جان بریڈ اور اس کے ساتھی کو ایف بی آئی ایجنٹوں کا معاون مقرر کیا گیا تھا۔ مگر ہوا یہ کہ ایک انٹرویو کے دوران ایف بی آئی ایجنٹس کی پیٹر سے زبانی جھڑپ ہوئی اور جان اچانک یوں اس جھگڑے میں کودا کہ اس نے پیٹر کے منہ پر مکا مار کر اس کا جبڑا توڑ دیا۔ پیٹر کا آپریشن ہوا اور اس کا جبڑا تار کی مدد سے جوڑا گیا۔ ایک مہینے بعد وہ کہیں ٹھیک سے بولنے کے قابل ہوا۔ میئر ایڈورڈ اسی کیس کا حوالہ دے رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "اب اس کے بعد بھی کوئی جواز ہے؟"

پیٹر کرسٹن، میئر ایڈورڈ کے قریبی دوستوں میں سے تھا اور اس نے اس کی انتخابی مہم کے لیے بھاری چندہ دیا تھا۔ بریم یہ بات اچھی طرح سمجھ رہا تھا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جان بریڈ کے سلسلے میں اس کی طلبی کے پس پشت پیٹر کا دباؤ بھی ہوگا۔ سارے اہم معاملات چھوڑ کر میئر نے سب سے پہلے جان کا کیس ایسے ہی نہیں چھیڑا تھا۔ وہ یقیناً اس کے بارے میں فیصلہ کر چکا تھا۔ بریم یہ بھی جانتا تھا کہ میئر ہی شہر کا باس ہے۔ وہ اس کے ہر فرد کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتا ہے اور اگر اس نے جان بریڈ کے بارے میں کوئی فیصلہ کر لیا تھا تو اسے کوئی رد نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے اس نے سوچ کر کہا۔ "اس معاملے میں جان واقعی حد سے گزر گیا۔۔۔ لیکن مسٹر کرسٹن نے انٹرویو کے موقع پر جو طرزِ عمل اختیار کیا وہ ان کے شایانِ شان نہیں تھا۔ انہوں نے بہت غلط زبان استعمال کی اور جان بریڈ کو براہِ راست دھمکی دی کہ میئر تبدیل ہوتے ہی ملازمت سے اس کی چھٹی ہو جائے گی۔"

میئر ایڈورڈ پھر برہم ہو گیا۔ "تم کیا سمجھتے ہو مسٹر پولیس چیف! کیا میں صرف اپنے دوست کے کہنے پر انکوائری کر رہا ہوں؟"

"بالکل نہیں جناب۔۔۔ میں جانتا ہوں آپ ایک

ایمان دار اور اچھے انسان ہیں۔ آپ وہی کریں گے جو آپ کا ضمیر کہے گا۔ میں صرف مسٹر کرسٹن کے الفاظ دہرا رہا ہوں۔ یہ ریکارڈ شدہ ہیں۔"

ایڈورڈ کا غصہ کسی قدر کم ہوا۔ "پیٹر کا کہنا ہے کہ وہ اشتعال میں آگیا تھا اور اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا۔"

"اس کے باوجود ان الفاظ کی سنگینی آپ محسوس کر سکتے ہیں سر۔۔۔ بدقسمتی سے مسٹر کرسٹن نے خود معاملے کو میڈیا پر دیا اور اب اگر یہ ریکارڈنگ منظرِ عام پر آئی تو اس سے بہت سے مسائل کھڑے ہو سکتے ہیں۔"

"تم اس کی فکر مت کرو۔ وہ ریکارڈنگ ایف بی آئی کے ریکارڈ کا حصہ ہے اور کسی صورت پبلک نہیں ہوگی۔"

"یہ رپورٹ پولیس ریکارڈ کا بھی حصہ ہے۔" بریم ابراہام نے آہستہ سے کہا۔ "کوئی بھی عام فرد معلومات تک رسائی کے قانون کے تحت اس کا مطالبہ کر سکتا ہے۔"

میئر ایڈورڈ کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ اس نے سرد لہجے میں کہا۔ "مسٹر ابراہام! کیا تم مجھے ڈرانے کی کوشش کر رہے ہو؟"

"سر! میں صرف آپ کو خبردار کر رہا ہوں۔ ابھی جان بریڈ سرکاری ملازم ہے۔ اس کی ملازمت کے دس سال باقی ہیں۔ اگر اسے قبل از وقت فارغ کیا گیا تو وہ عام شہری شمار ہوگا۔"

میئر ایڈورڈ سمجھ رہا تھا کہ بریم ابراہام اسے کیا کہنا چاہ رہا ہے۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا جیسے اس پر سوچ بچار کر رہا ہو۔ اس کے چہرے پر کشمکش نظر آئی۔ بریم اسے غور سے دیکھ رہا تھا اور جب میئر ایڈورڈ نے گہری سانس لی تو بریم جان گیا کہ وہ اپنے فیصلے پر قائم ہے۔ میئر ایڈورڈ نے لفافہ اٹھایا اور میز کے دوسری طرف اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔ اس نے لفافہ کھول کر اس میں موجود لیٹر نکالا اور پین اٹھا کر اس پر اپنے دستخط کرنے کے بعد میئر کی مخصوص مہر بھی ثبت کر دی۔

☆☆☆

میئر آفس کے باہر سکون تھا۔ برف باری اور سرد ترین ہواؤں کی وجہ سے سڑکیں اور فٹ پاتھ سنسان تھے۔ ایک اوورکوٹ پوش شخص میئر آفس کی عالی شان عمارت کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ جوان آدمی تھا، چہرے سے تعلیم یافتہ اور سلجھا ہوا شخص لگ رہا تھا۔ اس کا لباس بہترین تھا اور پیروں میں چمڑے کے بہترین جوتے تھے۔ بال کریو کٹ تھے۔ دو دن پہلے یہاں سیکیورٹی بہت سخت تھی اور کوئی بھی اجنبی شخص آسانی سے اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا مگر میئر ایڈورڈ نے پہلے روز سے سیکیورٹی کو نرم کر دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر عام لوگ اس سے آسانی سے نہیں ملیں گے تو وہ ان کی مشکلات سے کس طرح واقف ہوگا۔ اس لیے اب صرف دو گارڈز باہر تھے۔ انہوں نے اس شخص کو روکا۔ انہوں نے اس کی تلاشی نہیں لی لیکن اس سے پوچھ لیا۔ "کیا تمہارے پاس کوئی ہتھیار ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ انہوں نے ڈیٹیکٹر سے چیک کر کے اسے اندر جانے دیا۔ وہ اندر آیا اور میئر آفس کی طرف بڑھا۔ ایسا لگ رہا تھا اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ میئر آفس کہاں ہے۔ اس نے اندر موجود استقبالیہ پر پوچھنے کی زحمت نہیں کی۔ لابی کے آغاز میں موجود ایک گارڈ نے اسے روکا اور پھر اسے آلے سے چیک کیا۔ اس بار بھی اس کی تلاشی نہیں لی گئی۔ آلے سے چیک کرنے کے بعد گارڈ نے اسے جانے دیا۔۔۔۔ وہ میئر آفس کے پاس موجود واش روم میں داخل ہوا۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کیا اور ایک واش روم کی طرف بڑھا۔ اس کا فلیش ٹینک کا ڈھکن کھول کر اس نے اندر سے پلاسٹک میں لپٹی ہوئی جدید ترین۔۔۔ خودکار رائفل نکالی۔ یہ ٹکڑوں کی صورت میں تھی اور اس کے ساتھ دو عدد میگزین تھے۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹا پستول بھی تھا۔ اس نے پلاسٹک شاپر کھول کر رائفل جوڑی اور اس میں میگزین فٹ کیا۔ پھر اس نے پستول اپنی کمر کی بیلٹ سے لگایا اور رائفل اوورکوٹ میں کرتا ہوا باہر آگیا۔ اس بار اس کا رخ میئر آفس کی طرف تھا۔

☆☆☆

میئر ایڈورڈ نے بریم ابراہام کی طرف دیکھا اور بولا۔ "مجھے افسوس ہے لیکن۔۔۔"

اس کا جملہ منہ میں رہ گیا۔ کمرے کا دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور جولیا اندر آئی۔ میئر ایڈورڈ نے اس طرح آمد پر برہمی سے اسے دیکھا اور پھر کھڑا ہو گیا۔ اس کے انداز نے بریم کو گڑبڑ کا احساس دلایا اور وہ اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے گھوما تھا کہ ساکت ہو گیا۔ آنے والے جوان آدمی نے جولیا کی آڑ لے رکھی تھی اور۔۔۔ خودکار رائفل کا رخ میئر کی طرف تھا۔ موقع کی نزاکت بھانپ کر بریم نے ہاتھ واپس کھینچ لیا اور نارمل لہجے میں بولا۔

"کون ہو تم اور اندر کیسے آئے؟"

جوان آدمی نے دانت نکوسے۔ "مسٹر میئر سے پوچھو، یہ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔"

بریم نے سوالیہ نظروں سے میئر کی طرف دیکھا تو اس نے سر ہلایا۔ "یہ میکانی اروچی ہے، ایک پرائیویٹ کنٹریکٹر۔ سابقہ میئر نے آفس کا کچھ تعمیراتی کام اسی کی کمپنی سے کرایا تھا۔ یہ ابھی ایک ہفتہ پہلے مکمل ہوا ہے۔ میں اس سے واقف ہوں۔"

"اور یہ بھی بتاؤ کہ میری یہاں موجودگی کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔" اس نے کہا اور لات مار کر عقب میں دروازہ بند کر دیا اور پھر ان پر سے نظریں ہٹائے بغیر ہاتھ بڑھا کر اسے اندر سے لاک بھی کر دیا۔

"اس کی کمپنی اسکائی اسکریپر کے اس منصوبے کا ایک حصہ تھی جو منسوخ ہونے والا ہے۔"

"اس منسوخی کی وجہ سے میں تباہ ہونے والا ہوں۔" میکانی نے دانت پیس کر کہا۔ وہ یقیناً اٹالین نژاد امریکی تھا۔ "بلکہ ہو چکا ہوں کیونکہ یہ اطلاع ملتے ہی میری تمام ادائیگیاں رک گئی ہیں اور جو مجھے کریڈٹ دیتے تھے، انہوں نے ایک سینٹ کا کریڈٹ دینے سے بھی انکار کر دیا ہے۔ مجھ پر اتنا قرض ہے کہ میں اپنا سب کچھ تین بار بیچ دوں تب بھی یہ قرض ادا نہیں کر سکتا۔ میری بیوی مجھے چھوڑ کر جا چکی ہے اور عدالت میں طلاق کا کیس چل رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے، تمہیں بہت سارے مسائل ہیں۔" بریم نے کہا۔ "لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم اس طرح رائفل اٹھا کر میئر کے دفتر میں گھس آؤ۔ کیا تمہیں اندازہ ہے تم کیا کر رہے ہو؟"

"کیوں نہیں۔" میکانی نے کہا اور رائفل کا رخ بریم کی طرف کر کے ہلکا سا برسٹ مارا۔ بریم کی دونوں ٹانگیں چھلنی ہو گئیں اور وہ کراہ کر نیچے گرا۔ کپتان بریم کے ساتھ میئر اور جولیا کے لیے بھی یہ غیر متوقع تھا۔ جولیا کی ہذیانی چیخ کمرے میں گونجنے والے فائرنگ کے شور میں گم ہو کر رہ گئی۔ میئر ایڈورڈ بے ساختہ میز کے نیچے ہو گیا۔ فائرنگ کا شور تھما تو میکانی کی تمسخرانہ آواز آئی۔ "میئر! باہر نکل آؤ... اگر تمہیں مارنا ہوتا تو پہلے تم پر فائر کرتا۔ ویسے مرا یہ بھی نہیں ہے... اگر اسے طبی امداد مل گئی تو یہ بچ جائے گا۔"

میئر ایڈورڈ خفت کے احساس کے ساتھ میز کے نیچے سے نکلا اور اس نے فرش پر گرے بریم کی طرف دیکھا۔ تمام گولیاں اس کی دونوں ٹانگوں میں لگی تھیں اور خون بہت تیزی سے بہہ رہا تھا لیکن وہ ہوش میں تھا۔ اسی لمحے انٹرکام کی بیل بجی۔ میکانی نے آگے بڑھ کر اس کا ریسیور اٹھا لیا اور غرا کر بولا۔ "غور سے سنو، میئر آفس میں میئر اور اس کی سیکریٹری جولیا گن پوائنٹ پر ہیں... اگر کوئی شخص دفتر کے پاس پھٹکا تو میں ان دونوں کو شوٹ کر دوں گا۔ لو میئر سے بات کرو۔"

دوسری طرف میئر آفس کا سیکیورٹی چیف گارڈز تھا۔ اس نے پوچھا۔ "سر! آپ ٹھیک ہیں؟... اندر سے فائرنگ کی آواز آئی ہے۔"

"ہاں میں ٹھیک ہوں لیکن پولیس چیف شدید زخمی ہے۔ اس کی ٹانگوں پر کئی گولیاں لگی ہیں۔"

"آگے بھی بتا دو کوئی اس طرف نہ آئے۔" میکانی نے اسے حکم دیا جس پر ایڈورڈ نے گارڈز کو حکم دیا۔

"کوئی اس طرف نہ آئے۔ ورنہ یہ شخص ہمیں مار دے گا۔"

میکانی نے اس سے ریسیور لے کر ایک طرف پھینک دیا۔ پھر اس نے سب کے موبائل فون بھی قبضے میں لے لیے۔ اب باہر سے کوئی اس کی مرضی کے بغیر اندر رابطہ نہیں کر سکتا تھا۔ ایڈورڈ نے خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیری۔ "تم کیا چاہتے ہو؟"

"یہ جاننے کے لیے تم ٹی وی لگا سکتے ہو۔ کوئی بھی نیوز چینل لگاؤ۔"

میئر نے ریموٹ سے چالیس انچ سائز کا ایل ای ڈی ٹی وی آن کیا۔ ایک نیوز چینل لگایا اور فوراً ہی اس پر میکانی کی تصویر ابھری۔ پس منظر میں اس کی آواز آ رہی تھی۔ "اس وقت میں میئر ایڈورڈ کے دفتر میں ہوں اور وہ میرے نشانے پر ہے۔ میرا مطالبہ ہے ٹاؤن کونسل اسکائی اسکریپر منصوبے کو بحال رکھنے کا اعلان کرے اور اس سلسلے میں دو گھنٹے کے اندر قانون سازی کرے کہ اب یہ منصوبہ واپس نہیں لیا جائے گا۔ دوسری صورت میں دو گھنٹے بعد نیویارک شہر اپنے میئر سے محروم ہو جائے گا۔ یہ پلان حتمی ہے۔ وقت نوٹ کر لیا جائے، ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے تک اگر ٹی وی پر یہ اعلان نہیں ہوا تو میئر ایڈورڈ زندہ نہیں رہے گا۔ آفس سے رابطے کی کوشش نہ کی جائے کیونکہ کوئی جواب نہیں دیا جائے گا۔"

"یہ احمقانہ بات ہے۔" میئر ایڈورڈ نے کہا۔ "تمہارا یہ مطالبہ تسلیم نہیں کیا جائے گا۔"

"اس صورت میں وہی ہو گا جو میں کہہ چکا ہوں۔" میکانی نے سرد لہجے میں کہا تو ایک طرف سہمی کھڑی جولیا نے رونا شروع کر دیا۔ میکانی نے بریم کے پاس آ کر اس کا پستول نکال لیا تھا۔ اس نے میئر کو میز سے دور رہنے کا

حکم دیا۔ اسے معلوم تھا کہ میز کی کسی دراز میں کوئی نہ کوئی ہتھیار ہو گا۔ جولیا اور ایڈورڈ دونوں ایک طرف رکھے صوفوں پر بیٹھ گئے۔ میکانی ان کے سامنے ٹہل رہا تھا پھر اس نے جولیا کی طرف دیکھا۔ "تم شادی شدہ ہو؟"

اس نے سر ہلایا۔ "ہاں۔"

"بچے ہیں؟"

"میرے دو بچے ہیں۔ ایک بیٹی ہے جو ہائی اسکول کے آخری سال میں ہے اور دوسرا بیٹا... وہ ساتویں گریڈ میں ہے۔"

"سچ مچ۔" میکانی نے حیرت سے کہا۔ "میں تو سمجھتا ہوں کہ تمہارے بچے ابھی چھوٹے ہوں گے۔ تم تیس بتیس سے زیادہ کی نہیں لگتیں۔"

"میں چالیس سال کی ہو گئی ہوں۔" جولیا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "بارہ سال سے اس آفس میں کام کر رہی ہوں اور مسٹر ایلڈر تیسرے میئر ہیں جن کے ساتھ میں کام کر رہی ہوں۔"

"گڈ! اگر تم چاہتی ہو کہ یہ کام جاری رہے تو مہربانی کر کے ان کھڑکیوں پر بلائنڈ کر دو کیونکہ کچھ دیر میں پولیس اسنائپر یہاں پہنچنے والے ہوں گے۔"

جولیا نے بلائنڈ کھینچ دیے۔ میکانی گھوم کر میئر کی کرسی پر جا بیٹھا۔ اس نے رائفل سامنے میز پر رکھ لی۔ ایک طرف لگی قدیم پنڈولم کلاک میں دس بج کر پینتالیس منٹ ہو رہے تھے۔ جولیا نے بریم ابراہام کی طرف دیکھا اور میکانی سے التجا کی۔ "پلیز اسے دیکھنے دو اگر اس کا خون بہتا رہا تو یہ مر جائے گا۔"

"دیکھ لو لیکن یہاں نہ تو باہر سے کچھ آئے گا اور نہ باہر جائے گا۔"

"واش روم کے کیبنٹ میں مرہم پٹی کا سامان موجود ہے۔" جولیا نے کہا تو میکانی نے اسے اجازت دے دی۔ وہ وہاں سے سامان لے آئی اور بریم کے زخموں سے خون روکنے کی کوشش شروع کر دی۔ وہ نیم غشی میں تھا۔ چھونے سے تکلیف ہوئی تو وہ کراہنے لگا۔ جولیا نے اسے تسلی دی۔ "اٹس او کے... تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

میکانی نے اسے یاد دلایا۔ "بہ شرط کہ ٹاؤن کونسل نے میرا مطالبہ مان لیا۔"

"تم خودکشی مشن پر ہو۔" ایڈورڈ نے اسے آگاہ کیا۔

"میں جانتا ہوں لیکن میں اکیلا نہیں مروں گا۔" میکانی نے جواب دیا۔ جولیا اکیلی یہ کام نہیں کر پا رہی تھی۔ اس نے بے بسی سے میکانی کی طرف دیکھا۔

"پلیز، مجھے مدد کی ضرورت ہے۔"

میکانی نے میئر ایڈورڈ کی طرف دیکھا اور استہزائیہ انداز میں بولا۔ "غالباً تمہیں اس شہر کی خدمت کے لیے یہاں بھیجا گیا ہے مگر تم نے آنے سے پہلے بہت سے لوگوں کا روزگار برباد کر دیا اور ان کو بھی برباد کر دیا۔ بہر حال تمہارے پاس ایک موقع ہے اپنے انتخاب کو درست ثابت کرنے کا۔"

ایڈورڈ آگے آیا۔ اس نے بریم کے زخموں کا جائزہ لیا۔ دو گولیاں اس کی دائیں ران میں اتری تھیں اور دو ہی اس کے بائیں پاؤں میں گھٹنے کے نیچے اور پنڈلی میں لگی تھیں۔ تمام ہی زخموں سے خون روانی سے بہہ رہا تھا۔ ایڈورڈ نے اپنا کوٹ اتارا جو بھاری کپڑے کا تھا۔ اس نے اس کی آستینیں الگ کر کے ان کی گدی بنائی اور بریم کے زخموں پر رکھ کر اوپر سے ٹیپ کس کر باندھ دیا۔ وہ اس کے لیے اتنا ہی کر سکتے تھے۔ مرہم پٹی کا سامان بھی ناکافی تھا۔ دس بجنے میں دو منٹ رہ گئے تھے۔ اب ڈیڑھ گھنٹا باقی رہ گیا تھا۔ میکانی نے پولیس چیف کو شدید زخمی کر کے واضح کر دیا تھا کہ وہ اپنے الفاظ میں مکمل سنجیدہ ہے۔ اگر اس کا مطالبہ پورا نہیں ہوا تو وہ ساڑھے گیارہ بجتے ہی ان سب کو موت کے گھاٹ اتار دے گا۔ میکانی نے ریموٹ لے کر ٹی وی آن کر دیا۔ اس پر یہی خبر چل رہی تھی اور نیوز کاسٹر نے اطلاع دی کہ ٹاؤن کونسل کا ہنگامی اجلاس طلب کر لیا گیا ہے جو اب سے چند منٹ بعد شروع ہونے والا تھا۔

☆☆☆

جان بریڈ کا سر گھوم رہا تھا کیونکہ اس کی شام کی ڈیوٹی تھی اس لیے وہ دیر سے اٹھا تھا اور رات دو بجے تک وہ ایک بار میں تھا۔ کثرتِ مے نوشی نے اسے مدہوش کر دیا تھا۔ اسے نہیں یاد کہ وہ کب گھر آیا تھا۔ جان بریڈ شروع سے آزاد منش انسان تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی شادی ناکام رہی۔ اس کے دوست بھی کم تھے اور دشمن یقیناً بہت زیادہ تھے۔ محکمے میں بھی اسے زیادہ پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ ڈیوٹی کے علاوہ اس کا زیادہ وقت بار میں گزرتا تھا۔ یہ واحد جگہ تھی جہاں اسے خوش آمدید کہا جاتا تھا۔ اس نے اٹھ کر سب سے پہلے کافی تیار کی اور اس کے گھونٹ لیتے ہوئے ٹی وی آن کیا اور اپنی پسند کا نیوز چینل لگایا۔ اس کے پانچ منٹ بعد وہ میئر آفس جا رہا تھا۔ اس نے راستے میں لیفٹیننٹ فلپ سے رابطہ کیا۔ وہ اس کا باس تھا۔ اس کی آواز سن کر اس نے کہا۔ "جان! تم کہاں ہو؟ میکانی اروچی نے کپتان کو شدید زخمی کر

دیا ہے۔"

"میں اسی طرف جارہا ہوں۔"

"میں یہاں پہنچ گیا ہوں۔ شہر کی چوتھائی پولیس یہاں آچکی ہے۔" لیفٹیننٹ فلپ نے کہا۔

"بیکار ہے، اس وقت پوری فوج بھی مل کر کچھ نہیں کر سکتی۔" جان نے کہا۔ "وہاں آکر بتاتا ہوں... میں اس شخص کو اچھی طرح جانتا ہوں۔"

دس بج کر پندرہ منٹ پر وہ میئر آفس کی سفید عمارت کے سامنے تھا۔ وہاں بلاشبہ درجنوں پولیس کاریں موجود تھیں اور سوات کی ٹیم بھی آچکی تھی۔ چاروں طرف پولیس والے تھے۔ آس پاس کی ان تمام عمارتوں پر پولیس اسنائپر پہنچ چکے تھے جہاں سے میئر آفس کی کھڑکیاں ذرا بھی نظر آتی تھیں۔ بریم ابراہام کا نائب اسکاٹ بھی وہاں موجود تھا۔ اس نے ناپسندیدگی سے جان کو دیکھا اور لیفٹیننٹ فلپ سے پوچھا۔ "اسے یہاں کس نے بلایا ہے؟"

"یہ میکائی کے بارے میں کچھ جانتا ہے۔" لیفٹیننٹ فلپ نے آہستہ سے کہا۔ اس نے اشارے سے جان کو آگے بلایا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اسکاٹ کو اس کی یہاں آمد پسند نہیں آئی ہے۔ اس کا بس چلتا تو وہ اسے ایک لمحے کو محکمے میں برداشت نہ کرتا۔ مگر جان کو اس کی پروا نہیں تھی۔ اسکاٹ نے پوچھا۔

"تم میکائی کے بارے میں کیا جانتے ہو؟"

"یہی کہ وہ دائیں بازو کے انتہا پسندانہ خیالات کا حامل ہے۔ اس کے نزدیک تشدد ہر مسئلے کا حتمی حل ہوتا ہے۔ پچھلے دنوں ٹائمز اسکوائر پر اسکائی اسکریپر پروجیکٹ کی منسوخی کے خلاف مظاہرے میں وہ پیش پیش تھا اور اس نے پولیس پر حملے کیے تھے مگر پھر موقع سے فرار ہوگیا۔"

اسکاٹ حیران ہوا۔ "تو کیا اس کی گرفتاری کی کوشش نہیں کی گئی؟"

"یہ تو تمہارا کام ہے۔" جان نے تلخی سے کہا۔ "جب مجھے علم ہے تو تمہیں اس کے بارے میں کیوں نہیں پتا؟"

اسکاٹ کا منہ بگڑ گیا۔ فلپ نے جلدی سے مداخلت کی۔ "فی الوقت ہمیں جو مسئلہ درپیش ہے، اس پر توجہ دی جائے۔"

"میں اسی لیے یہاں آیا ہوں۔" جان نے اس کی طرف دیکھا۔ "یہ شخص مرنے کے ارادے سے یہاں آیا ہے۔"

"تب اس نے مطالبہ کیوں کیا ہے؟" اسکاٹ نے کہا۔

"احمقانہ بات ہے، اس کا مطالبہ اور اس پر یقین کرنا۔" جان نے اکھڑے لہجے میں کہا۔ "ٹاؤن کونسل کسی صورت یہ بات منظور نہیں کرے گی اور اگر وہ کوئی رول پاس کرتی ہے تو اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی۔ یہ تب بھی میئر اور کپتان کو نہیں چھوڑے گا۔"

"وہاں میئر کی سیکریٹری بھی ہے۔" فلپ نے اسے آگاہ کیا۔

"گویا حملہ آور سمیت چار افراد کی جان داؤ پر لگی ہے۔" جان نے کہا۔ "ان میں غیر اہم صرف حملہ آور ہے۔"

"کسی حد تک اس کی سیکریٹری بھی۔" اسکاٹ نے کہا۔

"کیونکہ وہ عام فرد ہے؟" جان کا لہجہ مزید تلخ ہو گیا۔ "لیکن تم فکر مت کرو اگر جولیا ماری گئی تو اس کا مطلب ہے میئر اور کپتان پہلے ہی مرچکے ہوں گے۔"

اسکاٹ کے پاس اسے نظرانداز کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے اپنے ساتھی افسران سے وہیں میٹنگ شروع کردی۔ فلپ کا خیال تھا کہ ٹی وی پر ایک جعلی اعلامیہ چلایا جائے جس میں اسکائی اسکریپر منصوبے کو جاری رکھنے کا بتایا جائے۔

"کم سے کم چار چینل اس وقت ٹاؤن کونسل کے اجلاس کی کوریج کررہے ہیں۔" ایک پولیس افسر نے مطلع کیا۔ "ان کو کسی صورت نہیں روکا جاسکتا۔"

"لعنت ہو۔" اسکاٹ غرایا۔ "ان کو روکا نہیں جاسکتا ہے؟"

جان نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ ناقابلِ ذکر بات کی۔ "ان کو کون روک سکتا ہے؟"

"تم خاموش نہیں رہ سکتے؟" اسکاٹ کا موڈ خراب ہو گیا۔

"اوکے، میں چپ ہوجاتا ہوں۔" جان نے شانے اچکائے۔ اسے معلوم تھا کہ وہ لوگ آپس میں کن تجاویز پر بات کریں گے۔ وہ میکائی سے وقت لینے کی کوشش کریں گے مگر اس نے پہلے ہی بتادیا تھا کہ وہ ساڑھے گیارہ بجتے ہی اپنے ہتھیاروں کا استعمال شروع کردے گا۔ جان وہاں سے ہٹ گیا اس نے اپنی گاڑی سے وھسکی کی چھوٹی سی بوتل نکال کر اس سے ایک گھونٹ لیا۔ وہ ڈیوٹی پر نہیں تھا کچھ دیر بعد فلپ اس کی طرف آیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "تم یہاں پی رہے ہو... چاروں طرف میڈیا موجود ہے اور اس کے کیمرے ہم پر لگے ہیں۔"

"میڈیا جائے جہنم میں..." جان نے بدمزگی سے کہا۔

"ٹھیک ہے لیکن میئر..."

"وہ بھی جہنم میں جائے۔ مجھے بریم کی فکر ہے، وہ زخمی ہے اور اس کی حالت کا کچھ پتا نہیں ہے۔ ہم جتنی دیر کریں گے اس کی زندگی کے امکانات اتنے ہی کم ہوجائیں گے۔ میئر بننے کے لیے دس لوگ آجائیں گے لیکن اس شہر میں کتنے لوگ ہیں جو پولیس چیف بننے کی اہلیت رکھتے ہیں۔"

"میری اطلاع کے مطابق ٹاؤن کونسل نے مطالبہ ماننے سے انکار کردیا ہے۔ اگرچہ ووٹنگ نہیں ہوئی ہے لیکن اکثر اراکین اس کے خلاف بول رہے ہیں۔"

"انہوں نے تو بولنا ہے کیونکہ اس طرح وہ قانون کی پاسداری کرتے ہوئے میئر بننے کی راہ ہموار کرسکتے ہیں۔ اگلا میئر ان میں سے ہی کوئی ہوگا۔"

"میرا مسئلہ ٹاؤن کونسل نہیں، یہاں کی صورتِ حال ہے۔" فلپ نے کہا۔ "کمانڈر تم ہو؟"

"ہاں۔"

"لیکن یہ بھی سر پر موجود ہے۔" جان نے اسکاٹ کی طرف دیکھا جو بظاہر سرگرم تھا لیکن جان جانتا تھا، صورتِ حال اس کے بس کی نہیں تھی۔ وہ شرلاک ہومز ٹائپ کا تنقیدی جاسوس تھا جو ہنگامی صورتِ حال میں بیکار ہوجاتا تھا۔

"اس کی موجودگی سے فرق نہیں پڑے گا۔" فلپ نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "یوں سمجھ لو کہ کام مجھے اور تمہیں کرنا ہے۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں۔" جان نے سر ہلایا۔ "پہلے ذرا جاسوسوں کی رپورٹ لے لیں۔"

وہ خاص آلات سے مزین وین میں آئے۔ میئر آفس پر کئی طرح کے آلات مرکوز کیے جاچکے تھے۔ وہ سارے آلات اپنا ڈیٹا اس وین میں بھیج رہے تھے۔ ایک اسنائپر گن کے ساتھ خاص قسم کی دوربین لگی تھی جو بلائنڈ کے پار دکھانے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اس کے مطابق آفس میں چار افراد تھے، ان میں سے ایک فرش پر دراز تھا۔ دو سامنے دیوار کے ساتھ صوفے پر بیٹھے تھے اور ایک میئر کی میز پر موجود تھا۔ یہ واضح نہیں تھا کہ ان میں سے حملہ آور کون ہے۔ وہ سب خاکوں کی صورت میں دکھائی دے رہے تھے۔ جان نے کہا۔ "تھرمل امیج لیا جارہا ہے؟"

"یہ ادھر موجود ہے۔" ایک آپریٹر نے اپنے سامنے اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔ اس پر رنگوں سے آفس کا منظر دکھایا جارہا تھا مگر آتش دان میں بھڑکتے شعلے منظر کو متاثر کر

ضروری بات

"جرم ثابت ہوگیا۔" جج صاحب نے نظریں جھکا کر گمبھیر آواز میں کہا۔ "وکیلِ استغاثہ کی جرح اور ملزم کے جوابات سے صاف ظاہر ہے کہ ملزم نے تین سال سے اپنی بیوی کو زرخرید کنیز بنا رکھا تھا، وہ ملزم کی مرضی کے بغیر شاید سانس بھی نہیں لے سکتی تھی..."

خوف زدہ ملزم جج کی بات کاٹ کر گھگیایا۔ "عالی جاہ! رحم... میں برا ضرور ہوں مگر اتنا برا نہیں کہ اپنی..."

"خاموش!" جج صاحب نے اپنا چوبی ہتھوڑا میز کی سطح پر مار کر ملزم کو ڈانٹا۔ "عدالت میں غیر ضروری باتیں مت کرو... یہ بتاؤ کہ بیوی کو یوں قابو میں کرنے کے کیا طریقے ہیں؟"

کوٹ ادو سے جمال مصطفی کی برجستگی

رہے تھے۔ جان نے پوچھا۔

"اسے واضح نہیں کیا جاسکتا؟"

"یہ ٹیکنالوجی سی آئی اے اور فوج کے پاس ہے۔" فلپ نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "ہم بے چارے پولیس والے ہیں۔"

"اس طرح تو پتا نہیں چلے گا کہ حملہ آور کون ہے۔ جب تک واضح نہ ہو، ہم اسنائپر سے کام نہیں لے سکتے۔"

فلپ نے میئر کی کرسی پر بیٹھے خاکے کی طرف اشارہ کیا۔ "میرا خیال ہے یہ حملہ آور ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے لیکن کیا اس خیال کی بنیاد پر اسنائپر کو گولی چلانے کی اجازت دی جاسکتی ہے؟"

جان کے اس سوال کا جواب فلپ کے پاس نہیں تھا۔ جان نے وہاں موجود بلٹ پروف جیکٹ اٹھا کر پہنتے ہوئے کہا۔ "ہم یہاں وقت ضائع کررہے ہیں، ہمیں اندر جانا ہوگا۔"

"اس نے وارننگ دی ہے کہ میئر کے آفس کے پاس کوئی نہ آئے۔"

"آلات سے چیک کیا ہے؟ دھماکا خیز مادہ یا کوئی ڈیٹونیٹر لگا ہے؟"

"اندر ماہرین موجود ہیں، وہ چیک کررہے

ہیں۔" فلپ نے کہا۔

"آؤ، ان سے براہِ راست رپورٹ لیتے ہیں۔"

ایک ٹیکنیشن ان کو ریڈیو سیٹ لگا رہا تھا۔ اس نے ائر فون جان کے کان میں لگایا۔ جان نے رائفل لینے سے انکار کر دیا۔ اس کے پاس اس کا پسندیدہ کولٹ پسٹل تھا۔ پوری طرح تیار ہو کر وہ بلڈنگ میں داخل ہوئے جسے عام افراد سے مکمل خالی کرا لیا گیا تھا اور وہاں اب پولیس والے تھے یا سواٹ ٹیم کے ارکان۔ اس وقت پونے گیارہ بج رہے تھے، ان کے پاس کچھ کرنے کو صرف پون گھنٹا رہ گیا تھا۔ میئر آفس سے دس گز کی دوری تک ہر جگہ خالی کرالی گئی تھی۔ یہاں سواٹ ٹیم نے مورچے لگائے ہوئے تھے۔ فلپ نے ان سے رپورٹ لی۔ ماہرین یہاں آلات لگا رہے تھے جن سے میئر آفس کے اندر کی صورتِ حال جاننے کی کوشش کی جا رہی تھی مگر مسئلہ یہ تھا کہ رازداری کے نقطۂ نظر سے آفس کو ساؤنڈ پروف بنایا گیا تھا۔ اس کی دیواریں اتنی موٹی تھیں کہ عام انفراریڈ آلات اندر نہیں دیکھ سکتے تھے۔ جان نے فلپ سے کہا۔

"مجھے اسٹیتھو اسکوپ چاہیے۔"

فلپ حیران ہوا لیکن پھر سمجھ گیا۔ اس نے ایک آدمی کو روانہ کیا اور بولا۔ "اس کے لیے پاس جانا ہوگا اور اس نے خبردار کیا ہے کہ کوئی پاس نہ آئے۔"

جان نے بے پروائی سے شانے ہلائے۔ اس کی آنکھیں سرخ اور چہرہ ستا ہوا ہو رہا تھا لیکن اس کا ذہن پوری طرح کام کر رہا تھا۔ کچھ دیر میں اسٹیتھو اسکوپ آ گیا۔ جان میئر آفس کے دروازے تک آیا اور اس نے اسے کان سے لگا کر اس کا دوسرا حصہ دروازے سے لگا دیا۔

☆☆☆

گیارہ بجنے میں پانچ منٹ رہ گئے تھے۔ وہ تینوں ٹی وی کی طرف متوجہ تھے جس پر ٹاؤن کونسل کے اجلاس کی کارروائی براہِ راست نشر کی جا رہی تھی اور وہاں اراکین میں زبردست ہنگامہ آرائی جاری تھی۔ اکثر اس تجویز کے خلاف تھے۔ میکانی نے کہا۔ "لگتا ہے یہ تمہارے ڈیتھ وارنٹ پر دستخط کرنے کے لیے بے چین ہیں۔"

"یہ ٹھیک کر رہے ہیں۔" ایڈورڈ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "قانون کسی فردِ واحد کے لیے نہیں بنتے، یہ مفادِ عامہ کے لیے ہوتے ہیں۔ اسی لیے اسکائی اسکریپر پروجیکٹ منسوخ کیا جا رہا ہے۔ اس شہر کو مزید بلند عمارتوں کی ضرورت نہیں ہے۔"

میکانی کو غصہ آ گیا۔ "اس سے جو لوگ بے روزگار ہوں گے ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"کوئی بے روزگار نہیں ہوگا۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے، اسکائی اسکریپر کی تعمیر سے سب سے کم ملازمتیں نکلتی ہیں۔ اتنا ہی تعمیراتی میٹریل کہیں اور استعمال ہوتا ہے تو اس سے دگنی ملازمتیں نکلتی ہیں۔ اسکائی اسکریپر میں لیبر کا خرچ تناسب کے لحاظ سے سب سے کم ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ عام کالونیوں کی تعمیر میں ہوتا ہے اور میں نے پہلے ہی طے کر لیا ہے کہ ہمیں نئی کالونیوں کی ضرورت ہے۔ آنے والے چند مہینوں میں روزگار کی صورتِ حال بہتر ہو جائے گی۔"

"تم میئر بن چکے ہو۔" میکانی نے بدمزگی سے کہا۔ "اس لیے تقریر جھاڑنا بند کرو۔"

"تم فیصلہ کر کے آئے ہو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ اس لیے تمہیں کسی وضاحت سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

"نہیں، میں ایمان داری سے کہہ رہا ہوں اگر کونسل نے پروجیکٹ جاری رکھنے کا فیصلہ کیا تو میں خود کو پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ بے شک یہ صرف مجھے دکھانے کے لیے یہ فیصلہ کریں۔"

جولیا نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ "تو کیا تم ہماری زندگیوں سے جوا کھیل رہے ہو؟"

"صرف تمہاری نہیں، میں اپنی زندگی بھی داؤ پر لگا کر آیا ہوں۔"

"کیونکہ تمہارے پاس گنوانے کے لیے زندگی کے سوا کچھ نہیں ہے۔" جولیا نے پھر کہا۔ "تم نے کپتان کو گولی مار کر ثابت کر دیا ہے کہ تم مرنے مارنے کا سوچ کر آئے تھے۔"

"محترم خاتون، اگر تم ایسا سمجھ رہی ہو تو سمجھنے کے لیے آزاد ہو لیکن تم جان سکتی ہو کمانڈ میرے ہاتھ میں ہے۔" میکانی نے میز پر رکھی رائفل کی طرف اشارہ کیا اور پھر میئر ایڈورڈ کو حکم دیا۔ "مسٹر میئر! یہاں آ جاؤ۔"

میکانی نے میز کے دوسری طرف رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ایڈورڈ کے پاس حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میکانی نے جان کی فائل اٹھائی اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ "یہ فائل کس خوشی میں یہاں ہے؟"

"میں نے اس آفیسر کو پولیس سے نکالنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

میکانی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "اسے نکال رہے ہو... لیکن کیوں؟"

"اس کے خلاف بہت ساری شکایات ہیں۔ اس کی فائل خاصی طویل ہو گئی ہے۔"

میکانی فائل دیکھ رہا تھا۔ "نہیں دوست! تم شکایات نہیں صرف شکایت کی بنیاد پر اسے نکال رہے ہو اور یہ شکایت تمہارے دوست پیٹر کرسٹن کی طرف سے ہے۔"

"ایسا نہیں ہے۔" ایڈورڈ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"تمہارا فیصلہ یہی ظاہر کر رہا ہے۔ آج تمہارا پہلا دن ہے اور تم نے بغیر کسی تازہ انکوائری یا اسے صفائی کا موقع دیے بغیر یہ فیصلہ کر لیا۔ ایسا صرف اس صورت میں ممکن ہے جب تم ذہن بنا کر یہاں آئے ہو۔ جیسا کہ تم مجھے کہہ رہے ہو مسٹر میئر کہ میں ذہن بنا کر یہاں آیا ہوں، اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟"

ایڈورڈ سیاست دان تھا جو لاجواب نہیں ہوتے لیکن اس وقت اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میکانی فائل دیکھ رہا تھا۔ اس نے پھر کہا۔ "اس فائل میں جو باتیں اس پولیس افسر کا جرم بنائی گئی ہیں، ان میں سے بیشتر اس کے کارنامے ہیں۔ مسٹر میئر! مجھے حیرت ہے کہ تم ایسے شخص کو پولیس سے نکال رہے ہو۔"

"یہ انتظامی فیصلہ ہے۔"

"یہ غلط فیصلہ ہے۔ جب تم ایک فرد کے بارے میں درست فیصلہ نہیں کر سکتے تو پورے شہر کے بارے میں کیسے درست فیصلے کرو گے؟"

"میرا فیصلہ درست ہے۔" میئر ایڈورڈ کو غصہ آنے لگا مگر وہ اس خطرناک شخص کے سامنے خود پر قابو رکھنا چاہتا تھا جو اب اسے اشتعال دلانے پر تلا ہوا تھا۔ میکانی ذرا آگے جھکا۔

"تم نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اگر پوری پولیس فورس میں تمہیں کوئی شخص اس وقت بچا سکتا ہے تو وہ یہی جان بریڈ ہے۔"

کلاک کی سوئی رفتہ رفتہ ساڑھے گیارہ کی طرف بڑھ رہی تھی اور اب صرف اٹھارہ منٹ رہ گئے تھے۔ ٹاؤن کونسل کے اجلاس سے مخالف اراکین نے واک آؤٹ شروع کر دیا تھا اور ان کی تعداد یقیناً بہت زیادہ تھی کیونکہ کچھ ہی دیر میں بیشتر کرسیاں خالی ہو چکی تھیں۔ میکانی نے اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔ "تم نے دیکھا، انہیں تمہاری زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

ایڈورڈ کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "مسٹر اروچی! میری ایک درخواست ہے۔"

"کہو؟"

"جولیا اور کپتان بریم غیر متعلق لوگ ہیں، انہیں جانے دو۔"

میکانی نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس کمرے میں موجود ہر شخص متعلق ہے۔ مجھے معلوم ہے جولیا بھی اسکائی اسکریپر منصوبے کے مخالفوں میں شامل ہے اور یہ سابق میئر کی خاص مشیر تھی۔ کیوں، کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" جولیا نے سر ہلایا۔ اب وہ خوفزدہ نہیں تھی۔ "لیکن سابق میئر نے میری بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ مسٹر ایلڈر نے یہ منصوبہ ترک کرنے کا اعلان کیا ہے اور مجھے اس کی بہت خوشی ہے۔ میں ان نیویارکرز میں سے ہوں جو مزید اسکائی اسکریپر نہیں چاہتے۔"

"چاہے اس کے لیے مجھ جیسے بے شمار لوگوں کو تباہ ہونا پڑے؟"

"کوئی تباہ نہیں ہوگا سوائے ان کے جو خود تباہ ہوں۔ کیا کام کی کمی ہے؟ کیا تمہاری کمپنی صرف اسکائی اسکریپر سے کمائی تھی؟"

"نہیں... مگر میں اس منصوبے پر انحصار کر رہا تھا۔"

"تب یہ تمہاری نااہلی ہے۔ اگر مجھے آج مسٹر ایلڈر جاب سے نکال دیں تو میں کہیں اور جاب تلاش کروں گی۔"

"بیکار ہے۔" میئر ایڈورڈ نے گھڑی سے نظر ہٹا کر جولیا کی طرف دیکھا۔ "مجھے افسوس ہے۔"

"افسوس کی ضرورت نہیں ہے مسٹر میئر... میں نے بہت اچھی جگہ جاب کی ہے اور میں نے اس کا ہر لمحہ انجوائے کیا ہے۔" جولیا نے حوصلے سے کہا۔ ساڑھے گیارہ بجنے میں سات منٹ رہ گئے تھے۔

☆☆☆

جان اندر ہونے والی گفتگو سن رہا تھا۔ وہ دبے قدموں واپس فلپ کی طرف آیا۔ "میرا اندازہ درست نکلا ہے، وہ جنونی ہے اور اس نے کوئی حفاظتی انتظامات نہیں کیے ہیں۔"

فلپ فکرمند ہو گیا۔ "اس کا مطلب ہے وہ یہاں مرنے کے لیے آیا ہے؟"

"ہاں، ہمیں فوری اندر جانا ہوگا۔ دس منٹ سے بھی کم وقت رہ گیا ہے۔" جان نے گھڑی دیکھی۔

"سواٹ ٹیم..."

"نہیں، وہ بلاسٹ کر کے دروازہ کھولیں گے اور تب اندر جائیں گے۔ اس میں چند سیکنڈ لگ سکتے ہیں۔ ان چند سیکنڈ میں وہ آرام سے سب کو شوٹ کر سکتا ہے۔"

"تب تم کیا کرو گے؟"

"مجھے ایک آدمی چاہیے جو شاٹ گن استعمال کرے گا۔" جان نے کہا۔ "دروازے پر لاک کہاں ہے، اس کی درست لوکیشن چاہیے۔"

فلپ سمجھ رہا تھا کہ وقت کم ہے۔ وہ تیزی سے حرکت میں آیا۔ میٹز آفس کا نقشہ وہاں موجود تھا اور شاٹ گن بھی تھی۔ نقشے میں دروازے پر لاک کی درست جگہ کا تعین کیا گیا۔ اس جگہ نشان لگایا گیا۔ سواٹ ٹیم کا ایک رکن شاٹ گن استعمال کرتا اور دوسرا لات مار کر دروازہ کھولتا۔ اس کے بعد جان اندر جاتا۔ فلپ نے بیک اپ میں سواٹ ٹیم کا کہا لیکن جان نے مسترد کر دیا۔ "وہاں صرف ایک آدمی ہے، اس لیے اندر جتنے کم لوگ جائیں گے میرے لیے اس سے نمٹنا اتنا ہی آسان ہوگا۔"

جب تک وہ تیار ہو کر دروازے کے سامنے آئے، ساڑھے گیارہ بجنے میں چار منٹ رہ گئے تھے۔ جان نے اشارہ کیا اور شاٹ گن والے نے دروازے کے لاک پر فائر کیا اور دوسرے تنومند آدمی نے پوری قوت سے لات ماری۔ دروازہ کھل گیا۔ جان ذرا پیچھے تھا، وہ بھاگتا ہوا آیا اور اس نے چھلانگ لگائی۔ اندر قالین پر گرتے ہوئے اس نے میکائی کو دیکھ لیا تھا جو رائفل اٹھا کر اس کا رخ میٹز کی طرف کر رہا تھا۔ جان کا ہاتھ سامنے تھا۔ اس نے پسٹل سے مسلسل فائر کیے اور اس دوران میں اس کا جسم مسلسل حرکت میں رہا مگر گولیاں نشانے پر لگیں۔ میکائی جھٹکا کھا کر پیچھے گیا اور اس کی رائفل سے برسٹ چلا لیکن گولیاں اوپر گئی تھیں۔ اس دوران میں میٹز اور جولیا دونوں نیچے گر چکے تھے۔ جان قلابازی کھا کر اٹھا اور میز پر سے ہوتا ہوا میکائی پر گرا جو اٹھ رہا تھا۔ اس نے رائفل کا رخ جان کی طرف کرنا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی وہ اس پر گر چکا تھا اور اس نے گرتے ہی پسٹل اس کے جسم پر رکھ کر لگاتار کئی فائر کیے۔ میکائی کو جھٹکا لگا اور رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اس نے اپنا پستول نکالنے کی کوشش کی لیکن جان کے اوپر ہونے کی وجہ سے وہ کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی تو ہونٹوں سے خون پھوٹ نکلا۔ وہ بڑی مشکل سے بولا۔

"میں نے میٹز... سے کہا تھا... اسے کوئی... بچا سکتا ہے... تو وہ تم ہو۔"

جان نے اٹھتے ہوئے اس کا پستول نکال لیا تھا۔ "اس اعتماد کا شکریہ۔" وہ کہتے ہوئے تیزی سے کپتان بریم کی طرف آیا۔ وہ ہوش میں تھا۔ جان نے اس سے پوچھا۔ "تم ٹھیک ہو؟"

بریم نے مشکل سے سر ہلایا اور سرگوشی میں بولا۔ "ویل ڈن آفیسر۔"

ایک منٹ سے پہلے کمرے میں ایک درجن سے زیادہ افراد گھس آئے تھے۔ لیفٹیننٹ فلپ نے میٹز اور جولیا کو بہ خیریت پا کر سکون کا سانس لیا۔ پیرامیڈک آ گئے تھے اور بریم کو اسپتال لے جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ میکائی قریب المرگ تھا۔ وہ جان لینے اور دینے کے ارادے سے آیا تھا۔ کم سے کم دوسرے مقصد میں وہ کامیاب رہا تھا۔

کپتان بریم کو لے جائے جانے کے بعد جان بھی وہاں سے جانے لگا تو جولیا آگے آئی۔ اس نے گرم جوشی سے اس سے ہاتھ ملایا۔ "تھینک یو آفیسر! تم نے ہمیں بچایا۔"

"یہ میرا فرض تھا۔" اس نے نرمی سے کہا۔

میٹز ایڈورڈ اب تک خاموش تھا وہ بھی آگے آیا۔ اس نے جان کا شانہ تھپکا۔ "آفیسر! تم نے بہترین کام کیا ہے۔"

"شکریہ۔" اس بار جان کا لہجہ خشک تھا اور وہ مزید کچھ کہے بغیر وہاں سے چلا گیا۔ میٹز ایڈورڈ نے کھسیا کر لیفٹیننٹ فلپ کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

"بدتمیز آدمی ہے۔"

"ہاں لیکن کام کا آدمی بھی ہے۔" فلپ نے کہا۔ "اس وقت اس نے جو کیا، یہ صرف وہی کر سکتا تھا۔"

میٹز ایڈورڈ جانتا تھا۔ جان جس طرح جان کی پروا کیے بغیر میکائی پر کودا تھا، یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ اگر جان ایسا نہ کرتا تو زخمی ہونے کے باوجود وہ انہیں نشانہ بنا سکتا تھا۔ ایڈورڈ جولیا کے ساتھ دوسرے کمرے میں آ گیا اور فی الحال اس کا آفس پولیس کی تحویل میں چلا گیا۔ تنہائی میسر آتے ہی جولیا نے لفافہ میٹز کی طرف بڑھایا۔ "سر! یہ... اس کا کیا کرنا ہے؟"

میٹز ایڈورڈ نے لفافہ لے کر ایک لمحے کو سوچا پھر اسے پھاڑ کر ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔ "میرا خیال ہے کہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ پولیس کے محکمے کو جان بریڈ کی ضرورت ہے۔"

جولیا مسکرانے لگی، یقیناً اس کی بھی یہی خواہش تھی۔

◆◆◆

محبت و وصل کے لمحے رائگاں چلے جاتے ہیں... اگر راستے جدا ہو جائیں... کسی کو چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش ہر ایک دل میں بسی ہوتی ہے... کسی خوش بخت کی یہ تمنا پوری بھی ہو جاتی ہے... اور کسی سیاہ بخت کے نصیب میں ہمیشہ کے لیے تنہائی بسیرا کر لیتی ہے... محبت کی خاطر زندگی تیاگ دینے والوں کا فسانۂ عبرت...

محبت... رقابت... اور حاسدانہ جذبات کی رسہ کشی کا فسانہ

سیریناراض

محبت کی خاطر

وہ لاش دو درختوں کے درمیان پڑی ہوئی تھی جو ڈوئل کے لیے مخصوص تھے۔ سراغ رساں جیکس ڈگلس اپنی کار سے اترا اور دھند میں لپٹے ہوئے درختوں کے درمیان سے گزرتا ہوا لاش کی طرف بڑھا۔ اس نے لاش کے قریب کھڑے ہوئے باوردی سپاہی کو اپنا بیج دکھایا تو اس نے سر ہلا کر اسے آگے جانے کی اجازت دے دی۔ ایک درخت کے نیچے لمبے قد کا شخص کھڑا ہوا تھا جبکہ دوسرے درخت کے نیچے بغیر آستین کی قمیص پہنے ہوئے ایک مرد اور گہرے

رنگ کے سوٹ میں ملبوس ایک عورت نظر آ رہی تھی۔

لاش کے قریب پہنچ کر ڈگلس نے اس کے کلین شیو چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہ زمین پر کمر کے بل لیٹا ہوا تھا۔ اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی۔ اس کا قد چھ فٹ اور بال سیاہ تھے۔ اس نے سفید قمیص اور سیاہ پتلون پہن رکھی تھی۔ اس کی قمیص یا جسم کے کھلے حصوں پر کوئی نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ ڈگلس نے اس کی نبض ٹٹولی جو ساکت تھی اور دل کی دھڑکن بند ہو چکی تھی۔

قدموں کی آواز سن کر ڈگلس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ عورت اس کے قریب آ چکی تھی۔ اس نے اپنے سر سے اسکارف اتارا اور ایک ادا سے اپنے لمبے سنہری بالوں کو پیچھے کی جانب جھٹک کر ڈگلس کو دیکھنے لگی۔ اس کی روشن نیلی آنکھوں میں بڑی کشش تھی۔ جیسے ہی ڈگلس اپنی جگہ سے اٹھا، اس نے اپنا ہاتھ مصافحہ کے لیے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میرا نام ایما الزبتھ ہے اور میں ''گزٹ'' کے لیے کام کرتی ہوں۔''

''تم رپورٹر ہو؟'' ڈگلس نے پوچھا۔

وہ اس کے قریب ہوتے ہوئے بولی۔ ''دراصل میں لوگوں کے خطوط کے جواب دیتی ہوں لیکن کوئی اخباری نمائندہ موجود نہیں ہے لہٰذا میرے لیے یہ ایک خاص خبر ہو گی۔ تمہیں میری یہاں موجودگی پر کوئی اعتراض تو نہیں؟''

''نہیں۔'' اس نے عورت کے لباس سے پھوٹتی پرفیوم کی مہک کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ''تم یہاں کیسے آ گئیں؟''

ایما نے لمبے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اسے پارک سے نکلتے ہوئے دیکھا۔ وہ دوڑتا ہوا سائمس کافی ہاؤس تک گیا اور اس پولیس والے کو ساتھ لے کر یہاں آیا۔ میں بھی ان دونوں کے پیچھے چلی آئی۔ پھر میں نے یہاں یہ لاش دیکھی۔''

ڈگلس نے جیب سے نوٹ بک اور پنسل نکالی اور پولیس والے کو اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ آفیسر جیو مرفی اس سے قد میں دو انچ چھوٹا تھا لیکن اس کا جسم بھاری اور عمر بھی ڈگلس سے زیادہ تھی۔ چھبیس سالہ ڈگلس، نیو اورلینز پولیس میں سب سے کم عمر سراغ رساں تھا۔ اس کا قد چھ فٹ اور وزن ایک سو اسی پاؤنڈ تھا۔ گہری بادامی آنکھوں اور گھنے سیاہ بالوں نے اس کی شخصیت کو صنفِ نازک کے لیے مزید پُرکشش بنا دیا تھا۔ مرفی نے اس کے قریب آ کر کہا۔ ''بظاہر تو یہی لگتا ہے کہ یہ ڈوئل کے دوران مارا گیا۔''

''کس ہتھیار سے؟'' ڈگلس کو وہاں کوئی کارتوس یا ریوالور نظر نہیں آیا اور نہ ہی اس نے فضا میں بارود کی بو محسوس کی۔

''یہ گھونسے کی ضرب سے ہلاک ہوا ہے۔'' یہ کہہ کر مرفی نے چھوٹے قد کے آدمی کی طرف اشارہ کیا جو ایما کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ ''اس کا کہنا ہے کہ اس نے مرنے والے کو صرف ایک ہی گھونسا مارا تھا۔''

ڈگلس کو یہ بات ہضم نہیں ہوئی لیکن اس نے مزید کریدنے کے بجائے پوچھا۔ ''اور وہ تیسرا شخص کون ہے؟''

''وہ ایک ڈاکٹر ہے اور اس کا کہنا ہے کہ وہ ان دونوں کو جانتا ہے۔''

ڈگلس اس ڈاکٹر کی جانب بڑھا۔ اس نے اپنا تعارف بنجمن ایڈمز سے کروایا۔

''میں نے اس کا معائنہ کیا ہے، یہ مر چکا ہے۔'' ڈاکٹر کی عمر ساٹھ سے زیادہ تھی۔ کندھے جھک گئے تھے اور چہرے پر بھی جھریاں نظر آ رہی تھیں۔ ''مرنے والے کا نام ایڈورڈ ہینٹر ہے۔ یہ کافی دولت مند شخص ہے اور اس کے ایک درجن کے قریب جہاز چلتے ہیں۔''

''اور یہ دوسرا شخص کون ہے؟''

''اس کا نام الفریڈ ٹارسٹن ہے۔ معمولی حیثیت کا آدمی ہے۔ بظاہر ان دونوں کا کوئی جوڑ نہیں پھر یہ ڈوئل پر کیسے آمادہ ہو گئے۔''

ڈاکٹر ایڈمز نے تصدیق کی کہ ان دونوں کے درمیان گھونسے بازی ہوئی تھی۔ الفریڈ نے صرف ایک ہی مکا مارا تھا جو ہینٹر کے جبڑے پر لگا۔ وہ سیدھا زمین پر گرا اور بے حس و حرکت ہو گیا۔

ڈگلس نے اپنی نوٹ بک پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''کیا لڑائی سے پہلے اس کی جسمانی صحت ٹھیک تھی؟''

''مجھے وہ ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر سختی تھی اور وہ تکلیف میں نظر آ رہا تھا۔''

''لڑائی کی وجہ کیا تھی؟''

''اس کی وجہ الفریڈ کی محبوبہ مس روگن ہے۔'' ڈاکٹر اس کے قریب ہوتے ہوئے بولا۔ ''وہ بھی مسٹر ہینٹر پر فریفتہ تھی۔''

ڈگلس نے سر ہلایا اور الفریڈ ٹارسٹن کی جانب بڑھا جو اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے کھڑا تھا۔ ایما بھی اپنی نوٹ بک سنبھالے اس کے پیچھے چل دی۔ ٹارسٹن کا قد پانچ فٹ آٹھ انچ اور بال سیاہ تھے۔ اس نے اپنی عمر بائیس سال بتائی اور کہا کہ وہ جیراڈ اسٹریٹ پر رہتا ہے۔ ڈگلس نے اس سے پوچھا کہ اصل قصہ کیا تھا۔

''یہ میری عزت کا سوال تھا اسی لیے میں نے کسی ہتھیار کے بجائے مکے بازی کے ذریعے ڈوئل لڑنے کا چیلنج دیا۔ میں نے اسے صرف ایک ہی گھونسا مارا تھا کہ وہ زمین پر گر گیا۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ اس طرح مر سکتا ہے۔ شاید یہ حکمِ خداوندی تھا۔''

''لڑائی کی وجہ کیا تھی؟''

''اس نے میری محبوبہ ڈیانا روگن کو جنسی طور پر ہراساں کرنے کی کوشش کی تھی جب وہ بہت کم عمر اور ناسمجھ تھی۔ وہ اپنی دولت کے بل بوتے پر اس کی معصومیت سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہ رہا تھا۔''

ڈگلس چلتا ہوا اس ٹیکسی تک گیا جس میں وہ یہاں آیا تھا۔ اس نے ڈرائیور کو ایک رقعہ دیا اور کہا کہ وہ یہ خط لے کر سیدھا پولیس اسٹیشن جائے۔ پھر اس نے اشارے سے مرفی کو اپنے پاس بلایا اور اسے ٹارسٹن کے پاس ہی کھڑے ہونے کی ہدایت کی کہ کہیں وہ اِدھر اُدھر نہ ہو جائے۔

''کیا وہ زیرِ حراست ہے؟'' مرفی نے آہستہ سے پوچھا۔

''ہاں جیسے ہی پولیس کی گاڑی آئے گی، ہم اسے گرفتار کر لیں گے۔''

مرفی کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ اس جانب چل دیا جہاں ٹارسٹن اور ایما کھڑے ہوئے تھے۔ ڈگلس نے محسوس کیا کہ وہ دونوں دوستانہ انداز میں گفتگو کر رہے تھے۔ شاید اس طرح ایما اپنی اسٹوری کے لیے اس سے کچھ معلوم کرنا چاہ رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد درختوں کے درمیان سے ایک ایمبولینس نمودار ہوئی اور لاش کے قریب آ کر رک گئی۔ ڈاکٹر ایڈمز نے بتایا کہ اس نے یہ ایمبولینس چیریٹی اسپتال سے منگوائی ہے۔

''میں لاش کے ساتھ مردہ خانے تک جانا چاہتا ہوں، اگر تم اجازت دو۔''

ڈگلس نے لاش کی تلاشی لی۔ اس کی جیب سے ایک پرس ملا جس میں پچپن ڈالرز تھے اور اس کے ہاتھ پر قیمتی سنہری گھڑی بندھی ہوئی تھی۔ ڈگلس نے دونوں چیزیں ڈاکٹر کے حوالے کر دیں۔ ایما بھی ان کے پاس آ گئی۔

''کیا ٹارسٹن نے تمہیں کوئی اور بات بتائی؟'' ڈگلس نے ایما سے پوچھا۔

''نہیں، وہ سمجھتا ہے کہ تم اسے گھیرنے کی کوشش کر رہے ہو جو ڈوئل کے قوانین کے خلاف ہے۔ اس کے خیال میں یہ ایک مضحکہ خیز بات ہے کیونکہ جیوری کسی شخص کو محض گھونسا مارنے پر مجرم قرار نہیں دے سکتی۔''

ایمبولینس کے جانے کے بعد ڈگلس نے ڈاکٹر سے ٹارسٹن کا ہیٹ اور کوٹ لیا اور اس سے پوچھا۔

''تم نے اس ڈوئل کے لیے مسٹر ہینٹر کو کب چیلنج کیا تھا؟''

''ایک ہفتے پہلے..... لیکن وہ مجھ سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔''

''چیلنج قبول کرنے کے بعد اس نے کسی ہتھیار کا انتخاب کیا؟''

''ہاں، وہ جانتا تھا کہ مجھے چاقو اور آتشیں اسلحے کے استعمال میں مہارت حاصل ہے۔ اس لیے اس نے گھونسے بازی کو ترجیح دی۔''

ڈگلس نے اس سے کچھ اور سوالات پوچھے اور تصدیق کر لی کہ وہ جیراڈ اسٹریٹ پر رہتا ہے۔ اس کی محبوبہ ڈیانا روگن کی رہائش کونسٹینس اسٹریٹ پر ہے اور وہ خود ایک میری ٹائم لاء فرم میں کلرک ہے۔ جیسے ہی پولیس کی گاڑی وہاں پہنچی، ڈگلس نے اسے درختوں کی جانب منہ کرنے کا حکم دیا اور اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی۔ ٹارسٹن حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ''کیا میں زیرِ حراست ہوں؟''

''ہاں۔'' ڈگلس اسے پولیس کی گاڑی کی طرف لے جاتے ہوئے بولا۔ اس کے آگے مرفی اور پیچھے ایما چل رہی تھی۔

''میرا جرم کیا ہے؟'' ٹارسٹن نے پوچھا۔ ''کیا میں نے ڈوئل کے قانون کی خلاف ورزی کی ہے؟''

''نہیں، غیر ارادی قتل کے الزام میں۔''

ٹارسٹن نے لمبی سانس بھری۔ ڈگلس اسے گاڑی میں بٹھاتے ہوئے بولا۔ ''اگر ڈسٹرکٹ اٹارنی نے یہ محسوس کیا کہ تم نے مرنے والے کو ایک منصوبے کے تحت ڈوئل لڑنے کا چیلنج دیا تھا تو تم پر قتلِ عمد کا الزام بھی عائد کیا جا سکتا ہے۔''

ایما نے ڈگلس سے کہا کہ کیا وہ اسے لفٹ دے سکتا ہے کیونکہ اس کے اخبار کا دفتر پولیس اسٹیشن کے راستے میں ہی ہے۔ ڈگلس نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور وہ لپک کر گاڑی میں سوار ہو گئی۔ راستے میں ایما نے اپنی نوٹ بک کھولی اور نوٹس پر نظر ڈالتے ہوئے بولی۔ ''اس پر غیر ارادی قتل کا الزام کیوں لگایا گیا ہے؟''

''یہ الزام اس شخص پر لگایا جاتا ہے جو لڑائی کے دوران کسی کو مارے اور یہ قتل ہمیشہ جوش کے عالم میں ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ ٹارسٹن کے جذبات شدید ہوں لیکن چیلنج دینے کے ایک ہفتے بعد اس کا جوش سرد پڑ جانا چاہیے تھا اور

اگر ڈسٹرکٹ اٹارنی نے یہ محسوس کیا کہ یہ چیلنج کسی منصوبہ بندی کے تحت کیا گیا تھا تو وہ اس پر قتل کا الزام عائد کرسکتا ہے۔"

"اور اگر اس نے اپنے دفاع میں حملہ کرنے کا دعویٰ کیا تو......" ایما بولی۔ "کیونکہ دونوں ہی لڑ رہے تھے۔"

"مقامی قانون کے تحت پہل کرنے والا اپنے دفاع کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔" ڈگلس نے کہا۔ "تاریسٹن نے اسے ڈوئل کا چیلنج دیا اور پہلا گھونسا بھی اسی نے مارا۔ اسے ہی حملہ آور قرار دیا جائے گا۔"

ڈگلس نے جان بوجھ کر بلند آواز میں کہا تاکہ پیچھے بیٹھا ہوا تاریسٹن بھی یہ سن لے۔ اس طرح پولیس اسٹیشن پہنچنے کے بعد اس سے مزید سوال جواب کرنے میں آسانی رہتی۔ اس کے بعد ایما نے کوئی بات نہیں کی اور خاموشی سے اپنے نوٹ پڑھتی رہی۔ اس کا یہ انداز دیکھ کر ڈگلس کو شک گزرا کہ کیا واقعی یہ عورت اخبار کے دفتر میں کام کرتی ہے، اخبار والے اپنی لکھی ہوئی تحریر کو بار بار نہیں پڑھتے۔ اخبار کا دفتر آیا تو اس نے ڈگلس کا شکریہ ادا کیا اور الوداعی انداز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے گاڑی سے اتر گئی۔

پولیس اسٹیشن پہنچ کر الفریڈ تاریسٹن نے اقبالی بیان پر دستخط کرنے سے انکار کردیا اور نہ ہی مزید سوالات کے جواب دیے لہٰذا ڈگلس نے اسے حوالات میں بند کردیا۔ وہ اپنے دفتر واپس آیا تو ایک نوجوان عورت اس کا انتظار کررہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی وہ بولی۔

"کیا تم انسپکٹر ڈگلس ہو؟"

"سراغ رساں ڈگلس۔" اس نے تصحیح کی۔

"میرا نام ڈیانا روگن ہے۔"

وہ اسے اپنے کمرے میں لے گیا اور اپنے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "میں تمہاری کیا خدمت کرسکتا ہوں مادام؟"

اس کے چہرے پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ پھیل گئی اور بولی۔ "میں ابھی صرف بائیس سال کی ہوں۔ میرے لیے مادام کا لفظ کچھ اچھا نہیں لگتا۔" پھر اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"کیا الفریڈ تاریسٹن زیرِ حراست ہے؟"

ڈگلس نے اسے تمام حالات اور الفریڈ پر عائد الزام کے بارے میں بتایا تو وہ جھجکتے ہوئے بولی۔

"میرا ایک مسئلہ ہے۔ کیا میں تم پر بھروسا کرسکتی ہوں؟"

ڈگلس نے آہستہ سے سر ہلا دیا۔

وہ تھوڑی دیر اپنا نچلا ہونٹ کاٹتی رہی پھر اس نے چاروں طرف دیکھا۔ وہاں ان دونوں کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ وہ آہستہ سے بولی۔ "میں اپنے کچھ خطوط واپس لینا چاہتی ہوں۔"

"الفریڈ سے؟"

ڈیانا کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ بولی۔ "نہیں۔ ایڈورڈ بینٹر سے۔ وہ خط میں نے اسے اس وقت لکھے تھے جب میں سمجھ رہی تھی کہ اس سے محبت کرتی ہوں۔"

"کیا اسی وجہ سے تاریسٹن نے بینٹر کو ڈوئل کے لیے چیلنج کیا تھا؟"

"نہیں...... الفریڈ ان خطوط کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور میں نہیں چاہتی کہ وہ کبھی انہیں دیکھے۔"

ڈگلس نے اسے غور سے دیکھا اور بولا۔ "الفریڈ نے مجھے بتایا ہے کہ یہ عزت کا معاملہ تھا۔ بینٹر نے تمہاری کم عمری کا ناجائز فائدہ اٹھایا۔"

ڈیانا نے نفی میں سر ہلایا اور ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولی۔ "میری کوئی عزت نہیں۔ البتہ الفریڈ نے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ بینٹر کے علاوہ بھی دوسرے مردوں نے مجھ سے فائدہ اٹھایا۔" اس نے اپنا منہ پھیر لیا اور کھڑکی کی جانب دیکھنے لگی۔

"اب تم کیا چاہتی ہو؟" ڈگلس نے کہا۔

"کیا تم مجھے وہ خطوط لا کر دے سکتے ہو؟"

"میں تمہیں وہ خطوط دینے کا وعدہ نہیں کرتا لیکن اس کے گھر سے ضرور لے آؤں گا۔ ممکن ہے کہ ڈسٹرکٹ اٹارنی انہیں ثبوت کے طور پر عدالت میں پیش کرے۔"

یہ سن کر لڑکی کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ ڈگلس اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔ "کیا تمہارے اطمینان کے لیے اتنا کافی نہیں ہے کہ اس طرح پریس کے لوگوں کو ان خطوط کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہوسکے گا؟"

"لیکن جب وہ خطوط عدالت میں پیش کیے جائیں گے تو سب کو معلوم ہوجائے گا۔" ڈیانا گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"ہوسکتا ہے کہ اس کی ضرورت پیش نہ آئے۔ تم نے اچھا کیا کہ میرے پاس آگئیں ورنہ اگر وہ خطوط بینٹر کے گھر والوں کے ہاتھ لگ گئے تو وہ انہیں ضرور پریس کو دے دیں گے۔"

ڈیانا نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "کیا وہ خطوط

ڈسٹرکٹ اٹارنی کو دینا ضروری ہیں؟"

"ان خطوط کو پڑھے بغیر میں کچھ نہیں کہہ سکتا...... اگر ان کا اس معاملے سے کوئی تعلق نظر آیا تو مجبوری ہے۔"

☆☆☆

ایڈورڈ بینٹر، کارلٹن ایونیو پر واقع ایک دو منزلہ مکان میں رہتا تھا۔ ڈگلس نے کال بیل بجائی تو ہاؤس کیپر نے دروازہ کھولا اور اسے اندر لے گئی۔ اس کی عمر ساٹھ سال سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ ڈگلس نے اس سے پوچھا کہ کیا اسے بینٹر کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کے بارے میں علم ہے تو اس نے بتایا کہ مرفی یہ اطلاع دینے آیا تھا۔ پھر وہ ڈگلس کو لیونگ روم میں لے گئی اور ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "تم کیا پینا پسند کرو گے؟"

"کچھ نہیں۔" اسے کمرے میں ایک عجیب سی مہک کا احساس ہوا۔ "کیا مسٹر بینٹر کے خاندان کا کوئی فرد پہنچا ہے؟"

"اس کا ایک بھتیجا ہی واحد وارث ہے جو الینوس میں رہتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنا حصہ لینے کے لیے ضرور آئے گا۔"

ڈگلس نے کہا کہ وہ ایک نظر مکان کو دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ عورت چونکتے ہوئے بولی۔ "کیا تمہیں کسی خاص چیز کی تلاش ہے؟"

"شاید تم کوئی مدد کرسکو۔ یہ بتاؤ کہ مسٹر بینٹر اپنے کاغذات کہاں رکھا کرتے تھے؟"

اینا نے ایک بار پھر اسے غور سے دیکھا اور پہلی منزل پر واقع بینٹر کے دفتر میں لے گئی جس کی دو دیواروں میں ریک لگے ہوئے تھے اور ان میں فرش سے لے کر چھت تک کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ کمرے کے وسط میں ایک بڑی سی میز پر بہت سی فائلیں اور رجسٹر ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ اینا کافی بنانے چلی گئی۔ ڈگلس نے جلدی جلدی میز کی درازیں دیکھیں لیکن وہ خطوط نہیں ملے۔ پھر اس نے کتابوں کے ریک کی تلاشی لی تو اسے سب سے نچلے خانے میں ایک سبز رنگ کا بکس نظر آیا جس میں ایک درجن کے قریب خطوط ربن سے باندھ کر رکھے گئے تھے۔ ڈگلس نے ان خطوط پر لگی ہوئی مہریں دیکھیں، وہ سب اگست اور نومبر 1888ء کے دوران لکھے گئے تھے۔ اس وقت ڈیانا کی عمر انیس سال ہوگی۔ اس نے وہ خطوط اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھے اور بکس کو واپس اپنی جگہ پر رکھ دیا۔ اینا کافی بنا کر لائی تو ڈگلس نے پوچھا۔

"تم اس ڈوئل کے بارے میں کیا جانتی ہو؟"

"میں اس شخص کو نہیں جانتی جس نے مسٹر بینٹر کو قتل کیا ہے۔ ویسے بھی میں ہفتے میں صرف چار دن یہاں آتی ہوں۔"

"تمہیں یہاں کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوگیا؟"

"گیارہ سال اور کچھ مہینے۔"

"پھر تو تم ڈیانا کو بھی جانتی ہوگی۔"

اینا نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ڈگلس نے اس کا حلیہ بیان کیا تو اینا بولی کہ اس نے کبھی اس لڑکی کو نہیں دیکھا اور نہ ہی اس کے بارے میں کچھ سنا۔

☆☆☆

ڈگلس نے اپنے دفتر میں ان خطوط کو پڑھا۔ ان میں سوائے محبت کے اور کوئی خاص بات نہیں تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ یہ کسی ناپختہ ذہن کی جذباتی تحریر ہے جس میں جگہ جگہ اشعار کا سہارا لیا گیا تھا۔ ڈیانا نے کم از کم چھ خطوط کا آغاز ایک ہی جیسے جملوں سے کیا تھا اور ہر خط کا اختتام ان جملوں پر ہوا تھا۔ "تم پر لازم ہے کہ مجھ سے محبت کرو۔ خواہ اس کا انجام کچھ بھی ہو لیکن میری محبت کی خاطر......" ان خطوط سے جسمانی تعلق کا اشارہ تو ضرور ملتا تھا لیکن ان میں ایسی کوئی بات نہ تھی جو کسی کو متاثر کرسکے۔ البتہ اگر یہ خطوط پریس کے ہاتھ لگ جاتے تو ان میں دیے گئے اشاروں کی بنیاد پر ایک ہنگامہ خیز جنسی اسکینڈل بن جاتا۔ ڈگلس نے ان خطوط کو ربن سے باندھا اور اپنی میز کی نچلی دراز میں رکھ کر اسے لاک کردیا۔ اسے سگار بکس میں ایک پانچ ڈالر کا نوٹ نظر آیا تو اسے وہ عورت یاد آگئی جس نے یہ نوٹ یادگار کے طور پر رکھنے کے لیے کہا تھا۔ اس کا نام میری کینن تھا۔ اس کے سوگوار حسن نے ڈگلس کو اس کی جانب متوجہ ہونے پر مجبور کردیا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ کیا وہ اب بھی مسی سپی میں ہوگی۔ اس کی ماں کو کسی گوریلے نے قتل کردیا تھا اور ڈگلس اسی کیس کی تحقیقات کے لیے وہاں گیا تھا۔ اس نے وہ نوٹ واپس سگار بکس میں رکھ دیا اور سوچنے لگا کہ کیا کبھی میری نے بھی اسے یاد کیا ہوگا۔

دوسرے دن اس نے مختلف اخبارات میں ایڈورڈ بینٹر کی موت کی خبر پڑھی۔ گزٹ میں یہ خبر ایما کے نام سے شائع ہوئی تھی جس میں دوسرے اخبارات کے مقابلے میں تفصیل کے ساتھ واقعے کو بیان کیا گیا تھا۔ اس نے ڈوئل کی وجہ ضرور بتائی لیکن ڈیانا کا ذکر نہیں کیا۔ ڈگلس نے کافی ختم کی اور دفتر کی طرف روانہ ہوگیا۔ اسے اپنی رپورٹ مکمل

کرتی تھی۔ ڈگلس کا خیال تھا کہ وہ ذاتی طور پر گزٹ کے دفتر جا کر ایما کی ستائش کرے گا... اگر اس کے پاس وقت ہوا تو اسے لنچ کی دعوت بھی دے گا۔

ایما بخوشی اس کے ساتھ لنچ پر چلنے کے لیے تیار ہو گئی۔ انہوں نے کنال اسٹریٹ پر واقع ایس اولیسٹر ہاؤس کو منتخب کیا۔ ڈگلس نے اس کے آرٹیکل کی تعریف کی تو وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"تم پہلے شخص ہو جس نے میری اسٹوری کی تعریف کی ہے، ورنہ دفتر کے ساتھیوں نے تو اسے کوئی اہمیت ہی نہیں دی۔"

جب وہ ریستوران سے باہر آنے لگے تو وہاں موجود کئی لوگ ایما کو تعریفی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ گو کہ وہ میری گین یا ڈیانا جیسی خوب صورت نہیں تھی لیکن اس کا رکھ رکھاؤ، سلیقہ اور اعتماد اسے دوسری عورتوں سے ممتاز کرتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ مرد اس کی جانب دیکھنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ دفتر کے دروازے پر پہنچ کر وہ دروازے پر ہی رک گیا۔ ایما نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کے گالوں کا بوسہ لیتے ہوئے بولی۔ "تمہیں ڈنر کی دعوت دینا چاہتی تھی۔" یہ کہتے ہوئے اس کی نیلی آنکھوں میں ایک شوخ چمک ابھر آئی۔

"ہفتے کی شام کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "یقیناً میں تمہارے ساتھ جانا پسند کروں گی۔ میرا خیال ہے کہ آٹھ بجے کا وقت مناسب رہے گا۔"

ایما نے اسے اپنے گھر کا پتا سمجھا دیا۔ وہ بیناری روڈ پر رہتی تھی جو بینٹر کے گھر سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے معلوم ہوا کہ گھونسا لگنے سے موت واقع نہیں ہوئی تھی۔ پوسٹ مارٹم کرنے والا ڈاکٹر جونز ریٹائرڈ نیول سرجن تھا جس نے ڈگلس کو بتایا۔ "اس کے جسم میں زہر کی کافی مقدار پائی گئی جو اسے مارنے کے لیے کافی تھی۔ موت سے ایک گھنٹا پہلے ہی وہ ناکارہ ہو چکا تھا اور یقیناً ڈوئل کے لیے جاتے وقت شدید اذیت میں مبتلا ہو گا یا اپنی انا کی خاطر ڈوئل لڑنے چلا گیا ہو گا۔"

"ہاں، دونوں میں سے کوئی بھی انکار کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔" ڈگلس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"مجھے اس کے جسم پر کوئی نیل یا سیاہ دھبا نظر نہیں آیا لیکن جسم کے اندر زہر کی موجودگی کا انکشاف ہوا ہے۔"

"کیا؟" ڈگلس نے پوچھا۔ "یہ کس قسم کا زہر ہے؟"

ڈاکٹر مسکراتے ہوئے بولا۔ "چوہے مار دوا حاصل کرنے کا سب سے آسان ذریعہ جو کسی بھی دکان سے خریدی جا سکتی ہے۔ اس کی تھوڑی سی مقدار کافی یا چائے میں ملا دی جائے تو کسی دوسرے زہر کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔"

"کیا اس میں سے زہر آسانی سے الگ کیا جا سکتا ہے؟"

"ہاں اگر اسے ابالا جائے تو زہر بھاری ہونے کی وجہ سے تہ میں بیٹھ جائے گا، البتہ اس عمل میں کافی وقت لگتا ہے اور اس کے لیے بڑے صبر اور ناگوار بو کو برداشت کرنے کی ضرورت ہے۔"

☆☆☆

ڈگلس ایک بار پھر مسز بینٹر کے گھر گیا۔ خادمہ ابھی تک سیاہ ماتمی لباس پہنے ہوئے تھی۔ اس نے ڈگلس کو ایک ٹیلی گرام دکھاتے ہوئے کہا کہ بینٹر کا بھانجا آج سہ پہر کو یہاں آنے کے لیے سان فرانسسکو سے ٹرین میں سوار ہو گا۔ "میں نے ابھی ابھی کافی بنائی ہے۔ کیا تم پینا پسند کرو گے؟"

وہ اس کا جواب سنے بغیر گئی اور چند منٹ بعد ہی ایک ٹرے میں کافی کے دو کپ لے کر آ گئی۔ کافی بہت زیادہ اسٹرانگ اور گاڑھی تھی اور اس میں مناسب مقدار میں چینی کے علاوہ کریم بھی ڈالی گئی تھی۔ ڈگلس نے ایک گھونٹ لینے کے بعد کافی کی تعریف کی اور پھر اپنے مقصد پر آتے ہوئے بولا۔

"گزشتہ روز مسٹر بینٹر نے ناشتے میں کیا لیا تھا؟"

"میں عموماً اسے ناشتے میں انڈے اور فرنچ ٹوسٹ دیا کرتی تھی لیکن کل وہ میرے آنے سے پہلے ہی جا چکا تھا، البتہ کچن میں دو کپ رکھے ہوئے تھے جن میں سے کوکو کی بو آ رہی تھی۔"

ڈگلس نے نوٹ بک کھول کر کچھ لکھا اور بولا۔ "کیا مسٹر بینٹر اکثر کوکو لیا کرتے تھے؟"

"میں نے کبھی گھر میں کوکو نہیں دیکھی۔ ہو سکتا ہے وہ خود ہی لے کر آیا ہو۔ عام طور پر گھر کا سودا سلف میں ہی لاتی ہوں لیکن کبھی کبھی وہ خود بھی اپنے شوق کی چیزیں خریدنے جاتا تھا۔"

ڈگلس نے پوچھا۔ "کیا وہ کبھی چوہے مار دوا بھی لے کر آیا تھا؟"

"نہیں، اگر تم چاہو تو ہم کچن کی الماری میں دیکھ سکتے ہیں لیکن میں نے کبھی وہ دوا نہیں دیکھی۔"

وہ اسے لے کر کچن میں گئی۔ وہاں نہ تو کوکو تھی اور نہ ہی چوہے مار دوا۔

"تم نے چوہے مارنے والی دوا کے بارے میں کیوں پوچھا؟" ایما کے لہجے میں پریشانی تھی۔

وہ اسے زہر کے بارے میں نہیں بتانا چاہ رہا تھا لہٰذا اس نے جھوٹ بولا کہ اس کے گھر میں چوہے ہو گئے ہیں لہٰذا وہ سوچ رہا تھا کہ اگر مسٹر بینٹر چوہے مار دوا استعمال کرتے ہوں گے تو وہ یقیناً اچھی کوالٹی کی ہو گی۔

"تمہارا مکان دریا کے قریب ہے۔ اس لیے وہاں چوہوں کی موجودگی لازمی ہے۔" ایما اس کی کہانی پر یقین کرتے ہوئے بولی۔

"یہاں مجھے کوکو کی بوتل نظر نہیں آ رہی پھر مسٹر بینٹر کے پاس کہاں سے آئی؟ کہیں انہوں نے پڑوسیوں سے تو نہیں لی تھی؟" ڈگلس نے خیال ظاہر کیا۔

"نہیں۔" ایما نے جواب دیا۔ "مسٹر بینٹر تنہائی پسند تھے اور پڑوسیوں سے میل جول نہیں رکھتے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ انہوں نے کس کے ساتھ کوکو پی تھی۔"

ڈگلس نے پڑوسیوں سے پوچھ گچھ کی۔ سب کا یہی کہنا تھا کہ انہوں نے گزشتہ روز مسٹر بینٹر کو نہیں دیکھا اور نہ ہی ان کے گھر کے دروازے پر کوئی نظر آیا۔ ماسوائے ایما کے جو معمول کے مطابق نو بجے آئی تھی۔ البتہ چھ بلاک کے فاصلے پر رہنے والے ڈاکٹر بنجمن ایڈمز سے اس کی ملاقات ضرور ہوئی تھی جب وہ ڈوئل کے لیے جا رہا تھا لیکن اس نے بھی بینٹر کے ساتھ کوکو پینے کی تردید کی۔

ایڈمز نے تصدیق کی کہ اس کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا اور قدم ڈگمگا رہے تھے۔ وہ سمجھا کہ شاید اس کے ذہن پر ڈوئل کا دباؤ ہے۔ اس نے بینٹر سے باتیں کر کے اس بوجھ کو کم کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے بینٹر کے علاوہ کسی اور کو نہیں دیکھا۔

ڈگلس نے وہ سہ پہر بینٹر کے علاقے میں ہی گزاری۔ وہ راہ گیروں سے پوچھتا رہا کہ انہوں نے بینٹر کے گھر کے آس پاس کوئی غیر معمولی بات دیکھی تھی۔ اس نے ان دکانوں اور فارمیسی سے بھی معلوم کیا جو چوہے مار دوا بیچتے تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی بینٹر کو نہیں جانتا تھا اور نہ ہی کسی ایسے گاہک کی نشاندہی کر سکا جس کا حلیہ بینٹر یا ٹاریسٹن سے ملتا ہو۔ اس کے بعد وہ ٹاریسٹن کے علاقے میں گیا اور وہاں بھی اسی طرح کی پوچھ گچھ کی لیکن کوئی کامیابی نہ ہو سکی۔

اندھیرا پھیل چکا تھا جب اس نے ڈیانا کے دروازے پر دستک دی۔ اس کے والدین کہیں گئے ہوئے تھے اور وہ گھر میں اکیلی تھی۔ ڈگلس کو دیکھ کر وہ گھبرا گئی تاہم اس نے اسے اندر آنے سے نہیں روکا۔ ڈگلس نے اسے بتایا کہ اس نے وہ خط حاصل کر لیے ہیں اور اب وہ اس کے پاس محفوظ ہیں۔

"کیا تم وہ خط مجھے دے سکو گے؟"

"میں کوشش کروں گا کہ انہیں مقدمے سے الگ رکھوں لیکن کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔"

"الفریڈ کا کیا بنے گا؟"

"اس پر مقدمہ چلے گا اور اگر دفاع مضبوط ہوا تو شاید وہ جیل جانے سے بچ جائے۔"

ڈیانا کے چہرے پر فکرمندی کے آثار نظر آنے لگے۔ ڈگلس نے گفتگو کا رخ موڑتے ہوئے کہا۔

"میرے گھر میں چوہے بہت ہو گئے ہیں، کیا تمہارے یہاں بھی یہی مسئلہ ہے؟"

"ہاں لیکن ہم چوہے مار دوا استعمال کرتے ہیں۔"

"کیا تم کسی اچھی دوا کا نام بتا سکتی ہو؟"

ڈیانا اندر گئی اور ایک چھوٹا سا زرد رنگ کا باکس لے کر آئی۔ یہ دوا اکنساس سٹی کی کسی کمپنی نے بنائی تھی اور اس میں سنکھیا کی بڑی مقدار شامل تھی۔

"یہ تم نے کہاں سے لی تھی؟"

"کونے پر واقع شارلین فارمیسی سے۔"

"کیا الفریڈ کو بھی اسی مسئلے کا سامنا ہے؟"

"اس نے کبھی ذکر نہیں کیا۔" الفریڈ کے ذکر پر اس کی آنکھیں بھر آئیں اور اس نے اپنی نظریں زمین پر گاڑ دیں۔ ڈگلس واپس جانے کے لیے مڑا تو وہ بولی۔

"معاف کرنا، میں نے تم سے پوچھا نہیں۔ تم کیا پینا پسند کرو گے.... آئس ٹی یا کافی؟"

"نہیں، اب میں چلوں گا۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔"

واپس جاتے ہوئے اس نے علاقے کی دکانوں اور فارمیسی سے معلوم کرنا چاہا کہ کیا کسی عورت نے حال ہی میں چوہے مار دوا کی بڑی مقدار خریدی ہے؟ اس نے ڈیانا کا حلیہ بھی بیان کیا لیکن کہیں سے کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملا۔

دوسرے دن دفتر جانے سے پہلے ڈگلس ایک بار پھر مسز بینٹر کے گھر گیا۔ اس نے علاقے میں واقع دکانوں اور فارمیسی سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ کسی عورت نے

حالیہ دنوں میں چوہے مار دوا بھاری مقدار میں خریدی ہے۔
ایک فارمیسی والے نے اسے بتایا کہ حال ہی میں ایک عورت نے اس کی دکان سے نصف درجن باکس خریدے تھے۔ جب اس نے عورت کا حلیہ پوچھا تو وہ ڈیانا کے بجائے ایما کا تھا۔ چمک دار چہرہ، سنہری بال اور نیلی آنکھیں۔ اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

اس نے ایک بار پھر مسٹر ہینٹر کے دروازے پر دستک دی۔ اسی خادمہ نے دروازہ کھولا اور اسے اندر آنے کے لیے کہا لیکن اس نے پورچ میں ہی کھڑے کھڑے پوچھا۔ ”مسٹر ہینٹر! ایما کو کتنے عرصے سے جانتے تھے؟“

خادمہ نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ”چھ ماہ سے۔ آخری بار میں نے اسے جولائی میں دیکھا تھا لیکن وہ مسٹر ہینٹر کے مقابلے میں بہت کم عمر تھی۔ ان دونوں کا کوئی جوڑ نہیں تھا۔“

”اس کے بعد تم نے اسے نہیں دیکھا؟“ ڈگلس نے پوچھا۔

”نہیں۔“ خادمہ نے جواب دیا۔ ”کیا تم کچھ پینا پسند کرو گے؟“

ڈگلس نے اس کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے چل دیا۔

کیپٹن جیمز گرے اپنے آفس میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ ڈگلس سے عمر میں بیس سال بڑا تھا۔ اس وقت اس کے سامنے گزٹ کا تازہ شمارہ رکھا ہوا تھا۔ ڈگلس نے اس خبر کی جانب اشارہ کیا جس میں ڈسٹرکٹ اٹارنی نے الفریڈ ٹارسٹن کو ہینٹر کی موت کا ذمے دار ٹھہرایا تھا۔ اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”میرے پاس دوسرے شواہد بھی ہیں۔“

”میں نے تمہاری اور ڈاکٹر کی رپورٹ ڈسٹرکٹ اٹارنی کو بھیج دی تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے انہیں پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ تم زہر کی بات کر رہے ہو نا؟“

ڈگلس نے تائید میں سر ہلایا۔

”میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا تاکہ ہم دونوں ساتھ جا کر اس کا دن برباد کر سکیں۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھا اور کوٹ پہنتے ہوئے بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ ٹارسٹن نے ہی اسے زہر دیا ہے۔“

ڈگلس نے اسے کوکو کی پیالیوں کے بارے میں بتایا تو گرے کو تسلیم کرنا پڑا۔ واقعی یہ ممکن نہیں کہ دو حریف ڈوئل سے پہلے ایک ساتھ بیٹھ کر گرم چاکلیٹ پئیں۔

ڈسٹرکٹ اٹارنی کو جب انہوں نے موت کی وجہ بتائی تو وہ غصے میں آ گیا۔ اس نے گرے اور ڈگلس پر الزام لگایا کہ وہ اسے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر وہ اس شخص کے بارے میں معلوم کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو اس نکتے پر غور کیا جا سکتا ہے۔

ڈگلس نے خاموشی سے اس کی بات سنی اور اٹھ گیا۔

اسی شام وہ آٹھ بجے کے بعد ایما کے گھر گیا۔ وہ اسے دیکھ کر حیران ہو گئی اور بولی۔ ”میرا خیال ہے کہ ہم نے ہفتے کے روز ملنے کا پروگرام بنایا تھا۔“

”مجھے تم سے ایک ضروری کام ہے۔ کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟“

”بہتر ہوگا کہ ہم پورچ میں بیٹھیں۔“

اس نے دروازہ تھوڑا سا کھولا تو ایک عجیب سی مہک اس کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ اس نے ناک سکیڑتے ہوئے ایما سے پوچھا۔ ”یہ کیسی خوشبو ہے؟“

”یہ چوہے مارنے کا زہر ہے۔“

ڈگلس حیران ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ اس کے قریب ہوتے ہوئے بولی۔ ”جب میں اسے ابالتی ہوں تو اس میں سے ایسی ہی مہک آتی ہے۔“

ڈگلس کا سر چکرانے لگا۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”تم اسے کیوں ابالتی ہو؟“

”سنکھیا حاصل کرنے کے لیے۔“

ڈگلس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی، وہ کمزور سی آواز میں بولا۔ ”تمہیں اس کی ضرورت کیوں پیش آئی؟“

وہ مسکرائی اور اس کے گال پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے بولی۔ ”اپنی جلد کو نرم رکھنے کے لیے یہ ایک کاسمیٹکس ہے۔ اسے اس لیے ابالنا پڑتا ہے کہ اس میں سے سیاہی الگ ہو جائے۔ ظاہر ہے میں اپنے چہرے پر کالک تو نہیں مل سکتی۔“

ڈگلس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔ کیا واقعی عورتیں سنکھیا کو اپنی جلد کی خوب صورتی کے لیے استعمال کرتی ہیں؟

ایما کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ وہ اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے بولی۔ ”ملکہ وکٹوریہ کے زمانے میں انگریز عورتوں نے یہ نسخہ ایجاد کیا تھا۔ تم اتنی حیرت سے مجھے کیوں دیکھ رہے ہو؟ میں کوئی کہانی نہیں سنا رہی۔“

وہ اس سے پوچھنا چاہ رہا تھا کہ وہ ہینٹر کو کب سے جانتی ہے لیکن اس نے یہ کارڈ کسی آئندہ وقت کے لیے رکھ لیا اور اس کے بجائے دوسرا سوال پوچھ لیا کہ کیا ایما نے کافی ہاؤس جاتے ہوئے کسی شخص کو ہینٹر کے گھر کے آس پاس

دیکھا تھا۔ ایما نے نفی میں سر ہلا دیا۔

گھر واپس جاتے ہوئے ڈگلس نے فارمیسی کی دکان پر پوچھا تو انہوں نے تصدیق کی کہ واقعی کسی زمانے میں انگلستان میں سنکھیا کو آرائشِ جمال کے لیے استعمال کیا جاتا تھا لیکن امریکا میں اس کا رواج نہیں ہے کیونکہ اسے چوہے مار دوا کو ابال کر حاصل کیا جاتا ہے۔

وہ دفتر پہنچا تو ایک اور پیغام اس کا منتظر تھا۔ ”ایک اور موت زہر کے نتیجے میں واقع ہوئی ہے۔ تم فوراً میرے پاس آ جاؤ۔“

ڈاکٹر جونز اپنے دفتر میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اسے مردہ خانے لے جاتے ہوئے بولا۔ ”یہ میت آخر شب چیریٹی اسپتال سے آئی ہے۔ ان بے وقوفوں نے اسے قدرتی موت قرار دے دیا تھا۔“

لاش پوسٹ مارٹم ٹیبل پر رکھی ہوئی تھی۔ جیسے ہی ڈاکٹر نے اس کے چہرے پر سے چادر ہٹائی، ڈگلس چونک کر پیچھے ہٹا۔ وہ ڈیانا روگن تھی۔ اس کا بے جان چہرہ خوب صورتی سے محروم ہو چکا تھا۔ لمبے بال میز کے نیچے جھول رہے تھے اور اس کی گہری سبز آنکھیں ادھ کھلی تھیں۔ ڈاکٹر نہ جانے کیا کچھ کہتا رہا لیکن ڈگلس کچھ نہیں سن پا رہا تھا۔ اس کے لیے مزید وہاں رکنا دشوار تھا۔ وہ تیزی سے باہر نکلا اور ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر ڈیانا کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ گھر کے سامنے والے پورچ میں چار افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک اپنے آنسو پونچھتا ہوا آیا۔ ڈگلس نے اپنا تعارف کرایا تو اس نے بتایا کہ وہ ڈیانا کا باپ ہے۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس نے نیلی قمیص اور سیاہ پینٹ پہن رکھی تھی۔ اس نے شکستہ آواز میں بتایا کہ گزشتہ شب وہ اور اس کی بیوی ایک پارٹی میں گئے ہوئے تھے۔ نصف شب کے قریب ان کی واپسی ہوئی تو انہوں نے ڈیانا کو کچن کے فرش پر پڑا ہوا پایا۔ وہ اسے اسپتال لے کر گئے لیکن اس وقت تک وہ مر چکی تھی۔

”کیا میں مسز روگن سے مل سکتا ہوں؟“ ڈگلس نے پوچھا تو روگن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

مسز روگن دبلی پتلی عورت تھی اور چھ سات عورتوں کے ساتھ کچن ٹیبل پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ سب اس کی دوست اور رشتے دار تھیں۔ اس نے ان عورتوں سے پوچھا کہ ان میں سے کسی نے ڈیانا کو گزشتہ شب دیکھا تھا۔ سب نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس نے کچن کا سنک دیکھا، وہ خالی تھا البتہ کئی مگ اس کے برابر میں دھلے ہوئے رکھے تھے۔ اس نے دوسرا سوال کیا کہ جب ڈیانا کی لاش دریافت ہوئی تو سنک میں کوئی مگ پڑا ہوا تھا؟ وہاں دو مگ پائے گئے جن میں کافی پی گئی تھی لیکن انہیں دھو دیا گیا تھا۔ ڈگلس سوچ میں پڑ گیا کہ اس وقت کافی کیوں پی گئی؟

باہر آ کر اس نے وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں سے پوچھا کہ گزشتہ شب انہوں نے کسی کو مکان کے آس پاس دیکھا تھا۔ سب نے لاعلمی ظاہر کی۔ سڑک کے دوسری جانب کچھ بچے کھڑے ہوئے تھے۔ ڈگلس ان کی جانب بڑھا۔ اس نے اپنا کوٹ اتار کر کندھے پر ڈال لیا تھا۔ اس کی کمر سے لٹکا ہوا پستول دیکھ کر بچے اس کے گرد جمع ہو گئے اور مختلف سوالات کرنے لگے اور صرف چار منٹ بعد ہی ڈگلس معاملے کی تہ تک پہنچ گیا۔

دو لڑکوں نے باتوں باتوں میں بتا دیا کہ انہوں نے گزشتہ شب عورتوں کو روگن کے پورچ میں دیکھا تھا۔ ان میں سے ایک ڈیانا اور دوسری زرد لباس پہنے ہوئے سنہری بالوں والی عورت تھی۔ وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکے لیکن وہ کوئی جوان عورت معلوم ہو رہی تھی۔

ڈگلس فوراً ہی ایما کے مکان کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں پولیس اسٹیشن پر رک کر اس نے آفیسر مرفی کو ساتھ لیا اور ایما کے گھر سے کچھ فاصلے پر اس نے ٹیکسی چھوڑ دی۔ پھر اس نے مرفی کو وہیں ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور صدر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے دروازے پر دستک دی تو ایک مرد کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”میرا خیال ہے کہ گاڑی آ گئی۔“

کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور الفریڈ ٹارسٹن گھر سے باہر آیا لیکن ڈگلس اور مرفی کو دیکھ کر دروازے میں ہی رک گیا۔

”تم جیل سے کیسے باہر آ گئے؟“ ڈگلس نے اپنے ریوالور پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

ٹارسٹن نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ”اسے ضمانت کہتے ہیں، شاید تم نے یہ نام پہلے سنا ہو۔“

اسی لمحے ایما باہر آئی اور ڈگلس نے محسوس کیا کہ وہ دونوں سفر پر جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ ان دونوں کے کندھوں پر کوٹ تھے اور ٹارسٹن کے عقب میں دو سوٹ کیس نظر آ رہے تھے۔ ڈگلس نے ایما کے چہرے پر نظریں جمائیں اور پوچھا۔ ”تم لوگ کہیں جا رہے ہو؟“

ایما نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ڈگلس نے پھر پوچھا۔ ”یہ کس کا آئیڈیا تھا؟“

ایما نے بھی اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیے۔ تب ڈگلس کو یاد آیا کہ یہ دونوں ڈوئل کے مقام پر کس طرح گھل مل کر باتیں کر رہے تھے۔ اسے اپنے چہرے پر پسینا بہتا ہوا محسوس ہوا لیکن اس نے اپنی نظریں ایما پر جمائے رکھیں پھر وہ ٹاریسٹن کی طرف گھوما اور بولا۔

"تم نے ڈیانا کو کیوں مارا؟"

ٹاریسٹن کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ ایک قدم پیچھا ہٹا اور ایما کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "ڈیانا۔"

"اس کی لاش مردہ خانے میں ہے۔" ڈگلس نے کہا۔

"نہیں۔" وہ چلایا اور مزید ایک قدم پیچھے ہٹ کر ایما کی طرف دیکھنے لگا۔

انہوں نے ایما اور ٹاریسٹن کو ہتھکڑی پہنا دی اور پولیس کی گاڑی کے آنے کا انتظار کرنے لگے۔ تلاشی کے دوران ایما کے کوڑے دان سے چوہے مارنے والی دوا کے چھ خالی باکس بھی برآمد ہوئے جبکہ کچن کی الماری سے کوکو کی آدھی بھری ہوئی بوتل بھی ملی۔

کیپٹن گرے پوچھ گچھ کے لیے ایما کو ایک چھوٹے انٹرویو روم میں لے گیا اور ڈگلس، الفریڈ ٹاریسٹن کو مردہ خانے لے گیا۔ جب ڈاکٹر نے ڈیانا کے چہرے پر سے چادر ہٹائی تو ٹاریسٹن پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا جیسے اسے ڈیانا کی موت کا شدید صدمہ ہوا ہو۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد ڈگلس اسے ایک دوسرے کمرے میں لے گیا اور اسے ٹاریسٹن سے اعترافِ جرم کروانے میں صرف دس منٹ لگے۔ ڈگلس نے روایتی انداز میں تفتیش کرنے کے بجائے ٹاریسٹن کے ساتھ ہمدردانہ رویہ اختیار کیا اور اس سے اعترافی بیان لینے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ ایما کا آئیڈیا تھا۔ دونوں ہی بینٹر کو نیچا دکھانا چاہ رہے تھے۔ جب ایما کو معلوم ہوا کہ ٹاریسٹن نے بین کو ڈوئل لڑنے کا چیلنج دیا ہے تو وہ اس سے کافی ہاؤس میں ملی۔ کوکو والا آئیڈیا بھی اسی کا تھا۔

"ڈیانا کا کیا قصور تھا؟"

"وہ اس منصوبے کا حصہ نہیں تھی۔" ٹاریسٹن نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"یہ ایما کا آئیڈیا ہو سکتا ہے۔"

کیپٹن گرے نے ڈگلس کو اپنے کمرے میں بلایا اور اسے ایما کا اعترافی بیان دکھایا۔ اس کے مطابق یہ سارا آئیڈیا ٹاریسٹن کا تھا۔ وہ بینٹر سے انتقام لینا چاہ رہا تھا اور ایما کی خاطر ڈیانا کو بھی چھوڑنے پر تیار ہو گیا تھا۔

"اگر یہ بات تھی تو ایما نے ڈیانا کو کیوں قتل کیا؟"

"اسے ٹاریسٹن اور ڈیانا کے تعلق کا علم تھا اور جانتی تھی کہ ٹاریسٹن نے اسی کی وجہ سے بینٹر کو ڈوئل لڑنے کا چیلنج دیا تھا۔ اسے خطرہ تھا کہ کام نکل جانے کے بعد ٹاریسٹن اسے دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال کر پھینک دے گا چنانچہ اس نے جوشِ رقابت میں ڈیانا کا کام تمام کر دیا۔"

ڈگلس کی آنکھوں کے سامنے ڈیانا کا بے جان چہرہ گھوم گیا اور اس کے کانوں میں ڈیانا کے وہ الفاظ گونجنے لگے جو اس نے بین کے نام اپنے خط میں لکھے تھے۔ "تم مجھ سے محبت کرتے رہو۔ چاہے اس کا نتیجہ کچھ بھی نکلے۔ صرف اس محبت کی خاطر جو میں تم سے کرتی ہوں۔"

انہوں نے ایما اور الفریڈ ٹاریسٹن کو بینٹر اور ڈیانا کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا اور مکمل رپورٹ ڈسٹرکٹ اٹارنی کو بھیج دی تاکہ وہ مقدمے کا چالان تیار کرنے کے ساتھ ساتھ اخباری نمائندوں کے سوالات کے جواب بھی دے سکے۔ اس کے بعد وہ ذاتی طور پر ڈیانا کے باپ کو ایما کی گرفتاری کے بارے میں بتانے گیا جسے سن کر روگن خاندان حیران رہ گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کوئی عورت اتنی سفاک ہو سکتی ہے۔

جب وہ پولیس اسٹیشن واپس آیا تو استقبالیہ پر موجود ڈیسک سارجنٹ نے اسے بتایا کہ مہمانوں کے کمرے میں کوئی خاتون اس کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ ایما اور ڈیانا کے علاوہ وہ عورت کون ہو سکتی ہے لیکن جب وہ مہمانوں کے کمرے میں داخل ہوا تو اسے بادامی آنکھوں، شرمیلی مسکراہٹ اور نازک چہرہ دیکھ کر سب کچھ یاد آ گیا۔ میری پہلے کے مقابلے میں زیادہ خوب صورت دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھی اور اسے ایک کاغذ تھماتے ہوئے بولی۔ "اس پر میرا نیا پتا لکھا ہوا ہے۔" پھر اس نے شرماتے ہوئے کہا۔ "میں نے گریجویشن کر لیا ہے۔"

ڈگلس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔ "کیوں نہ اس کامیابی کی خوشی میں ہم آج اکٹھے ڈنر کریں۔"

میری کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔ وہ شرماتے ہوئے بولی۔ "میں تمہارے ساتھ ہر جگہ جانے کے لیے تیار ہوں۔"

اس لمحے ڈگلس اپنے آپ کو فضاؤں میں اڑتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ ذاتی زندگی میں یہ اس کی سب سے بڑی کامیابی تھی۔

"ہاں، میں نے اسے پہچان لیا ہے۔ یہ میری ایک کلائنٹ تھی۔" جیمز نے بتایا۔ اس نے بمشکل حلق تر کرتے ہوئے تھوک نگلا اور اپنے لیونگ روم میں مزید آگے بڑھ گیا۔ "لیکن یہ یہاں کیا کر رہی تھی؟"

"ہم ابھی اس بارے میں پُر یقین نہیں ہیں۔" انسپکٹر میک گلز نے کہا۔ "ہمیں لگ بھگ نصف گھنٹے قبل آپ کی پڑوسن کی فون کال موصول ہوئی تھی جو آپ کے مکان کے پاس سے گزر رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس نے آپ کے لیونگ روم کے فرش پر ایک لاش پڑی دیکھی ہے۔ آپ مقتولہ سے کس حد تک واقف تھے مسٹر جیمز؟"

"جیسا کہ میں نے بتایا کہ وہ میری ایک کلائنٹ تھی... انسپکٹر... اور بس۔"

تصادم

سکندر علیم

زندگی کے بعض موڑ اہم ہونے کے ساتھ جان لیوا بھی ثابت ہو جاتے ہیں... اس نے اپنی خواہش کو تحریر کی شکل دی... اور اس غلطی نے ایک خطرناک موڑ اختیار کر لیا... جرم... محبت اور تصادم کی تکونی صورتِ حال...

معمول کی سرگرمی میں غیر معمولی سنگینی کا ڈرامائی ڈراپ سین

"کب سے؟"

"لگ بھگ چھ ماہ سے۔"

"کب آیا کرتی تھی؟"

"ہر دوسرے یا تیسرے ہفتے، میں یہی کہوں گا۔"

"صرف ایک کلائنٹ تھی مسٹر جیمز؟"

"میں نے یہی کہا ہے۔"

انسپکٹر نے بھویں اچکا دیں۔

"آئی ایم سوری۔ ہاں، صرف ایک کلائنٹ۔" جیمز نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔ "یہ ایک قسم کا میرے لیے شاک ہے کہ میں گھر آیا ہوں اور یہ سب کچھ....." جیمز نے کاؤچ پر بیٹھتے ہوئے اپنی پیشانی سے پسینا پونچھا اور سامنے خلا میں خالی نظروں سے دیکھنے لگا۔

"آپ کی بیوی کہاں ہیں، مسٹر جیمز؟"

"وہ بزنس ٹرپ پر شہر سے باہر گئی ہوئی ہے۔ وہ آج صبح ہی ٹیکسی سے ائرپورٹ گئی تھی۔"

انسپکٹر اپنی نوٹ بک میں لکھ رہا تھا تو مزید پولیس موقع پر پہنچ گئی۔ وہ اس طرح مکان میں پھیل گئے جیسے چیونٹیاں کسی مردہ کیڑے کے گرد چکر کاٹتی ہیں۔

جیمز بدستور کاؤچ پر بیٹھا اس منظر کو دیکھ رہا تھا جو اس کے سامنے کھل رہا تھا۔ گو اس نے اپنی گردن میں بندھی ٹائی ڈھیلی کی ہوئی تھی لیکن اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اسے سانس لینے میں دشواری پیش آ رہی ہو اور اس کا گلا گھٹ رہا ہو۔

چند منٹ کے خاموش استغراق کے بعد حقیقت کا احساس اسے دوبارہ کمرے میں لے آیا۔ وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا اور اپنے اطراف کا طائرانہ نگاہوں سے جائزہ لینے لگا۔ بالآخر اس کی نظریں فرش پر پڑی ہوئی لاش پر ٹھہر گئیں۔ پریشان سے سنہری بالوں نے لاش کے چہرے کے ایک حصے کو ڈھانپا ہوا تھا۔ اس کے رخسار پر لپ اسٹک کا ایک دھبا بھی دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا بلاؤز اور اسکرٹ شام گزارنے کی مناسبت سے پرفیکٹ اور فٹ تھا اگر وہ ایک مردہ عورت کے بدن کی زینت نہ ہوتا۔

"کیا یہ ممکن ہے کہ اس پر قریب میں کہیں حملہ کیا گیا ہو اور وہ مدد کے لیے لڑکھڑاتی ہوئی یہاں تک آ گئی ہو؟" جیمز نے پوچھا۔

"ممکن نہیں۔" انسپکٹر نے کہا۔ "اور اگر ایسا ہے تب بھی اس کا مطلب ہے اسے معلوم تھا کہ تم کہاں رہتے ہو۔ کیا اس کا یہ مطلب نہیں مسٹر جیمز؟"

جیمز کی نگاہیں فرش پر جم گئیں۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"بہرصورت۔" انسپکٹر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "وہ زیادہ دور تک لڑکھڑاتے قدموں سے نہیں جا سکتی تھی۔ آپ اس کے حلقوم پر وہ نشانات دیکھ رہے ہیں؟ لگتا ہے جیسے کسی نے اس کا گلا گھونٹا ہے۔ شاید کسی رسی یا نک ٹائی کی مدد سے۔"

انسپکٹر یہ کہہ کر دوبارہ اپنے پیڈ پر کچھ لکھنے لگا۔ اس دوران میں پولیس کے لوگ وقفے وقفے سے اس کے پاس آتے رہے اور چپکے چپکے باتیں کرتے رہے۔ ان میں سے ایک نے انسپکٹر کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک پرزہ تھما دیا۔ انسپکٹر نے وہ کاغذ پڑھنے کے بعد اثبات میں سر ہلا دیا اور دوبارہ اپنے پیڈ پر لکھنا شروع کر دیا۔

جیمز اب کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ پسینے سے اس کی قمیص کا کالر تر ہو گیا تھا اور اس کے بال بھی گیلے ہو رہے تھے۔ پھر وہ کچن میں چلا گیا اور پانی کا ایک گلاس بے ڈھب انداز میں بھرا اور بڑی کوشش کے بعد ایک ہی گھونٹ میں حلق سے نیچے انڈیل لیا۔

لکھنے سے فارغ ہونے کے بعد انسپکٹر نے اسے مخاطب کیا۔ "اوکے، مسٹر جیمز۔" پھر وہ پُرسکون فیصلہ کن انداز میں اس طرح آگے بڑھا جیسے کوئی سرجن آپریشن ٹیبل کی جانب بڑھتا ہے۔ خاکستری بالوں والے انسپکٹر نے جیمز پر اپنا پہلا چرکا لگایا۔ "آپ اعتراف کیوں نہیں کر لیتے؟"

"میں تمہیں بتا چکا ہوں... وہ ایک کلائنٹ تھی اور بس۔ میں تمام دن اپنے کام پر تھا۔ تم چاہو تو میرے دفتر فون کر کے چیک کر سکتے ہو۔" جیمز نے کہا۔

"وہ تو ہم کر لیں گے۔ آپ کو اس بارے میں کسی قسم کا شبہ نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن میں بوڑھا ہوں اور تھک چکا ہوں۔ اگر آپ کھلے دل کے ساتھ ہر بات کا اعتراف کر لیتے ہیں تو میرا کام اس بات سے بے حد آسان ہو جائے گا۔ آپ اس وقت خاصی مشکل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ آپ کی بیوی شہر سے باہر گئی ہوئی ہیں۔ آپ اپنے پورے گھر میں اکیلے ہیں اور ایک نوجوان سنہری زلفوں والی عورت... آپ کی کلائنٹ آپ کے لیونگ روم میں مردہ پائی گئی ہے اب آپ کیا کہتے ہیں؟" انسپکٹر نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے پوچھا۔

جیمز گھبراہٹ کے عالم میں ہکلانے لگا لیکن اس

گھیراؤ کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ انسپکٹر نے اشارے سے جیمز کو اپنے پاس بلایا اور اپنی جیب میں سے وہ کاغذ کا ٹکڑا نکال لیا جو کچھ دیر قبل ایک پولیس افسر اسے تھما گیا تھا۔ "یہ اس عورت کے بیگ میں پایا گیا ہے۔"

"الزبتھ!

وہ پیر تک شہر سے باہر ہوگی۔ جمعے کی سہ پہر مجھ سے میرے گھر پر ملو اور میں پورے ویک اینڈ تمہارا رہوں گا۔

جیمز۔"

انسپکٹر پوری توجہ سے جیمز کا جائزہ لے رہا تھا۔

"کم آن مسٹر جیمز! ہم دونوں جانتے ہیں کہ کیا ہوا ہے۔" انسپکٹر نے کہنا شروع کیا۔ اس کی آواز کچھ دیر پہلے کے مقابلے میں قدرے دھیمی تھی۔ "آپ نے اس کے ساتھ ناجائز تعلقات استوار کیے ہوئے تھے۔ شاید آپ اس سے اکتا گئے تھے اور آپ نے ان تعلقات کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ شاید اس نے بہ خوشی یہ فیصلہ قبول کرنے سے انکار کر دیا ہو اور جب آپ نے اسے دھتکارنے کی کوشش کی ہو گی تو شاید آپ اپنے آپے سے باہر ہو گئے ہوں گے۔ آپ نے اس کی لاش ٹھکانے لگانے کے لیے باہر کوئی جگہ تلاش کرنا چاہی ہو گی لیکن آپ کے لاش سے چھٹکارا حاصل کرنے سے پیشتر ہی آپ کی ایک پڑوسن نے لاش تاڑ لی۔ میں یہ سب سمجھ رہا ہوں۔"

انسپکٹر اب نہایت نرمی کے ساتھ اس کے چہرے کو ٹانکے لگا رہا تھا۔ "بس ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن چلے چلیں۔"

"نہیں انسپکٹر، میں قسم کھاتا ہوں... میں نے اسے چھوا تک نہیں... اس انداز سے نہیں۔" جیمز نے لاش کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میرا مطلب ہے، تم نے ہمارے بارے میں درست کہا ہے۔ میں اس سے ملاقاتیں ضرور کر رہا تھا لیکن تم یہ خیال نہیں کر سکتے کہ یہ میں نے کیا ہے۔"

"مردہ لڑکیاں سوچے سمجھے بغیر کسی کی دہلیز پر اتفاق سے پائی نہیں جاتیں، جیمز!" انسپکٹر نے کہا۔

"تمہیں مجھ پر یقین کرنا ہو گا، انسپکٹر۔ میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

انسپکٹر میک گلز نے جیمز کو دوسری جانب گھما دیا اور اپنی ہتھکڑیوں کو نکالنے لگا۔ جیمز کی گریہ وزاری بلند ہو گئی۔ البتہ اس نے اپنی حراست پر کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی۔

لیکن اس سے قبل کہ انسپکٹر، جیمز کو اس کے حقوق پڑھ کر سناتا، ایک سپاہی نے اسے اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے بیچ میں مداخلت کر دی۔

"انسپکٹر!" ایک پولیس مین نے زینے سے تیزی کے ساتھ نیچے آتے ہوئے پکارا۔ "ایک منٹ رک جائیں۔"

انسپکٹر اس مداخلت پر قدرے جھنجلا سا گیا۔ پھر اس نے جیمز کو ایک اور سپاہی کی تحویل میں دیا اور خود اس پولیس مین سے ملنے کے لیے زینے کی جانب چل دیا جس نے اسے آواز دی تھی۔ پھر وہ دونوں آپس میں کچھ بات کرنے لگے۔

چند لمحوں بعد انسپکٹر میک گلز جیمز کے پاس واپس آ گیا۔ "لگ رہا ہے کہ آپ اس الزام سے بری ہیں، دوست!" انسپکٹر نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔

"ہم... میں سمجھا نہیں۔" جیمز نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی حیران نظروں سے انسپکٹر کو دیکھنے لگا۔

"کیا آپ نے اپنی کلائنٹ کے نام وہ پیغام اسی گھر میں لکھا تھا، مسٹر جیمز؟" انسپکٹر میک گلز نے پوچھا۔

"ہاں، یہیں لکھا تھا۔" جیمز نے اقرار کیا۔

"اچھا۔" انسپکٹر میک گلز نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے جیمز کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ جیمز اس کے پیچھے اوپری منزل کی جانب بڑھنے لگا۔ انسپکٹر کا رخ اوپری منزل پر کونے میں بنے ہوئے ماسٹر بیڈروم کی جانب تھا۔

"جب آپ کسی کو اپنے مختصر پیار بھرے پیغامات بھیج رہے ہوتے ہیں تو آپ کو اس بارے میں کہیں زیادہ محتاط رہنا چاہیے کہ انہیں باہر بھیجنے سے پہلے کون دیکھ سکتا ہے۔"

ایک لمحے کے لیے جیمز کو انسپکٹر کی سرزنش کا مطلب قطعی سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر ماسٹر بیڈروم میں داخل ہوتے ہی فوری طور پر یہ عقدہ اس پر واضح ہو گیا۔

اس کی بیوی کمرے کے ایک گوشے میں ایک کرسی پر نفاست سے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک آسودہ مسکراہٹ تھی۔ اس کے زانوؤں پر رسی کا ایک بڑا سا ٹکڑا پڑا ہوا تھا اور ایک پیک کیا ہوا سفری بیگ اس کے برابر میں دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے جیمز پر ایک نگاہ ڈالنا بھی گوارا نہیں کی تھی۔

"میں تیار ہوں۔ انسپکٹر۔" اس کی بیوی نے کہا۔

"کیا تم مجھے اب اپنے ساتھ لے جا رہے ہو؟"

جیمز اپنی بیوی کی آسودگی اور بے رخی پر ششدر رہ گیا۔

پھر وہ جیمز کو نظر انداز کرتے ہوئے فاتحانہ انداز میں انسپکٹر کے ساتھ چل پڑی۔

بُدھو

حمیرا اقبال

کوئی بھی شخص اس وقت تک حکمرانی نہیں کر سکتا... جب تک وہ اپنے جذبات و احساسات پر قابو نہ پالے۔ اسے بھی اپنی شخصیت کی تعمیر و تشکیل کے لیے خاصی محنت کرنا پڑی تھی... اور اب اس محنت کا ثمر مستقبل میں اس کا رہنما تھا...

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ... کی عملی تفسیر... مغرب کی ایک اور جادوگری

وکٹوریا نے داخلی دروازہ کھولا تو شیرف ڈونالڈ کو اپنے گھر کی دہلیز پر کھڑے ہوئے پایا۔ اس نے شیرف پر نگاہ پڑتے ہی ایک گہرا سانس بھرا۔

''سوری میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا میڈم لیکن...''
شیرف نے اپنی چوڑی پیشانی پر سے رومال کی مدد سے پسینے کی بوندیں پونچھتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی اطراف میں پڑوس کے گنے چنے مکانوں پر نگاہ دوڑاتے ہوئے بولا۔ ''کیا ہم اندر چل کر بات کر سکتے ہیں، مسز ہیر نگٹن؟''

وکٹوریا نے اپنی آنکھوں پر آئی ہوئی سنہری بالوں کی لٹ پیچھے کی جانب اچھال دی اور رنگ میں لتھڑے ہوئے اپنے ہاتھوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''میں اپنی تازہ ترین آئل پینٹنگ کو بس فنش کر رہی تھی تاکہ ڈائنر پر اپنی ساڑھے گیارہ بجے کی شفٹ پر جانے کی تیاری کر سکوں...''

''میں آپ کے شوہر کے بارے میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں میڈم؟'' شیرف نے کہا۔

''ہیر نگٹن کے بارے میں؟'' وکٹوریا کو خوف کا ایک جھٹکا سا لگا اور اس نے پورا دروازہ کھول دیا تاکہ شیرف اندر آسکے۔ ''کیا اس کے ساتھ کوئی حادثہ تو پیش نہیں آگیا...؟''

''اوہ نو۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے بلکہ حقیقت میں جہاں تک مجھے علم ہے وہ خیریت سے ہے۔ لیکن کوئی بات ہے۔'' شیرف نے بتایا۔

''کیا بات؟''

''کوئی پرابلم ہے۔''

''پرابلم؟''

''ہاں۔'' شیرف نے پہلو بدلتے ہوئے ایک بار پھر اپنے چہرے سے پسینا پونچھا۔ ''کیا مجھے ایک گلاس پانی مل سکتا ہے، میڈم؟''

''اوہ، یقیناً۔ میری تمیز داری کو کیا ہوا۔ یہ ایک خاصی گرم صبح ہے، ہے نا؟ پلیز بیٹھ جائیں۔ یہ کرسی قدرے ابتر حالت میں ہے لیکن آرام دہ ہے۔'' وکٹوریا یہ کہہ کر تیز تیز قدموں سے چھوٹے سے کچن میں چلی گئی اور دو گلاس پانی میں برف ڈال کر لیونگ روم میں واپس آگئی۔

شیرف ڈونالڈ نے اپنی بھاری بھر کم انگلی سے مخالف دیوار پر لگی ہوئی پینٹنگ کی جانب اشارہ کیا اور بولا۔ ''جھیل پر ڈوبتے ہوئے سورج کا یہ منظر نہایت پُرسکون دکھائی دے رہا ہے، میڈم۔ بے حد عمدہ آئل پینٹنگ ہے۔ کیا آپ کی بنائی ہوئی ہے؟''

''ہاں، تھینک یو۔'' وکٹوریا نے پانی کا گلاس شیرف ڈونالڈ کو تھما دیا اور دوسرا گلاس لے کر ایک خستہ حال کاؤچ پر جا بیٹھی۔ ''شیرف تم نے ہیر نگٹن کے بارے میں کوئی بات اور پرابلم کا ذکر کیا تھا۔ کیا پرابلم ہے، شیرف؟''

شیرف نے ٹھنڈے پانی کا ایک بڑا سا گھونٹ پیا اور پھر ایک گہرا سانس لینے کے بعد وکٹوریا کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس کی گہری آنکھیں وکٹوریا کی آنکھوں میں گڑی ہوئی تھیں۔ ''کیا پچھلے دنوں آپ کے شوہر کا رویہ کچھ غیر معمولی رہا ہے؟''

''غیر معمولی؟''

''ہاں۔ جیسے راتوں کو دیر تک گھر سے باہر رہنا، اگلے روز صبح جوش و گھبراہٹ کا اظہار؟ مثال کے طور پر گزشتہ شب اور آج صبح؟''

وکٹوریا نے اپنی رنگ آلودہ انگلی گلاس کی بیرونی نم سطح پر پھیری اور بولی۔ ''یہ تو حقیقت میں نہایت الجھن پیدا کر دینے والی بات ہے۔ ہیر نگٹن تو شہر سے باہر گیا ہوا ہے۔ وہ کل صبح ہی اپنے بزنس ٹرپ پر چلا گیا تھا۔ تم جانتے ہو گے کہ وہ اب سیلز کے پیشے سے وابستہ ہے اور... اس کی اپنے چند کلائنٹس کے ساتھ نہایت اہم نوعیت کی میٹنگ تھی۔''

''کیا واقعی ایسا ہے؟'' شیرف ڈونالڈ نے آنکھیں میچتے ہوئے کہا۔ ''کیا وہ گزشتہ منگل کو بھی شہر سے باہر گئے ہوئے تھے؟ اور اس سے پہلے منگل کو بھی؟''

وکٹوریا نے تیوریاں چڑھا لیں۔ ''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ تم ہیر نگٹن کو کس بات کا مرتکب قرار دینا چاہ رہے ہو شیرف؟''

''میں اسے کسی چیز کا مرتکب قرار نہیں دے رہا ہوں۔'' شیرف نے کہا۔ ''میں بس اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔ حال ہی میں اس کاؤنٹی میں منگل کی شب اچانک رونما ہونے والی نقب زنی اور لوٹنے کی وارداتوں کا ایک سلسلہ چل پڑا ہے اور ہیر نگٹن کے ریکارڈ کو مدِنظر رکھتے ہوئے...'' شیرف نے جملہ نامکمل چھوڑتے ہوئے شانے اچکا دیے۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' وکٹوریا نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہیر نگٹن اب ایک تیر کی طرح سیدھا ہو چکا ہے۔''

شیرف نے اپنے گلاس میں سے پانی کا ایک اور گھونٹ بھرا۔ ''میں بھی یہی خیال کرنا چاہتا ہوں لیکن...'' اس نے ایک بار پھر جملہ ادھورا چھوڑ کر شانے اچکا دیے۔

''لیکن کیا؟''

''ہر واردات نہایت مشاقی اور صفائی سے کی گئی ہے۔ صرف چھوٹے اور آسانی سے لے جائے جانے والے آئٹمز کی چوری جیسے جیولری یا نقدی۔ اور جائے واردات پر کسی قسم کی انگلیوں کے نشانات یا ماخوذ کر دینے والی شہادت نہیں چھوڑی گئی۔ بالکل وہی انداز وہی طریقۂ کار جو آپ کے شوہر کا تھا... حتیٰ کہ اس شب جب مالک مکان غیر متوقع طور پر گھر واپس آگیا تھا اور آپ کے شوہر کو گن پوائنٹ پر اس وقت تک اپنی زد میں لیے رہا جب تک میں اور ڈپٹی شیرف رچرڈ وہاں نہیں پہنچ گئے تھے۔''

''یہ سب ماضی کی بات ہے۔'' وکٹوریا نے کہا۔ ''میں پھر دہرا رہی ہوں۔ ہیر نگٹن کا کردار اب بالکل بے داغ ہے۔ جیل نے اسے ایک بالکل بدلا ہوا آدمی بنا دیا ہے۔''

''گزشتہ شب بالکل اسی انداز سے ایک اور گھر میں نقب زنی کی واردات ہوئی ہے مسز ہیر نگٹن۔''

''تب وہ ہیر نگٹن ہرگز نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ میں نے بتایا وہ شہر سے باہر ہے۔''

''کیا آپ یہ بات ثابت کر سکتی ہیں؟'' شیرف ڈونالڈ نے کہا۔

''سچ پوچھو تو ہاں ثابت کر سکتی ہوں۔'' وکٹوریا یہ کہہ کر اٹھی اور کمرے کی دوسری جانب موجود ایک خستہ حال میز پر رکھا ہوا اپنا پرس اٹھا کر اسے ٹٹولنے لگی۔ ''ہاں... یہ رہا۔'' اس نے پرس میں سے ایک چھوٹا سے کارڈ باہر نکالا اور پھر دوبارہ پرس کو ٹٹولنے لگی۔ اس مرتبہ اس نے پرس میں سے ایک پنسل اور کاغذ کا ایک چھوٹا سا پیڈ نکالا اور کارڈ کو دیکھتے ہوئے پیڈ کے اوپری کاغذ پر کچھ لکھنے لگی۔ پھر اس نے وہ لکھا ہوا کاغذ پھاڑ کر شیرف کی جانب بڑھا دیا۔

''یہ وہ مقام ہے جہاں اس وقت میرا شوہر موجود ہے، شیرف۔ یہ جگہ یہاں سے دو سو میل کے فاصلے پر ہے اور دو ہفتے قبل اس وقت بھی وہ وہیں موجود تھا۔ تم اس سے اس نمبر پر رابطہ کر سکتے ہو۔ اگر ضرورت سمجھتے ہو تو ان لوگوں میں چند سے بات بھی کر سکتے ہو جن کے ساتھ وہ بزنس کر رہا ہے۔ مجھے یقین ہے وہ تمہیں بتا دیں گے کہ ہیر نگٹن گزشتہ تمام رات وہاں ان

کے ساتھ رہا ہے۔"

شیرف ڈونالڈ نے کاغذ پر نظریں جما دیں اور اثبات میں سر ہلا دیا اور پھر برف کے ڈلوں کو پانی میں گھماتے ہوئے باقی تمام پانی پی کر گلاس خالی کر دیا۔ "امید کرتا ہوں کہ آپ کی بات درست ہوگی میڈم۔ اس یقین کی امید ہے کہ آپ درست ہیں۔ میں ہیر گشن کو ہمیشہ سے پسند کرتا ہوں اور یقینی طور پر یہی دیکھنا چاہتا ہوں کہ اس نے خود کو سدھار لیا ہے۔ خاص طور پر اس کے بعد سے کہ جب وہ اپنی سزا کاٹ رہا تھا اور آپ نے جس انداز سے اس کا انتظار کیا تھا۔"

"میں اس سے پیار کرتی ہوں، شیرف۔"

"کتنا خوش قسمت آدمی ہے وہ۔" شیرف ڈونالڈ نے رشک بھرے لہجے میں کہا اور جانے کی اجازت چاہی۔

وکٹوریا اسے چھوڑنے کے لیے دروازے تک آئی۔

جب شیرف کی کار نظروں سے اوجھل ہوگئی تو تب کہیں وکٹوریا کے دل کی دھڑکن نارمل ہوئی۔ اس شیرف کی ہمت تو دیکھو، اس کے ہیر گشن پر شبہ کر رہا تھا لیکن پھر وکٹوریا نے سوچا کہ وہ شیرف کو مورد الزام قرار نہیں دے سکتی۔ سینڈی ہولو کا ذہنی زیادہ گنجان آباد نہیں تھی۔ یہاں آس پاس میں اس مہارت کے جرائم چند ہی ہوتے تھے جس مہارت کا مظاہرہ ہیر گشن نے کیا تھا۔

ہیر گشن کے لیے یہ خوش قسمتی کی بات تھی کہ وہ تین گھنٹے کی مسافت پر تھا اور اس کے پاس جائے واردات سے عدم موجودگی کا ٹھوس ثبوت بھی تھا۔

وکٹوریا دونوں خالی گلاس کچن میں لے گئی۔ البتہ ایک خیال مسلسل اس کے ذہن پر کچوکے لگا رہا تھا۔ کیا واقعی ہیر گشن کے پاس اس بات کا ٹھوس ثبوت موجود تھا کہ وہ جائے واردات سے بہت فاصلے پر تھا؟ کیا واقعی اس نے گزشتہ شب کا ایک بڑا حصہ اپنے کلائنٹس کے ہمراہ گزارا تھا؟

"کیوں نہ میں اسے فون کر لوں؟" وکٹوریا نے اپنے آپ سے کہا۔ "اسے شیرف کی آمد کے بارے میں بتا دوں تاکہ میرے ذہن کو بھی سکون مل جائے۔"

چند منٹ بعد وکٹوریا نے فون پر ہیر گشن سے رابطہ کیا اور صبح کے واقعے سے لے کر شیرف ڈونالڈ کے شبہے کے بارے میں ہر ایک بات تفصیل سے جذباتی انداز میں اسے بتا دی۔

"ریلیکس، وکٹوریا!" ہیر گشن نے اس وقت کہا جب وکٹوریا نے اسے بولنے کا موقع دیا۔ "شیرف صرف اپنا فرض نباہ رہا ہے۔ جب وہ مجھے یا یہاں پر موجود کسی کو بھی فون کرے گا تو اسے پتا چل جائے گا کہ وہ کتنی غلط فہمی میں مبتلا تھا۔"

"تو پھر تم اپنے وقت کا حساب دے سکتے ہو؟ اور دوسرے بھی تمہاری بات کی تائید کریں گے؟"

"بے شک! مجھ سے یہ مت کہنا کہ تم نے میری بات پر یقین نہیں کیا تھا۔ میں نے یہ وعدہ کیا تھا کہ میں آئندہ بھی کوئی واردات نہیں کروں گا؟"

"اوہ نہیں، ہیر گشن۔ میں جانتی ہوں کہ تم مجھ سے کبھی جھوٹ نہیں بولو گے لیکن شیرف ڈونالڈ... اس نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ میں نہیں چاہتی کہ جیل کی سلاخیں ہمیں ایک بار پھر ایک دوسرے سے جدا کر دیں۔"

"وہ اب کبھی ہمیں دوسرے سے جدا نہیں کریں گی۔ میری ہوٹل میں ڈنر میٹنگ انتہائی کامیاب رہی ہے۔ ہم نے کل سہ پہر پانچ بجے اپنی میٹنگ کا آغاز کیا تھا اور رات دس بجے کے بعد تک کوئی وقفہ نہیں کیا۔ اور پھر آج صبح تیس منٹ گزرے ہم نے چند تصفیہ طلب معاملات بہ خوبی نمٹا دیے اور میں ان کا اکاؤنٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ کیا تم جانتی ہو کہ اس کا کیا مطلب ہے، وکٹوریا؟ میری آمدنی میں ایک بڑا اضافہ۔ اب ہمیں مزید کفایت شعاری سے کام نہیں لینا پڑے گا۔ تم اپنے ویٹرس کے اوقات کار میں بھی کمی کر سکتی ہو اور پینٹنگ پر زیادہ وقت صرف کر سکتی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ ہم اس بات کے متحمل ہو جائیں کہ ایک عمدہ رہائش حاصل کر لیں۔ ایک ایسی رہائش جہاں پینٹنگ کرنے کا تمہارا اپنا کمرا ہو اور تمہارا اپنا آرٹ اسٹوڈیو ہو۔"

"واقعی، ہیر گشن؟ واقعی؟"

اپنے پینٹ برش صاف کرتے ہوئے وکٹوریا کا جوش و خروش قابلِ دید تھا۔ اس نے اپنے ناخنوں پر سے پینٹ رگڑ کر صاف کیا اور اپنا ویٹرس کا لباس زیب تن کر لیا۔ اب نہ صرف ہیر گشن جلد ہی گھر میں زیادہ رقم لانے لگے گا بلکہ وہ محفوظ بھی تھا۔ اسے گزشتہ شب کی نقب زنی کی واردات سے بھی جوڑا نہیں جائے گا۔

وہ جب اپنی ویٹرس کی ڈیوٹی پر ڈائنر جا رہی تھی تو اس کے ہونٹوں پر ایک کشادہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ آج کے بعد سے وہ ہیر گشن کے نقشِ قدم پر چلے گی اور اپنے طور پر رات کے کام میں کسی قسم کا خطرہ مول نہیں لے گی۔

وہ اپنی منگل کی رات کی نقب زنی کی وارداتوں کو تین تک ہی محدود رکھ کر آئندہ کبھی یہ کام نہیں کرے گی... شک اور الزام سے خود کو بری رکھے گی۔

ویسی ہی بدھو بنی رہے گی جیسے اسے نہ پہلے کچھ پتا تھا اور نہ اب پتا ہے۔

دغاباز

احمد اقبال

موسمِ بہار کو خوب صورتی و رعنائی کے ساتھ محبت کا موسم بھی کہا جاتا ہے... شادی دو روحوں کا ملاپ ہے... یہ دو روحوں کے درمیان محبت کا وہ مضبوط بندھن ہے جو ہجر و فراق کو ختم کر کے نزدیکیوں میں بدل دیتا ہے... اس مقدس رشتے میں بندھنے کی خواہش ہر ایک دل میں جاگزیں ہوتی ہے... رشتوں کی ڈور میں الجھ کے سب کچھ پالینے کا خواب دیکھنے والی خواب پرست لڑکی کا احوال... اچانک ہی اس کے خواب چکنا چور ہو کے رہ گئے... بزدل و صائمہ کے جانے پہچانے کرداروں کے ساتھ شروع ہونے والی کہانی... جس کی ہر سطر میں مزاح کی چاشنی کے ساتھ سنجیدگی اور تروتازگی کا عنصر نمایاں تر رہتا ہے...

دشت وفا سے دشت جفا کے سفر کی پُرانتقام روداد... سرورق کی تیز رفتار تحریر

صائمہ کی خواہش پر برات کے آگے روایتی انداز میں "اصلی شاہی بینڈ"... "جگر چھلنی ہے دل گھبرا رہا ہے... محبت کا جنازہ جا رہا ہے" بڑے جوش سے الاپ رہا تھا۔ بہت بڑے پیتل کے بھونپو میں پھنسا ہوا شخص گال پھلا کے زور لگاتا تھا تو اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر نکلنے لگتی تھیں اور گردن کی رگیں پھول جاتی تھیں۔ سب سے بڑے ڈرم کا بوجھ اپنے پیٹ کے گنبد پر سنبھالے ایک سفید مونچھوں والا اسے یوں پیٹ رہا تھا جیسے تھانے میں بے گناہ کو اقبالِ جرم کرانے کے لیے بجایا جاتا ہے۔ پیچھے بابو تانگے والے کے گدھے کے سائز والے گھوڑے پر میں سہرا باندھے بیٹھا تھا تو میرے پیر زمین کو چھوتے تھے۔ بابو نے دن بھر کی کمائی سے دگنا کرایہ لینے کے بعد اسے میرے حوالے کیا تھا تو بڑی دکھی الوداعی نظروں سے دیکھ کر کہا تھا

کہ دولہا سات فٹ کا ہو تو اسے اونٹ پر بٹھانا چاہیے۔ استقبال کرنے والوں کا سرغنہ خود انسپکٹر ظالم خاں تھا۔ اس نے میز پر ڈنڈا بجاتے ہوئے ضابطۂ فوجداری کا حوالہ دے کر کہا تھا کہ وہ اب میرا دوست نہیں، سالا تھانے دار ہے اور صائمہ کا بھائی چنانچہ میں نے بیوی سمجھ کے اس کو بری نظر سے بھی دیکھا تو وہ... اس کی دھمکی یہاں لکھی نہیں جا سکتی۔

میرے زمین پر قدم رنجہ فرمانے سے پہلے غالباً استقبال کے لیے بم جیسا دھماکا ہوا۔ عین اسی وقت گھوڑے نے دم اٹھالی تھی۔ غالباً ہر روز کی طرح اس نے مقررہ وقت پر ہضم شدہ خوراک کو خارج کیا تھا۔ دل دہلا دینے والے پٹاخے کا ایک ذرہ کسی ٹوٹے ہوئے تارے کی طرح گھوڑے کے اندر پہنچا اور غالباً ایک ثانوی حیثیت کا دھماکا کیا۔ اس مظلوم مخلوق کی جگہ ہاتھی بھی ہوتا تو چیخ مار کے اچھلتا اور منہ اٹھا کے کسی اسپتال کی طرف دوڑتا۔ گھوڑا نہ جانے کدھر گیا۔

جھاڑ پونچھ کے مجھے فرشِ خاک سے اٹھانے والے خود توپ صاحب تھے۔ ”میاں گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں... اور ابھی تو ابتدا ہے گویا۔“ انہوں نے منہ میں بارہ مسالے والے پان کی مسی بناتے ہوئے ارشاد کیا اور پھر کڑک مرغی کی طرح ہنسے تو سرخ پھوار نے میری آف وائٹ شیروانی کو پرنٹ کر دیا جو میں غضبناک ڈرائی کلینرز کے پروپرائٹر عجب خاں سے کرائے پر لایا تھا۔

”توپ صاحب! آپ یہاں بھی۔“ میں نے فریادی لہجے میں کہا۔

”وہ کچھ ایسا ہے برخوردار کہ ہم کو مسماۃ صائمہ نے اپنا ولی نامزد کیا ہے۔“ انہوں نے ایک فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”ہم گویا قائم مقام والد ہوئے اس کے۔“

”یا میرے خدا... یک نہ شد دو شد۔ پہلے ظالم خاں... اب آپ؟“ میں نے رو کے کہا۔

منکر نکیر کی طرح میرا نام نہاد سالا اور سسر نکاح کے وقت نمودار ہوئے۔ ان کے ساتھ طویل لہراتی سفید داڑھی والا پستہ قد اور مہین آواز والا شخص قاضی ثابت ہوا۔

اس نے ڈانٹ کر نکاح نامے میں اندراج کے لیے پوچھا۔ ”نام؟“

”بزدل...“ میں نے بے خیالی میں کہہ دیا۔

وہ پٹاخے کی طرح اچھلا۔ ”گالی دیتا ہے ہم کو... چار نکاح کیے ہیں ہم نے اور تو کہتا ہے بزدل ہمیں... ہمارا تو باپ بھی بہادر تھا... بہادر خاں۔“

توپ صاحب نے فوراً مداخلت نہ فرمائی ہوتی تو شاید وہ نکاح رجسٹر اٹھا کے واک آؤٹ کر جاتا۔ چند بدتمیز بالی میرے سامنے کھڑے یوں دانت نکال رہے تھے جیسے یہاں بندر کا تماشا ہو رہا ہو۔ میں نے اسپتال کے سامنے گنے کا جوس نکالنے والے بنگالی کو دیکھا جو یہاں بھی اپنی انگلی کو قابلِ اعتراض حد تک اٹھا کے ناک صاف کرتے ہوئے بتا رہا تھا۔ ”ارے گولی ڈونڈ اشادی بناتا ہے۔ وہ سب ڈاکٹر لوگ ٹی پی بولتا... ٹیلی فون پول...“ سننے والا قہقہہ مار کے ہنسا۔ وہ مستری راکٹ تھا۔

”ارے سب پتا ہے مجھے... اس کی پھٹیچر چار سال سے کھڑی ہے میرے پاس۔ یہ اس لیڈی ڈاکٹر کی مہران کار میں مرغا بن کے پھرتا ہے۔“

تیسرے منحوس شخص نے انہیں مطلع کیا۔ ”افسوس کہ لڑکی بہت جلد بیوہ ہو جائے گی۔ تین سال سے کرایہ نہیں دیا اس نے فلیٹ کا... مقدمہ کر رکھا ہے... نے...“ درمیان کی گالی خاصی اشتعال انگیز تھی۔

اس وقت توپ صاحب نے آخری وار کیا۔ ”میاں بزدل! وہ ہم نے بڑا اچھا حل نکالا ہے اپنے اور تمہارے مالی مسائل کا گویا... حقِ مہر ہو گا۔“ انہوں نے شیروانی کی جیب میں سے ایک کاغذ کا پرزہ برآمد کیا۔ ”تین لاکھ ستائیس ہزار چار سو بیس۔“

”کیا؟“ میں نے چلّا کے کہا۔ ”یہ رقم تو آپ کے ذمے نکلتی ہے میری۔“

انہوں نے پان کی پیک والا منہ اوپر اٹھا کے فرمایا۔ ”بالکل... اور حقِ مہر ہو گا عند الطلب... مطلب یہ کہ جب دلہن مانگے... تم کہہ سکو گے کہ واجبات ملتے ہی دے دوں گا۔“ وہ پیک سمیت ہنسے۔ ”دستخط کرو۔“

”چالاک بڈھے۔“ میں نے چلّا کے کہا۔ ”یہ کبھی نہیں ہو گا۔“

اس وقت دلہن کے پورے لباس میں صائمہ کود کر اسٹیج پر آ گئی۔ ”چلو پھر توپ صاحب کو اپنی جگہ دو... ان کے پاس اپنا گھر تو ہے رہنے کو... یہ بھی کنوارے ہیں اور میں مزید انتظار نہیں کر سکتی۔“

میں نے چیخ کے کہا۔ ”ایسا تم میری لاش پر سے گزر کے ہی کر سکتی ہو۔“

”یہ کیا مشکل ہے برخوردار... یہ ہمارے دادا مرحوم کا طمنچہ تھا۔ داشتہ آید بکار... انہوں نے جیب میں سے اٹھارویں صدی کا لمبی نال والا پستول نکالا۔ ”ہم ابھی صائمہ کو تمہاری لاش فراہم کر دیتے ہیں۔“

میں نے ایک دھماکا سنا اور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ لاحول ولا قوۃ... میں نے اس بے سروپا خواب سے جاگ کے کہا۔ اسی وقت دوسرا دھماکا ہوا۔ میرے کانوں نے چوڑیوں کی خفیف سی جھنکار نہ سنی ہوتی تو میں سمجھتا کہ نہار منہ میرے دروازے کو توڑ کے اندر آنے کی کوشش کرنے والا میرا مالکِ مکان ہی ہو سکتا ہے۔ دروازہ کھولتے ہی مجھ پر چودہ طبق روشن ہو گئے۔ خونخوار نظروں سے مجھے گھورتی صائمہ اندر آ گئی۔

”میں تو سمجھی کسی نے قتل کر دیا۔ دشمن بھی تو بہت ہیں تمہارے... کب سے دروازہ پیٹ رہی ہوں۔“

میں نے گھڑی دیکھ کے نیکر کے لباسِ فاخرہ پر بنیان پہنے ہوئے کہا۔ ”صحیح وقت تم ہی بتا سکتی ہو۔ میں تو خواب میں تمہارے ساتھ...“

اس نے باقی جملے کو غلط اندازے کی بنا پر سنسر کر دیا۔ ”بکومت... اور ابھی تک تم نیچے پڑے ہو۔ تین ہفتے پہلے تمہارے بیڈ کی پٹی ٹوٹی تھی۔ شرم آنی چاہیے تمہیں۔“

”دو ہفتے پانچ دن قبل۔“ میں نے کہا۔ ”اور ایسی شرمناک بات ہے تو تم ایک گرے پڑے شخص کے پاس کیا لینے آئی ہو؟“

”تمہیں تو نیا بیڈ لانے کی توفیق ہو گی نہیں۔ چلو میرے ساتھ، میں دلا دوں گی۔“

”ایسی جلدی کیا ہے سویٹ ہارٹ... آ جائے گا جہیز میں جب تم آؤ گی۔“

”یہ نہیں پوچھو گے کہ صبح سویرے مجھے کیوں آنا پڑا؟“

”یہ پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟ اب تم آ گئی ہو دل کے ہاتھوں مجبور ہو کے تو میں اسی قاضی کو بلا لیتا ہوں جو ابھی میرے خواب میں تھا۔“

”ہر وقت خواب... جاؤ منہ دھو کے انسان بنو۔ میں ناشتا بناتی ہوں۔“ وہ جھلا کر بولی۔

جب میں منہ دھو کے نکلا تو وہ عادت کے مطابق میرے کباڑ خانے کو سمیٹ رہی تھی اور صورتِ حال پر رننگ کمنٹری بھی کر رہی تھی۔ ”یہ دیکھو... جوتے میں چاکلیٹ... اور جوتے رکھے ہیں فریج پر... فریج میں کچھ بھی نہیں ہے کہ میں ناشتا بناؤں۔ پرانا کھانا سڑ رہا ہے اور کاکروچ کبڈی کھیل رہے ہیں۔ میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو... کپڑے بدلو... کہیں باہر جا کے کریں گے ناشتا۔“

”تمہارا منہ دیکھتے رہنا بھوکا رہنے سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ چلو... میں تیار ہوں... کپڑے بدل چکا ہوں۔“

”اف... ان کپڑوں میں جاؤ گے میرے ساتھ؟“ کسی روایتی بیوی کی طرح اس نے میلے کپڑوں کے ڈھیر میں سے ایک شرٹ اور پینٹ نکال کے ملاحظہ کی۔ ”ابھی تو یہ پہنو... باقی میں دیتی ہوں ارجنٹ ڈرائی کلین کرانے کے لیے۔“

اس کی جیسی نازک اور مختصر کار میں سرنگوں بیٹھ کے میں نے کہا۔ ”سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے۔ مجھے بھی کپڑوں سمیت ڈرائی کلین کرا دو۔“

”یہ مت کہنا کہ مجھے پھر صبح صبح اٹھا دیا۔“

”نہیں کہوں گا۔ دراصل جو خواب میں دیکھ رہا تھا، وہ ایک ہارر اسٹوری تھا۔ اس سے جاگ جانا ہی بہتر تھا۔ تم میری لاش پر سے گزر کے توپ صاحب کے عقد میں جانے والی تھیں۔“

”اس میں ہارر کہاں سے آ گیا؟ یہ تو کامیڈی ہے۔“

”اس رقیبِ روسیاہ نے میرا یعنی تمہارا حقِ مہر رکھا تھا... تین لاکھ ستائیس ہزار چار سو بیس روپے عند الطلب... چالاک یہودی... نہ وہ مجھے دے گا، نہ میں تمہارا مطالبہ پورا کر سکوں گا۔“

”یہ کیا فضول بات ہے۔ تم یہ نہیں پوچھو گے کہ مجھے کیوں آنا پڑا؟“

”اس میں پوچھنا کیسا... ظاہر ہے میرے عشق نے مجبور کر دیا تمہیں... مزید جدائی برداشت نہ ہوئی مگر میرا خیال ہے کہ تمہارا ناشتے کے لیے مجھے بھیجے کے پائے کھلانے لانا... یہ کوئی اور چکر ہے۔“

اس نے کار کا دروازہ بند کیا۔ ”کیوں تمہیں پسند نہیں؟“

”یہی تو حیرانی ہے۔ تم اپنی پسند پر میری پسند کو ترجیح دے رہی ہو۔ ضرور تمہاری کوئی غرض وابستہ ہو گی۔ ڈاکٹر صائمہ عرف قاتل حسینہ... آہ...“ یہ آخری آہ نتیجہ تھی میرے سر کے دروازے سے ٹکرانے کا۔ اندر ناشتا خوروں کی اکثریت اس سے محظوظ ہوئی۔

”تم نے صحیح اندازہ کیا۔“ وہ آرڈر دینے کے بعد بولی۔ ”میں کچھ پریشان ہوں۔“

”پریشانی کی تو بات ہے۔ عمر نکلی جا رہی ہے اور میرے سوا اچھا رشتہ کوئی رہ گیا ہے تو وہ توپ صاحب ہیں۔“

”میں غزالہ کی وجہ سے پریشان ہوں۔“

"اس سے کہنا کہ زیادہ پریشان نہ ہو۔ آخر چار سال سے وہ میری قائم مقام محبوبہ ہے۔ بہت جلد میں تم سے توبہ کر کے اسے اپنالوں گا۔"

"افوہ۔" وہ جھلا کے بولی۔ "کبھی سنجیدہ بھی ہوجایا کرو۔"

ساتھ والی میز پر سے ایک خاتون نے حسرت سے کہا۔ "دیکھا... کیسے صبح صبح ڈانٹ رہی ہے میاں کو۔"

باخبر شوہر نے قہقہہ مار کے کہا۔ "وہ تو بزدل ہے... میں جانتا ہوں۔"

میں تردید کرنا چاہتا تھا کہ بزدل میں ضرور ہوں مگر صائمہ میری بیوی... ایسی میری قسمت کہاں... لیکن صائمہ نے مجھے مزید ڈانٹا۔ "اسے بڑی عجلت میں پنڈی جانا پڑا۔ اپنے بھائی کی وجہ سے۔"

گرم گرم خستہ پراٹھوں اور پایوں کی مہک اس کی آواز پر غالب آگئی۔ ایک ڈکار لے کر میں نے چائے کا پہلا گھونٹ لے کر پوچھا۔ "تم کچھ کہہ رہی تھیں۔ معاف کرنا میں ذرا مصروف تھا، سنا نہیں۔"

"یہ ہے میری اہمیت تمہارے نزدیک... بھیجے کے پائے سے بھی کم۔" وہ خفا ہوگئی۔

"جانِ من... سچ کڑوا ہوتا ہے چنانچہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ تم پر بھیجا قربان۔"

"نہیں... اب باہر جا کے بات ہوگی۔ جہاں میرے سوا تمہیں کچھ نہ دکھائی دے نہ سنائی دے... اٹھو۔"

باغِ جناح کے ایک ویران گوشے میں وہ میرے ساتھ بیٹھ گئی۔ سیمنٹ کی بینچ اتنی مختصر تھی کہ مجھ پر دوسرا نشہ غالب آنے لگا۔ نشے کا علاج عام کرنا فحاشی کے زمرے میں آتا تھا مگر خلافِ توقع صائمہ کا رنگ لال ہوا... چٹاخ کی آواز کے ساتھ میرا گال نہیں۔ "فیس وصول کرلی۔ اب میری سنو گے۔" اس نے وینٹی بیگ سے لپ اسٹک نکالی۔ "غزالہ کا بھائی غائب ہوگیا... اکلوتا بھائی۔"

"ہوں۔" میں نے غور کر کے کہا۔ "کیسے غائب ہو گیا۔ جیسے محاورے کے مطابق گدھے کے سر سے سینگ... یا بھوت؟"

"وہ اپنی منگیتر کے ساتھ سڑک پار کررہا تھا، کرن آگے تھی۔"

"کرن کون؟"

"وہی... اس کی منگیتر... اگلے مہینے ان کی شادی طے تھی۔"

میں نے کہا۔ "یہ بے صبری ہے یا بے شرمی؟"

صائمہ نے اس اشتعال انگیزی کو نظرانداز کردیا۔ "وہ بینک روڈ پر شاپنگ کررہے تھے۔ وہ کچھ ایسی شاپنگ ہے جیسے یہاں لبرٹی مارکیٹ... اس کے برابر تو نہیں لیکن اچھا شاپنگ سینٹر... ٹریفک وہاں ون وے ہے... تم کو معلوم ہوگا۔"

"ہاں... مری سے واپسی پر ہم نے... میرا مطلب ہے تم نے شاپنگ کی تھی وہاں سے۔"

"کرن نے سڑک عبور کر کے دیکھا تو حامد پیچھے نہیں تھا۔"

"پھر کون تھا اور یہ حامد کہاں سے آگیا بیچ میں؟"

"یار! غزالہ کے بھائی کا نام ہے حامد۔ کرن نے انتظار کیا کچھ دیر... کہ کہیں وہ پیچھے کسی شاپ میں کچھ لینے تو نہیں رک گیا۔ پانچ منٹ کے بعد وہ سڑک پار کر کے واپس گئی جہاں کونے پر بیکری ہے اور اندر دیکھا۔ اس خیال سے کہ وہ کولڈ ڈرنک یا جوس لینے اندر نہ چلا گیا ہو مگر وہ اندر بھی نہیں تھا۔ اس نے باہر بھی اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر کچھ دیر وہیں رکی رہی۔ پندرہ منٹ کے بعد اسے تشویش ہونے لگی۔ حامد یوں بغیر بتائے کہیں بھی نہیں جاسکتا تھا، خواہ کچھ بھی ہوجائے۔ کرن نے کونے پر ایک پھول بیچنے والے کے علاوہ ٹیکسی ڈرائیوروں سے معلوم کیا اور پھر وہیں رک کر ہر طرف دیکھتی رہی۔ اس نے بار بار حامد کے موبائل فون پر بھی کال کی لیکن اسے یہی جواب موصول ہوا کہ مطلوبہ نمبر اس وقت بند ہے۔ یہ بھی تشویش کی بات تھی کیونکہ حامد تو رات کو بھی پاور آف نہیں کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ فون ہو تو بند کر کے رکھنے میں کوئی عقلمندی نہیں۔ کوئی ایمرجنسی میں بھی بات نہ کرسکے۔ کرن نے فون کر کے اپنے گھر اطلاع دی اور وہاں سے حامد کے گھر یہ خبر پہنچی۔ بیس منٹ میں حامد کے والد اپنے ایک داماد کے ساتھ پہنچ گئے اور کرن کے والد اپنے بیٹے کے ساتھ۔ انہوں نے بلاتاخیر قریبی تھانے کو مطلع کیا لیکن انہوں نے ایف آئی آر نہیں لکھی۔ ان کا کہنا تھا کہ صرف ایک گھنٹے لاپتا رہنے والے کو لاپتا نہیں تسلیم کیا جا سکتا۔ رپورٹ کم سے کم چوبیس گھنٹے بعد ہی درج کی جاسکتی ہے۔ دونوں طرف کے گھر والوں نے ہر جگہ سے پوچھا۔ حامد کے دوستوں کو فون کیا مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ ساری رات پریشانی میں گزری۔ حامد کے دوست اور عزیز و اقارب لے اسپتال اور مردہ خانے تک دیکھ لیے حالانکہ حادثے کا امکان ہی نہ تھا۔ حامد اطمینان سے کرن سے چند قدم پیچھے چل رہا تھا اور کسی قسم کا حادثہ ہوتا تو کرن کو وہیں معلوم ہو جاتا۔"

ایک وقفے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے کہا۔ "کیا ایمانداری سے تم یہ سمجھتی ہو کہ حامد واقعی کرن سے ہی شادی کرنا چاہتا تھا... وہ اس شادی سے خوش تھا؟"

"کیسی بات کرتے ہو؟ یہ لَو میرج تھی۔" صائمہ نے خفگی سے کہا۔

"میں سمجھ گیا۔ وہ واقعی لَو کے بعد میرج بھی کرنا چاہتا تھا... میری طرح۔"

"اگلے دن پولیس نے دباؤ پر رپورٹ تو لکھ لی مگر اس کے بعد وہی ہوا جو ہوتا ہے یعنی کچھ نہیں... غزالہ کو فوراً مطلع نہیں کیا گیا تھا۔ اس خیال سے کہ وہ پریشان ہونے کے سوا کیا کرے گی۔ اسے پرسوں اطلاع ملی۔ وہ صبح چلی گئی۔"

اس کے خاموش ہونے کے بعد میں نے اِدھر اُدھر دیکھا کیونکہ صائمہ اتنی ہی محبت سے میری طرف دیکھ رہی تھی، جتنی محبت سے قصائی بکرے کو دیکھتا ہے۔ مجبوراً میں نے کہا۔ "آئی ایم سوری... اللہ سے دعا ہے کہ بچھڑے ہوئے مل جائیں۔"

"میں تم سے دعا کرانے نہیں آئی تھی مولانا... کچھ کرو۔"

"دیکھو بلبلِ جان... کہیں زیادہ بہتر ہوتا اگر مجھ ناچیز سے رجوع فرمانے کے بجائے تم اصلی بابو بنگالی عامل سے رجوع فرماتیں... جتنی رقم تم نے بھیجے پائے کے ناشتے پر ضائع کی، اس سے بہت کم نذرانے میں تمہارا کام ہو جاتا۔"

وہ مجھے خطرناک نظروں سے دیکھتی رہی۔ خطرہ یہ تھا کہ اب وہ آنسوؤں سے مجھ پر حملہ کرے گی۔ "تم مذاق کررہے ہو۔" اس نے آواز میں رقت پیدا کی۔

"اور تم کیا کررہی ہو؟ مجھے بلیک میل۔" میں نے اپنے دفاع میں کہا۔ "بھلا بتاؤ کہ اس معاملے میں تمہاری یا غزالہ کی میں کیا مدد کرسکتا ہوں؟"

"تم سب کچھ کرسکتے ہو... اگر چاہو..."

"میں کرسکتا تو سب سے پہلے توپ صاحب سے اپنے تین لاکھ ستائیس ہزار چار سو بیس روپے کے واجبات وصول کرلیتا... اور اتنا دولت مند ہوجاتا کہ تمہیں چھوڑ کے پریانکا چوپڑا سے شادی کرتا۔ بے شک اسے مشرف بہ اسلام کرنے کے بعد۔"

اس کی آنکھوں میں ایک دم آنسو امڈ آئے۔ "یہ کہو تمہیں اب میری پروا نہیں رہی۔ ورنہ بہت کچھ کیا ہے تم نے میرے لیے۔" وہ بیگ اٹھا کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں نے اس کی کلائی تھام لی۔ "دیکھو، میں ایک غریب کالم نویس یا فضول سے شاعر کے سوا کچھ نہیں... مجھے علامہ تفنگ چنگیزی کے فضول روزنامہ "حقیقت ساز" کے سوا کوئی پوچھتا نہیں۔"

صائمہ نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ "جانے دو مجھے... میں ہی بے وقوف تھی کہ صبح صبح دوڑی چلی آئی۔"

میں نے اسے بلا مزاحمت بٹھا لیا۔ "تم نے مجھے حکم دیا ہوتا تو میں قلابازیاں کھاتا ہوا آتا مگر خیر، بتاؤ مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

اس نے اجازت دی کہ میں اس کے آنسو اپنی ہتھیلی سے پونچھ سکوں۔ "میں کیا بتاؤں... پنڈی جاکے دیکھو... حامد کا پتا چلاؤ۔"

اس وقت آنسوؤں کی نمی کے ساتھ وہ اتنی ہی حسین لگ رہی تھی جتنی بارش کے بعد ملکہ کوہسار مری کی فضا نظر آتی ہے اور میری عقلِ سلیم گھاس چرنے چلی گئی تھی۔ دماغ پر دل کا ناجائز قبضہ ہوچکا تھا، چنانچہ میں نے کہا۔

"اوکے... مگر میری بھی ایک شرط ہے۔"

"اب تم کہو گے کہ مجھے ساتھ چلنا ہوگا۔ میں چلوں گی۔" اس نے ایک قاتل شرمیلی سی مسکراہٹ سے میرے دل پر آخری وار کیا۔ خوب صورت لڑکیوں میں کسی بھی طرم خاں کو حکم کا غلام بنانے کی کیسی فطری صلاحیت ہوتی ہے۔ میں تو بزدل تھا۔ "اور کیا ہوگا چھٹی کا... میٹرنٹی لیو... میرا مطلب ہے میٹرنٹی وارڈ سے..."

"وہ سب میں کرلوں گی۔ ہم آج ہی جاسکتے ہیں... بائی روڈ۔"

"اس چوہے دان میں۔" میں نے نیچے کھڑی صائمہ کی کار کو دیکھا۔ "مرغا بن کے؟"

"نہیں، غزالہ بس سے گئی ہے۔ اپنی کار مجھے دے گئی ہے۔ ہم ایک ساتھ اسی میں واپس آجائیں گے۔" اس نے گویا آخری رکاوٹ بھی دور کردی۔

"ہم ہوٹل اسلام آباد میں ایک کمرا لیں گے۔ وہ بہت سرسبز رومان پرور جگہ ہے۔"

"مگر ہم رومانس کے لیے نہیں جارہے ہیں۔ ہم ٹھہریں گے غزالہ کے گھر میں۔ ڈھوک کالا خان میں۔"

"مگر میرے کپڑے... ڈرائی کلینر کل دے گا۔"

"چلو کل سہی... تمہیں جو لکھ کے دینا ہے لکھ لو۔ توپ

صاحب کو بتا دو۔ میں بھی غزالہ سے پھر پوچھ لوں اور اپنی تیاری کروں۔" وہ پھر اٹھ کے کھڑی ہو گئی۔ "اپنا فون بند مت کرنا۔"

سہ پہر تک کالم اور قطعہ لکھ کر میں پانچویں منزل پر روزنامہ "حقیقت ساز" کے دفتر کی سیڑھیاں چڑھ گیا۔ مرزا تفنگ چنگیزی عرف توپ صاحب عالم استغراق میں دونوں پاؤں کرسی پر سمیٹے آنکھیں بند کیے منہ میں بارہ مسالے والا پان گھوٹ رہے تھے۔ اپنی ناقابلِ اصلاح عادت کے مطابق انہوں نے پیچھے والی کھڑکی کھول کے مرغے کی طرح گردن نکالی، اِدھر اُدھر دیکھ کے پیک کی پچکاری چھوڑتے ہی بڑی مستعدی اور مہارت سے کھڑکی بند کر لی اور مجھے بڑی مسرور نظر سے دیکھا۔

میں نے انہیں شرمندہ کرنے کی ناکام کوشش کی۔ "نیچے صفائی کی مہم تھی آج۔"

وہ انڈا دینے والی مرغی کی طرح کڑکڑا کے ہنسے۔ "ہاں تو یہ داغِ ندامت بھی صاف ہو جائے گا گویا۔ تم فرماؤ آج نہار منہ اس عاشقِ مجبور کے رخِ بے نور کا نظر آنا چہ معنی دارد؟"

"توپ صاحب! میں جا رہا ہوں۔"

"اچھا میاں جاؤ۔ یہ عمر تو نہ تھی تمہارے جانے کی۔ اللہ مغفرت کرے تمہاری۔"

"میں پنڈی جا رہا ہوں، صائمہ کے ساتھ... مجھے تین لاکھ ستائیس ہزار چار سو بیس روپے اسی وقت ادا کر دیں... مجھے ضرورت ہے۔"

"ہوں۔" انہوں نے غور فرماتے ہوئے چھت کو دیکھا۔ "مطالبہ مختصر کر دو۔ ہم دیتے ہیں فی الفور چار سو بیس روپے۔"

"آپ اسے مزید مختصر کر سکتے ہیں، صرف تین لاکھ تک۔ ستائیس ہزار بھی دے دیں۔"

یہ ایک ناقابلِ یقین منظر تھا جب انہوں نے تائید میں سر ہلا کے کہا۔ "اچھا برخوردار! تم بھی کیا یاد رکھو گے کہ ایک خاندانی رئیس سے پالا پڑا تھا۔" اور کثرتِ استعمال سے براؤن ہو جانے والی سیاہ شیروانی کی جیب سے اپنا خزانہ برآمد کیا۔ انہوں نے گن کے رقم میرے حوالے کی۔ "باقی کے لیے یومِ حساب کب آئے گا، انتظار فرمائیے۔ پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ۔"

میں نے جھپٹ کے نوٹ سمیٹے اور دیکھا کہ ان پر شادی مبارک بھی لکھا ہوا نہیں ہے۔ وہ بالکل اصلی نوٹ تھے۔ میں نے غور سے انہیں دیکھا۔ "توپ صاحب خدانخواستہ یہ خیال تو نہیں آ گیا آپ کے دل میں کہ آدمی کو مقروض نہیں مرنا چاہیے... اس عمر میں..."

"عمر کی بات مت کرو عزیزم۔" وہ بولے اور پھر گنگنائے۔ "ابھی تو میں جوان ہوں... اور میاں بزدل اب تو گویا طے کر لیا ہے کہ ہم بھی گھر بسا ہی لیں۔ تم بھی کرو... اس کے بعد دیکھو ہمارے لیے کوئی دلہن۔"

میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "واقعی آپ کے دماغ پر اثر ہے۔"

توپ صاحب نے میز پر ہاتھ مارا۔ "بے تمیز ہو گیا تھا۔ آدمی خطا کا پتلا ہے۔ جب تمہاری اس خیالی منکوحہ... کیا نام ہے اس کا... ڈاکٹر صائمہ... اس نے فون پر ہم سے دردناک اپیل کی کہ تمہارے کوئی دور پار کے چچا پنڈی میں بسترِ مرگ پر لاوارث پڑے ہیں اور تم ان کو پچیس ہزار دینے کے لیے کسی سود خور افغان سے رجوع کرنے کا سوچ رہے ہو... تمہیں کم سے کم اتنی رقم فی سبیل اللہ دے دی جائے... تو بخدا ہم جذباتی ہو گئے تھے۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "یہ صائمہ نے کہا آپ سے... کب؟"

"ابھی تمہارے نزولِ اجلال سے کچھ دیر قبل گویا۔" انہوں نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی۔

اس وقت میری حالت دیکھنے والا میری ذہنی صحت پر شک کرتا۔ میں پہلے ہنسا اور پھر رویا۔ ہنسا میں صائمہ کی ہوشیاری پر تھا اور رونا اس لیے آ رہا تھا کہ اب اتنی بڑی رقم کی جو لاٹری نکلی تھی، اس کا صائمہ کے "تعمیر گھر فنڈ" میں جمع ہونا لازمی تھا۔ میں نے مردہ دلی سے کہا۔ "میں چلتا ہوں۔ چچا زندہ ملے تو ان کے لیے کچھ کروں گا۔ ورنہ یہ رقم خرچ ہو جائے گی کفن دفن پر۔"

توپ صاحب نے بڑی پھرتی سے کرسی پر لٹکی ہوئی چھتری اتاری اور اس کا گول ہینڈل میری گردن میں ڈال دیا۔ "ایسے کہاں برخوردار! پہلے یہاں بیٹھ کے ہفتہ وار کالم اور قطعہ لکھو۔"

میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کے کاغذ ان کے سامنے پھینک دیے۔ "یہ کیا پُرتشدد طریقہ ہے توپ صاحب! میری اکلوتی گردن ٹوٹ بھی سکتی تھی۔"

انہوں نے چھتری واپس لٹکا کے کاغذات اٹھا لیے۔ "تو کیا فرماتے ہیں بزدل صاحب گویا:

ایک ڈھانچے نے بتایا کہ پہلوان تھا وہ

عشق نے آم سے اچور کیا ہائے غضب
جیسے بیماریِ دل نے جو کمانڈو تھا اسے
کورٹ جانے سے بھی معذور کیا ہائے غضب"

"بھئی سبحان اللہ۔" توپ صاحب پھڑک گئے۔ "دل تو چاہتا ہے اس کو صفحۂ اول پر جلی حروف میں جگہ دیں۔ کیا برمحل ارشاد کیا ہے۔"

آفس سے نیچے اترتے ہوئے میں خود کو تسلی دے رہا تھا کہ ابھی تو درمیان میں ایک رات ہے۔ اگر میں سارے یارانِ عزیز کو طلب کر لوں تو آج کا دن مبارک ثابت ہو رہا ہے۔ صبح تک یہ رقم ایک لاکھ ہو سکتی ہے، صائمہ پچیس ہزار ہی ضبط کرے گی نا۔ باقی پچہتر ہزار... میری خوشی کا طیارہ جوڈرون کی طرح انتہائی بلندی پر محوِ پرواز تھا، دھڑام سے لکشمی چوک میں گر کے تباہ ہو گیا۔ آخری سیڑھی کے سامنے صائمہ کار میں میری منتظر تھی۔ میں نے مفرور مجرم کی طرح خود کو اس کی تحویل میں دے دیا۔ پھر تابع داری سے ساری رقم خاموشی سے خون کے گھونٹ پیتے ہوئے اس کے حوالے کر دی۔

"اب پچیس ہزار تو جائیں گے تعمیر گھر فنڈ میں۔" وہ ہنسی۔ "کیسا چکر دیا توپ صاحب کو؟"

"گھر تو نہیں، اس سے میرا مزار بنوا دینا۔" میں نے بھنا کے کہا۔

"دو ہزار چار سو بیس میں تمہاری طرف سے ڈنر... تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔ جتنی جلدی تمہارا اپنا گھر بنے گا، اتنی ہی جلدی میں رخصت ہو کے آ جاؤں گی نئے گھر میں... اب تو اس کرائے کے فلیٹ پر بھی تمہارا جھگڑا چل رہا ہے۔ تمہارے وہ جواری دوست آج ہی رات کو تمہیں کنگال کر جاتے۔ اسی لیے میں آ گئی۔ بولو کیا کھاؤ گے؟"

میں نے ایک سرد آہ بھری۔ "اس وقت تو سنکھیا مل جائے کہیں سے ایک کلو تو..."

لیکن یہ سب کہنے کی بات تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ صائمہ کے عشق کا جادو یوں سر چڑھ کے بولتا تھا کہ میں واقعی بزدل بلکہ وہ بن جاتا تھا جو ایک پسندیدہ عوامی گالی ہے مگر ناقابلِ اشاعت... کچھ دیر بعد جب میں ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے لاؤنج میں چاندنی کو اس کے رخِ روشن پر نثار اور ستاروں کو اس کی آنکھوں میں جوت جگاتے دیکھ رہا تھا تو سب بھول چکا تھا۔ سوائے اس کے کہ میرا وجود صرف صائمہ کے عشق سے ہے۔

☆☆☆

غزالہ کے گھر کی اس جگہ ڈھوک کالا خان جیسے نام سے کوئی مناسبت نہیں تھی۔ وہ ایک نو تعمیر شدہ ایک کنال پر یعنی تقریباً چھ سو گز پر دو منزلہ خوب صورت عمارت تھی۔ دستیاب زمین کا نصف حصہ سرسبز لان اور چھوٹے سے باغ پر مشتمل تھا۔ بہار کے سارے رنگ پھولوں میں اتر آئے تھے اور گرد و پیش کی شادابی کے ساتھ نیلے آسمان کے پس منظر میں مری کے پہاڑوں کا نظارہ پُرسکون و فرحت بخش تھا۔ نصف شب تک کھانے کے بعد کافی پیتے ہوئے ہم سب حامد کی باتیں کرتے رہے تھے۔ اپنی پوری کوشش کے باوجود میں غزالہ کو اپنی "جاسوسانہ" صلاحیت کے بارے میں جذباتی تقریر سے روک نہیں سکا تھا۔ میری چند کامیابیوں کو... جن کو میں ذاتی صلاحیت یا کوشش سے زیادہ اتفاق اور تائیدِ ایزدی سے منسوب کرتا تھا، اس نے یوں پیش کیا جیسے میں ہی شرلاک ہومز کا جدید پاکستانی ایڈیشن ہوں اور ناول کے کردار تو افسانہ ہوتے ہیں درحقیقت پاکستان میں کوئی حامد کو بازیاب کرا سکتا ہے تو وہ جناب بدیع الزماں دلنواز لالہ موسوی عرف بزدل کی ذات والاصفات ہے۔

عام حالات میں اس نے میرے منہ پر میرے بارے میں اتنی اچھی رائے کا اظہار کیا ہوتا تو میں بہت پہلے اسے قائم مقام محبوبہ کی پوسٹ سے ترقی دے کر فل ٹائم محبوبہ مقرر کر دیتا اور صائمہ کو تنزلی کے بعد قائم مقام کے عہدے پر رہنا پڑتا لیکن یہاں معاملہ مختلف تھا۔ غم گزیدہ اور مایوس ماں باپ نے مجھ سے غیر ضروری توقعات وابستہ کر لی تھیں اور مجھے یوں دیکھ رہے تھے جیسے میں الہ دین کے چراغ سے بھی سپر چیز ہوں اور بس چٹکی بجانے میں حامد کو سامنے لا کھڑا کروں گا۔ میری تردید کو انکساری سمجھا گیا اور غزالہ کے والدین بار بار آہ بھر کے یہی کہتے رہے کہ "بس بیٹا! اب اللہ کے بعد تم سے ہی امید ہے... پولیس تو کچھ کرے گی نہیں۔"

خود صائمہ مسلسل اپنی سہیلی کے بیان کی تائید میں سر ہلاتے ہوئے مجھے صدقے واری جانے والی پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی اور یوں فخر کر رہی تھی جیسے اس گوہرِ نایاب کو دریافت کر کے خدمتِ خلق کے لیے وقف کرنے کا سہرا اسی کے سر ہے۔ مجھے اس کی اداکاری پر خوشی نہیں تھی، طیش آ رہا تھا کیونکہ خلوت میں جو خطابات اس نے مجھے دیے تھے یا خود ڈاکٹر غزالہ کا تحفہ تھے، ان میں... جواری،

... کون ہوں... توبہ... خانہ بدوش... وغیرہ تھے۔ میں غیر ذمے دار تھا۔ کالم نویسی اور قطعہ نگاری سے محض مزاح پیدا کرتا تھا یا شہرت حاصل کرتا تھا۔ جو پیسا ملتا تھا ان چوروں، ڈاکوؤں سے ملتا تھا جن کا میں سرکاری ترجمان اور وکیل بنا ہوا تھا۔ جو ایک افسوسناک، خطرناک، شرمناک بات تھی مگر مجھے ناک کٹنے کا قطعی احساس نہ تھا... وغیرہ وغیرہ۔

ابھی ہنی مون ایک خواب پریشاں تھا مگر صائمہ کی رفاقت سے میں خوش تھا۔ نہ سہی وصل تو حسرت ہی سہی۔ اور ناممکنات کے فلمی خواب بھی دیکھ رہا تھا کہ کسی ہوٹل میں صرف ایک ہی کمرا ہے اور وہ بھی سنگل... یا جو کمرا صائمہ کو ملا اس میں بھوتوں کا ڈیرا ہے اور وہ رات کو تھر تھر کانپتی میرے کمرے میں آ گئی ہے۔ راولپنڈی میں بادل خوب گرج چمک کے ساتھ برستے ہیں، شاعر کا کہا سچ ہو جائے... لپٹ جاتے ہیں وہ بجلی کے ڈر سے... خدایا یہ گھٹا کچھ دن تو برسے۔

لیکن اچانک میرے قائم مقام ساس اینڈ سسر نے بڑی شفقت سے فرمایا۔ ”ابھی تو خیر بہت رات ہو گئی ہے۔ تمہارے لیے اوپر کمرا تیار ہے۔ غزالہ کہتی ہے کہ وہ صائمہ کو نیچے اپنے بیڈروم میں رکھے گی۔“

ایک دیوار نہیں بلکہ ایک منزل کی دوری نے میرے تمام رومان کا خاتمہ کر دیا۔ اس رات بادل بھی گرجے اور بجلی بھی چمکی مگر باقی سب صرف خواب میں ہوا جو میں نے سوچا تھا۔ صبح میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو ایک نئی اجلی صبح تھی۔ سبزے پر دونوں سہیلیاں سفید لباس میں مرغابیوں کی طرح ٹہل رہی تھیں۔ میں نے لان تک پہنچنے کا راستہ دریافت کیا۔

”کافی پیو گے؟“ غزالہ نے پوچھا۔

”کمال ہے، کیا یہاں مہمانوں سے پوچھا جاتا ہے کہ ناشتا کرو گے... کھانا کھاؤ گے؟“

وہ صائمہ سے خالی مگ لے کر اندر گئی تو میں نے کہا۔ ”بے شک اس خوب صورت منظر میں تم مجھے آسمان سے اتری مخلوق لگ رہی ہو لیکن جو کل رات تم نے کیا، اس سے یہ بات درست ثابت ہوتی ہے کہ... خدا یا حسن دیتا ہے یا عقل... مجھے اتنا بانس پر چڑھانے کی کیا ضرورت تھی؟“

وہ خفگی سے بولی۔ ”لو، تمہاری تعریف کی تو کیا برا کیا۔ سچ بولنا بھی گناہ بن گیا میرا۔“

”صائمہ ڈیئر! تم نے ان پریشان حال لوگوں کی توقعات بڑھا دیں۔ میں کچھ نہ کر سکا تو وہ پہلے سے زیادہ دکھی ہوں گے۔ اس سچ سے جھوٹ بہتر جس سے ... ہو۔“

”میری خاطر تم کوشش تو کر سکتے ہو۔“

”یہ تم ایکسپلائٹ کر رہی ہو مجھے... تم میری خاطر ایک چھوٹا سا کام کرو۔“

”کیسا کام؟“

کچھ آگے بڑھ کر میں نے کہا۔ ”ایسی حسین صبح کا آغاز... اگر...“

وہ پیچھے ہٹ گئی۔ ”تھپڑ ماروں گی جو یہاں بدتمیزی کی۔“

”لاحول ولاقوۃ... تم لڑکیاں ہر وقت خوابوں کی دنیا میں ایسے قابلِ اعتراض مناظر کیوں دیکھتی رہتی ہو۔ یار، میں تو کہہ رہا تھا کہ میری تمام حق حلال کی کمائی پر تم نے غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ دس روپے تو دے دو مجھے۔“

غزالہ مسکراتی ہوئی نمودار ہوئی اور اس نے مگ مجھے تھما دیا۔ ہم لان پر رکھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

میں نے کہا۔ ”سویٹ ہارٹ! رات کو میں نے تمہارے والدین کے سامنے حامد کے ذکر سے گریز کیا تھا۔ ماں کا دل ایسا ہی ہوتا ہے لیکن تم ڈاکٹر ہو... زیادہ حقیقت پسند... تم بتاؤ کہ تم کیا سوچتی ہو؟ حامد کا یوں غائب ہو جانا کیا ہے؟“

”میرا ذہن تو صرف اغوا کی طرف جاتا ہے۔“

”اغوا بے وجہ نہیں ہوتا۔ یہ پولیس نے بھی کہا ہوگا۔ ابھی تک کسی نے تاوان طلب نہیں کیا۔ آج چوتھا دن ہے۔ نہ حامد سے رابطہ کرایا۔ یہ پیشہ ور اغوا کاروں کا طریقۂ کار نہیں۔ مزید یہ کہ اس جگہ سے حامد کو اٹھانا سڑک پر پڑا اسکر اٹھانا نہیں تھا کہ نہ کوئی دیکھے، نہ اہمیت دے۔ وہ خود بھی جوان مرد تھا، مزاحمت کرتا...“

”کیا یہ ناممکن ہے کہ کار قریب آ کے رکے اور کوئی حامد کو کھینچ لے۔ مزاحمت سے پہلے اس کی ناک پر کلوروفارم میں بھیگا رومال رکھ دیا جائے اور گاڑی نکل جائے۔“

”تھیوری میں یہ منظر ممکن ہے، عملی طور پر شاید ناممکن... ایسا کرنے میں بھی دس پندرہ سیکنڈ تو لگ جائیں گے۔ وہاں ون وے ٹریفک ہے۔ یہ واردات ہوئی سگنل کے قریب۔ میں فرض کر لیتا ہوں کہ اس وقت ٹریفک رکا ہوا تھا اور یہ گاڑی بھی سب سے آگے... کس کس نے یہ منظر دیکھا ہوگا۔ نمبر ون... زیبرا کراسنگ پر سے گزرنے

والے... نمبر دو... کارنر پر مسافروں کا انتظار کرنے والے ٹیکسی ڈرائیورز... نمبر تین... دکان دار اور وہاں موجود گاہک... نمبر چار... اس کار کے ڈرائیور اور پسنجر نے جو بالکل پیچھے رکی ہوئی تھی۔ اس نے تو نمبر بھی نوٹ کیا ہوگا مگر وہ خاموشی سے نکل گیا۔“

غزالہ نے کچھ سوچتے ہوئے اقرار میں سر ہلایا۔ ”پرائے پھڈے میں کوئی نہیں پڑتا۔“

”رائٹ، یہ ایک خود غرضانہ سوچ ہے جو پولیس کے علاوہ ہمارے نظامِ انصاف نے پیدا کر دی ہے۔ بہادر اور قانون کا مددگار بننا مہنگا پڑتا ہے۔ دیکھنے والے نظر چرا جاتے ہیں اور خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ واردات کا شکار ہونے والے وہ نہیں... بعد میں تھانہ کچہری کے چکر لگانے کے لیے نہ کسی کے پاس فرصت ہے اور نہ حوصلہ... یہ ڈر اپنی جگہ کہ چشم دید گواہ بننے کی حماقت کی سزا دینے مجرم اس کے گھر نہ پہنچ جائیں۔“

”بالکل یہی بات ہے۔“ غزالہ نے اداسی سے کہا۔ ”پولیس کا بھی یہی موقف ہے۔“

”انہوں نے دکان داروں سے پوچھا؟“

”ہاں لیکن وہ انجان بن گئے ہیں۔ کہتے ہیں ہماری توجہ گاہکوں پر تھی۔ ہم باہر نہیں دیکھ رہے تھے۔ ایک نے کہا کہ اس کی دکان تو بند تھی۔ تیسرے نے کہا کہ وہ نماز پڑھنے گیا ہوا تھا۔ سب جھوٹ... سچ یہ ہے کہ پولیس خود بھی دلچسپی نہیں لے رہی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ وقت گزار دیں۔ فرض شناسی کا لگا بندھا ڈراما چل رہا ہے۔ ابو بھی ان کی ذہنیت کو سمجھتے ہیں۔ انہوں نے خرچہ پانی کے لیے دس ہزار تو دے دیے، مزید کی آس دلا دی ہے۔ وہ حامد کا سراغ لگا لیں تو ابو خوشی سے ایک لاکھ بھی دے دیں گے۔“

”غلط ہونے کے باوجود میں اس رویے کو غلط نہیں کہہ سکتا۔ یہ تمہارے ابو کی مجبوری تھی۔ فریادی اب اس کے عادی ہو گئے ہیں... خیر، اب میں آتا ہوں کچھ بے حد پرسنل سوالات کی طرف۔ حامد کا نہ سہی... تمہارے ابو یا امی کا کوئی دشمن... دشمنی کی وجہ بہت پرانی بھی ہو سکتی ہے۔“

”مثلاً؟“ صائمہ نے سہیلی کے وکیل کی حیثیت سے پوچھا۔

”مثلاً... کسی نے کبھی اپنی بیٹی کے لیے حامد کا رشتہ مانگا ہو اور تمہارے والدین نے انکار کر دیا ہو۔ یا خود حامد نے... یا تمہاری ہونے والی بھابی کا کوئی...“

”یقیناً ایسے لوگ ہیں مگر وہ شریف لوگ ہیں۔“

”میں اس جواب کا مطلب یہ لوں گا کہ شریف نظر آتے ہیں تمہیں۔ ایسا ہی ایک اور سوال ہے۔ حامد کا کوئی افیئر جو ناکام ہوا... ویسے تو نوجوانی کے تجربات بہت ہوتے ہیں اور ہر سچی محبت کا انجام عقد پر نہیں ہوتا اور بھائی بھی بہنوں کو کچھ بتاتے نہیں۔“

”دو لڑکیاں تو سسرال میں خوش و خرم بیٹھی ہیں۔ ایک ہے کچھ بگڑی ہوئی اولاد... رئیس ماں باپ کی... اس کا مجھے علم نہیں۔“

”بھائی تم سے اپنے رومینٹک ایڈونچرز شیئر کرتا تھا؟“

”نہیں لیکن مجھے پتا چل جاتا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”ابھی یہ سوال بے مقصد اور غیر ضروری ہوگا کہ کیا اسی طرح بھائی بھی اندازہ کر لیتا ہوگا۔ جواب میں تم بن جاؤ گی معصوم... اس لیے مجھے اس لڑکی کے بارے میں بتاؤ۔“

”میرا خیال ہے... بلکہ میں نے بھائی کو خبردار بھی کیا تھا کہ اس سے راہ و رسم نہ رکھیں۔ وہ اچھی لڑکی نہیں ہے۔“

”تمہیں کیا برائی نظر آتی تھی اس میں؟“

غزالہ نے رک کر کہا۔ ”بس... وہ بدنام تھی۔ ہم لڑکیوں میں کئی بار اس کے اسکینڈل ڈسکس ہوئے۔ وہ کچھ نفسیاتی تھی۔ گھر کا ماحول، والدین کا رویہ... وہ کئی سال کی لڑائی کے بعد الگ ہو گئے تھے۔ بیٹی کی تحویل کے لیے عدالت میں لڑتے رہے۔ دونوں بیٹی کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکاتے رہے اور الزام تراشی میں جھوٹ کو انتہا تک لے گئے۔ اس سے پہلے طلاق کے مسئلے پر انہوں نے ایک دوسرے پر بہت کیچڑ اچھالا تھا۔ وہ لڑکی نہ ایک طرف تھی نہ دوسری طرف۔ ایک رسہ کشی کے عذاب میں مبتلا تھی کہ کیا کرے۔ کسے اچھا سمجھے کسے برا۔ اگر نانی دادی یا ماموں ہوتے تو وہ گھر سے چلی جاتی۔ دونوں کو چھوڑ دیتی۔ اور میں نے سنا تھا کہ ایک بار وہ گھر سے نکل گئی تھی۔ تین دن نہ جانے کہاں رہی۔ کسی شخص نے فجر کی نماز کے لیے جاتے وقت پارک کے ایک گوشے میں اسے بینچ پر سوتا دیکھا۔ وہ مسجد اسی پارک میں ہے۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ وہ شریف آدمی اسے اپنے گھر لے گیا اور پھر اس کی بیوی نے بڑی ہوشیاری سے اسے روک کے رکھا اور سب پوچھ کے واپس اپنے گھر پہنچا دیا۔ میں اس واقعے کی تصدیق نہیں کر سکتی لیکن

اسے جھوٹ یا کسی کا پروپیگنڈا ابھی نہیں کہہ سکتی۔ عموماً لڑکیوں کو اس سے ہمدردی بھی۔"

"وہ تمہاری کلاس فیلو تھی؟"

"ہاں، سیکنڈ ایئر ایم بی بی ایس تک... حامد سرکاری اسپتال میں ڈاکٹر تھا۔"

میں چونکا۔ "حامد ڈاکٹر ہے، یہ تو مجھے کسی نے نہیں بتایا تھا۔"

"فائنل ایئر کی لڑکیاں اسپتال جاتی تھیں۔ نگہت... یہ اس لڑکی کا نام ہے، ان کے ساتھ بلاوجہ شامل ہو جاتی تھی۔ یوں حامد کے ساتھ افیئر شروع ہوا۔ اب میں کیا کہوں... وہ ہوشیار لڑکی تھی۔ خوب صورت بھی... اس نے میڈیکل کی تعلیم سے زیادہ لڑکوں کو امپریس کرنے... صاف بات یہ ہے کہ پھانسنے کا فن سیکھا تھا۔ لیکن ہر بار اس کی بدنامی سے زیادہ اس کے مزاج اور فطرت کی خرابی آڑے آجاتی تھی۔ اسے تم شخصیت کی خامی سمجھ لو۔" وہ کچھ دیر رکی۔ "میں کسی ثبوت کے بغیر الزام نہیں لگاتی مگر جانتی ہوں کہ لڑکے زیادہ تر شکاری ہوتے ہیں۔ لڑکیاں سوچتی ہیں گھر بسانے کا... لڑکے وقت گزارتے ہیں، دل لگی کرتے ہیں۔"

میں نے ایک آہ بھر کے صائمہ کو دیکھا۔ "یہاں تو معاملہ الٹا ہے۔"

"کیونکہ تم خود الٹے ہو۔ الٹی کھوپڑی کے... جو کماتے ہو جواری یاروں میں لٹا دیتے ہو۔ گھر بسانے والے ہوتے تو اب تک..." صائمہ بھڑک اٹھی۔

"یار، اس وقت بھی وہی لڑائی۔" غزالہ اٹھی۔ "چلو اندر، امی ابو ناشتے پر انتظار کر رہے ہوں گے۔"

میں نے کہا۔ "ان مسماۃ نگہت کے بارے میں اور کیا بتا سکتی ہو تم؟ بلکہ کیا یہ ممکن ہے کہ تم مجھے اس سے ملوا دو۔"

"کوئی فائدہ نہیں۔ وہ جانتی ہے تمہیں... تمہارے گلے پڑ جائے گی۔ اگر تم نے شک ظاہر کیا یا سچ بولنے کی حماقت کی... اور تم جس لائن پر سوچ رہے ہو، وہ غلط ہے۔ نگہت یہ نہیں کر سکتی۔"

"کرا تو سکتی ہے۔" میں نے بے خیالی میں کہا۔

پورا گھر ایک افسوسناک ماتمی سوگوار فضا میں ڈوبا ہوا تھا۔ غزالہ زیادہ ہمت سے کام لیتے ہوئے ماں باپ کو بھی سنبھال رہی تھی اور میزبانی کے فرائض بھی نبھا رہی تھی۔ اس کے والد کی عمر ساٹھ کے قریب تھی اور ان کی صحت بھی بری نہیں تھی مگر جوان بیٹے کے غم میں وہ خاموش بیٹھے خلا میں گھورتے رہتے تھے اور کبھی بلاوجہ اچانک یوں چونک پڑتے تھے جیسے کسی نے انہیں پکارا ہو۔ وہ سوالیہ نظروں سے مجھے، صائمہ اور غزالہ کو اور اپنی بیوی کو دیکھتے تھے اور دوبارہ دیوار کو دیکھنے لگتے تھے۔ غزالہ کی ماں یقیناً کم عمر ہوگی لیکن شوہر کے مقابلے میں اس کی صحت اچھی نہیں تھی۔ وہ دبلی پتلی اور کمزور تھی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے بہتے رہتے تھے جن کو وہ دوپٹے کے پلو سے پونچھتی جاتی تھی اور زیرلب کچھ پڑھتی رہتی تھی۔ ظاہر ہے وہ دعائیں ہوں گی یا درود و وظائف... ایک ماں کے دل پر کیا بیت رہی ہوگی... شاید میں اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ صرف غزالہ کے مجبور کرنے پر انہوں نے ناشتے میں ایک دو لقمے کھائے اور چائے لے لی۔ ان سے ہمدردی اور تسلی کے دو بول بولنے کے سوا میں کیا کر سکتا تھا۔ میری معلومات کا ذریعہ اب صرف غزالہ تھی۔

صائمہ نے اشارے سے مجھے باہر بلا کے ڈانٹا۔ "گھر میں بیٹھے صرف باتیں بناتے رہو گے یا کچھ کرو گے بھی؟"

"خاتون! یہ حقیر فقیر پرتقصیر کر رہا ہے اپنی بساط کے مطابق۔"

"یہ تو وہی بندر والی بات کی ہے تم نے۔"

"بندر والی بات...؟" میں نے برہمی سے کہا۔ "تمہارا یہ خیال ہے تو پھر میں ابھی واپس چلا جاتا ہوں۔" میں واک آؤٹ کے انداز میں واک ران کر گیا۔ صائمہ میرے پیچھے لپکی۔

شیر کے مظالم سے پریشان جانوروں نے ذہین سمجھے جانے والے بندر کو اپنا بادشاہ بنا لیا۔ شیر حسب سابق روز کسی جانور کو اسی طرح ہڑپ کرتا رہا جیسے ہمارے بادشاہ سرکاری خزانے کو کرتے ہیں۔ بندر کو منتخب کرنے والے فریاد لے کر گئے اور کہا کہ حضور کچھ کیجیے... بندر نے انہیں صبر کی تلقین کی اور ایک درخت سے دوسرے درخت پر چڑھتا اترتا رہا اور ادھر سے ادھر چھلانگیں لگاتا رہا۔ فریادی بہت دیر یہ تماشا دیکھتے رہے۔ جب صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو انہوں نے احتجاج کیا۔ "آپ نے کچھ نہ کیا تو آج کسی اور کی جان جائے گی۔"

بندر نے خفگی سے کہا۔ "دیکھتے نہیں میں کتنی دوڑ دھوپ کر رہا ہوں۔ اب کیا اپنی جان دے دوں؟ جاؤ کسی اور کو بادشاہ منتخب کر لو۔"

صائمہ میرے احتجاج کو سمندر کے جھاگ سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی تھی۔ اس نے اندر آ کے مجھے میرے کمرے

میں گھیر لیا۔ "ناراض کیوں ہو... میرا مطلب تھا کہ پولیس سے بات کرو۔" اس نے میرے گلے میں بانہیں ڈال کے کہا۔

حوصلہ ہوتا تو میں خفگی کا ڈراما اس رشوت کے بعد بھی چلاتا مگر میں بزدل تھا۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھانے کے بعد کہا۔ "ناراض کون کافر ہو سکتا ہے تم سے... بس حکم دو اور میں جاتا ہوں پولیس اسٹیشن سر کے بل۔"

غزالہ کھنکھار کے اندر آئی۔ "آئی ایم سوری، میں نے ڈسٹرب کیا۔ وہ... پولیس اسٹیشن سے فون آیا تھا، وہ پھر آ رہے ہیں تفتیش کے نام پر دماغ چاٹنے۔"

میں نے جھینپ کے کہا۔ "ان سے میں نمٹ لوں گا... فکر مت کرو۔"

"وہ اب ایس پی ہو گئے ہیں نا... تمہارے نامزد برادر ان لا..." غزالہ نے مجھے یاد دلانے کی کوشش کی۔

اس کا اشارہ رحم دل خاں کی طرف تھا جو اب میرے دیے ہوئے ظالم خاں کے نام سے زیادہ مشہور تھا۔ اس نے خود کو زبردستی صائمہ کا بھائی بنا لیا تھا اور میرے احتجاج کے باوجود صائمہ اس رشتے کو تسلیم کرتی تھی۔

اپنی خودی کو بلند رکھنے کے لیے میں نے کہا۔ "وہ سالا اتنا قابل ہوتا تو صائمہ مجھے کیوں لاتی یہاں... اپنے ناجائز بھائی سے کہہ دیتی۔"

صائمہ نے احتجاج کیا۔ "وہ پہلے تمہارا دوست تھا اور اس کے پاس ہی دوڑے جاتے ہو تم ہر کام کے لیے... وہ ناجائز کیسے ہو گیا آج؟"

"جب تک تم میری شرعی منکوحہ نہیں ہو، اس کی تقرری ناجائز ہی رہے گی۔"

غزالہ ہماری بے موقع نوک جھونک کی عادی تھی۔ باہر سے ہارن کی آواز پر وہ پیچھے ہٹی۔ "وہ آ گئے شاید۔"

تفتیش کار ایک روایتی تھانے دار تھا۔ ایک عظیم توند کا مالک جو ہر لمحہ پھٹنے کے قریب محسوس ہوتی تھی۔ سفاک چہرے، غصیلی آنکھوں اور سوا تو بجاتی مغرور مونچھوں والا... میرے یا کسی کے کہنے سے قبل ہی وہ صوفے میں دھنس گیا۔ اس کا بانس جیسا حواری حوالدار مؤدبانہ انداز میں کچھ فاصلے پر براجمان ہوا۔ رجسٹر یا فائل اٹھا کے لانے والا منشی دست بستہ انداز میں کھڑا رہا۔ پھر وہ تیسرے صوفے پر یوں بیٹھ گیا جیسے اچانک اٹھ کر بھاگ لے گا۔

میں نے تھانے دار کے ساتھ بیٹھ کے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "سب انسپکٹر زمرد خاں! کیسے آنا ہوا؟"

اس نے گھور کر مجھے دیکھا۔ اس کے ماتحتوں نے تھانے دار کو سب انسپکٹر کہنے... اس کے ساتھ بیٹھنے اور اس بے تکلفی سے سوال کرنے پر آنکھوں ہی آنکھوں میں اجازت مانگی کہ اس گستاخ کے خلاف کسی سنگین جرم مثلاً اسلحہ یا ہیروئن رکھنے کا پرچہ کاٹ دیا جائے بلکہ اس کی برآمدگی بھی ظاہر کر دی جائے۔

"کیا مطلب ہے اوئے تمہارا... ہم اغوا کے کیس کی تفتیش کرنے آئے ہیں۔" تھانے دار غرایا۔ "کون ہو تم؟"

"میں؟... میں بزدل ہوں۔"

"بنتا تو بہت بہادر ہے... کارِ سرکار میں مداخلت کرتا ہے۔"

غزالہ نے فوراً دخل اندازی کی۔ "یہ مشہور صحافی ہیں۔ ان کے کالم چیف منسٹر اور تمہارے آئی جی تک پڑھتے ہیں۔ بزدل ان کا قلمی نام ہے... اور تخلص بھی۔"

"قلمی نام...؟ قلمی آم تو سنے تھے۔ یہ تخلص کیا ہوتا ہے جی؟" وہ مزاحیہ انداز میں مجھ سے مخاطب ہوا۔

"وہ تمہارے کام کی چیز نہیں... چھوڑو، یہ بتاؤ اغوا کس کا ہوا ہے؟" میں نے کہا۔

"اپنے ڈاکٹر حامد صاحب کا۔" گرگٹ کی طرح رنگ بدل کے وہ باادب ہو گیا۔

"آئی سی، گویا اغوا کا ثبوت مل گیا ہے تمہیں... پھر تو یہ گمشدگی کا کیس نہیں رہا۔"

وہ سٹپٹایا۔ "وہ جی... میرا مطلب تھا... لگتا ایسا ہے... اور مدعی بھی کہتا ہے، ابھی ہم تفتیش کر رہے ہیں۔"

خاتون بہت خوش جمال مگر بدخصال تھیں۔ تلخیوں سے بچنے کے لیے شوہر نامدار ہمیشہ اپنی زبان بند رکھتے، دل ہی دل میں جلتے بھنتے رہتے، اپنی تو بیاہتا بیوی کی دل آزاری کے خیال سے کوئی حرف شکایت زبان پر نہ لاتے۔

ایک صبح ان کی بیوی نے بہت ناز و ادا کے ساتھ ان سے شکوہ کیا کہ رات کو وہ نیند کی حالت میں اسے بہت برا بھلا کہہ رہے تھے۔

شوہر نے بے رخی سے بیوی کی شکایت سنی اور تلخی سے کہا۔ "مجھے سب معلوم ہے، تمہیں جان لینا چاہیے کہ اس وقت میں پوری طرح جاگ رہا تھا۔"

بھکر سے دانش نواز کا چٹکلا

میں نے کہا۔ ”مجھے میرے برادرانِ لا نے اطلاع دی ہے کہ تفتیشی ٹیم کا سربراہ اسے بنا دیا گیا ہے۔ تم کو تو معلوم ہوگا... ایس پی ظالم خاں۔“

اس کے ماتھے پر دوبارہ ناگواری کی شکن آگئی۔ ”ظالم خاں تو کوئی نہیں پولیس فورس میں۔“

میں ہنسا۔ ”سوری، میں کہتا ہوں اسے... اصل نام ہے رحم دل خاں۔“

وہ ہکلایا۔ ”رحم... دل... خاں... اچھا؟ مجھے معلوم نہیں تھا... کب تشریف لا رہے ہیں آپ کے برادرانِ لا... ٹیم میں میرا نام بھی ہوگا۔“

میں نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ”مشکل ہے... تمہاری پروگریس چار دن میں صفر ہے۔“

”ایسی بات نہیں سر! ہم نے وقوعہ کا جائزہ لینے کے بعد گواہان کو تلاش کیا اور بیانات لیے۔“

”لیکن چشم دید گواہ سامنے کوئی نہیں آیا؟ رائٹ... کیا تم جانتے نہیں کہ ہمارے ملک میں اب چوری، ڈکیتی، قتل اور اغوا جیسی وارداتیں تو ہر جگہ ہر روز بلکہ ہر وقت ہوتی ہیں۔ کمال یہ ہے کہ چشم دید گواہ ایک بھی نہیں ہوتا۔ تم اس چیز کی تلاش میں کیوں وقت ضائع کرتے ہو جو اس ملک میں پہلے ہوتی تھی۔ بہت سی چیزیں ہیں جو نایاب ہیں... تاریخ میں ان کا ذکر باقی رہ گیا ہے۔ مثلاً فرض شناسی، خالص دودھ، انصاف، دیسی گھی۔“

وہ منہ کھولے دیکھتا رہا اور جی جی کرتا رہا۔

میں نے اپنا کالم جاری رکھا۔ ”تم دیکھ رہے ہو کیسے اور بھی بہت کچھ ختم ہو رہا ہے۔ چوبیس گھنٹے بجلی، گیس، پانی، ریل کا سفر، پی آئی اے۔ تو میاں تھانے دار... چشم دید گواہ کہاں ملے گا۔ خیر، یہ بتاؤ تم نے بیان کس کا لیا؟“

”ان دکان والوں کا سر... جو وقوعہ پر دکان رکھتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”تمہاری سمجھ میں یہ بات آتی ہے؟ ایک جیتا جاگتا فل سائز آدمی دن دہاڑے سب کے بیچ میں سے غائب ہو گیا اور کسی نے نہیں دیکھا؟ ایسے تو بھوت غائب ہوتے ہیں اور وارث حلفیہ کہتے ہیں کہ وہ انسان تھا۔“

”وہ تو آپ نے بجا فرمایا... لیکن...“

”تمہارا کتنا تجربہ ہے پولیس میں نوکری کا؟“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

”اٹھارہ سال جناب عالی۔ آپ ایس پی صاحب سے میری سفارش کریں۔“

میں نے جیسے اس کی بات ہی نہیں سنی۔ ”تمہارا تجربہ کیا کہتا ہے... بندہ کدھر گیا؟“

”لگتا تو ایسا ہے سر... کہ اغوا کا کیس ہے۔“

میں نے اپنی جرح جاری رکھی۔ ”اغوا کا بھی مقصد ضرور ہوتا ہے۔ کسی نے کیوں اغوا کیا؟“

”اغوا برائے تاوان تو اب ایک پیشہ بن گیا ہے سر۔“

میں نے کہا۔ ”ایسی صورت میں اغوا کار کیا کرتے ہیں؟ آج پانچواں دن ہے۔ وہ خاموش بیٹھے ہیں۔ نہ تاوان کا مطالبہ سامنے آیا ہے، نہ ڈاکٹر حامد سے رابطہ کرایا ہے۔“

وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ”کسی کی دشمنی ہوئی تو... مغوی کی جان بھی لے سکتا ہے۔“

میں نے پینترا بدلا۔ ”جب یہ واردات ہوئی تو وقت کیا تھا؟“

”مسماۃ کرن... نے گیارہ بجے کا وقت لکھوایا تھا۔“ وہ ایف آئی آر دیکھ کے بولا۔

”دن کے گیارہ بجے کون سی نماز ہوتی ہے؟“

”نماز؟“ وہ بھونچکا رہ گیا۔ ”کوئی نہیں سر۔“

”ایک دکان دار نے یہ بیان بھی دیا تھا کہ وہ نماز پڑھنے گیا ہوا تھا... دوسرے نے کہا کہ اس کی دکان بند تھی۔ تم نے پوچھا کہ دکان کیوں بند تھی؟“

وہ بغلیں جھانکنے لگا۔ ”ابھی پوچھ لیتے ہیں سر۔“

”یہ واردات ٹریفک سگنل پر ہوئی۔ کیا اس وقت ٹریفک رکا ہوا تھا؟ سگنل ریڈ تھا؟“

”ہاں جی، مسماۃ کرن کے مطابق جب اس نے سڑک کراس کی...“

”کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ڈاکٹر حامد کو گھسیٹ کر کسی گاڑی میں ڈال لیا گیا... سگنل اسی وقت گرین ہوا اور وہ گاڑی نکل گئی۔“

”ہو سکتا ہے سر... کیوں نہیں ہو سکتا... بلکہ ایسا ہی ہوا ہوگا۔“

”رائٹ... تو ایسی صورت میں اس گاڑی کے پیچھے جس میں ڈاکٹر حامد کو اغوا کیا گیا، دوسری گاڑی رکی ہوئی ہوگی۔ اس کے ڈرائیور نے سب دیکھا ہوگا اور نمبر بھی نوٹ کیا ہوگا۔“

”جی سر! لیکن معلوم نہیں وہ کون تھا؟“

”کیا یہ معلوم کرنے کا کوئی طریقہ تمہاری عقل شریف میں آتا ہے؟ جاؤ اپنے افسرانِ بالا یا کسی عقلمند سے مشورہ کرو کہ اس چشم دید گواہ کو کیسے تلاش کیا جائے اور اس نمازی

دکان دار کے علاوہ دوسرے بندے کو بھی بلاؤ جس کی دکان بند تھی۔ میں ابھی ڈی آئی جی صاحب سے ملنے جا رہا ہوں۔ واپسی میں آؤں گا تمہارے پاس۔“

وہ کسی عالمِ نزع کے مریض کی طرح اٹھا۔ جی سر، جی سر کہتے اس کی زبان سوکھ گئی تھی لیکن اس کا مستقبل مزید تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔ ”سر! ہمارا کچھ خیال کریں۔“ وہ مردہ آواز میں بولا۔

”زمرد خاں! میں بھی رشوت لیے بغیر کسی کا کوئی کام نہیں کرتا۔ کتنے لیے تھے تم نے ڈاکٹر حامد کے والد سے؟ اس کے دگنے مجھے دو گے تو میں زبان ہلاؤں گا۔“

نہایت ڈھٹائی اور بے شرمی کے ساتھ اس نے ہاتھ ایک جیب میں ڈالا اور کچھ بڑے نوٹ برآمد کیے۔ ”یہ دگنی رقم ہے سر، میری ترقی ہونے والی ہے انسپکٹر کے عہدے پر...“

”قتل کے کیس کو دبانے کے لیے تم کیا نذرانہ لیتے ہو؟ میرا مطلب ہے ایف آئی آر سے کیس خراب اور کمزور کرنے کا... یہ اپنے پاس رکھو... تھانے میں بات کریں گے۔“

اس کے جاتے ہی غزالہ کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔ ”چودہ طبق روشن کر دیے تم نے... مگر جو تم نے جھوٹ بولا۔“

”جھوٹ تو میرا ناجائز سالا اپنی بہن کی خاطر زیادہ بول سکتا ہے اور بولے گا۔ ڈی آئی جی سے تو میں اخلاقاً بھی ملتا۔ کبھی وہ بھی تھانے دار تھا اور جب وہ انسپکٹر سے ڈی ایس پی بنا تھا تو میں نے اس کا ریکارڈ خراب نہیں ہونے دیا تھا۔ ایک کالم لکھ کے واپس لے لیا تھا۔ وہ احسان مانتا ہے۔“

صائمہ نے اچانک کہا۔ ”تم واقعی رشوت لو گے اس سے؟“

”جیسے کو تیسا۔ کیوں نہ لوں ڈاکٹر صاحب؟ تمہارا تو ایم ایل او مرضی کی میڈیکل رپورٹ یا پوسٹ مارٹم رپورٹ دیتا ہے تو مرضی کی قیمت لیتا ہے یا نہیں؟ توپ صاحب میرے تین لاکھ دبائے بیٹھے ہیں۔ میری حلال کی کمائی تم غضب کر لیتی ہو۔ صرف اس لیے کہ میں بزدل ہوں۔“

”اس سے کتنے لو گے؟“ صائمہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”کم سے کم بھی دس لاکھ وصول کرنا۔“

میں دم بخود رہ گیا۔ دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی۔ اسے اپنا بنانے کی دیوانگی یک طرفہ نہیں تھی۔ گھر بنانے کی شرط عائد کر کے وہ خود پریشان تھی کیونکہ اسے

سردار جی کے صاحب زادے خاندانی روایات کے عین مطابق لکھائی پڑھائی میں بالکل کورے تھے۔ امتحانات سر پر آئے تو کتابوں میں سر کھپانے کے بجائے پرچے آؤٹ کرنے کے چکر میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ کسی نے بتایا کہ انگریزی کے پرچے میں ”میرا دوست“ کے عنوان پر مضمون لکھنا ہوگا۔ ابا جی کو خوش خبری سنائی تو انہوں نے کسی کی مدد سے ایک مضمون لکھوا کر اپنے ہونہار فرزند کو رٹانا شروع کر دیا۔

پرچے میں ممتحن نے دوست کو باپ سے بدل دیا ”مائی فادر“ یعنی میرا باپ پر مضمون لکھنا تھا۔ صاحب زادے چکرا گئے کہ اب کیا کریں۔ عقل نے دوڑ لگائی تو ترکیب سوجھ ہی گئی۔ انہوں نے رٹے ہوئے مضمون میں دوست کی جگہ باپ کا لفظ ڈال کر سب کچھ چھاپ ڈالا۔ اس نادر مضمون کا ابتدائی پیراگراف کچھ یوں تھا۔

”دنیا میں ہر ایک کے بہت سے باپ ہوتے ہیں لیکن سب قابلِ ذکر نہیں ہوتے۔ ان میں سے ایک آدھ ہی اچھا ہوتا ہے۔ ویسے تو میرے دسیوں باپ ہیں لیکن مجھے اسد بہت پسند ہے۔ وہ روزانہ کئی مرتبہ ہمارے گھر آتا ہے۔ دوسروں کو میری ماتا جی منہ نہیں لگاتیں، اس سے بہت محبت کرتی ہیں۔ میری غیر حاضری میں بھی گھنٹوں اس سے باتیں کرتی رہتی ہیں...“

کراچی سے میمونہ عزیز کا امتحان

مستقبل قریب میں اس کے امکان نظر نہیں آتے تھے۔ مزید انتظار اس کے لیے ایسی آزمائش بن گیا تھا کہ اب وہ جائز ناجائز کے فرق کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مجھے رشوت لینے کی اجازت دے رہی تھی تاکہ گھر تعمیر فنڈ میں جلد از جلد اضافہ ہو۔ کہاں وہ وقت تھا کہ وہ میرے ڈاکوؤں کا کیس عدالت میں لڑنے کی فیس پر بھی حرام کمائی کا لیبل لگاتی تھی۔ حالانکہ میں کیس قانونی دلائل سے عدالت میں لڑتا تھا۔ دلائل سے اپنے موکل کو رہائی دلاتا تھا۔ پولیس رپورٹ اور گواہی سب کو جھوٹا ثابت کرتا تھا۔ وہ جو بھی دیتے تھے، خوش ہو کے دیتے تھے اور ہمیشہ احسان مند رہتے تھے۔

صائمہ کی بات افسوسناک تھی لیکن مجھے ایک روحانی خوشی ہوئی۔ میری خاموشی اور مظلوم محبت جیت رہی تھی۔ لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا۔ شاید بہت جلد وہ مایوس ہو

کے اپنی شرط واپس لے گی اور میرے خواب کو تعبیر مل جائے گی۔ کسی شاعر نے کہا تھا۔ جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ہوگا۔ میں نے جو تھانے دار سے کہا تھا، غلط نہ تھا۔ دیسی گھی اور خالص دودھ کی طرح شرافت اور ایمان داری سے وہ بھی تائب ہو رہے تھے جو اس پر یقین رکھنے کے جرم کی سزا پا رہے تھے۔ اپنی ایک زندگی میں خوشیوں کی قربانی دینا اور احساسِ محرومی کے ساتھ جینا پہلے مشکل تھا تو اب ناممکن ہونے لگا تھا۔

معلوم نہیں غزالہ نے صائمہ کے بارے میں کیا رائے قائم کی ہوگی اور میرے بارے میں کیا سوچے گی۔ میں اس کی مدد کرنے آیا تھا یا کمائی کرنے۔ بھائی مل گیا تب بھی اور نہ ملا تو بھی مجھے تو دس لاکھ مل ہی جائیں گے۔ صائمہ ایسا سوچ سکتی ہے۔ میں بزدل ہوں... ایسا نہیں کر سکتا۔

☆☆☆

تفتیش کا عمل بڑے زور و شور سے جاری تھا۔ زور تھا تھانے دار زمرد خاں کا اور شور تھا ملزمان کا۔ یہ عمل میری تشریف آوری کی خوشی میں کچھ دیر کے لیے روک دیا گیا۔

"جنابِ عالی! یہ ہے وہ نمازی... اسے ہم نماز کے اوقات بتا رہے ہیں۔" اس نے صرف قمیص میں اسے لیٹے ہوئے شخص کا تعارف کرایا۔ "امید ہے اس کی یادداشت بحال ہو جائے گی اور یہ دوسرا بندہ ابھی تک اپنے بیان پر قائم ہے کہ اس کی دکان بوجہ فوتگی ماموں صاحب بند تھی جو اس کا سسر بھی تھا۔ اور یہ ہے گورکن اس قبرستان کا جہاں سسر کو گاڑا گیا تھا، اپنے ریکارڈ کے ساتھ۔" اس نے کونے میں مرغا بنے واویلا کرتے ڈھانچے کی پشت پر ایک بید رسید کی۔

"ان سب کو جانے دو زمرد خاں۔" میں نے کہا۔

"جی سر؟" وہ پھر بھونچکا رہ گیا۔ "ابھی بیان لینا باقی ہے۔"

"چھوڑو بیان کو... تم نے اس کار کے مالک یا ڈرائیور کی تلاش کے لیے کیا سوچا ہے جو ایک پکا چشم دید گواہ ثابت ہوگا۔"

تھانے دار نے مایوسی کے عالم میں زیرِ تفتیش افراد کو دفع ہو جانے کے احکامات صادر فرما کے اور کسی "ماں کے یار" سے دہاڑ کے پوچھا کہ چائے ابھی تک کیوں نہیں آئی۔ بزدل صاحب کو آئے کتنی دیر ہو گئی۔

میں نے اپنا سوال دہرایا۔

"وہ تو مشکل... بلکہ ناممکن ہے جنابِ عالی۔ ڈی آئی جی صاحب کو بتا دیا تھا میں نے۔ ان کا فون آیا تھا، آپ تو جانتے ہوں گے۔"

"ہاں، میں اس وقت وہیں تھا مگر یہ ناممکن ہے تو پھر تمہاری پروموشن بھی ناممکن ہے۔"

اس کا چہرہ لٹک گیا۔ "سر! ہم بات کر سکتے ہیں۔ کیس ڈی آئی جی صاحب کے پاس ہے۔ ان سے دستخط کرا دیں آپ فائل پر تو... دس لاکھ کا نذرانہ دوں گا۔"

میں نے دہاڑ کے کہا۔ "رشوت؟ تم مجھے حرام کھلانا چاہتے ہو... تمہیں معلوم ہے یہ جرم ہے۔"

اچانک میرے موبائل فون کی گھنٹی بجنے سے میری آواز بند ہو گئی۔ تھانے دار زمرد خاں پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا تھا۔ شاید اسے وہ سودے بازی کا ایک انداز سمجھ رہا تھا۔ نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز۔ یعنی اپنا ریٹ بڑھا احمق... تو اتنا سستا بکنے پر کیوں راضی ہے۔ میری ہیلو کے جواب میں غزالہ کی آواز آئی۔

"وہ... تم کہاں ہو اس وقت... فوراً گھر آؤ۔" وہ سخت نروس تھی۔

"غزالہ... خیریت تو ہے نا؟"

"ہاں ہاں، سب خیریت ہے۔ ایک کال آئی تھی بھائی کے لیے... اس نے دس لاکھ روپے مانگے..."

"کس نے...؟"

"انہوں نے جو بھائی کو اغوا کر کے لے گئے تھے۔ کل شام تک کا وقت دیا ہے انہوں نے۔"

"اچھا، میں آتا ہوں آدھے گھنٹے میں۔" اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ میں تھانے دار سے مذاکرات ختم کر کے گھر جاؤں اور کال کی تفصیل پوچھوں۔ تھانے دار کے سامنے میں کوئی بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔

وہ مجھے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ "کیا ہوا سر! آپ جا رہے ہیں؟ میں نے چائے منگوائی تھی۔"

"وہ تم خود پیو اور سوچو کہ اس کار کا پتا کیسے چلایا جا سکتا ہے جو حامد کو اغوا کرنے والوں کی گاڑی کے پیچھے تھی۔"

"ابھی یہ ایک مفروضہ ہے سر کہ اسے گاڑی میں اغوا کیا گیا۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "نہیں، اب یہ حقیقت ہے کہ حامد کو اغوا کیا گیا اور بینک روڈ کے اس چوراہے سے نہ کسی کو کندھے پر ڈال کے لے جایا جا سکتا ہے، نہ سائیکل یا رکشا پر۔"

جب میں نے باہر کا رخ کیا تو تھانے دار اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھامے بیٹھا تھا۔ اسے یقین تھا کہ جو کام میں نے اس کے سپرد کیا ہے، وہ الہ دین کے چراغ کے جن کی مدد کے بغیر ناممکن ہے۔ اپنی دس لاکھ کی قوتِ خرید پر بھی اس کا ایمان متزلزل ہو چکا تھا اور شاید وہ سوچ رہا تھا کہ خود کو بزدل کہنے والا یہ ساڑھے چھ فٹ کا ہونق سا آدمی کتنا بے خوف ہے۔ کیا چاہتا ہے آخر وہ؟ بیس لاکھ؟ پچاس لاکھ؟ کاش اسے پولیس مقابلے میں گولی مارنا آسان ہوتا۔ ایک اخبار کے دفتر جا کے میں نے صبح کے ایڈیشن کے لیے ایک اشتہار دیا جس کے آخر میں میرا فون نمبر تھا۔ اس معتبر روزنامے کے دفتر کے باہر مجھے ایک خوش گوار حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ کچھ دیر قبل جو داڑھی وار شخص تھانے کے ننگے فرش پر الٹا پڑا چھتروں سے لطف اندوز ہو رہا تھا، اچانک میرے سامنے آ گیا۔ اس نے مجھ سے مصافحہ کر کے ادھر اُدھر دیکھا۔ "مجھے بات کرنی ہے آپ سے۔"

"ضرور کرو... تم وہی ہو نا... جس کی دکان ماموں صاحب کے فوت ہونے کی وجہ سے بند تھی؟"

وہ کچھ جھینپا۔ "نہیں جی، میں نے کہا تھا کہ... میں نماز پڑھنے گیا تھا۔"

میں ہنس پڑا۔ "اچھا وہ گیارہ بجے والی نماز۔"

"میں نے اس بندے کو اغوا ہوتے دیکھا تھا۔" وہ بولا۔ "میرا نام ہاشم ہے۔"

چونکنے کی باری اب میری تھی۔ "تم نے دیکھا تھا؟ پھر انکار کیوں کر رہے تھے... گواہی کے ڈر سے؟"

اس نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ "بندہ خوار ہو جاتا ہے جی۔ سچ بولنے اور انصاف کا ساتھ دینا بڑا مہنگا پڑتا ہے۔ تھانے کچہری کے چکروں میں دھندا چوپٹ... یہ تھانے دار... بہت کمینہ ہے۔ اس نے تھانے میں الٹا لٹکا دیا تھا مجھے کہ ملاجی... گیارہ بجے والی نماز ہم پڑھائیں گے تمہیں... رات کے گیارہ بجے... میں نے اپنی جان چھڑانے کے لیے بیس ہزار دیے۔ یہ تو پچاس مانگ رہا تھا۔"

میں اسے غور سے دیکھتا رہا۔ "چلو، دیر سے سہی تم نے مجھے تو سچ بتانے کا فیصلہ کیا۔ کون تھا وہ؟"

"بس ایک جھلک دیکھی تھی میں نے پیچھے سے۔ کوئی نوجوان تھا۔ گورا چٹا اور مضبوط... جینز اور کالی ٹی شرٹ میں تھا۔ اس کے ساتھ شلوار قمیص والا ڈرائیور ہوگا۔ دبلا پتلا مونچھوں والا۔"

"یہ سب دیکھ لیا تم نے۔ پھر تو یہ بھی دیکھا ہوگا کہ گاڑی کیسی تھی... اس کا نمبر؟"

"آپ میری دکان پر چل کے دیکھ لیں۔ پھر آپ کو صحیح اندازہ ہوگا۔" اس نے ایک ٹیکسی کو روک لیا۔

وہ ایک چھوٹی سی موبائل فون مارکیٹ تھی۔ پتلی سی گلی میں دونوں طرف کیبن جیسی آٹھ دس دکانیں ہوں گی۔ پہلی دکان اس کی تھی۔ کاؤنٹر پر چودہ پندرہ سال کا ایک لڑکا سیلز مین کے فرائض ادا کر رہا تھا۔ اس نے لڑکے کو کھڑا کر دیا۔ "جا پتر... دو چائے کا بول۔"

میں نے اسے منع کر دیا۔ "اس کی ضرورت نہیں۔"

"چل پھر دو بوتلیں پکڑ لا۔" اس نے لڑکے کو باہر دھکیل دیا۔ "یہ بیٹا ہے میرا۔ اس کے سامنے میں کوئی بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اب آپ یہاں آئیں میری جگہ... باہر دیکھیں شیشے میں سے... گاڑیاں رکی ہوئی ہیں۔ سگنل بھی نظر آ رہا ہے کہ ریڈ ہے۔ آپ گاڑی کا رنگ بھی دیکھ سکتے ہیں لیکن نمبر پیچھے سے نظر نہیں آتا۔ گاڑیوں کی اتنی پہچان نہیں مجھے... مگر ہوگی یہی سوک یا ٹویوٹا... سفید رنگ تھا۔"

"ٹھیک ہے۔ تم نے کیا دیکھا؟"

"بس یہ کہ وہ بندہ سڑک کراس کر رہا تھا، زیبرا کراسنگ پر سے... ایک دم ان دونوں نے مل کے اسے کھینچا اور گاڑی میں ڈال لیا، چند سیکنڈ میں... اور گاڑی چل پڑی کیونکہ سگنل گرین ہو گیا تھا۔"

"کیا وہ گاڑی پہلے سے کھڑی تھی وہاں؟"

"میں نے دیکھا نہیں۔ جو گاڑیاں پارک ہوں، وہ ترچھی ایک دوسرے کے متوازن ہوتی ہیں لیکن کچھ لوگ سیدھی بھی کھڑی کر دیتے ہیں۔ انجن چالو رکھتے ہیں اور اندر ڈرائیور بھی بیٹھا رہتا ہے۔ کیونکہ ایسے گاڑی پارک نہیں کی جا سکتی، ٹریفک وارڈن آ جائے تو آگے پیچھے کر لیتے ہیں۔"

"تم دکان کے اندر تھے، زیبرا کراسنگ پر آگے پیچھے اور لوگ نہیں تھے؟ کسی نے مداخلت نہیں کی؟ شور نہیں کیا؟"

"اتنا وقت ہی کہاں ملا جناب... گاڑی نکل گئی سیدھی... اور پھر وہی بات... جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔ شور مچانے والا مشکل میں ہی ڈالتا خود کو۔"

"اچھا، اب ایک زیادہ اہم سوال۔ اس گاڑی کے پیچھے بہت سی گاڑیاں رکی ہوں گی۔ بالکل پیچھے والی گاڑی میں جو آگے بیٹھے تھے۔ انہوں نے یہ واردات بالکل قریب سے اپنے سامنے دیکھی ہوگی۔"

"بالکل دیکھی ہوگی جناب۔"

"یہ ناممکن ہے کہ کسی نے اس گاڑی کا نمبر بھی نہ دیکھا

ہو جس میں حامد کو اغوا کیا گیا۔ میں ہوتا تو شاید فلمی اسٹائل میں گاڑی کا پیچھا کرتا اور اسے ٹکر مار کر روکنے کی کوشش کرتا۔"

"معاف کرنا، اگر آپ بزدل سے بہادر بننے کی بے وقوفی کرتے تو مارے جاتے... ایسے مجرم مسلح ہوتے ہیں۔"

"یہ تو ٹھیک کہا تم نے... پیچھے والی گاڑی کے بارے میں کیا بتا سکتے ہو... دماغ پر زور دو۔"

"وہ جناب... خیبر تھی۔ گرے کلر کی۔ اس لیے پہچانتا ہوں میں کہ ویسی ہی گاڑی میرے پاس بھی ہے مگر سفید رنگ میں... اس کا نمبر نہیں دیکھا میں نے... گاڑی ملتان کی تھی۔"

"ایک آخری سوال... اگر دوبارہ اغوا کرنے والوں کو دیکھو گے تو پہچان لو گے؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا جناب... نوجوان کے چہرے کی بس ایک جھلک دیکھی تھی میں نے... ہاں ایک اور بات... میں نے کسی لڑکی کو چلّاتے سنا تھا۔"

میں چونکا۔ "یہ سب سے اہم بات بھول گئے تم... کیا چلّا رہی تھی وہ...؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "پتا نہیں، یہی کہہ رہی ہوگی کہ جلدی کرو۔"

"اس نوجوان نے ڈاکٹر حامد کو پیچھے والی سیٹ پر ڈالا ہوگا اور خود بھی وہیں بیٹھ کے دروازہ بند کر لیا ہوگا۔ یہی ہوا تھا نا؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "ڈرائیور آگے بیٹھ گیا تھا۔"

"کہاں؟ وہ لڑکی تو نہیں بیٹھی تھی ڈرائیونگ سیٹ پر... سوچ کے جواب دو۔"

اس نے سر ہلایا۔ "آپ نے ٹھیک کہا۔ وہ مونچھوں والا دوسری طرف بیٹھا تھا اور لڑکی کے چلّانے کی آواز بھی شاید آگے سے آئی تھی۔ پانچ سیکنڈ میں سب ہو گیا تھا۔"

"تھینک یو ہاشم صاحب... آپ نے میرا کام آسان کر دیا۔"

"لیکن جناب! میں گواہی نہیں دوں گا کہیں بھی... میں صاف انکار کر دوں گا کہ آپ سے میری بات نہیں ہوئی۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ "تمہاری مجبوری میں سمجھتا ہوں۔ تمہارا پیشہ یہی کرتا ہے ہمیشہ... بوتل لینے جاتا ہے تو مہمان کے جانے سے پہلے واپس نہیں آتا؟"

وہ خفیف ہوا لیکن اس نے مجھے روکا نہیں۔ شاید یہ بھی کاروباری سمجھ بوجھ کی بات تھی۔ خاطر مدارات کا پوچھو ضرور مگر نہ کرنے کی نیت کے ساتھ... اس محاورے میں کہ گز دو گز جیسی بات ہی کر دو۔ یہی دانش چھپی ہے... مجھے اس نے اندھیری سرنگ کے آخر میں ایک روشنی دکھا دی تھی۔ ایک موہوم سی امید جگا دی تھی کہ شاید اب الجھی ہوئی ڈور کا سرا جو نظر ہی نہیں آتا تھا، میرے ہاتھ میں آ جائے۔

وہ دونوں سبز گھاس پر زرد اور نیلے رنگ کے شوخ لباس میں رنگ بکھیر رہی تھیں۔ میں نے ان کے حسن و جمال کا ہزارویں بار موازنہ کر کے خود کو مبارک باد کا مستحق سمجھا کہ میرا فیصلہ جذباتی ہونے کے ساتھ عقلی بھی تھا۔ صائمہ زیادہ حسین اور مستقل محبوبہ کی پوسٹ کے لیے میرٹ پر پوری اترتی تھی۔ قائم مقام یا ایکٹنگ محبوبہ کے لیے غزالہ بھی اچھی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی ان دونوں نے منکر نکیر کی طرح مجھے گھیر لیا۔

"اتنی دیر کیوں کی؟ کب فون کیا تھا تمہیں؟" منکر نے سوال کیا۔

"سارا دن کہاں اور کس کے ساتھ مٹر گشت میں گزارا؟" نکیر نے کہا۔

ایک تجربہ کار مستقل مزاج اور محبت کی ڈپلومیسی کو سمجھنے والے عاشقِ صادق کی طرح میں نے مسکرانے پر اکتفا کیا اور جواب کو ٹال دیا۔ "وہ میں بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے بتاؤ فون کرنے والا کون تھا؟"

"اس نے نام نہیں بتایا اپنا۔" غزالہ بولی۔

"او کے، کال کس نمبر سے کی گئی تھی، یہ تو دیکھا ہوگا تم نے؟"

"نمبر بھائی کا تھا۔ تم ابو سے بات کر لو... وہ بہت سینٹی ہو رہے ہیں۔"

"سینٹی یعنی جذباتی... نیوٹ جنریشن کی لغت..." میں نے کہا۔ "ان سے میں بعد میں ملوں گا۔ تم میں سے ایک میرے لیے کافی بنا کے لائے اور کچھ کھانے کو دے ورنہ میری موت کا سبب پوسٹ مارٹم میں لکھا جائے گا فاقہ کشی... صبح سے صرف دھکے کھا رہا ہوں۔" میں ایک کرسی پر ٹک گیا۔

غزالہ نے یہ ذمے داری صائمہ کو سونپی اور خود میرے سامنے بیٹھ گئی۔ وہ خاصی خوش دکھائی دیتی تھی۔ "ابو کا خیال ہے کہ تم نے پولیس پر دباؤ ڈالا تو یہ ہوا۔ انہیں سب

معلوم ہوتا ہے کہ کس واردات کے پیچھے کون ہے۔ انہیں حصہ پہنچ جاتا ہے نا۔"

"میری معلومات میں اضافے کا بے حد شکریہ حسین خاتون۔" میں نے کہا۔ "میرے بارے میں غلط فہمی بہت جلد دور ہو جائے گی۔ یہ فرماؤ کہ بات تم سے ہوئی تھی یا کسی اور سے؟"

"میں نے بات کی تھی۔"

"دماغ کے آرکائیو ARCHIVE میں تلاش کرو۔ وہ آواز شاید کہیں محفوظ ہو۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "صرف اتنا اندازہ ہے کہ وہ بوڑھا یا بچہ نہیں تھا۔"

"ظاہر ہے دونوں ایسے کام نہیں کر سکتے۔ لہجے پر غور فرمایا آپ نے... اردو، پنجابی، انگریزی یا کوئی اور زبان بول رہا تھا وہ؟ جاہل لگتا تھا یا پڑھا لکھا؟"

"وہ بات تو اردو میں کر رہا تھا۔ انگریزی کے جو الفاظ اس نے استعمال کیے وہ ٹین ایجرز کی ڈکشنری کے تھے۔ اس نے بار بار مجھے بے بی کہا۔ کول، سینٹی اور شٹ تو اس کی زبان پر چڑھا ہوا تھا۔ وہ بیچ میں یوں ہی کہتا تھا بلاوجہ... اولیول والا لگتا تھا۔ ہاں ایک اور بات... بیک گراؤنڈ میں ٹیلر سوفٹ کا گانا سنائی دے رہا تھا۔"

"یہ محترمہ کیا ایلزبتھ ٹیلر مرحومہ کی صاحب زادی ہیں یا پوتی...؟"

"شٹ۔" غزالہ بولی اور پھر جھینپی۔ "اس کی آٹھ شادیوں کی ایک بھی اولاد نہیں تھی۔ یہ آج کی ٹاپ سنگر ہے۔ اس سال کا گریمی ایوارڈ لے گی دیکھنا۔"

"میں نہ سنوں گا نہ دیکھوں گا۔ لیکن تمہاری آبزرویشن کی تعریف ضرور کروں گا۔ بہت باریکی سے پوسٹ مارٹم دیا ہے۔ لیکن ابھی تک میں کسی نتیجے پر پہنچا ہوں تو یہ... کہ کال بوگس تھی۔"

"بوگس تھی کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تفتیش کو غلط راہ پر ڈالنے کے لیے کی گئی تھی۔"

"یہ تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو؟" غزالہ کچھ مایوس نظر آنے لگی۔

صائمہ کافی والی ٹرے درمیان میں رکھ کے بیٹھ گئی۔

"جبکہ نمبر خود حامد کے موبائل فون کا تھا۔"

"اس سے صرف ایک امید پیدا ہوتی ہے۔ حامد کے زندہ ہونے کی۔ ظاہر ہے اس کا فون بھی اغوا کرنے والوں

...ہمہ آفتاب است

تین امریکی دوست برسوں کے بعد ایک ہوٹل میں یک جا ہوئے اور پُرجوش انداز میں ماضی کی خوشگوار یادیں تازہ کرنے لگے۔

اس دوران میں ایک اٹھ کر واش روم گیا تو باقی دونوں نے اپنے بچوں کے بارے میں باتیں شروع کر دیں۔

ایک نے بتایا کہ اس کا بڑا بیٹا نیویارک کا مشہور آرکیٹکٹ ہے۔ بے حساب کماتا ہے... حد یہ ہے کہ ایک ہفتے قبل اس کے کسی عزیز دوست کی سالگرہ تھی تو اس نے تحفے میں اسے دو نشستوں والا سیاحتی جہاز دیا تھا۔

دوسرے کا بیٹا کامیاب ترین ڈاکٹر تھا۔ اس نے فخر سے بتایا کہ اس کے بیٹے نے بھی پچھلے ہفتے اپنے ایک قریبی دوست کو اس کی سالگرہ پر سب سے مہنگی مرسیڈیز کا تحفہ دیا تھا۔

دونوں ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے تھے کہ تیسرا بھی لوٹ آیا۔ انہوں نے اس سے پوچھا کہ اس کا اکلوتا بیٹا کیا کر رہا ہے۔

"بس ٹھیک ہے..." اس نے ڈھیلے ڈھالے لہجے میں کہا۔ "اس میں ایک بڑی خرابی ہے کہ عورتوں اور لڑکیوں سے دور بھاگتا ہے... مردوں میں خوش رہتا ہے۔"

ان دونوں نے بیک وقت تحیر زدہ آوازوں میں اس سے اظہارِ ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ "پھر تو بڑی مفلسی کے دن گزار رہا ہوگا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ لاکھوں میں کھیلتا ہے۔ پچھلے ہفتے اس کی سالگرہ تھی تو اس کے ایک دوست نے اسے نئے ماڈل کی مرسیڈیز کار اور دوسرے نے دو نشستوں والا تفریحی جہاز تحفے میں دیا تھا... وہ اپنے با حیثیت دوستوں میں بہت مقبول ہے۔"

کراچی سے خرم علیم کی سوغات

کے پاس ہے۔ اب میں معلوم کرواتا ہوں کہ اس فون سے اور کہاں کال کی گئی اور اس پر کس کس نمبر سے کال موصول ہوئی۔"

"جب میں نے کال کی تو فون بند تھا۔" غزالہ بولی۔

"ابو کہتے ہیں کہ دس لاکھ ان کے منہ پر مارو اور خدا کا شکر ادا کرو کہ سستے چھوٹے... حامد کے لیے وہ ایک کروڑ مانگ لیتے تو؟"

میں نے میز پر ہاتھ مارا۔ "یہ... یہی ہے اصل نکتہ خاتون... وہ ایک کروڑ مانگتے تو مطالبہ جینوئن ہوتا۔ اغوا کرنے والوں کے طریقہ کار کے خلاف دو باتیں ہیں۔ ایک یہ کہ انہوں نے چار دن گزار دیے۔ پہلی کال چوبیس گھنٹے میں آتی ہے۔ وہ چار دن ہاتھ پر ہاتھ رکھے نہیں بیٹھے رہتے۔ دوسری زیادہ اہم بات یہ ہے کہ شکاری ایک کروڑ سے کم نہیں مانگتے۔ پھر بارگین میں یہ رقم چوتھائی رہ جاتی ہے۔ دس لاکھ پر بھی آجاتے ہیں نئے کھلاڑی... لیکن جو دس لاکھ مانگے... وہ اناڑی ہے... وہ پروفیشنل نہیں ہے۔"

دونوں خواتین کے منہ لٹک گئے۔ "پھر کون ہے؟"

"تم جانتی ہو تو بتاؤ... اور اب میں عرض کروں کہ آج سارا دن مٹرگشت نہیں کیا میں نے... جو معلومات ملی ہیں مجھے، ان سے ایک جگ سا پزل JIGSAW PUZZLE کے ٹکڑے مل رہے ہیں اور امید ہے کہ میں ان کو جوڑ کے جو تصویر مکمل کروں گا، وہ مجرم کی ہوگی۔"

"کون ہے مجرم؟" ان دونوں نے ایک ساتھ پوچھا۔

"وہی... جس نے یہ جرم کیا۔ بس نام پتا معلوم کرنا رہ گیا ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ کیا فضول بات ہے؟" صائمہ نے کہا۔

"ابو کو بہت مایوسی ہوگی۔" غزالہ بولی۔

"ابھی کیا ضرورت ہے ان کو مایوس کرنے کی؟ امید کی خوشی بھی غنیمت ہے ان کے لیے... کل شام تک... جب کوئی کال نہیں آئے گی۔"

"اور آگئی تو؟"

"میں اپنا نام بزدل سے بدل کر احمق کرلوں گا.....

تمہارا بھائی زندہ ہے اور مجھے اس کی واپسی یقینی نظر آتی ہے لیکن راستہ نہیں سوجھ رہا ابھی... یہ ہوسکتا ہے کہ مجھے تھری ناٹ تھری سے مدد لینی پڑے۔"

"تھری ناٹ تھری... رائفل تمہاری کیا مدد کرے گی؟" صائمہ تیکھے لہجے میں بولی۔

"تمہاری ناقص معلومات میں اضافے کے لیے بتانا ضروری ہے کہ اس نام کا ایک شہرۂ آفاق ڈاکو تھا جسے ملنا تو چاہیے تھا پرائڈ آف پرفارمنس اس کے کارناموں پر... لیکن وہ یہاں اڈیالہ جیل میں سات سال کی جیل کاٹ رہا تھا، آخری اطلاع کے مطابق... اور شاید اس کی رہائی بھی اسی سال متوقع ہے۔"

صائمہ نے ناگواری سے کہا۔ "وہ کیا کرے گا؟"

"جو میں، تم اور پولیس مل کے نہیں کرسکتے۔ یہ تو ایک سچائی ہے کہ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ اسے ہوئی تھی سزائے موت اور سات سال کی قید... دو الگ الگ جرم تھے، ڈکیتی اور قتل... ڈاکا اس نے ڈالا تھا مگر قتل نہیں کیا تھا۔ قتل کا کیس اس پر پولیس نے بنایا۔ وہ معاہدے سے ایک پیسا زیادہ دینے پر راضی نہیں تھا۔ میں اس کا وکیل بنا تو ہائی کورٹ میں قتل کا کیس ختم ہوگیا۔ ظاہر ہے وہ میرا مرید ہوگیا۔ اب یہاں آیا تھا تو سوچا خیرسگالی کے اظہار کے لیے کل اس سے بھی ملاقات کرلی جائے۔ کیا پتا اس کی مدد کی ضرورت پڑجائے۔"

رات گئے تک میں غزالہ کے والدین سے باتیں کرتا رہا۔ اس کے ابواب خلا میں نہیں گھور رہے تھے۔ وہ پرامید اور خوش تھے۔ غزالہ کی ماں کی آنکھوں میں حامد کے ذکر پر اب بھی آنسو آجاتے تھے لیکن ان میں دکھ کا نہیں خوشی کا رنگ تھا۔ وہ میرے انکار کو انکساری اور عاجزی سمجھ رہے تھے اور اس خیال پر قائم تھے کہ میں زمرد خاں کی کلاس نہ لیتا... ایس پی رحم دل خاں کا دباؤ نہ ہوتا اور میں ڈی آئی جی سے نہ ملا ہوتا تو کچھ نہ ہوتا... ظالم خاں نے ایک بار پھر دوستی کا حق ادا کرتے ہوئے نہ صرف زمرد خاں سے بات کی تھی بلکہ غزالہ کے والدین کو بھی یقین دلایا تھا کہ حامد بہت جلد لوٹ آئے گا لیکن وہ جلدی نہ کریں۔ ادھر غزالہ کے والدین دس لاکھ نقد کا انتظام کرچکے تھے اور اب یہ چاہتے تھے کہ رقم دے کر حامد کو لانے کا کارنامہ بھی میں سرانجام دوں۔

"یہ رقم اپنے پاس رکھ لو تم۔" انہوں نے ایک شاپنگ بیگ میرے حوالے کرنا چاہا جس میں نوٹوں کے اوپر مٹھی پالک وغیرہ بھر دیے گئے تھے۔

"دیکھیے، اس کی جلدی نہیں۔ کال تو آنے دیں... میں لے لوں گا۔"

"یہ ہے تو خطرناک کام بیٹا... لیکن اب ہم کس پر بھروسا کریں۔ زمانہ کسی پر بھروسا کرنے کا نہیں رہا۔ گزشتہ سال ہمارے ایک چاہنے والے کے ساتھ کیا ہوا۔ ان کا بھی بیٹا اٹھا کے لے گئے تھے اور ایک کروڑ مانگ رہے تھے۔ خیر سودا ہوا پچیس لاکھ پر۔"

میں نے سوالیہ نظروں سے صائمہ اور غزالہ کی طرف دیکھا کہ اب کیا خیال ہے؟ میں نے غلط کہا تھا۔

"تو وہ جو کزن گیا رقم لے کر... وہ لوٹ کے ہی نہیں آیا۔ نہ بیٹا واپس پہنچا۔ فون آیا کہ ڈاکو تو مجھے پچیس لاکھ سمیت اٹھا کے لے گئے ہیں اور آپ نے پولیس کو بیچ میں ڈالا تو پھر میری لاش ہی ملے گی۔ لو جی نئی مشکل... اب دگنی رقم درکار تھی۔ سب ناتجربہ کاری بلکہ بے وقوفی کے باعث ہوا۔ ادھر جب پچیس لاکھ طلب کرنے والوں نے پھر فون کیا اور پوچھا کہ آپ لوگ طے شدہ وقت اور مقام پر رقم لے کر کیوں نہیں آئے، تو انہیں برا بھلا کہا گیا کہ یہ ہے تمہارا ایمان... ہم نے تو سنا تھا کہ چور ڈاکو کسی کے اعتبار کو دھوکا نہیں دیتے... زبان سے نہیں پھرتے۔ انہیں گالیاں بھی دی گئیں اور بددعا بھی۔ وہ بڑے چراغ پا ہوئے کہ ہم نے تو ایسا کوئی کام نہیں کیا۔ یہ کس کی شامت آئی تھی کہ ہمارے نام پر پچیس لاکھ لے گیا۔ اب معاملہ الٹا ہوگیا۔ انہوں نے کزن صاحب کا سراغ لگالیا جو رقم لے کر گئے تھے۔ ان کو خوب جوتے لگائے اور پچیس لاکھ سمیت دروازے پر پھینک گئے۔"

"اور لڑکا ملا یا نہیں؟"

"اگلے دن اس کا باپ خود رقم لے کر گیا اور بیٹے کو لے آیا۔ تو بیٹا ہم کسی اور پر بھروسا کرتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ وہ رقم لے کر بھاگ گیا پھر؟"

میرے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی تو میں نے معذرت کی اور باہر نکل گیا۔ اس پر توپ صاحب کا نمبر تھا۔

"میاں برخوردار بزدل... خیر سے زندہ سلامت ہو نا؟"

"میں اس فضول سوال کا مقصد نہیں سمجھا۔"

"ہمارا مطلب تھا کہ چلو ان میں تو شامل نہیں ہوئے، وہ کیا کہلاتے ہیں، لاپتا افراد۔ دراصل ایک بڑی دردناک خرابی ہوگئی۔ تمہارے اس قطعے کی وجہ سے... ہاں وہی جو دے گئے تھے۔"

"کیا خرابی ہوگئی؟"

"بس عزیزم! اب خیریت مطلوب ہے تو جوتیاں بغل میں دبا کے بھاگ لو واپس۔ وہ کسی نے بڑے خطرناک انداز میں دھمکی دی تھی۔ کہتا تھا کہ حساس ادارے کا افسر ہوں۔ وہیں اپنے اسلام آباد میں۔ تمہارا پتا پوچھ رہا تھا، ہم نے لاعلمی ظاہر کی تو بولا کوئی بات نہیں۔ ہم اٹھا لیں گے جہاں بھی ملا... فکر کرنے کی ضرورت نہیں... ہم تمہارا نام نامی اس فہرست میں شامل کرادیں گے۔ وہ جو عدالتِ عالیہ کے سامنے ہے اور اللہ نے چاہا تو یومِ حشر سے قبل ہی بازیاب کرالیں گے۔"

میں نے بھنا کر کہا۔ "آپ یہ کیوں بھول رہے ہیں توپ صاحب کہ پرنٹر اور پبلشر آپ ہیں۔ میں تو ان کے ہاتھ نہیں آنے والا۔ آپ فوری دستیاب ہیں۔"

مجھے اپنی گفتگو کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔ باہر سے ایک گاڑی آئی اور اس میں سے ایک جیسی دو خواتین برآمد ہوئیں۔ ایک تقریباً پچاس سال پرانا ایڈیشن تھی۔ دوسرا نیا اور شاید بائیس چوبیس سال کا۔ وہ مجھے مشتبہ نظروں سے گھورتی ہوئی اندر چلی گئیں تو میں نے بہتر جانا کہ اوپر اپنے بیڈروم میں جاکے کچھ دیر آرام کرلوں لیکن لیٹتے ہی مجھے پھر اٹھنا پڑا۔ غزالہ اور صائمہ کے درمیان وہی اجنبی لڑکی اندر آگئی تھی۔

"یہ ناصر و خان ہیں۔" غزالہ نے اعلان کیا۔ "میری ہونے والی بھابی... کرن۔"

"تشریف رکھیے معزز... خواتین۔" میں نے کہا۔

"یہ بزدل ہیں۔" کرن کی حیران سوالیہ نظر کے جواب میں صائمہ نے میرا طویل نام بتانے کے بعد کہا۔ "یہ ان کے نام کا خلاصہ ہے۔"

"یہ بیک وقت کالم نویس، شاعر، وکیل اور جاسوس ہونے کی شہرت رکھتے ہیں۔"

"وجۂ شہرت ایک اور بھی ہے۔" میں نے صائمہ کی طرف دیکھا۔ "تم بتادو۔"

صائمہ کا رنگ لال ہوا۔ "اگر تمہیں ان سے کچھ پوچھنا ہے تو پوچھ لو۔ کرن کو اسی لیے رخصتی سے قبل سسرال آنا پڑا۔"

"مزاج ہی پوچھنا تھا مجھے... لیکن یہ چاہیں تو اپنی زبان میں اس افسوسناک واقعے کا فرسٹ ہینڈ اکاؤنٹ بتا دیں۔ شاید کوئی بات نئی معلوم ہوجائے۔"

لیکن میری یہ توقع پوری نہیں ہوئی۔ رک رک کر اٹکتے اور کبھی کبھی رقت کے ساتھ آنسو بہاتے ہوئے اس نے سب وہی بتایا جو مجھے معلوم ہوچکا تھا۔ میں اسے تسلی اور حوصلہ دینے کے رسمی الفاظ بولنے کے سوا کیا کرسکتا تھا۔

کھانے کی میز پر اس کی ماں سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک چرب زبان نان اسٹاپ بولنے والی خاتون تھی۔ میں نے دل ہی دل میں حامد کے لیے ہمدردی محسوس کی۔ شاید دو چار سال میں بے تکلف ہو کے بیٹی بھی مال گاڑی سے ایکسپریس بن جائے گی۔ چونکہ صائمہ اور غزالہ مجھے پہلے ہی فریق ثانی کی طرف سے یقین دہانی کرا چکی تھیں کہ نہ کرن کا کوئی سابق پرستار یا منگیتر تھا جو اب رقابت پر اتر آیا ہو، نہ اس کے خاندان کا دشمن تھا۔ اس کے باپ کا کئی سال پہلے انتقال ہو چکا تھا اور کرن بلاوجہ ایم ایس سی کرنے کے بعد صرف یوم عقد کے انتظار میں فارغ بیٹھی تھی۔ بلاوجہ اس لیے کہ باپ کی جائداد اور سرمایہ کاری سے انہیں معقول آمدنی مل رہی تھی اور کرن کا اس تعلیم کو کہیں بھی استعمال کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ جیسا کہ آج کل لیڈی ڈاکٹرز کا دستور ہے۔

کھانے کے بعد وہ فیملی خاصی مایوس رخصت ہوئی۔ شرلاک ہومز پاکستانی نے ان سے بال کی کھال نکالنے والے کوئی سوالات نہیں پوچھے تھے۔ صائمہ نے تو بعد میں یہ بھی لگی لپٹی رکھے بغیر بتا دیا کہ ڈاکٹر حامد کی نامزد ساس نے میرے بارے میں کیا رائے دی تھی۔ ”یہ بجو کی شکل والا لمبو کیا کرے گا۔ جس کا نام ہی بزدل ہو وہ خاک توپ چلائے گا۔“

گزشتہ روز کی طرح وہ رات کو کافی لے کر میرے کمرے میں آگئی تھیں۔ گھر کا ماحول ایسا سوگوار تھا کہ میں باہر کہیں تفریح کے لیے جانے کی بات بھی نہیں کر سکتا تھا۔

”اس قسم کے ریمارکس پر لازم تھا کہ تم احتجاج کرو۔ آخر میں تمہارا معزز مہمان ہوں اور تمہاری نکلی کا مرحوم... میرا مطلب ہے محروم مجازی خدا۔“

غزالہ نے پوچھا۔ ”میری ہونے والی بھابی کیسی لگی تمہیں؟“

”کاش یہی سوال میں کرن سے کر سکتا کہ تمہیں ہونے والی نند کیسی لگی اور وہ سچ بول سکتی۔ خیر کیوں نہ ہم کام کی بات کریں، اگر پیار کی بات نہیں کر سکتے۔ مجھے نگہت سے ملنا ہے۔“

وہ ایک ساتھ چونک گئیں۔ ”نگہت خان سے... کیوں؟“ صائمہ ٹھنک کے بولی۔

”بس... دل مچل رہا ہے۔“ میں نے کہا۔

غزالہ مسکرانے لگی۔ ”میں نے بتایا تھا، وہ نفسیاتی مریض ہے۔“

”وہ تو میں بھی بن گیا ہوں۔“ میں نے صائمہ کی طرف دیکھ کے آہ بھری۔ ”خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو... کہاں ملے گی وہ؟“

غزالہ بولی۔ ”پوچھنا پڑے گا۔ آج کل ماں کے ساتھ ہے یا باپ کے ساتھ... یا کسی اور کے ساتھ۔“

”آخری بار کب ملاقات ہوئی تھی تمہاری؟“

”بہت عرصہ پہلے... لیکن سنسنی خیز رپورٹس مجھے ملتی رہتی تھیں کچھ پرانی فرینڈز سے۔“

”ان فرینڈز میں سے کسی کو فون کرو... ابھی...“

”او کے۔“ غزالہ نے اپنا موبائل فون نکال کر نمبر تلاش کیا اور کال ملائی۔ ان کی یکطرفہ زنانہ گفتگو سنتے اور صائمہ کو بدمعاشی سے گھورتے ہوئے میں نے دو بار آنکھ ماری۔

”کیا آنکھ میں کوئی تکلیف ہے؟“ اس نے خفگی سے کہا۔

”تکلیف دل میں ہے جو آنکھ کی وجہ سے شروع ہوئی تھی۔ تمہیں دیکھنے سے... اور اس کا علاج حکیم لقمان نے شربت وصل ہمراہ معجون عقد تجویز کیا تھا، یہ دوا ملتی نہیں۔“

صائمہ کا رنگ غصے یا شرم سے لال ہو گیا۔ ”پھر تو تمہارا آخری وقت قریب ہے۔“

غزالہ نے فون بند کیا۔ ”دوسری طرف جا رہی ہو گی تمہاری ہر بات۔“

”جانے دو۔ بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہو گا... پتا معلوم ہوا؟“

”ہاں، وہ ماں کے ساتھ ہے۔ تمہیں بات کرتے وقت خیال رکھنا ہو گا کہ کوئی جان لیوا چیز اس کی دسترس میں نہ ہو۔ بیٹی گن ہے تو ماں کلاشنکوف... میرے خیال میں اس نے اپنا گھر ہی نہیں، اپنی بیٹی کو بھی خراب کیا۔ باپ نے تو دوسری شادی نہیں کی بیٹی کی خاطر... لیکن...“

”لیکن کیا... کھل کر غیبت کرو۔“

”شادی نہ کرنا زیادہ خرابی کا سبب بنا۔ دیگر خواتین گھر میں آتی جاتی رہیں۔ وہ اچھا دولت مند بزنس مین ہے۔ ایک ہاؤس میڈ اور ایک سیکریٹری ہمیشہ رہی۔ کوئی سال کوئی دو سال... اس کا اثر بیٹی نے قبول کیا۔ پھر اس کا بزنس بھی ایسا ہی ہے۔ یعنی شرافت سے نہیں چل سکتا اور بدمعاشی اس کے مزاج میں آگئی تو بیٹی اس سے بھی متاثر ہوئی۔ تم دونوں سے مل لو... بلکہ تینوں سے۔“

”میں نگہت کے باپ سے مل سکتا ہوں، خان صاحب سے... ماں بیٹی سے ملاقات صائمہ کرے گی۔ اسے میں بریف کر دوں گا۔“

”میں نہیں پڑنے والی اس چکر میں۔“ صائمہ گھبرائی۔

”بس تو پھر صبح چلتے ہیں واپس... لوٹ کے بدھو گھر کو جائیں۔ حامد آجائے گا شام کو دس لاکھ دے کر... اگر اللہ کو منظور ہوا۔“

غزالہ نے مگ اٹھا لیے۔ ”جائے گی صائمہ یار! کیوں نہیں جائے گی۔ میں لے جاؤں گی۔“

”تم اسے باہر تک چھوڑنے جا سکتی ہو۔ وہ صائمہ کو نہیں پہچانتی... تمہیں جانتی ہے۔ ہم قریب ہی کسی ایمرجنسی کال کے لیے ایمبولینس کی طرح گاڑی لیے موجود ہوں گے۔ دیکھو نا... ابھی تم نے میری جان کے لیے خطرات کا اندیشہ ظاہر کیا تھا۔“

”اچھا ہے، میری جان بھی چھوٹے اور تمہاری بھی۔“

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”جان کیسے چھوٹ سکتی ہے۔ غزالہ پروموشن کی منتظر بیٹھی ہے، شب بخیر...“ میں نے لیٹ کر کمبل منہ پر کھینچ لیا۔ گزشتہ شب کی بارش کے بعد سردی میں کچھ اضافہ ہوا تھا۔

وہ پھر بھی بیٹھی رہیں اور ایک دوسرے کو دیکھ کے مسکراتی رہیں تو میں نے پھر کمبل سے سر نکالا۔ ”معزز خواتین! کیا آپ اونچا سنتی ہیں یا رات کو جاگنے والی مخلوق ہیں؟“

”وہ... ایک بات کہنا چاہتی تھی صائمہ تم سے؟“ غزالہ نے کہا۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”ایسی کیا بات ہے جس کے لیے صائمہ کو تم جیسی وکیل کی ضرورت پڑی؟“

صائمہ مسکرائی۔ ”پوچھنا یہ تھا کہ تم نے اس تھانے دار سے دس لاکھ مانگے؟“

میں حیرانی، افسوس اور غصے سے صائمہ کو دیکھتا رہا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے، میں ایسا کر سکتا تھا؟ بے موقع نہیں اس لیے اکبر الٰہ آبادی کی زبان میں بات کرتا ہوں۔

اگر ٹھہری یہ شرطِ وصلِ لیلیٰ
تو استعفا میرا با حسرت و یاس“

صائمہ کا چہرہ چمکنے لگا۔ ”یعنی تم نے کچھ نہیں لیا؟“

”جانِ من، جان تو دے سکتا ہوں میں تمہارے ایک اشارے پر... آزما لو لیکن شادی کی شرط پوری کرنے کے لیے میں گھر تعمیر فنڈ میں رشوت کے دس لاکھ نہیں ڈال سکتا۔ مجھے تو دکھ تھا کہ تم نے ایسا سوچا بھی کیسے...“ میں نے افسوس سے سر ہلایا۔

غزالہ نے مایوسی سے صائمہ کو ایک کاغذ کا پرزہ تھما دیا۔ ”تو جیت گئی شرط۔“

صائمہ نے فخریہ انداز میں وہ کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔ یہ دس ہزار کا بیئرر چیک تھا۔ ”صائمہ سے کہا تھا میں نے کہ تم ایسا نہیں کرو گے... میرے کہنے پر بھی۔“

میں ہکا بکا بیٹھا ان دونوں کی صورت دیکھتا رہا۔ خدا ہی تھا جس نے میری اور صائمہ کے لیے میرے پیار کی آبرو رکھی۔ بزدل اور ایک خطا کار انسان اتنا بہادر ثابت ہوا تھا کہ اپنی محبت کی منزل تک پہنچنے کے لیے غلط راستے پر نہیں چلا تھا۔ ان دونوں نے اٹھنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ میں نے انہیں روک لیا۔ ”ایک منٹ۔“ اور دس ہزار کے اس چیک کو پرزہ پرزہ کر کے صائمہ پر پھول کی پتیوں کی طرح اچھال دیا۔ پھر میں نے لائٹ آف کی اور سکون سے سو گیا۔

اندھیرے میں رات کو نہ جانے کس وقت میں نے اپنے ماتھے پر کسی کے ہونٹوں کے پیار بھرے لمس کو محسوس کیا۔ جلتے آنسو کا ایک قطرہ میرے چہرے پر ٹپکا لیکن میں آنکھیں بند کیے سوتا رہا۔ اس قطرے میں خوشی سے زیادہ فخر کے احساسِ محبت کی خوشبو تھی۔

☆☆☆

اڈیالہ جیل میں کسی بزدل کا جانا آسان نہ تھا۔ مجھے باہر دروازے پر ہی ایک تھرتھراتی مونچھوں والے نے غرا کے ”دفع“ ہو جانے کا حکم دیا اور اپنی رائفل کا رخ بھی یوں میری طرف کیا جیسے تعمیلِ حکم نہ کرنے والوں کو گولی مار دینا اس کا معمول تھا۔ میں نے اپنا نام بتانے کے بعد صرف یہ درخواست کرنے کی گستاخی کی تھی کہ جیل سپرنٹنڈنٹ صاحب کو بتا دیا جائے کہ میں ان سے ملاقات کا متمنی ہوں۔

مجبوراً مجھے کان کو ہاتھ گھما کے پکڑنا پڑا۔ میں نے ظالم خاں کو فون کیا۔

”دیکھو... تمہیں انہوں نے اٹھا لیا ہے تو میں کچھ نہیں کر سکتا... بلکہ میری تمہاری دوستی بھی ختم۔ آئندہ مجھے فون بھی مت کرنا۔“ اس نے میری بات سنتے ہی بولنا شروع کر دیا حالانکہ میں نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ میں اڈیالہ جیل سے بول رہا ہوں۔

”یار! میں جیل کے باہر ہوں اور یہاں بھی میں لایا نہیں گیا ہوں، آیا ہوں۔ مجھے جیلر سے ملنا ہے۔“ میں نے برہمی سے کہا۔ ”کوئی سالا بزدل کی نہیں سنتا، سوائے تمہارے۔“

دس منٹ کے بعد جیل سپرنٹنڈنٹ بقلم خود نمودار ہوا۔

"آیئے آیئے... مجھے ذرا بھی اندازہ ہوتا کہ آپ ہیں تو انتظار کی زحمت نہ اٹھانا پڑتی۔ فون ہی کر دیتے تشریف آوری سے قبل۔"

دروازے سے گزرتے ہوئے میں نے تھرتھراتی مونچھوں والے سنتری کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "تم مجھے واپسی میں گولی مار دینا۔" تھرتھراہٹ اب مجھے اس کے پورے وجود میں محسوس ہوئی۔

زبردستی چائے پلانے کے بعد جیلر صاحب نے پوچھا۔ "آپ انٹرویو کرنا چاہتے ہیں کسی ڈاکو کا تو میں دس کو لائن اپ کر دیتا ہوں۔"

"مجھے صرف تھری ناٹ تھری سے ملنا تھا۔ وہ میرا دوست ہے۔"

جیلر کی شکل پر بارہ بج گئے۔ "دوست... وہ تو نہیں ہے... گزشتہ ماہ رہا ہو کے چلا گیا۔"

"اچھا۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اس کا پتا ٹھکانا کیا ہے آج کل؟ آپ کو تو معلوم ہوگا۔"

وہ جھینپ کر بولا۔ "معلوم کر لیتے ہیں جناب۔ اس کا دوست ہے بمبارڈاکو... اس کا دستِ راست تھا جو سردار بنا ہوا تھا۔ اب سردار واپس آ گیا ہے تو یہ اندر ہے۔"

بمبار ڈاکو کسی وزیر جیل خانہ جات کی طرح اندر آیا تو اس نے جھک کر بڑی عقیدت کے ساتھ مجھ سے مصافحہ کیا۔ جیلر کے سامنے اس نے کان میں مجھے سردار کا پتا بتا دیا۔ جیلر بے بسی سے دیکھنے کے سوا کیا کر سکتا تھا۔ میں باہر نکلا تو مجھے ایک ہاکر دکھائی دیا۔ میں نے اسے روکا اور اخبار خرید لیا۔ میرا دیا ہوا اشتہار سنڈے ایڈیشن میں مقامی صفحے پر شائع ہوا تھا۔ یہ ایک اشتہار تھا۔

"گرے خیبر والے متوجہ ہوں!

"جینک روڈ پر لیڈیز کے ایک نامور بوتیک کے افتتاح کی خوشی میں گرے کلر کی خیبر کار کے ان مالکان کو جدید ترین فیشن کا ایک سوٹ پیش کیا جائے گا جو آٹھ فروری 2014ء کو صبح آٹھ سے رات آٹھ کے درمیان ہمارے شوروم کے سامنے سے گزرے ہوں گے۔"

آگے میرا فون نمبر تھا۔ یہ نمبر نہ جانے کس کا تھا۔ عالم خاں ضرورت پڑنے پر مجھے ایک موبائل فون کی سم فراہم کر دیتا تھا جو میرے نام پر رجسٹرڈ نہیں ہوتی تھی اور خفیہ مقاصد کے لیے استعمال کی جا سکتی تھی۔ چوری کے یا ملزمان سے برآمد ہونے والے درجنوں فون ہمیشہ ہر تھانے میں دستیاب رہتے تھے۔ یہ اشتہار اتنا ترغیب دینے والا تھا کہ مجھے شام تک تقریباً ہر گرے کلر خیبر کی مالک خاتون یا ان کے شوہر نامدار کا فون موصول ہونا لازمی تھا۔ یہ سم میں نے غزالہ کے ایک موبائل فون میں ڈال دی تھی اور اسے سمجھا دیا تھا کہ اس نمبر پر جتنے فون موصول ہوں، محفوظ رکھے اور سب سے "رانگ نمبر" کہہ کے جان چھڑائے۔ بالآخر یہ سب کو معلوم ہو ہی جائے گا کہ یہ کسی نے پریکٹیکل جوک کیا تھا اور اشتہار بوگس تھا۔

میں دوپہر سے قبل ہی غزالہ کے گھر پہنچا تو پہلی رپورٹ مجھے غزالہ نے دی۔ "صبح سے اب تک سولہ فون آ چکے ہیں۔ یہ چکر کیا ہے؟"

"معلوم ہو جائے گا سویٹ ہارٹ۔ پہلے اپنے بھائی کو تو آنے دو۔" میں نے کہا۔

صائمہ نے بڑی پُرامید مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "وقت سے پہلے یہ کچھ نہیں بتانے والا۔"

غزالہ بولی۔ "تم نے نگہت... کی طرف جانے کے لیے کہا تھا؟"

"اور میں نے بتا دیا تھا کہ اکیلی نہیں جاؤں گی۔" صائمہ بولی۔

میں نے کہا۔ "اکیلا تو میں تمہیں جنت میں بھی نہ جانے دوں۔ میں تمہارے ساتھ جاؤں گا بلبلِ بغداد۔"

"ابو بڑی بے چینی سے دس لاکھ کے لیے کال کا انتظار کر رہے ہیں۔" غزالہ نے مجھے مطلع کیا۔

"چلو، ایک امید کے آسرے پر ہی سہی... ان کے دکھ میں کمی تو ہے۔" میں نے کہا۔

"تم اب بھی اس مفروضے پر قائم ہو کہ کال نہیں آئے گی؟" غزالہ بولی۔

"یہ مفروضہ اب حقیقت بن چکا ہے میڈم۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کال سے پہلے تمہارا بھائی آ جائے۔"

غزالہ کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔ "تمہارا یقین غلط نہیں ہو سکتا۔ نگہت کی طرف کب جانا ہے؟"

"ابھی... بلکہ اسی وقت... کیونکہ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔"

میں غزالہ کی گاڑی میں پیچھے بیٹھ گیا اور وہ نمبر ملاتا رہا جواب تک غزالہ کو اشتہار کے جواب میں کال کر چکے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ دوپہر تک ان سب کی کال موصول ہو جائے گی جو گرے کلر کی خیبر کے مالک تھے اور اشتہار دیکھ چکے تھے۔ یہ ایک ایسا جوا تھا جس میں کامیابی کا تناسب کم تھا۔ اخبار پڑھنے والوں کی تعداد ہمارے ملک میں افسوسناک

حد تک کم ہے لیکن خریداروں کے مقابلے میں اخبار پڑھنے والے کئی گنا تھے۔ ایک فیملی کے علاوہ ریستورانوں، نائی کی دکانوں اور عام جگہوں پر اخبار سارا دن گردش میں رہتا تھا۔ یہ اخبار مقبولیت اور اشاعت میں سرفہرست تھا۔ اس اشتہار کو پڑھنے والوں نے فون کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ اب وہ رہ گئے تھے جن کو دیر سے یا بالواسطہ کسی سے یہ خبر ملی تھی۔ اس میں قرعہ اندازی کا ذکر نہیں تھا۔ سو فیصد کال کرنے والوں کو سوٹ ملنے کی امید تھی۔

تقریباً ہر کال کے جواب میں میری گفتگو کچھ یوں رہی۔

"جی ہیلو... آپ کون بول رہے ہیں؟"

"خاتون محترم... کیا آپ اپنی گرے خیبر میں آٹھ فروری کو جینک روڈ سے گزری تھیں؟"

"جی... مگر ابھی کسی بدتمیز نے جواب دیا تھا کہ اشتہار بوگس تھا۔ آپ کون ہیں؟"

"میں معافی چاہتا ہوں۔ ہمیں مجبوراً ایسا کہنا پڑا۔ اشتہار میں ایک غلطی تھی۔ اس میں وقت درست نہیں لکھا گیا تھا۔ آپ وہاں سے کس وقت گزری تھیں؟"

"میں تو نہیں... میرے شوہر گزرے تھے۔" پھر خاتون وقت بتاتی تھیں۔ میں یہ کہہ کے فون بند کر دیتا تھا کہ شوروم کا افتتاح گیارہ بجے ہوا تھا۔ انعام گیارہ سے رات گیارہ تک گزرنے والی گاڑیوں کے لیے تھا... سوری...

یہ ڈائیلاگ شاید چالیس بار چلے۔ میں تقریباً مایوس ہو چکا تھا جب ایک شخص نے کہا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ وہاں سے گیارہ بجے گزرا تھا۔ شاید دو چار منٹ آگے پیچھے۔

میں نے آواز کو نارمل رکھتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کی گاڑی کا نمبر... ہم اپنے کلوز سرکٹ کیمرے سے تصدیق کریں گے۔ ہو سکتا ہے انعام آپ ہی کا ہو... آج ہی آپ کے گھر پہنچا دیا جائے گا۔"

اس نے نمبر بتا دیا۔ پھر نام اور پتا بھی۔

میں نے ایک نعرہ لگایا اور حلق سے وہ آوازیں نکالیں جو شتر مرغ کے پروں کی لنگوٹی میں ملبوس افریقا کے آدم خور حضرات و خواتین اس رقص کے دوران نکالتے ہیں جو کسی سفید فام کے سوپ کی تیاری کے دوران کیا جاتا ہے۔

صائمہ نے بغیر گھبرائے (وہ ایسی آوازوں کی عادی تھی) اور غزالہ نے گھبرا کے پیچھے دیکھا تو ہلکی سی ٹکر سے ایک سائیکل سوار کو ناک آؤٹ کر دیا مگر گاڑی کو رواں رکھا۔ "کیا ہوا؟"

"میرا دل چاہتا ہے میں ارشمیدس کی طرح سڑک پر لباسِ قدرت میں چلاتا جاؤں۔ میں نے پا لیا... میں نے پا لیا... اس نے سونے کی کثافت دریافت کرنے کا طریقہ معلوم کر لیا تھا ورنہ اس کا سر بادشاہ کے حکم پر قلم کر دیا جاتا۔ میں نے چشم دید گواہ کو پا لیا ہے۔" میں نے کہا۔

"کون چشم دید گواہ؟"

میں نے کہا۔ "مائی ڈیئر ایکٹنگ سویٹ ہارٹ... مہار موڑ لو۔ ہماری منزل بدل گئی ہے اب ہمیں نگہت خان سے نہیں راجا بنارس سے ملنا ہے۔ ایشیا کے طویل ترین بازار چلو۔"

"یعنی منچ بھاٹا؟" اس نے بریک لگائے۔ "بزدل صاحب وہاں یہ گاڑی نہیں جا سکتی اور چلی جائے تو واپس نہیں آ سکتی۔ کیا یہ بات آپ کے علم میں ہے؟ وہاں سڑک ہے گلی جیسی اور ٹریفک اللہ کی پناہ... یہ سائیکل والا تو بچ گیا۔ وہاں کوئی بے گناہ ضرور مارا جائے گا۔" وہ بات کرتے کرتے رکی۔ "لیکن ایک طریقہ ہے۔ ہم ٹیکسی میں جا سکتے ہیں۔"

ہم نے گاڑی کو بائیس نمبر چونگی کے قریب پارک کیا اور ایک ٹیکسی والے کو دگنے چوگنے کرائے کے وعدے پر راضی کر لیا کہ وہ ہمیں راجا بنارس کی دکان تک پہنچا کے انتظار کرے اور پھر واپس پہنچا دے۔ اس نے پانچ سو روپے کے لیے ٹیکسی کو اس ہجوم میں اتار دیا جو کسی سرنگ میں ہر طرف سرگرداں تھا۔ بس، ٹرک، رکشا، موٹر سائیکل ہر قسم کی سواری کے علاوہ جو ٹریفک کے قوانین کو پامال کرتے راستہ بنا رہے تھے۔ پیدل چلنے والوں کا بھی جمِ غفیر تھا جو ہر گاڑی کے نیچے آنے کا خواہش مند نظر آتا تھا۔

جب گھنٹا بھر جھک مار کے ہم بالآخر "راجاجی جنرل اسٹور" دریافت کرنے میں کامیاب ہوئے تو وہاں کے پروپرائٹر نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے انکشاف کیا کہ اس کا نام راجا بنارس نہیں بلکہ سرکار گل ہے۔ صورت سے وہ خرکار گل نظر آتا تھا اور فالتو بات سننے پر تیار نہ تھا۔

"دھندے کا ٹائم ہے مارا... کچھ لینا نہیں ہے تو جاؤ۔"

میں نے دوبارہ راجا بنارس کے نمبر پر فون کیا تو جواب یہی ملا کہ آپ کا ملایا ہوا نمبر اس وقت بند ہے۔ ایک گھنٹے بعد میں نے ہتھیار ڈال دیے اور پھر مسماۃ نگہت خان کو شرفِ ملاقات دینے چل پڑے...... تھکی ہاری غزالہ نے مزید ایک گھنٹے بعد گاڑی کسی نسبتاً کشادہ سڑک پر روک لی۔

"میں یہاں ٹھہرتی ہوں۔ وہ سامنے ہے نگہت خان کا

گھر... این کے بیوٹی پارلر۔''

میں نے کہا۔ ''تم آرام کرو... اب کسی فون کال کا نمبر نوٹ کرنے کی ضرورت نہیں۔ پاور آف کر دو۔''

ابھی میں نے کال بیل کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ میرے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ''ابھی فون کیا تھا آپ نے؟'' اس نے مجھ سے پہلے پوچھا۔ ''انعام لے کر آئے تھے۔''

''جی، ہم قریب ہی موجود ہیں۔'' مجھے اچانک ایک ترکیب سوجھ گئی۔ ''اگر آپ ایک سوال کا جواب دے دیں تو سوٹ آپ کا... بہت آسان سوال ہے۔''

''پوچھو جی، سو بار پوچھو۔'' اس نے ٹھیٹ پوٹھوہاری لہجے میں کہا۔

''گیارہ بجے آپ سگنل پر رکے ہوئے تھے... بینک روڈ اور کشمیر روڈ کے سگنل پر؟''

''ہاں جی... آپ نے دیکھ لیا کیمرے میں؟''

''یہ بتا دیں کہ جو گاڑی آپ کے سامنے رکی ہوئی تھی، اس کا نمبر کیا تھا؟''

چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد لائن کاٹ دی گئی۔

''ٹھیک ہے راجا جی... ابھی جواب دیتے تو آسانی رہتی۔ جواب نکلوانا پڑے گا بذریعہ تیرہ نمبر چھتر... میری شکل کیا دیکھ رہی ہو؟ گھنٹی بجاؤ۔'' میں نے صائمہ کو ڈانٹا۔

''تمہاری چال ناکام ہو گئی تو غصہ مجھ پر کیوں اتار رہے ہو؟'' اس نے مسکرا کے بٹن پر انگلی رکھ دی۔

خودکار دروازہ اندر سے کھول دیا گیا۔ ہم پورچ کی سائڈ سے گزرے جہاں دو گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک سیاہ رنگ کی ہنڈا سٹی تھی۔ دوسری سفید رنگ کی ٹویوٹا شاید سال پرانے ماڈل کی... پورچ کے آخر میں ایک دروازہ کھلا اور دنیا کی سب سے موٹی عورت نمودار ہوئی۔ ہتھنی جیسی ضخامت کے باوجود اس نے چست لباس میں اپنا سارا گوشت کا پہاڑ نمایاں کر رکھا تھا اور بال پریا ناگا چوپڑا کی طرح کٹوا رکھے تھے۔

میں نے محتاط انداز میں کہا۔ ''میں ایک اخباری نمائندہ ہوں۔''

''اچھا اچھا... بے بی کے بیوٹی پارلر پر فیچر بنانا ہے۔ میں بے بی کو بتا دوں۔'' وہ میری وضاحت سنے بغیر فلیٹ کے اندر غائب ہو گئی۔ چند منٹ بعد پھر آئی اور ہمیں اندر لے گئی۔ صائمہ کو اشارہ کر دیا تھا کہ خاموش رہے جو ہو گی دیکھی جائے گی۔ اور میں سمجھتا تھا کہ ٹرمپ کارڈ میرے ہاتھ میں ہے۔

ہمیں ایک بہت بڑے کمرے یا چھوٹے ہال کے آدھے حصے میں لگے ہوئے صوفے پر بٹھا کے بے بی کی بے بے پھر غائب ہو گئی۔ ہال کا بقیہ نصف حصہ روایتی انداز میں بیوٹی پارلر کی طرح بنایا گیا تھا۔ قدِ آدم آئینے، ڈریسنگ چیئرز، کاؤنٹر، میک اپ کے لوازمات سے بھرے ہوئے، ہیئر اسٹائل والی ماڈلز کی فریم کی ہوئی تصاویر۔

نگہت خان یوں نمودار ہوئی جیسے فیشن شو میں ریمپ پر کیٹ واک چلنے والی ماڈلز نمودار ہوتی ہیں۔ دائیں بائیں جھولتی لہراتی بل کھاتی... ماں اس کا مستقبل تھی تو وہ بہت بھیانک تھا۔ ابھی اس کے حسن پر بہار تھی تو شباب طغیانی پر آیا ہوا دریا... ٹانگوں پر چپٹی ہوئی جینز کے اوپر جو چار گرہ کپڑا اس نے پہن رکھا تھا، وہ کسی ڈھیلے مختصر تھیلے کی طرح تھا جس کے اوپر دو سوراخوں سے اس کے بازو نکلے ہوئے تھے اور نسبتاً بڑے سوراخ سے گردن باہر تھی۔ تھیلا ریشمی اور اتنا مختصر تھا کہ کمر سے چند انچ اوپر ہی ختم ہو گیا تھا۔ ستر پوشی کی یہ ادا از خود دعوتِ دیدار دیتی تھی اور نظر کو اسیر کر لیتی تھی۔ بال اس کے بھی تراشیدہ اور شانوں سے اوپر اس کے خونِ کبوتر میں رنگے ہونٹوں، دہکتے انگارہ گالوں، مصنوعی پلکوں اور سرے سے بنی بھووں والے چہرے پر لہرا رہے تھے۔ تیز خوشبو سے میرا دماغ چکرانے لگا۔

''تم کو نومی نے بھیجا ہے نا؟'' وہ چیونگم چباتے ہوئے میرے مقابل بیٹھ گئی۔

''نومی کون... وہ سبزی منڈی کا آڑھتی۔''

''مائی فٹ... میں نعمان کی بات کر رہی تھی جو مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔''

''سوری مس نگہت! میں ڈاکٹر حامد کے سلسلے میں بات کرنے آیا تھا۔''

اسے جیسے کرنٹ لگا۔ وہ اچھل کے کھڑی ہو گئی۔

''واٹ... کون ڈاکٹر حامد؟''

''وہ جس سے آپ کی شادی نہ ہو سکی۔''

''شٹ اپ اینڈ گیٹ آؤٹ۔'' اس نے انگلی اٹھا کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

''تو مس نگہت! میں بات کیے بغیر نہیں جاؤں گا۔''

وہ ہسٹریائی انداز میں چیخی۔ ''مگر میں اس کتے کے بچے کے بارے میں کوئی بات نہیں کر سکتی۔ اگر تم نہیں جاؤ گے تو میں پولیس کو بلا کے تم کو اندر کروا دوں گی۔''

''ضرور بلاؤ... لیکن یہ نہ ہو کہ گرفتار تم ہو جاؤ... ڈاکٹر حامد کو اغوا کر لیا گیا ہے چار دن پہلے... اور کچھ لوگوں

نے بتایا ہے کہ تمہارے تعلقات دشمنی کی حد تک کشیدہ ہو چکے تھے۔ ابھی تم نے میرے سامنے اسے کتے کا بچہ کہہ کے اس خیال کی تصدیق کر دی ہے۔ اچھا ہے جو ہم پوچھنا چاہتے تھے، وہ پولیس پوچھے گی۔''

اس نے گھبرا کے کہا۔ ''پولیس... لیکن میں نے تو لمبی مدت سے اس کو دیکھا بھی نہیں۔ میں اسے بھول چکی ہوں، ایک تلخ یاد کی طرح۔''

''اس تعلق کے ختم ہونے کی وجہ کیا تھی مس نگہت؟''

''وہ ایک مطلبی اور بدکردار شخص تھا۔ اس نے مجھے جسمانی طور پر بھی ایکسپلائٹ کیا اور میں ایک نادان جذباتی لڑکی استعمال ہوتی رہی۔ انتہا اس وقت ہوئی جب اس نے اپنی جان چھڑانے کے لیے کہا کہ میں اس کے ہونے والے بچے کو مار ڈالوں اور الزام لگایا کہ اس کا باپ کوئی اور ہے۔ پھر اس نے میرے انکار پر زبردستی کی۔ دھوکے سے مجھے لے گیا کسی ڈاکٹر کے پاس۔''

''یہ سب تم پولیس کے سامنے اپنے بیان میں کہو گی اور ثابت کرو گی؟'' صائمہ نے سوال کیا۔

وہ بھڑک اٹھی۔ ''تم کون ہوتی ہو یہ پوچھنے والی؟''

میں نے کہا۔ ''یہ میری وائف... ڈاکٹر صائمہ... گائناکالوجسٹ ہیں۔''

وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ ''سوری! میں نے بہت کچھ کہہ دیا جو مجھے کہنا نہیں چاہیے تھا۔'' پھر اس نے چلّا کے ماں کو آواز دی۔ ''ابھی تک تم کو مہمانوں کی خاطر تواضع کا خیال نہیں آیا؟''

''اس کی ضرورت نہیں۔'' میں نے کہا مگر اسی وقت مادر مہربان ہمارے لیے چائے اور بیٹی کے لیے ٹرے میں ایک جام سجا کے لے آئی۔ وہ جانتی تھی کہ کس کی ضرورت کیا ہے۔ پھر وہ بیٹی کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔

اسی وقت نگہت کا فون بول اٹھا۔ اس نے جام حلق میں انڈیلا اور فون کے اسکرین پر نظر آنے والے نمبر کو دیکھا۔ ''کیوں فون کیا ہے اس وقت... نہیں... ابھی مت آؤ... میں بزی ہوں... مہمان بیٹھے ہیں میرے پاس... سمجھتے کیوں نہیں یو سن آف اے بچ... ابھی میں بات بھی نہیں کر سکتی... میں خود ہی آ جاؤں گی جب فرصت ملے گی... تم کو میری بات ماننی چاہیے نومی... تم آج بھی میرے حکم کے غلام ہو اور ہمیشہ رہو گے... یہ کبھی مت بھولو ایڈیٹ۔'' اس نے فون بند کر دیا۔

پھر اس نے مجھ سے قطعی بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کیا تم واقعی مجھے پولیس سے بچا سکتے ہو؟ مجھے تفتیش کی بدنامی سے بہت ڈر لگتا ہے۔ وہ نخرے مردوے اکھاڑیں گے بلاوجہ... اگر مجھے ان کا منہ بند کرنا ہو تو کتنے پیسے دوں... ایک لاکھ کافی ہوں گے؟''

میں نے کہا۔ ''مس نگہت! پہلے آپ مجھے حقائق بتائیں۔ آپ کہتی ہیں بدکرداری کے باعث آپ نے بہت پہلے حامد کو چھوڑ دیا تھا؟''

''ہاں، میں اس کے ساتھ کیسے رہ سکتی تھی، اتنے گندے الزام کے بعد... یہ تو بہت پرانی بات ہے، اس کے بعد وہ مجھے نظر نہیں آیا۔''

''کیا تم ڈاکٹر حامد کی بہن ڈاکٹر غزالہ سے واقف ہو؟ وہ قصوروار تم کو ٹھہراتی ہے۔ کہتی ہے کہ بدکرداری کے باعث حامد نے تم کو چھوڑا تھا۔''

''وہ ایک روایتی کینہ پرور نند ثابت ہوتی... لیکن اب فرق نہیں پڑتا کیونکہ جس آدمی سے میں شادی کر رہی ہوں... وہ لاکھ درجہ بہتر ہے۔ کردار... تعلیم... اسٹیٹس... ہر لحاظ سے۔''

''تمہاری مراد ہے نومی سے جس نے ابھی کال کی تھی۔'' صائمہ نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

وہ تیز لہجے میں بولی۔ ''وہ نومی نہیں... ایک پرانا ملازم تھا جو اب کیبل آپریٹر ہے۔ میرے گھر پر ڈش لگانا چاہتا تھا۔''

اب نگہت کی ماں نے کہا۔ ''خدا کرے حامد واپس آ جائے۔ ہمارا اس سے کوئی تعلق تھا تو اب نہیں ہے۔ پولیس زبردستی پیسے بٹورنے کے لیے ہم سے پوچھ گچھ کرے تو یہ ظلم ہے۔ لیکن میرا گھر کھلا ہے۔ تم بھی دیکھ لو... ہم نے اسے نہیں چھپا رکھا ہے۔''

میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''آپ پریشان نہ ہوں۔ وہ رسمی کارروائی کرتے ہیں۔ خدانخواستہ آپ پر اغوا کا الزام کیسے آ سکتا ہے؟''

''ہاں، میں اکیلی بیوہ ایک جوان لڑکی کے ساتھ رہتی ہوں۔ دنیا سو طرح سے بدنام کرتی ہے۔ زبان کس کس کی پکڑی جا سکتی ہے۔'' اس نے آواز میں رقت پیدا کرنے کی ناکام کوشش کی۔

ہمارے باہر آتے ہی گیٹ پھر بند ہو گیا۔ غزالہ وہیں بیٹھی سخت بور ہو رہی تھی۔ ''کیا نگہت نے لنچ کے لیے روک رکھا تھا؟ میری تو جان عذاب میں ہے۔ فون آ رہے ہیں۔''

میں نے آگے کا دروازہ کھولا۔ ''صائمہ تمہارے

ساتھ رہے گی۔"

"کیوں؟ تم کہاں جا رہے ہو؟" صائمہ بولی۔

میں نے کہا۔ "تم یہاں انتظار کرو۔ ابھی کچھ دیر میں نگہت اپنی گاڑی میں نکلے گی۔ تمہیں اس کا پیچھا کرنا ہے۔ مجھے بتانا وہ کہاں جا رہی ہے۔"

صائمہ نے دروازے کو بند کر دیا۔ "اتنا پراسرار کیوں بن رہے ہو؟ بتاتے کیوں نہیں کہ مجھے ڈراپ کر کے تم اکیلے کہاں جاؤ گے؟"

میں نے اسے پیار سے اندر دھکیل دیا۔ "بلبل جان... میں پولیس اسٹیشن جا رہا ہوں جو تم جیسی حسین خواتین کے لیے اچھی جگہ نہیں ہے۔ پھر یہ کام تمہارے سوا کون کر سکتا ہے؟ کیا تم چاہتی نہیں کہ تمہاری پیاری سہیلی غزالہ کی پریشانی جلد از جلد دور ہو؟ ہم کس لیے آئے ہیں یہاں؟"

وہ منہ پھلا کے بیٹھ گئی تو میں نے ایک گزرتی ہوئی ٹیکسی کو روکا۔ راولپنڈی میں اچھی بات یہ ہے کہ ٹیکسیاں بافراط ہیں چنانچہ نہ انتظار کرنا پڑتا ہے نہ اصرار۔ نہ انکار ہوتا ہے نہ اضافی کرائے کی تکرار۔ چھوٹی ٹیکسیاں صاف ستھری ہیں اور عام اجازت ہے کہ کوئی بھی اپنی ہر رنگ کی گاڑی پر سامنے ٹیکسی کا سائن لگائے اور مسافر اٹھائے۔ یہ بھی ایک پرائیویٹ مہران کار تھی جسے ایک اسٹوڈنٹ چلا رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ انٹر کا امتحان دے رہا ہے اور یہ باپ کی گاڑی تھی جس کو اب اس کی موت کے بعد وہ گھر چلانے کے لیے بطور ٹیکسی استعمال کر رہا تھا۔ میں نے اس کی تعریف کی اور اسے انتظار کرنے کو کہا۔

تھانے میں زمرد خاں کا کمرا خالی تھا۔ بقول محرر، صاحب گشت پر تھا۔ بلا تکلف میں نے اس کا کمرا استعمال کیا اور حکم دیا کہ تھانے دار صاحب کو میری تشریف آوری کی اطلاع وائرلیس پر کر دی جائے کیونکہ ایس پی رحم دل خاں بھی آ رہے ہیں۔ یہ دوسری جھوٹی بات سارے تھانے کو الرٹ اور اٹینشن کرنے کے لیے جادو کی گولی ثابت ہوئی۔

ایک اے ایس آئی مؤدبانہ میرے سامنے آ بیٹھا۔

"سر! آپ چائے لیں گے یا بوتل؟"

میں نے اسے راجا بنارس کا نمبر دیا۔ "اس بندے کو کتنی دیر میں حاضر کیا جا سکتا ہے؟ پتا میں بتا دیتا ہوں۔"

"پنج بھاٹا، گھنٹا تو لگ جائے گا سر... آنے جانے میں۔"

"صرف جانے میں کتنا وقت لگے گا... آدھا گھنٹا؟" میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "گاڑی ہے میرے پاس... چلو۔"

وہ آگے اور میں ٹیکسی میں پیچھے بیٹھ گیا۔ لڑکا کچھ اپ سیٹ لگتا تھا کہ پولیس کا معاملہ ہے تو اس کی محنت بیکار نہ بن جائے۔ ٹیکسی کے روانہ ہوتے ہی میرا فون بجنے لگا۔ کال صائمہ کی تھی۔

"وہ گھر سے نکلی ہے، ہم اس کے پیچھے ہیں۔"

"گڈ! غزالہ راستوں سے واقف ہے مگر اتنی اچھی ڈرائیور نہیں ہے۔ تم ٹیک اوور کر لو۔ اسے مس نہیں ہونا چاہیے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "کسی سگنل پر گاڑی رکے تو سیٹ بدل لینا اور رننگ کمنٹری کی ضرورت نہیں۔ وہ اتر کے کہیں جائے تو بتا دینا۔" میں نے فون بند کر دیا۔

راستہ قدرے صاف ملا تو میں بیس منٹ میں دوبارہ پنج بھاٹا میں تھا۔ میرے پوچھنے پر اے ایس آئی نے مفید معلومات دیں۔ "سنا ہے سر کہ یہاں انگریزوں نے خندقیں بنا رکھی تھیں۔ ذرا فاصلے پر چاند ماری گراؤنڈ ہے۔ چاند ماری کہتے ہیں نشانہ بازی کو... فائرنگ رینج کو... وہاں رینج روڈ بھی ہے... رینج بگڑ کر پنج ہو گیا۔ بھاٹا کہتے ہیں پتھر کو۔"

راجا جی بک اسٹور والے کا رویہ پولیس کے لیے بالکل مختلف ثابت ہوا۔ "سر جی، آپ آگے دیکھو ایک اور شاپ ہے۔ راجا جانی بک شاپ... یہ راجا بنارس ادھر نہ ہو۔"

اس کی تھیوری درست ثابت ہوئی۔ وہ ایک نسبتاً نئی اور چھوٹی دکان تھی۔ میں نے اے ایس آئی کو ٹیکسی میں چھوڑا اور خود دکان میں داخل ہو گیا۔ ایک دبلا پتلا شخص جس کے بال سر پر نہیں منہ پر خوب گھنے تھے، بڑی مستعدی سے آگے آیا۔ "جی جناب۔"

میں نے اسے چند سیکنڈ گھورنے کے بعد کہا۔ "راجا بنارس! تم کیا پسند کرو گے؟ اپنی بیوی کے لیے سوٹ... یا اپنے لیے ہتھکڑی۔"

وہ بری طرح چونکا۔ "کون ہو تم؟"

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔" میں نے درشتی سے کہا اور باہر کی طرف اشارہ کیا۔ "دونوں گاڑی میں موجود ہیں۔ سوٹ بھی اور پولیس بھی۔"

اس کے چہرے پر مردنی چھا گئی۔ وہ افسوس سے سر ہلانے لگا۔ "یہ سب لالچ کرنے کی سزا ہے۔"

"اس گاڑی کا نمبر؟"

"ایم این یو... ایک سو چھیاسی۔" آواز اس کے حلق میں پھنسنے لگی۔

"نمبر کیوں دیکھا تھا تم نے؟"

وہ گھگیانے لگا۔ "میں مشکل میں پڑ جاؤں گا سر... وہ خطرناک لوگ ہیں۔"

"ہم انہیں اندر کر دیں گے تو تم محفوظ ہو جاؤ گے۔ وہ گاڑی اغوا برائے تاوان کے ایک کیس میں استعمال ہوئی تھی۔ تم نے اغوا ہوتے دیکھا تھا۔ اغوا ہونے والا ڈاکٹر حامد تھا۔"

"مگر میں نے اغوا کرنے والوں کو نہیں دیکھا تھا۔" وہ قسمیں کھانے لگا۔

"قسم جھوٹے لوگ کھاتے ہیں۔ مجھے پورا واقعہ بتاؤ، تم نے کیا دیکھا تھا۔"

اس نے رک رک کر بتانا شروع کیا۔ "میرے ساتھ بیوی تھی۔ ہم کشمیر روڈ کے سگنل پر رکے تھے۔ میرے آگے صرف ایک گاڑی تھی۔ سفید رنگ کی نئی ٹویوٹا کرولا۔ وہ زیبرا کراسنگ لائن پر تھی۔ یونائیٹڈ بیکری کی طرف سے ایک نوجوان سڑک پار کرنے لگا تو ایک دم گاڑی کا دروازہ کھلا۔ آگے سے ایک شلوار قمیص والا اترا۔ اس کی مونچھیں تھیں۔ پیچھے سے کالی ٹی شرٹ اور جینز والا نوجوان۔ نوجوان نے سڑک کراس کرنے والے کو کھینچا۔ مونچھوں والے نے دھکا دیا۔ وہ اندر گرا تو دروازہ بند ہو گیا۔ ڈرائیور نے گاڑی بڑھا دی۔ سگنل دس پندرہ سیکنڈ پہلے ہو گیا تھا۔ میرے پیچھے گاڑیوں کی قطار تھی۔ گاڑیوں والے ہارن دے رہے تھے۔ سفید کرولا سیدھی نکل گئی۔"

"وہاں ٹریفک میں کوئی گاڑی زیادہ تیز نہیں بھگا سکتا۔ تم نے اس گاڑی کا پیچھا کیوں نہیں کیا... پولیس کو کیوں نہیں بتایا؟"

"میں نے کہا تھا مگر بیوی نے کہا کہ پاگل مت بنو۔ وہ تمہیں یا مجھے اٹھا کے لے جائیں گے۔ ٹھیک کہا تھا اس نے۔ پولیس کے پاس جاتا تو گواہی گلے پڑ جاتی۔ پیچھا کرنے کا ویسے بھی سوال نہیں تھا۔ ایک نئی کرولا کا پرانی خیبر سے کیا مقابلہ۔"

"ایک آخری سوال... اگر تم اغوا کرنے والوں کو دوبارہ دیکھو گے تو پہچان لو گے؟"

وہ ہاتھ جوڑنے لگا۔ "خدا کے لیے مجھے گواہی کے چکر میں نہ ڈالیں۔"

میں نے کہا۔ "صرف ایک بار تم تھانے میں اسے

کروڑپتی

نوجوان نے بڑی جدوجہد کے بعد بوڑھے کو گہرے سمندر میں ڈوبنے سے بچایا اور اسے کندھے پر لاد کر ساحلی ہٹ تک لے آیا۔

"جوان! میں تمہارا ممنون ہوں۔" ہوش میں آنے کے بعد بوڑھے نے فرطِ جذبات سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تمہارا یہ احسان کیسے اتاروں... بس ایک ہی راستہ ہے کہ میں اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی تمہارے ساتھ کر دوں۔"

"کہاں ہے وہ؟" نوجوان کی متجسس نگاہیں لڑکی کی تلاش میں بھٹکنے لگیں۔

بوڑھے نے آواز دی اور ہٹ کے دروازے سے اس کی بیٹی مسکراتے ہوئے نمودار ہوئی۔

اس پر نگاہ پڑتے ہی نوجوان نے پھرتی سے بوڑھے کو اپنے کندھے پر لادا اور اس کی چیخ و پکار کی پروا کیے بغیر سمندر کی طرف دوڑ لگا دی۔

"ارے... میرے ڈیڈی کو زبردستی کہاں لیے جا رہے ہو؟" لڑکی خوف زدہ ہو کر چیخی۔

"سمندر میں ڈبونے!" نوجوان نے دوڑتے ہوئے جواب دیا۔ "اس پر ایسا احسان کرنے سے میں باز آیا جس کے نتیجے میں مجھے تم سے شادی کرنی پڑے۔"

"لوٹ آؤ۔" نوجوان کے کانوں میں لڑکی کی آواز آئی۔ "میرے ڈیڈی کروڑپتی ہیں اور میں ان کی اکلوتی وارث ہوں۔"

نوجوان کے پیر ریت پر جم گئے۔ اس نے لمحہ بھر کے لیے سوچا اور بوڑھے کو احتیاط سے اپنے کندھے سے اتار دیا۔ پھر وہ دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے واپس جا رہے تھے اور لڑکی کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

تصویر العین کا چٹکلا

شناخت کرو گے، سامنے آئے بغیر... تمہارا نام کہیں نہیں آئے گا۔ یہ یقین ہو جانے کے بعد کہ ہم نے صحیح آدمی کو پکڑا ہے، ہم عدالت کے لیے گواہ کسی اور کو بنا لیں گے۔ اب رہ گیا تمہارا انعام۔"

"نہیں چاہیے جی مجھے کوئی انعام۔ آپ میری جان بخش دیں بس۔" وہ فریادی نظروں سے اوپر دیکھنے لگا۔

میں نے غرا کے کہا۔ "انعام تو تمہارا باپ بھی لے گا، اپنی بہو کے لیے۔" اور دکان سے نکل گیا۔

ایک بار پھر میرے بیٹھتے ہی صائمہ نے کال کی۔ "ہم اسلام آباد میں ہیں۔ کون سا علاقہ ہے یہ... یہ لو... غزالہ سے بات کرو۔"

غزالہ نے کہا۔ "ہم اسلام آباد ایکسپریس وے پر اس کے پیچھے رہے۔ اب کھڑے ہیں جی ایٹ ٹو میں۔"

"گاڑی کھڑی ہے... تم بیٹھی ہو گاڑی میں۔"

"یہ ایک درمیانہ سا گھر ہے۔ دو حصوں کا رقبہ تو پانچ سو گز ہو گا۔ علیحدہ دو یونٹ ہیں۔ گیٹ بھی الگ۔ ایک پر جہانگیر مرزا کی نیم پلیٹ لگی ہوئی ہے، دوسری پر کوئی نام نہیں۔ یہ وہ اسی حصے میں گئی ہے۔ اندر پہلے سے ایک گاڑی موجود تھی۔ اس نے پیچھے کھڑی کر دی اور گیٹ بند کر دیا۔ اب بتاؤ کیا کرنا ہے؟"

"اس جہانگیر مرزا سے یا اس کی فیملی سے پوچھو کہ یہاں مرزا تفنگ چنگیزی رہتے ہیں؟ وہ کہہ سکتی ہے کہ نہیں تو... یہاں فلاں رہتا ہے۔ وہ کرائے دار ہے یا مالک... تم پوچھ سکتی ہو... تھوڑا سا پریشانی کا اظہار کرنا کہ ہمیں کسی نے غلط بھیج دیا یا ہم نے غلط لکھا... سوری... اگر اتنی دیر نگہت وہاں موجود رہے تو دیکھو وہ واپسی میں کسی کے ساتھ گئی ہے یا اکیلی؟"

"اور وہ اندر ہی ہو پھر؟"

"پھر کیا... انتظار کرو۔ دیکھو وہ اکیلی واپس آتی ہے تو کب... نمبر دیکھ لینا گھر کا۔"

"اور وہ نکلی ہی نہیں رات بھر... پھر؟"

"گھبرانے کی بات نہیں۔ میں آتا ہوں، ابھی ایک گھنٹے میں۔"

اے ایس آئی نے پلٹ کر مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "خیریت تو ہے سر؟"

"ہاں، وہ میری بیوی کسی سے ملنے اسلام آباد گئی تھی۔ راستوں کا پتا نہیں۔" میں نے ایک روایتی شوہر کی طرح بیزاری کا اظہار کیا۔

ٹیکسی والے نے پیچھے دیکھے بغیر کہا۔ "اب کہاں جانا ہے سر؟"

میں نے کہا۔ "تھانے دار صاحب کو واپس تھانے میں بند کر کے... میرا مطلب ہے پہنچا کر تم مجھے اسلام آباد لے جاؤ گے یا پھر ڈھوک کالا خان۔"

میں نے اے ایس آئی کو تھانے میں اتارا تو زمرد خاں بے چینی سے ایس پی صاحب کا انتظار کر رہا تھا۔ "وہ ابھی تک نہیں آئے سر۔"

میں نے کہا۔ "افسر لوگ مرضی کے بادشاہ ہوتے ہیں۔ تم بتاؤ... جو کام میں نے تمہارے سپرد کیا تھا؟ اس کا کیا بنا؟"

اس نے بغلیں جھانکتے ہوئے کہا۔ "وہ میں نے کچھ مخبر لگائے ہیں اس کام پر... لیکن۔"

"اچھا چھوڑو... تم سے نہیں ہو گا کچھ بھی۔ مجھے تھوڑی سی ہیروئن چاہیے اور کچھ ناجائز اسلحہ؟"

وہ چونکا۔ "ہیروئن... اور اسلحہ۔"

"ہاں سو گرام ہیروئن دے دو اور کوئی اچھا سا کارآمد ریوالور... ڈراما کرنے کی ضرورت نہیں... مجھے معلوم ہے کہ ہر تھانے میں کسی بے گناہ پر فردِ جرم لگانے کے لیے سب کچھ ہوتا ہے۔ ضرورت نہیں پڑے گی تو تمہیں واپس مل جائے گا سب کچھ۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "اس کے بعد... آپ میری پروموشن کا کیس..."

"ہاں، میں غور کرنے کے امکانات کا جائزہ لینے کا سوچوں گا۔"

میں ٹیکسی میں روانہ ہوا تو میں نے غزالہ کو کال کیا۔ "تم پتا سمجھا سکتی ہو؟ مجھے نہیں، یہ ڈرائیور ہے میرے ساتھ... اس سے بات کرو۔"

"مگر وہ تو چلی گئی ہے واپس اکیلی... اور ہم بھی واپس جا رہے ہیں۔"

"جاؤ مگر اسے پتا بتا دو۔" میں نے موبائل اس نوجوان ڈرائیور کو تھما دیا۔

تقریباً چالیس منٹ کے بعد اس نے ایک سرسبز درختوں میں گھری ویران نظر آنے والی کوٹھی کے سامنے مجھے اتار دیا۔ میں نے گرد و پیش کا جائزہ لینے کے بعد اسے تسلی دی۔ "تم یہاں رکو... اور پیسوں کی فکر مت کرنا۔ جتنے کہو گے مل جائیں گے۔ بس ایمانداری سے لینا، یہ مت سمجھنا کہ اجنبی کو راستوں کا کیا پتا۔"

وہ کچھ نہیں بولا۔ کوٹھی کے واضح طور پر دو حصے تھے اور ایک جیسے۔ درمیان میں تین فٹ کی پتلی سی گلی دونوں کو جدا کرتی تھی۔ دونوں کا مشترکہ لان تھا۔ لان کے دونوں جانب دو گیٹ تھے۔ ایک میں دو کاریں کھڑی تھیں۔ یہ جہانگیر مرزا کی رہائش گاہ تھی۔ دوسرے گیٹ پر کوئی نیم پلیٹ نہیں تھی۔ میں نے اندر ہاتھ ڈال کے دروازہ کھولا اور سیدھا چلتا گیا۔ میرے سامنے ایک بند دروازہ آ گیا۔ میں نے اس پر ہاتھ سے دستک دے دی۔

ایک پچیس تیس سال کے گورے چٹے مضبوط جسم والے نوجوان نے دروازہ کھولا اور مجھے غصے سے دیکھا۔ "کون ہو تم؟ کال بیل کیوں نہیں بجائی؟"

میں نے خفت سے کہا۔ "آئی ایم سوری۔ گھنٹی کئی بار بجائی، میں سمجھا لائٹ نہیں ہے یا گھنٹی خراب ہے۔"

"کس سے ملنا ہے تمہیں؟" وہ واضح طور پر جارحانہ رویہ رکھنے والا بدتمیز آدمی تھا۔

"نعمان سے... تم نعمان ہی ہو نا؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا مگر دروازے کو روکے کھڑا رہا۔ "کیا کام ہے مجھ سے؟ اور تم ہو کون؟"

"کیا سارے سوال جواب یہیں کھڑے کھڑے پوچھو گے۔ مہمان سے اتنی بداخلاقی۔"

"میں نہیں جانتا تمہیں... پہلے نام بتاؤ اپنا اور کام۔"

میں نے کہا۔ "میں بزدل ہوں۔"

وہ کچھ حیران ہوا۔ "یہ کس قسم کا مذاق ہے۔ تم نشے میں ہو یا پاگل... دفع ہو جاؤ فوراً۔"

میں نے ایک دم اسے دھکا دیا اور اس کے پیچھے اندر داخل ہوتے ہی ریوالور نکال لیا۔ "میں نے مختصر نام بتایا تھا۔ پورا نام ہے بدیع الزماں دلنواز لالہ موسوی... میں ایک رپورٹر ہوں۔ سیدھے کھڑے رہو۔ یہ نقلی پستول نہیں ہے اور میرا نشانہ بھی اچھا ہے۔"

اس کی اکڑفوں ختم ہو گئی۔ "مسٹر بزدل! کیا چاہتے ہو تم؟"

"ہم یہاں کھڑے رہ کر بات نہیں کر سکتے۔"

"میں تمہیں اندر نہیں لے جا سکتا۔ میرے مہمان ہیں۔" وہ بولا۔

"ایک مہمان کا نام ڈاکٹر حامد تو نہیں ہے؟"

وہ چونکا اور جارحانہ انداز میں آگے بڑھا۔ میں نے ریوالور پر سے سیفٹی کیچ ہٹا دیا۔

انوکھا لاڈلا

بیٹا گہری نیند سو رہا تھا۔ ماں نے سرہانے جا کر پیار سے کہا۔ "اٹھ جاؤ، بہت دیر ہو گئی ہے، تمہیں اسکول جانا ہے۔"

"نہیں، میں آج اسکول نہیں جاؤں گا۔"

"تم دو دن سے غیر حاضر ہو... یہ بہت بری بات ہے۔" ماں نے قدرے خفگی سے کہا۔ "تم اسکول جانے سے کیوں جی چراتے ہو؟"

"میں اسکول جاتا ہوں تو وہاں سب بچے اور استاد مجھ سے نفرت کرتے ہیں... وہاں میرا دل نہیں لگتا... آخر میں اسکول کیوں جاؤں؟"

"میرے پیارے بیٹے... اسکول جاؤ، اس لیے کہ اب تم باون سال کے ہو گئے ہو اور تم اس اسکول کے پرنسپل ہو، آج کل گھوسٹ اسکولوں کے ساتھ گھوسٹ ٹیچرز کی بھی شامت آئی ہوئی ہے۔"

ترکیب

کیلی فورنیا کی عدالت میں فضا سازگار نہیں تھی۔ وکیل کو یقین تھا کہ اس کا موکل مقدمہ ہار جائے گا۔ اس نے اپنی فرم کے سینئر وکیل سے مشورہ کیا کہ جج سگاروں کا شوقین ہے۔ اسے ہوانا کے قیمتی سگاروں کا ایک بکس تحفے میں بھیج دیا جائے تو کیسا رہے گا۔ سینئر وکیل نے اسے سختی سے منع کرتے ہوئے بتایا کہ جج بہت ایمان دار ہے۔ اس نے ایسی حرکت کی تو وہ جیتا ہوا مقدمہ بھی ہار جائے گا۔

اگلی سماعت میں وکیل مقدمہ جیت گیا تو سینئر وکیل نے کہا کہ اگر وہ سگار بھیج دیتا تو ضرور مقدمہ ہار جاتا۔ وکیل نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں نے سگاروں کا بکس بھیج دیا تھا... اپنی طرف سے نہیں، فریقِ مخالف کی جانب سے۔"

محمد شاہان سعید کی عرق ریزی

”میں کسی ڈاکٹر حامد کو نہیں جانتا۔“ وہ ہکلایا۔

”مگر میں جانتا ہوں۔ اب تمہارے سامنے دو راستے ہیں، مجھ سے بات کر لو... ورنہ پولیس باہر موجود ہے۔ تمہارا جرم بہت سنگین ہے اور یہ مت سمجھنا کہ گواہ کوئی نہیں۔ وہ تھانے میں آجائیں گے تمہیں شناخت کرنے۔ اصلی نقلی سے فرق نہیں پڑتا۔ تم نے کب دیکھا تھا کہ کون دیکھ رہا ہے... چلو۔“

وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹا، میں آگے بڑھتا رہا۔ اگلا دروازہ ڈرائنگ روم کا تھا۔ نعمان کی حالت غیر تھی۔ وہ اتنا نروس تھا کہ سوچے سمجھے بغیر مجھ پر حملہ کر سکتا تھا۔ ایسا ہوتا تو میں بے دریغ اس کی ٹانگ میں گولی مار دیتا۔ تاہم میری خواہش تھی کہ پڑوسی یہ دھماکا نہ سنیں۔ پہلے میں نعمان سے اعترافِ جرم سن لوں۔

”تم اکیلے رہتے ہو یہاں؟“ میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا مگر ریوالور کا رخ اس کی طرف رکھا۔

اس نے کہا۔ ”میری فیملی آج کل بڑے بھائی کے پاس کراچی میں ہے۔ میں کرائے پر رہتا ہوں۔“

”ڈاکٹر حامد کو تم نے کہاں رکھا ہے؟“

”نیچے... بیسمنٹ میں۔“ وہ بولا۔ ”میں اسے لے آتا ہوں۔“

”ابھی جلدی نہیں۔ پہلے بتاؤ تمہاری کیا دشمنی تھی اس سے... کیوں اغوا کیا اسے؟“

وہ صوفے پر گر پڑا۔ ”میری کوئی دشمنی نہیں تھی۔ میں مجبور تھا۔“

”اس مجبوری کا نام نگہت خان تو نہیں؟“ وہ پھر چونکا۔ ”تم سزائے موت سے بچ سکتے ہو۔ اگر سچ بتا دو کہ تم نے نگہت کے کہنے پر اس جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ مجھے بتاؤ تم اس کے کہنے پر مجبور کیوں ہوئے تھے؟“

وہ کچھ دیر خلا میں گھورتا رہا۔ خوف کی زردی اب اس کے چہرے پر اتر آئی تھی۔ ”میں اس کو چاہتا ہوں۔ شادی کرنا چاہتا ہوں اس سے... لیکن... لیکن میں بے روزگار تھا۔ اس نے کہا میرا ایک کام کرو تو میں تم سے شادی کر لوں گی۔ میرے پوچھنے پر اس نے ڈاکٹر حامد کو اغوا کر کے لانے کا کہا۔ اس نے کہا کہ وہ اپنی تذلیل کا انتقام لینا چاہتی ہے۔ سارا پلان اس کا تھا۔“

”کیا وہ اسے قتل کرنا چاہتی تھی؟“

”آئی ڈونٹ نو... وہ پاگل ہے کچھ... یہاں اس نے ڈاکٹر حامد کو بہت گالیاں دیں۔ مارا اپنے جوتے سے... اور مجھ سے کہا... اس کے منہ پر... پیشاب کرو۔“

”اور تم نے کیا؟“ میں نے چلّا کے اسے گالی دی۔

”میں اس کی کیسے نہ مانتا۔ اس نے حامد کے اغوا کو ایک شرط بنا لیا تھا۔ جب سے ڈاکٹر حامد کی منگنی اس لڑکی کرن سے ہوئی تھی، اس کا دماغ زیادہ خراب ہو رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میری شادی نہیں ہوئی تو میں کرن کی شادی بھی حامد سے نہیں ہونے دوں گی۔ اس نے میرے سامنے ایک شرط رکھ دی کہ تم حامد کو اٹھا لاؤ تو میں تم سے شادی کر لوں گی۔ میرے سمجھانے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ مجھے ذلیل کرتی تھی کہ یہ کیسی محبت ہے تمہاری... میں تم سے پہاڑ کھود کے دودھ کی نہر نکالنے کے لیے تو نہیں کہہ رہی ہوں... اس نے کہا کہ وہ میری مدد کرے گی اور اغوا کا سارا پلان اسی کا تھا۔“

”گاڑی بھی اسی کی استعمال ہوئی تھی؟“

اس نے اعترافِ جرم میں سر ہلا دیا۔ ”تمہیں کیسے معلوم تھا کہ اس وقت کرن اور حامد وہاں سے گزریں گے؟“

”وہ ان کے تعاقب میں تھی۔ اچانک اس نے کہا کہ گاڑی لے کر چوک پر آجاؤ۔ میں بہت پیچھے کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ڈرائیور نے گاڑی کو عین سگنل پر زیبرا کراسنگ کے سامنے لا کھڑا کیا۔ وہاں کوئی بھی گاڑی زیادہ دیر کیسے کھڑی رہ سکتی ہے۔ اس نے کہا کہ بونٹ اٹھا دو تاکہ پیچھے والے رکے نہ رہیں... یہ سمجھیں کہ گاڑی خراب ہے۔ لیکن ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔“

”اس نے مزاحمت نہیں کی؟“

”کی تھی لیکن میں نے اسے موقع نہیں دیا۔ میں نے اس کے گلے پر خنجر رکھ دیا اور کہا کہ آواز نکالی تو ذبح کر دوں گا۔ گاڑی میں سینٹرل لاکنگ تھی، وہ دروازہ کھول نہیں سکتا تھا۔ ہم اسے یہاں لے آئے۔“

”کیا نگہت اسے قتل کرنا چاہتی تھی؟“

”ہاں لیکن وہ ڈرتی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ حامد کو شادی کے ناقابل بنا دے گی۔“

”او مائی گاڈ، وہ واقعی پاگل ہے۔“ میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔

”ایک دن یہ ہو جاتا۔ اس نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں حامد کو قابو رکھوں... وہ نہ جانے کس کو لائی تھی۔ وہ تیز دھار چھرے سے حامد کو مردانگی سے محروم کر دیتا لیکن حامد نے بھی جان کی بازی لگا دی۔ اس نے مجھے اٹھا کے پھینکا اور وہی خنجر اس خلیفہ کی گردن پر رکھ دیا جو ایک لاکھ روپے میں یہ کام کرنے پر راضی ہو گیا تھا۔ اس وقت نگہت نے ریوالور نکال لیا اور حامد پر فائر کیا جو اس کی ٹانگ میں لگا مگر وہ خلیفہ بھاگ گیا۔“

”اور یہ دس لاکھ کس نے مانگے تھے؟“

وہ چپ رہا۔ ”اس میں نگہت کا کوئی ہاتھ نہیں۔ اسے تو معلوم بھی نہیں کہ میں نے حامد کے گھر فون کر کے دس لاکھ مانگے ہیں۔ دراصل... میں بالکل پھکو تھا۔ نہ نوکری، نہ کوئی اور کام۔ یہ گھر میرے باپ نے چھوڑا تھا۔ ہم نے بیچ دیا اور اب آدھا کرائے پر لے رکھا ہے۔ میں نے سوچا کہ دس لاکھ مل جائیں تو میری عزت نگہت کی نظر میں کچھ بحال ہو جائے۔ میں شادی کا خرچ پورا کر لوں اور اسے ہنی مون پر لے جاؤں۔ آج ویلنٹائن ڈے ہے نا... آج ہم شادی کر لیتے۔“

پون گھنٹے بعد زمرد خاں نے مجرم کو اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ وہ بہت خوش تھا کہ اس کامیابی کے بعد اس کی پروموشن یقینی ہو گئی ہے اور وہ میرا ممنون تھا کہ میں نے اس کامیابی کا کریڈٹ خود نہیں لیا۔

☆☆☆

ٹیکسی غزالہ کے گھر کے دروازے پر رکی۔ میں نے اس باہمت نوجوان سے کہا۔ ”تم کچھ دیر اور رکو اور ڈاکٹر حامد... ٹیک اٹ ایزی۔ میں تمہارے گھر والوں کو شاک نہیں دینا چاہتا۔ صرف پانچ منٹ انتظار کرو میری کال کا۔“

میں اندر گیا تو وہ سب لاؤنج میں چپ چاپ مجسم انتظار بنے دروازے کو تک رہے تھے۔ شام کے چھ بج چکے تھے۔ ان کے کان قریب رکھے فون کی آواز پر تھے کہ گھنٹی بجے اور کوئی کہے کہ دس لاکھ لے کر فلاں جگہ آجاؤ اور اپنا بیٹا لے جاؤ۔ کال ابھی تک نہیں آئی تھی۔ گھڑی کی سوئیاں جیسے رک گئی تھیں۔

میں ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ”کوئی کال نہیں آئی؟“

غزالہ نے نفی میں سر ہلایا۔ اس کے والد دیوار کو تکتے رہے۔ ماں نے آنکھوں کے ختم ہو جانے والے پانی کے آخری قطرے کو گال پر بہنے دیا۔

”کال نہیں آئے گی... میں نے کہا تھا نا؟“ میں مسکرایا پھر ہنسا۔

> بھارت میں آبادی میں تیز رفتار اضافے پر ایک سیمینار ہو رہا تھا اور تشویش انگیز سنجیدہ تقاریر جاری تھیں۔ جب ایک بھارتی مندوب نے یہ کہا کہ بھارت میں آبادی بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے، ہر دس سیکنڈ میں ایک عورت کے یہاں بچے کی ولادت ہو رہی ہے تو سردار جوگندر سنگھ بوکھلا کر اپنی نشست سے اٹھے اور کہا۔
> ”جناب صدر! یہ بڑی خطرناک بات ہے، ہمیں یہ بکھیڑا سمیٹ کر اسی وقت اس عورت کی تلاش میں نکل جانا چاہیے ورنہ یہ سیمینار ختم ہونے تک وہ کم از کم پندرہ، بیس ہزار بچوں کو جنم دے چکی ہوگی۔“
> (پشاور سے طاہر گلزار کی شمولیت)

انہیں میری مسکراہٹ بہت عجیب لگی اور ہنسی بہت بری۔ ”ایسا مت کہو۔“ غزالہ نے خفگی سے کہا۔

”میں صحیح کہہ رہا ہوں۔ کال نہیں آئے گی۔ خوش خبری آئے گی۔“

وہ سب چونک کر میری طرف متوجہ ہو گئے۔

”کیا... حامد کا پتا چل گیا ہے؟“

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”وہ آتا ہی ہوگا بلکہ شاید آگیا ہے۔“

حامد کی ماں چلّائی۔ ”آگیا ہے، کہاں ہے میرا حامد... آگیا ہے تو مجھے نظر کیوں نہیں آتا؟“

میں نے نمبر ملا کے حامد سے کہا۔ ”بھئی آجاؤ ڈاکٹر حامد... سب انتظار کر رہے ہیں۔“

حامد کا اندر آنا ایک ایسا منظر تھا جو میں تاحیات بھلا نہیں سکتا۔ اس کی ماں نے چیخ ماری اور حامد کو گلے لگا کے اس کے ہاتھوں میں جھول گئی۔ باپ یوں آگے بڑھا جیسے سوتے میں چل رہا ہو اور اس نے حامد کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ غزالہ ہچکیاں لیتی اس سے لپٹی رہی۔ حامد نے ماں کو صوفے پر لٹا دیا۔

اس وقت منظر سے غائب ہو جانے والی صائمہ پھر نمودار ہوئی۔ اس نے کرن کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ قریب آکے اس نے کرن کے ہاتھ میں حامد کا ہاتھ دے دیا۔ ”یہ لو اپنی امانت۔ اب سنبھال کے رکھنا۔“

”ہیپی ویلنٹائن ڈے... ہم سب کو... جن کا ایمان محبت ہے۔“ میں نے کہا۔

کرن نے اپنا ہاتھ چھڑایا اور بھاگ گئی۔ خوشی کے آنسو شرم سے لال ہو جانے والے گالوں پر یوں لگتے تھے

جیسے بہار کی صبح میں گلابوں پر شبنم... رونے والے ہنسنے لگے۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کے اور شرم کو بالائے طاق رکھ کے وہ رخصتی سے پہلے سسرال آگئی تھی۔ "اب تم لینے آؤ گے تو آؤں گی ہمیشہ کے لیے..." اس نے غائب ہونے سے پہلے پلٹ کے دیکھا۔

اس رات ہم دیر تک جاگتے رہے۔ کھانے کے بعد کافی پیتے ہوئے باتیں کرتے رہے... آزمائش کے وقت کی جو گزر گیا تھا، خوابوں کو تعبیر دینے والے وقت کی جو قریب تھا۔

گفتگو کے ایک مرحلے میں حامد کے والد نے کہا۔ "ابھی تمہارے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

میں نے معذرت کی۔ "انکل! ہم سب کی نوکری چلی جائے گی... غزالہ اور صائمہ کی اور میری۔"

"جانے دو۔ شادی میں دن ہی کتنے رہ گئے ہیں اب... صرف دو ہفتے۔"

"ہم پھر آجائیں گے... وعدہ۔" میں نے کہا۔ "غزالہ جانتی ہے میں جھوٹے وعدے نہیں کرتا۔"

"خوب جانتی ہوں محترم بزدل صاحب۔" غزالہ طنز سے ہنسی۔ "اور صائمہ بھی جانتی ہے۔"

غزالہ کی ماں نے کہا۔ "کیسی باتیں کرتی ہو؟ اس نے وعدہ کیا تھا کہ حامد کو واپس لائے گا اور لے آیا۔"

"میں کس طرح شکریہ ادا کروں تمہارا۔" اس کے باپ نے کہا۔

"شکریے کی بات کی تو میں نہیں آؤں گا۔" میں نے کہا۔ "میں بتا رہا ہوں۔"

"اسے تو میں لاؤں گی باندھ کے۔" غزالہ نے کہا۔ "لیکن کل تو واقعی مجھے بھی ان کے ساتھ ہی جانا ہے۔"

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ "بارہ بجنے والے ہیں۔ میرا خیال ہے مجھے سو جانا چاہیے۔"

میں دن بھر کی بھاگ دوڑ میں تھک گیا تھا۔ بستر پر لیٹتے ہی مجھے نیند آگئی لیکن خواب جیسے نیند کا آسرا ڈھونڈ رہے تھے۔ میں نے صائمہ کو دیکھا۔ سرتاپا شعلہ جوالہ بنی وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ سرخ ملبوس میں اس کی آب و تاب پر نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی۔ چہرے کی چاندنی کے گرد بھی شفق کی لالی تھی اور لب و عارض کی سرخی آتشِ شوق کو بھڑکاتی تھی۔ اس کے نازک مرمریں ہاتھوں میں لال گلابوں کا گلدستہ تھا۔

اس نے مجھ پر جھک کے کہا۔ "ہیپی ویلنٹائن ڈے۔"

"آخر تم ایسا کیوں کرتی ہو میرے ساتھ؟ کب تک خوابوں سے بہلاتی رہو گی مجھے؟"

اس نے میرے ماتھے کو چوما۔ "خواب نہ ہوں تو تعبیر کہاں... آئی لو یو۔"

"مگر ویلنٹائن ڈے تو گزر چکا ہے۔"

وہ مسکرائی اور میرے پاس بیٹھ گئی۔ "نہیں... محبت کے دن پر آفتاب کبھی غروب نہیں ہوتا۔ دیکھو، دن ٹھہر گیا ہے۔"

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ واقعی اس میں ابھی بارہ نہیں بجے تھے۔ سوئیاں رکی ہوئی تھیں۔

"میں نے وقت کو روک دیا ہے۔" وہ ہنسی۔ "ہم ویلنٹائن ڈے کے پابند ہوں گے یا ویلنٹائن ڈے ہمارا پابند ہوگا۔"

تب میں نے جانا کہ یہ کوئی خواب نہیں اور میں نے اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ کے آہستہ سے اس کے لبوں کی سرخی چرالی۔ "ہیپی ویلنٹائن ڈے... جو ہماری پوری زندگی پر محیط ہوگا۔"

آنے والے اتوار کی صبح جب میری آنکھ اپنے خانہ ویراں کے فرش پر کھلی تو فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ "تم مجھتے ہو بڑے چالاک ہو۔"

"ہرگز نہیں، میں بزدل ہوں لیکن صبح دم یہ آتش فشانی کیسی؟"

"کل میلے کپڑوں کے نیچے سے مجھے ایک بیگ ملا تھا جو تم نے مجھ سے چھپا کے رکھا تھا... لال رنگ کا۔"

"کیسا بیگ بلبلِ جان... میرے پاس تو کوئی لال بیگ نہیں ہے۔"

"پوچھو... کہاں سے ملے تھے وہ دس لاکھ روپے... خیر، وہ جمع کرا دیے ہیں میں نے گھر تعمیر فنڈ میں ورنہ آج لے جاتے تمہارے لٹیرے دوست۔"

فون بند ہونے کے بعد بھی میں ہکا بکا لیٹا رہا۔ دس لاکھ روپے... لال بیگ... میں سوچتا رہا پھر گرہیں کھلنے لگیں۔ یہ وہی دس لاکھ تھے جو حامد کے والد اسے اغوا کرنے والوں کو دینے کے لیے لے کر بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھ سے کوئی بات کیے بغیر انہوں نے وہ بیگ میرے سامان کے ساتھ ڈکی میں رکھ دیا ہوگا اور میں نے دیکھے بغیر اسے نکال کے فلیٹ میں رکھ دیا تھا۔ ویلنٹائن ڈے گزر چکا تھا۔

دہری دھار

سمیرا یعقوب

برسہا برس سے سچ اور جھوٹ... حق و باطل شانہ بشانہ مصروفِ سفر ہیں... اس سفر میں بے انتہا مدوجزر اور صعوبتوں سے گزرنا پڑتا ہے... خصوصاً پیارے وطن کی حفاظت پر مامور جاں بازوں کے قلوب میں جوش و جذبہ... حرارتِ ایمانی کی شمعیں روشن رہتی ہیں... وہ آگ اور خون کا دریا پار کر کے اس دیارِ پاک کی مقدس سرزمین کو دشمنوں کی عیاریوں سے بچانے کے لیے اپنی جان نذر کر دیتے ہیں... اسی تناظر میں لکھی گئی... انتقام اور پیار کی داستان... دہری دھار پر چلتے ہوئے ان کے قدم ... ڈگمگاہٹ سے کوسوں دور تھے...

انتقام کے بھڑکتے شعلے اور سرفروشوں کی حکمت عملی کا جیتا جاگتا مظہر...

میں آفس میں آیا تو ہیڈ کوارٹر سے آیا ہوا ایک لفافہ میرا منتظر تھا۔ میں نے لفافہ چاک کیا تو پتا چلا مجھے دیگر افسران کے ساتھ افغانستان بھیجا جا رہا ہے۔ دونوں ملکوں کے درمیان ہونے والے ایک معاہدے کے تحت ہمیں بھیجا جا رہا تھا۔ ہمیں وہاں افغان فوجیوں کے ایک دستے کو ٹریننگ دینی تھی۔

اس سلسلے میں بریفنگ دینے کے لیے دو دن بعد مجھے ہیڈ کوارٹر طلب کیا گیا۔ میں نے مراسلہ واپس لفافے

میں ڈالا۔ جسم میں میٹھی سی سنسنی دوڑ گئی۔ میں آفس کا بندہ تھا ہی نہیں۔ میری پہلی ترجیح ہمیشہ فیلڈ ہی رہی تھی ۔ مراسلہ شاید میری فیلڈ ورک کے لیے دی گئی درخواست کا ہی نتیجہ تھا۔

کام کچھ خاص نہیں تھا مگر کچھ نہ کچھ تبدیلی کا احساس تو تھا۔ افغانستان میں، میں پہلے بھی ایک مشن مکمل کر چکا تھا۔ وہاں کا سخت موسم، کھانے اور غیور لوگ مجھے بے حد پسند تھے۔ ٹھیک دو دن بعد میں ہیڈ کوارٹر کے ایک چھوٹے سے کانفرنس روم میں ایک افسر سے بریفنگ لے رہا تھا۔ میرے ساتھ پانچ دوسرے افسران بھی اس بریفنگ میں شریک تھے۔

افسرِ اعلیٰ نے اپنی اسٹک ہاتھ میں گھماتے ہوئے بریفنگ کا آغاز کیا۔ ”آپ پانچوں کو منتخب کرنے کی پہلی اہم وجہ یہ ہے کہ افغانستان آپ لوگوں کے لیے اجنبی ملک نہیں ہے۔ دوسرا آپ لوگ پشتو زبان سے بھی شغف رکھتے ہیں اور تیسری وجہ آپ لوگ اپنے شعبوں میں پیشہ ورانہ مہارت رکھتے ہیں۔

”افغانستان ہمارا برادر ہمسایہ ملک ہے۔ ہمارا ازلی دشمن وہاں تیزی سے اپنا اثر ونفوذ بڑھا رہا ہے۔ ہم جہاں دیگر محاذوں پر اپنے ازلی دشمن کے خلاف برسرِ پیکار ہیں، وہاں ہم اس محاذ پر بھی پیچھے نہیں رہ سکتے۔

”جس طرح آپ لوگوں کو افغان دستے کی تربیت کرنی ہے، ایسے ہی انڈین آرمی کے چنیدہ افسران ایک دوسرے دستے کی تربیت کریں گے۔ ہماری تربیت کا معیار ان سے بہت بہتر ہونا چاہیے۔ آپ کی پیشہ ورانہ مہارت کا پھل مستقبل قریب میں ہمیں افغان آرمی کی تربیت میں کلیدی کردار کی صورت میں مل سکتا ہے۔“

سب نے اپنی پیشہ ورانہ ذمے داری کو پوری صلاحیت کے ساتھ ادا کرنے کا عزم ظاہر کیا۔ بعد میں سوالات کے وقفے میں کرنل محمود نے کچھ تکنیکی نوعیت کے سوالات کیے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ سینئر ہونے کے ناتے کرنل محمود ہی ہمارے لیڈر تھے۔ میں نے ہاتھ فضا میں بلند کیا تو جنرل صاحب نے سر کی خفیف جنبش سے اجازت مرحمت فرمائی۔

”سر! افغانستان میں ہماری ”حدود“ کیا ہوگی؟“

میرا بظاہر یہ عام سا سوال اپنے اندر جو وسعت رکھتا تھا، اس تک میرے سینئر افسران کو پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ کرنل محمود نے چونک کے میری طرف دیکھا۔ میں ان کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ فوج کے خاص حلقوں میں میری ایک مخصوص پہچان تھی۔

جنرل صاحب کی گھنی بھوؤں کے نیچے چمکتی آنکھوں نے بھی لمحے بھر میں میرے کاسۂ سر کے اندرونی گوشوں تک رسائی حاصل کرلی۔ انہوں نے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”میجر! آپ کو اپنی متعین حدود سے تجاوز نہیں کرنا مگر کسی سے دبنا بھی نہیں ہے۔ ممکن ہے آپ کا پالا دوسرے ملکوں کے ٹرینرز سے پڑ جائے۔“

”تھینک یو سر۔“ میں نے خاصا اطمینان محسوس کیا۔

رات میں سونے کے لیے لیٹا تو میرے ذہن میں وہ الفاظ بازگشت بن کر گونج رہے تھے... ”ممکن ہے آپ کا پالا دوسرے ملکوں کے ٹرینرز سے پڑ جائے۔“

ایک نام میرے دماغ میں دہکتے ہوئے انگارے کی طرح اتر آیا... میجر راہول ٹوبا۔ اور دل سے آہ کی صورت میں ایک خواہش بلکہ دعا نکلی۔ کاش قدرت اس سفاک درندے کو کسی طرح گھیر کر میرے مقابل لے آئے۔ اس کا بہت سا قرض تھا جو میرے سینے پر کوہِ گراں کی طرح دھرا ہوا تھا۔ دہکتا ہوا انگارہ دماغ سے سینے میں اتر آیا تھا۔

میں سینہ مسلتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اب میرے لیے سونا ممکن نہیں رہا تھا۔

دسمبر کی ایک بے حد خنک دوپہر میں رسد لے کر جانے والے سی ون تھرٹی نے ہمیں کابل ائرپورٹ پر اتار دیا جہاں ایک روسی ساختہ پرانے ٹرانسپورٹ ہیلی کاپٹر کے قریب افغان آرمی کا ایک بے حد سرخ چہرے اور اچھی خاصی توند والا کرنل ہمارا منتظر تھا۔

افغان کرنل نے بڑے روکھے انداز میں ہمارا استقبال کیا۔ یقیناً وہ اس مخصوص دھڑے سے تعلق رکھتا تھا جو ہم سے مخاصمت کے لیے بطورِ خاص جانا جاتا تھا۔

رینک کے لحاظ سے وہ سینئر تھا۔ میں نے بادلِ ناخواستہ اسے سیلوٹ کیا۔ ہیلی کاپٹر کی سمت بڑھتے ہوئے کیپٹن رسالت نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ”یہاں کی آرمی میں چند ایسے اور افسر نکل آئے تو پھر جوانوں کے راشن کا خدا ہی حافظ ہے سر۔“

فضائی سفر کے دوران میں ہم سب لوگوں میں دوستانہ بے تکلفی پیدا ہو چکی تھی۔ رسالت کو ویسے بھی میرے اسسٹنٹ کے فرائض انجام دینے تھے۔ اس کی روشن پیشانی، مضبوط کندھے اور چہرے پر لشکارے مارتا جوانی کا خون مجھے کسی کی یاد دلاتے تھے اور دل اس کی طرف کھنچتا تھا۔

”اگر اسے تمہارے حوالے کر دیا جائے تو کتنے عرصے میں اس کی توند کا تختہ کر دو گے؟“ میں نے لطف لیتے ہوئے پوچھا۔

اپنے ”شاندار استقبال“ کا غصہ ابھی تازہ تھا۔ رسالت کے نتھنے پھول گئے۔ ”صرف پندرہ منٹ میں سر۔“

ہمارے ساتھ چلتے میجر فواد نے کہا۔ ”کوئی جادو جانتے ہو کیپٹن؟ میری معمولی سی توند کو تو پھر دو منٹ میں ٹھیک کر دو گے۔“

”جادو ہی سمجھیں سر!“ رسالت نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ ”مگر توند کو ”تختہ“ کرنے والے گھونسے آپ برداشت نہیں کر پائیں گے۔“

میجر فواد کے حلق سے نکلنے والا قہقہہ بے حد بے ساختہ تھا۔ سب سے آگے چلتے کرنل محمود اور افغانی کرنل نے بیک وقت سر گھمایا۔ کرنل محمود کے چہرے پر خفگی اور افغانی کرنل کے چہرے پر واضح خشونت نظر آئی۔

میجر فواد نے زیرِلب خود کو کوسا۔ ہماری ٹیم کے باقی ممبران کے چہروں پر مسکراہٹیں چمکنے لگیں۔ ہمارے استقبال کی طرح ٹرانسپورٹ ہیلی کاپٹر بھی ”شاندار“ تھا۔ اس ٹرانسپورٹر کو عرفِ عام میں ”اڑتا ہوا تابوت“ کہا جاتا تھا۔

ہم مختصر سامان کے ساتھ عقبی حصے میں لد گئے۔ افغانی کرنل آگے پائلٹ کے ساتھ والی نشست پر بیٹھ گیا۔

ہیلی کاپٹر کا انجن اسٹارٹ ہونے سے پہلے میجر فواد نے اپنے ”بے ساختہ“ قہقہے پر کرنل محمود سے معذرت کی جسے انہوں نے قبول کرلیا۔ کوئی جونیئر آفیسر ہوتا تو اس بے ساختگی کی سزا یقینی تھی۔

ہیلی کاپٹر کا انجن قیامت خیز شور کے ساتھ اسٹارٹ ہوا اور اڑنے والے تابوت نے زمین چھوڑ دی۔ دو ہزار فٹ بلندی پر پہنچنے کے بعد بھی پائلٹ ہیلی کاپٹر کو آگے بڑھانے کے بجائے بلندی میں بتدریج اضافہ کرتا چلا گیا۔

ایم آئی 16 جہاں فضائی حادثات کے لیے مشہور تھا، وہاں اس کی بہت زیادہ بلندی پر پرواز کی خوبی بھی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ سات ہزار فٹ کے لگ بھگ بلند ہونے کے بعد ہیلی کاپٹر آگے بڑھا۔

اس ہیلی کاپٹر کے استعمال کی وجہ اب سمجھ میں آرہی تھی۔ ایک جنگ زدہ ملک میں جہاں جدید اسلحے کی فراوانی ہو اور ورجنوں ”وارلارڈز“ موجود ہوں، وہاں زیادہ بلندی پر ہی فضائی سفر قدرے محفوظ تھا کیونکہ جدید ترین سام میزائل ہی اس بلندی پر کسی ہدف کو نشانہ بنانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

ہیلی کاپٹر کا پُرشور سفر تقریباً بیس منٹ جاری رہا۔ پھر پہاڑوں میں گھرے ایک ملٹری تربیتی مرکز کے اوپر پہنچ کر اس کی بلندی کم ہونے لگی۔ تھوڑی دیر میں ٹریننگ سینٹر کے خدوخال نمایاں ہونے لگے۔ بم پروف ریڈی میڈ دیواریں جنہیں بہ وقتِ ضرورت وہاں سے اٹھا کر کہیں اور بھی نصب کیا جاسکتا تھا، گواہی دے رہی تھیں کہ وہ امریکن یا نیٹو فورسز کا فوجی اڈا رہا ہوگا جسے ان کے خالی کرنے کے بعد تربیتی مرکز میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔

ہمیں ایک دو منزلہ عمارت کی اوپری منزل پر تین کمرے دیے گئے۔ کرنل محمود کے علاوہ ہر کمرے میں دو دو افراد تھے۔ یہ پروٹوکول کے خلاف تھا مگر اس سلسلے میں جگہ کی کمی وغیرہ کا بہانہ بنا کر رسمی معذرت بھی نہیں کی گئی۔

ہیڈ کوارٹر میں دی جانے والی بریفنگ میں اس مخاصمانہ رویے کا خدشہ ظاہر کرکے ہمیں برداشت کرنے کی ہدایت دی گئی تھی۔ سو ہم نے اس رویے کو کڑوی گولی کی طرح حلق سے اتارا اور اپنے کمروں کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔

یہ دیکھ کر ہمیں اچھی خاصی حیرت ہوئی کہ ہمارے کمروں کو کسی بھی طرح سے ”بگ“ نہیں کیا گیا تھا۔ ہماری گفتگو اور حرکات وسکنات پر نظر رکھنے کے لیے وہاں کسی بھی قسم کے جاسوسی آلات نصب نہیں تھے۔

میں باتھ روم سے ہو کر آیا تو رسالت، جو میرا روم میٹ تھا کھڑکی کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ ہماری رہائشی عمارت کے سامنے ایسی ہی ایک اور عمارت تھی۔ اس کی نظریں اسی عمارت پر تھیں۔

میں نے تولیا پھیلاتے ہوئے کہا۔ ”یہ وہ کھڑکی نہیں ہے جس کے سامنے کھڑے ہو کر تم گا سکو ”میرے سامنے والی کھڑکی میں اک چاند سا مکھڑا رہتا ہے...“ پیارے! تمہیں افغان کرنل جیسے شیری جیسے چہرے ہی نظر آئیں گے۔“

”نہیں سر! سامنے والے کمرے میں کوئی لڑکی ہے۔ میری نظر دھوکا نہیں کھا سکتی۔ میں نے اس کی ناگن کی طرح لہراتی چوٹی دیکھی ہے۔“

اس کے انداز نے مجھے چونکا دیا۔ بے شک وہ شگفتہ مزاج کا مالک تھا مگر اس وقت بالکل مذاق کے موڈ میں نہیں تھا۔

میں نے بغور سامنے والی کھڑکی کی طرف دیکھا مگر مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔ ملٹری ٹریننگ سینٹر میں کسی لڑکی کا نظر آنا کوئی ایسی اچنبھے کی بات نہیں تھی مگر ناگن کی طرح لہراتی چوٹی کے ذکر نے مجھے بے چین کر دیا تھا۔

میری محویت کو محسوس کر کے رسالت نے شرارت بھرے انداز میں کہا۔ ”خیال رہے سر، پہلے میں نے اسے دیکھا ہے اس لیے پہلا حق میرا ہے۔“

میں نے ہاتھ کھڑے کیے۔ ”میں بعد کے لیے بھی تمہارے حق میں دست بردار ہوتا ہوں۔“

اس فراخ دلی پر اس نے باقاعدہ میرا شکریہ ادا کیا تو ہم دونوں ہی بیک وقت ہنس پڑے۔ دوپہر کا کھانا ہم نے اپنے کمروں میں کھایا۔ رات کے کھانے پر ہمیں ملٹری ٹریننگ سینٹر کے انچارج میجر جنرل خالد کی طرف سے مدعو کیا گیا تھا۔

فضائی سفر کی معمولی سی بھی تھکان نہیں تھی، اس کے باوجود رسالت اپنے بستر میں گھس گیا۔ میں نے اردلی سے کافی منگوائی اور چادر لپیٹ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ نظریں غیر ارادی طور پر سامنے والی کھڑکی کی طرف اٹھی تھیں اور تصور میں ناگن کی طرح بل کھاتی ایک موٹی سی بالوں کی چوٹی لہرا کر غائب ہو جاتی تھی۔

سینے کے پھپھولے دوبارہ سے جل اٹھے تھے۔ ایک من موہنی سی صورت تصور کے پردے پر چمکی... اندھیری رات کی طرح سیاہ اور موتی کی طرح شفاف آنکھوں نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تھا۔ ”میں، تمہاری خاطر سب کچھ چھوڑنے کو تیار ہوں... حتیٰ کہ اپنا دھرم بھی۔“

اس پل میں ضرور کوئی جادو چھپا ہوا تھا یا شاید جادو اس بے حد ملائم جلد والی سلونی سی لڑکی کے وجود میں تھا۔ آنکھوں میں تھا یا پھر اس کی ناگن جیسی لہراتی، بل کھاتی بالوں کی موٹی سی چوٹی میں کہ میجر عامر نے جس کے دل پر ہمیشہ دماغ ایک پاسبان کی طرح رہا تھا، اس پل دل ہار بیٹھا۔

دماغ کی وارننگ کو شاید پہلی دفعہ اس نے نظر انداز کرتے ہوئے دل کو من مانی کرنے دی اور شیلا کماری کو بانہوں میں بھر کر اس کے بے حد گھنیرے بالوں میں منہ چھپا لیا اور اس کے بعد ایک ”یادگار“ چوٹ کھائی۔

اچانک ہی سامنے والے کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ سیاہ وردی دیکھتے ہی میری تمام تر حسیات بیدار ہو گئیں۔ اس کی میری طرف پشت تھی۔ چھریرا جسم ”را“ کے اسپیشل ”بلیک کیٹ“ کمانڈوز کی مخصوص چست سیاہ وردی میں مقید تھا۔ سر پر مخصوص انداز میں بندھا رومال اس نے ایک جھٹکے سے کھولا تو پٹاری میں مقید ناگن کی طرح اس کی چوٹی آزاد ہو کر لہرانے لگی۔

میرے سینے میں دھڑکتے دل کو جیسے جیٹ انجن لگ گیا تھا۔ یہ چھریرا، لچکدار جسم مجھے لگا جیسے میرے لیے اجنبی نہیں ہے۔ پھر وہ قتالہ گھومی تو میرے سامنے زمین و آسمان نے جیسے اپنی جگہ بدل لی۔ جسم سن ہو گیا اور سینے میں نقارے سے بجنے لگے۔ بلاشبہ وہ شیلا کماری تھی۔

آہ... قدرت محض ایک سال اور آٹھ مہینوں میں ہی اسے دوبارہ میرے سامنے لے آئی تھی۔ سینے میں آگ سی دہکنے لگی۔ شیلا کی یہاں موجودگی کا مطلب تھا کہ راہول ٹوبا بھی کہیں ارد گرد ہی موجود ہوگا۔

شاید خدا نے میری سن لی تھی۔ مجھے بہت سے حساب چکانے تھے ان دونوں سے۔ اچانک ہی میں نے شیلا کو چونکتے دیکھا۔ اس کی مخصوص نسوانی حس نے اسے مرکزِ نگاہ ہونے کا احساس دلایا تھا۔ اس کی نظریں ہماری کھڑکی کی طرف اٹھیں۔

میں نے چادر لپیٹی ہوئی تھی جس میں سے صرف آنکھیں اور پیشانی کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔ مجھے پہچاننا ناممکن تھا پھر اچانک ہی میرے وجود میں ایک طوفان نے سر اٹھایا۔ میں اسے اور اس کے حواریوں کو بتانا چاہتا تھا کہ میجر عامر کی ”واپسی“ ہو چکی ہے۔ ان کی مکاری اور محبت کے جال میں پھنس کر اس نے جو ہزیمت اٹھائی تھی، اس کی سزا کاٹ کر وہ دوبارہ فیلڈ میں آ چکا ہے۔

میں نے نہ صرف چادر اتار پھینکی بلکہ اٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ سورج کی دم توڑتی کرنیں براہِ راست مجھ پر پڑ رہی تھیں۔

شیلا کو مجھے پہچاننے میں لحظہ بھی نہیں لگا۔ اس نے جیسے حیرت سے مغلوب ہو کر پلکیں جھپکائیں۔ میری موجودگی کا یقین آتے ہی اس کے جسم نے یوں جھٹکا کھایا جیسے اس نے ہزاروں وولٹیج کا ننگا تار چھو لیا ہو۔

اس کے ری ایکشن نے مجھے لطف دیا۔ اگلے ہی پل اس نے کھڑکی کا پردہ برابر کر دیا۔ میں واپس کرسی کی طرف لوٹا تو جسم میں سنسنی کروٹ لے رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میری موجودگی کی خبر بھارتیوں میں کھلبلی مچا دے گی۔

میں نے کرسی پر بیٹھ کر دوبارہ چادر اوڑھ لی۔ آنکھیں موند کر میں نے خود سے سوال کیا کہ کیا میں اس درندے کو اپنے سامنے دیکھ کر خود پر قابو رکھ پاؤں گا؟

میرا دل کہہ رہا تھا یہ ناممکن ہے مگر دل پر بیٹھا پاسبان جنرل صاحب کے الفاظ دہرا رہا تھا۔ ”تمہیں اپنی متعین

حدود سے تجاوز نہیں کرنا... تجاوز نہیں کرنا۔“

دائیں کنپٹی میں درد کی تیز لہر اٹھی اور پورے سر میں پھیل گئی۔ مجھے احساس ہوا کہ ہر طرف سے میں حدود، ضابطوں کے ان دیکھے بندھن میں بندھا ہوا ہوں۔ میں کافی دیر اس کیفیت کا شکار رہا۔ پھر زبردست کوشش سے میں نے خود کو سنبھالنا شروع کیا۔ مجھے یہاں باقاعدہ حکومتی سرپرستی میں بھیجا گیا تھا۔ میری جذباتیت میرے ملک کے وقار و عزت کو نقصان پہنچا سکتی تھی۔ مجھے یہاں خود کو سونپا ہوا فرض انجام دینا تھا۔ ہاں اگر قدرت مجھے کوئی موقع فراہم کر دیتی تو اپنے وطن کے ان زہریلے دشمنوں کے ٹینٹوے دبانے میں، میں پل بھر کی بھی تاخیر نہ کرتا۔

کوئی انجانی آواز پکار پکار کر مجھے بتا رہی تھی کہ جلد یا بدیر ایسا موقع مجھے ضرور ملے گا۔ میں نے خود سے عہد کیا کہ ایسا موقع ملنے تک میں خود کو قابو میں رکھوں گا۔

افغان جنرل کے عشائیے میں شرکت سے پہلے میں نے کرنل صاحب کو اپنے ارد گرد ”را“ کی موجودگی کی رپورٹ دے دی۔

☆☆☆

رات آٹھ بجے افغان آرمی کے تربیتی مرکز کے اس ”آفیسرز میس“ پر کسی بھارتی جم خانے کا گمان ہو رہا تھا۔ نصف درجن سے زائد ساڑھی و بندیا والی بھارتی ناریاں ہر طرف اپنے جلوے بکھیر رہی تھیں۔ لگ بھگ اتنے ہی بھارتی آرمی کے آفیسرز کے بھیس میں ”را“ کے ایجنٹ بھی تھے جن کی خشونت بھری نظریں ہم لوگوں پر جمی ہوئی تھیں۔

آفیسرز میس میں داخل ہوتے ہی میرے خون کی گردش معمول سے بڑھ گئی۔ میرا سامنا شیلا اور ممکنہ طور پر راہول ٹوبا سے ہونے جا رہا تھا۔

پھر میری نظر شیلا پر پڑی، وہ زرد رنگ کی ساڑھی میں تھی۔ خطرناک قوس و خم والا جسم اور شکاری کتیا جیسی پتلی کمر زرد ساڑھی میں بے حد نمایاں تھی۔ وہ خود سے چھوٹے قد کے کرنل پنج شیری کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔

کرخت چہرے والے کرنل کے چہرے پر نرم پھوار برس رہی تھی۔ وہ بری طرح سے اس پر ریشہ خطمی ہوا جا رہا تھا۔

میرے قریب موجود میجر فواد نے بے حد تلخ سرگوشی کی۔ ”اپنی عورتوں کو پیش نہ کریں تو کوئی انہیں اپنے ملک میں قدم بھی نہ رکھنے دے۔“

بھی کے سر تائیدی انداز میں ہلے۔ یہ بہت بڑی حقیقت تھی کہ ”را“ اپنے قدم جمانے کے لیے ہمیشہ ہی اپنے ”ٹیکنڈ ونگ“ کو استعمال کرتی تھی۔

میں نے لمحے بھر میں بھارتی اور افغان آفیسرز کو پرکھ لیا تھا۔ راہول ٹوبا ان میں نہیں تھا۔ مقامی آفیسرز کو تو کچھ ہوش نہیں تھا۔ وہ بھارتی ناریوں میں الجھے ہوئے تھے۔ جنرل خانخیلی کی ابھی آمد نہیں ہوئی تھی۔

پھر شیلا کی نظر مجھ پر پڑی تو اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ چہرے پر رونق بشاشت غائب ہو گئی۔

در و دیوار سے پھوٹتی دیسی موسیقی اور بھارتیوں سے بھرے اس ماحول میں ہم لوگ خود کو اجنبی محسوس کر رہے تھے۔ بھارتی ناریوں کے سحر میں کھو کر مقامی افسران اپنی روایتی مہمان نوازی بھی بھول گئے تھے۔ ہم پانچوں ایک کونے میں پڑی میز کے گرد بیٹھ گئے۔ آفیسرز میس چونکہ مغربی افواج کے استعمال میں رہا تھا، اس لیے وہاں لکڑی کے تختوں والا ڈائننگ فلور بھی موجود تھا۔

شیلا نے ابتدائی دھچکے سے سنبھالا لے لیا تھا۔ وہ اب کرنل پنج شیری کو کھلکھلاتے ہوئے ڈائننگ فلور کی طرف کھینچ رہی تھی۔ کرنل ہچکچا رہا تھا۔ سبھی لوگ دلچسپی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ اس رنگین کشمکش کے دوران شیلا کی چوٹی لہرائی تو کیپٹن رسالت پہلے چونکا۔ پھر دھیرے سے میرے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر سرگوشی کے انداز میں بولا۔

”سر! یہ وہی ہے... جو ہمارے سامنے والی کھڑکی میں رہتی ہے۔“

”جانتا ہوں۔ تمہارے سونے کے بعد میں دیکھ چکا ہوں اسے۔“

وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا مگر کرنل محمود بھی ہمارے ساتھ موجود تھے اس لیے اس کی زبان کو بریک لگ گئے۔

شیلا، کرنل پنج شیری کو ڈائننگ فلور پر لے جانے میں کامیاب ہو گئی تھی اور اسے نچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کرنل اس ”فن“ سے قطعی ناآشنا نظر آتا تھا مگر کچھ شراب اور کچھ شیلا کے نشے کے زیرِ اثر شیلا کی ”ڈگڈگی“ پر ”بندر“ کی طرح ناچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دیگر افراد تالیاں اور منہ سے ہو، ہا کی آوازیں نکال کر نہ جانے کرنل کو ہوٹ کر رہے تھے یا اس کی حوصلہ افزائی۔

چھٹی حس کے تحت میں نے یکایک داخلی دروازے کی طرف سر گھمایا۔ اگلے ہی پل خون اچھل کر سر کی طرف دوڑا۔ داخلی دروازے میں قیمتی سیاہ سوٹ میں ملبوس ایک دراز قامت شخص کھڑا ہوا تھا۔ سانولا رنگ، گول چہرہ...

چہرے پر ماتا کا بدنما داغ، موٹے کھڑے بال، شانوں پر دھری برائے نام سی توانا گردن، فولادی سانچے میں ڈھلا جسم جو چست سوٹ میں بے حد نمایاں تھا اور سب سے بڑھ کر بھوری آنکھیں... جن میں ہمہ وقت سرخ ڈورے تیرتے تھے اور ایک وحشت انگیز چمک مدِمقابل کو مسحور کر دیتی تھی۔ ان سب کے مجموعے کو میجر راہول ٹوبا کہتے تھے۔

اس بات سے بہت کم لوگ آگاہ تھے کہ انسانی روپ میں وہ ایک خون آشام درندہ ہے۔ اس کی حیوانیت کا میں گواہ تھا۔

ٹوبا نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ اس کے سیاہ مکروہ ہونٹوں پر بڑی اشتعال انگیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا بڑے پُراعتماد انداز میں اپنے گروپ کی طرف بڑھ گیا۔ میرے لیے خون کی کھولن پر قابو رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے ٹوبا پر سے نظریں ہٹا کر دو تین گہرے سانس لیے۔

میری اور ٹوبا کی نگاہوں کا تصادم کوئی چھپنے والی بات نہیں تھی۔ کرنل محمود نے میری طرف دیکھا۔ ”کون تھا یہ؟“ دیگر افراد کی سوالیہ نظریں بھی مجھ پر آجمی تھیں۔ ٹوبا کی اثرانگیز شخصیت نے سبھی کو متاثر کیا تھا۔

میں نے خود کو سنبھال کر نارمل سے انداز میں کہا۔ ”بھارتی آرمی کا میجر ہے، راہول ٹوبا۔ پہلے ”آئی بی“ میں تھا پھر ”را“ میں چلا گیا۔“ مزید کسی سوال سے بچنے کے لیے میں نے مخصمانہ شناسائی کی وجہ بھی بتادی۔ ”راجستھان میں ایک مشن کی تکمیل کے دوران اس سے ٹاکرا ہو چکا ہے۔“

میں اگر یہ حقیقت بتا دیتا کہ شیلا کے چکر میں پھنس کر میں نہ صرف ٹوبا کے ہاتھوں یادگار ہزیمت اٹھا چکا ہوں بلکہ بے حد محنت سے تیار کردہ دو مقامی بھارتی ایجنٹ اور ایک اپنا بے حد پیارا ماتحت کیپٹن رضوان علی، ٹوبا کے ہاتھوں ذبح کروا چکا ہوں تو یقیناً مجھے واپس بھیج دیا جاتا اور یہ میں کسی صورت نہیں چاہتا تھا۔

کرنل صاحب کے چہرے پر تشویش نمودار ہوئی۔ ”یہ بے حد خطرناک شخص نظر آتا ہے۔ تمہیں محتاط رہنا ہوگا میجر!“

میرے جبڑے خود بہ خود بھنچ گئے۔

کرنل صاحب کی دوربین نظریں میرے چہرے پر تھیں۔ ”یہ بات ہمیشہ تمہارے سامنے رہنی چاہیے کہ تم کسی دشمن ملک میں ”مشن“ پر نہیں ہو۔ یہاں تم اپنے ملک کے سفیر ہو۔“

میں بخوبی سمجھ رہا تھا کہ ڈھکے چھپے انداز میں کرنل صاحب مجھے کیا سمجھانا چاہ رہے ہیں۔ میں نے کہا۔ ”آپ بے فکر رہیں سر! میں اپنی حدود کو بخوبی سمجھتا ہوں۔“

”گڈ!“ کرنل صاحب نے مطمئن ہو کر سر ہلایا۔

اسی وقت جنرل خاتخیلی اپنے اسٹاف آفیسر کے ساتھ آفیسرز میس میں داخل ہوا۔ قیمتی آف وائٹ سوٹ اور پیروں میں چمچماتے جوتے، انگلیوں میں ہیروں کی دمکتی انگوٹھیاں اور سرخ و سفید چہرے پر بڑی سادگی آمیز معصومیت۔ انٹیلی جنس رپورٹ تھی کہ وہ ایک سابق ”وار لارڈ“ تھا جس نے اپنے پانچ سو سے زائد جنگجوؤں کے ساتھ افغان آرمی میں شمولیت اختیار کی تھی جس کے سبب اسے میجر جنرل کا عہدہ دیا گیا تھا۔

جنرل سیدھا ہماری طرف آیا اور بڑی گرم جوشی کے ساتھ افغان سرزمین پر خوش آمدید کہا۔ اس کی گرم جوشی دیکھ کر یقیناً بھارتیوں کے سینوں پر سانپ لوٹ گئے تھے۔

وہاں موجود سبھی افراد اپنی سرگرمیاں چھوڑ کر جنرل کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ جنرل نے اپنے جونیئر افسران کے علاوہ بھارتی آفیسرز سے بھی ہمارے گروپ کا تعارف اور وہاں ہماری موجودگی کی وجہ بتائی۔

تقریباً یہی وجہ اس نے بھارتی آفیسرز کی وہاں موجودگی کی بھی بتائی۔ باہمی مصافحہ کرتے ہوئے ٹوبا کی بالوں بھری مضبوط کلائی والا ہتھوڑا نما ہاتھ میرے ہاتھ میں آیا تو ایک گہری نیلی سی آگ تھی جو میرے پاؤں کے تلوں سے اٹھی اور سر تک پہنچ گئی۔ یہی وہ ہاتھ تھا جس نے کیپٹن رضوان کو ذبح کیا تھا۔

میں سردی کے باوجود پل بھر میں پسینے میں بھیگ گیا۔ مجھے لگا جیسے کوئی بے حد وزنی چٹان میرے سینے پر دھری ہو۔ شاید تمام تر قوت...... میری ہتھیلی میں سمٹ آئی تھی۔ ٹوبا کا رنگ ایک لمحے کے لیے متغیر ہوا۔ اگلے پل وہاں ازلی وحشت لوٹ آئی۔ ”آرام سے میجر! پرانا غصہ میرے ہاتھ پر ہی نکالو گے۔“

جنرل خاتخیلی چونکا۔ ”آپ دونوں واقف ہیں ایک دوسرے سے؟“

میری تو جیسے قوت گویائی طیش کے سبب سلب ہو چکی تھی۔ ٹوبا اپنے مخصوص شہد میں بھیگے زہریلے لہجے میں بولا۔

”ہاں سر! یہ خیرسگالی کے ”گل دستے“ لے کر ہمارے ملک تشریف لائے تھے۔ ہم نے ان کا ”شاندار“ استقبال کیا تھا اور واپسی پر ان کے گلے میں ”پھولوں کے ہار“ ڈال کر بھیجا تھا۔“

اس کے ساتھیوں کی دبی دبی استہزائیہ ہنسی مجھے ایسی سرخ آندھی کے سپرد کرنے لگی جس کے پار کچھ بھی نظر نہیں آتا۔

جنرل زیرک بندہ تھا۔ وہ پل بھر میں سمجھ گیا کہ دو روایتی حریف ملکوں کے حساس اداروں کے افسران کے درمیان کہاں کوئی خوش گوار تعلق ہو سکتا ہے۔ ماضی کی کوئی پرخاش ہی واقفیت کا سبب تھی۔ وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”گل دستے اور ہار آپ بچا کر رکھیں۔ افغانستان آپ دونوں کے ملکوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات کو اہمیت دیتا ہے۔ دونوں ملکوں کے نمائندے ہمارے مہمان ہیں۔ ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں ہے کہ آپ دونوں کے ممالک کے آپس میں تعلقات کیسے ہیں۔ ہمیں صرف اس چیز سے غرض ہے کہ ہمارے مرکز کا ڈسپلن برقرار رہے۔ آپ یہاں دوستوں کی طرح رہیں اور اپنے فرائض انجام دے کر خیریت سے رخصت ہو جائیں۔“

جنرل کی وارننگ میرے دماغ پر چھاتی سرخ آندھی کو تیزی سے کم کرنے لگی۔ لمحاتی وقفے کے بعد جنرل نے قدرے سخت انداز میں کہا۔ ”میں ڈسپلن کی معمولی سی خلاف ورزی بھی برداشت نہیں کروں گا۔ ایسا کرنے والا اپنے قول و فعل کا خود ذمے دار ہوگا۔ میں اس کا اور اس کی ٹیم کا مشن فوری معطل کر کے انہیں ان کے ملک روانہ کر دوں گا۔“

اس موقع پر کرنل محمود نے مداخلت کی۔ ”سر! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہماری ٹیم کی طرف سے آپ کو ڈسپلن کی کوئی شکایت نہیں ملے گی۔“

”گڈ!“ جنرل نے بھارتیوں پر نظر ڈالی۔ ”آپ لوگوں کی طرف سے یہ یقین دہانی کون کرائے گا؟“

ایک استخوانی چہرے اور سفید بالوں والے غالباً کرنل رینک کے آفیسر نے یہ یقین دہانی کروائی۔

”آپ لوگ ایک دفعہ پھر ہاتھ ملائیں۔“ کرنل صاحب نے ثوبا اور مجھے حکم صادر فرمایا۔

ثوبا نے بادلِ ناخواستہ میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے بھی بامر مجبوری اس کے ہاتھ کو تھام لیا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں سے کدورت نمایاں تھی تو میری آنکھوں میں لکھی تحریر بھی اسے صاف نظر آ رہی تھی کہ میں اس سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے بے چین ہوں۔

ثوبا نے ہماری پوری ٹیم پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”میں عزت مآب جنرل صاحب کی موجودگی میں آپ لوگوں سے ایک سوال کرنا چاہوں گا... اگر اجازت ہو تو؟“

مجھے بخوبی اندازہ ہو گیا کہ وہ پھر زہر اگلے گا۔

کرنل محمود نے نرم لہجے میں کہا۔ ”اجازت کی ضرورت نہیں... آپ دس سوال کر لیں۔“

”نہیں، صرف ایک۔“ ثوبا نے انگلی اٹھائی۔ ”پاکستان کو ٹریٹر کے روپ میں انٹیلی جنس بیورو کے ایجنٹوں کو بھیجنے کی ضرورت کیوں پڑ گئی؟ افغانستان تو آپ کا برادر ہمسایہ ملک ہے؟“

حسب توقع اس نے زہر ہی اگلا تھا۔ جنرل خاشخیلی بری طرح چونکا۔

اس موقع پر ہماری ٹیم کے سب سے کم گو میجر گل نواز نے بھرپور جواب دیا۔ ”اور ”را“ والے تو غالباً یہاں نوزائیدہ افغان آرمی کے جوانوں کے ”میچر“ تبدیل کرنے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔“

جواب کاری تھا۔ کئی افغان آفیسرز کی ہنسی چھوٹ گئی۔ خود جنرل خاشخیلی کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ بھارتیوں کے چہرے سیاہ پڑ گئے۔ ثوبا کی آنکھیں خون اگلنے لگیں مگر وہ زہر گھولنے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

جنرل بولا۔ ”غالباً دونوں طرف ہی یہ کہاوت بولی جاتی ہے کہ حمام میں سبھی ننگے ہیں۔ بہرحال اب کھانے کے لیے آ جائیں۔“

تھوڑی دیر میں بظاہر تناؤ کی کیفیت ختم ہو گئی مگر جب جب میری اور ثوبا کی نظریں ملتی تھیں، بجلی سی کوند جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ثوبا کی جلتی ہوئی نظریں گاہے بگاہے گل نواز پر بھی جا ٹھہرتی تھیں۔

میں جانتا تھا کہ وہ اونٹ کا سا کینہ رکھنے والا شخص ہے۔ گل نواز کا منہ توڑ جواب اب بھی اسے ”مرچ“ کی طرح جلن کر رہا ہے۔

شیلا مجھے نظر انداز کرنے کی کامیاب کوشش کر رہی تھی۔ اس کی تمام تر توجہ کرنل پنچ شیری پر تھی۔ وہی کیا، بھی بھارتی لڑکیوں نے وہاں موجود افغان آفیسرز کو اپنی ساڑھی کے پلوؤں سے باندھ رکھا تھا۔

کرنل محمود کو جنرل خاشخیلی نے اپنی میز پر جگہ دی تھی۔ وہاں استخوانی چہرے والا بھارتی کرنل پردیپ، شیلا اور کرنل پنچ شیری کے علاوہ سیاہ سنگی ساڑھی میں ملبوس بھرے بھرے جسم کی ایک اور سرخ و سفید لڑکی بھی موجود تھی جس کے ڈائی کیے سنہری بال بار بار چہرے پر آ جاتے تھے جنہیں وہ بڑی ادا سے ہٹاتی تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ گاہے بگاہے جنرل خاشخیلی کی

نظریں اس لڑکی پر ٹھہر جاتی تھیں۔ ان لمحوں میں ان نظروں میں مرد کی مخصوص بھوک صاف نظر آتی تھی۔ ابتدا میں جو بھارتیوں کا دباؤ محسوس ہوا تھا، وہ میجر گل نواز کے جواب کے سبب ختم ہو چکا تھا جس کی وجہ سے میرے ساتھیوں کا موڈ خوش گوار تھا۔ گل نواز کی پیٹھ ٹھونکنے کے بعد اب ہنسی مذاق چل رہا تھا۔ شخصیات پر تبصرے ہو رہے تھے۔ ان شخصیات میں سب سے نمایاں کرنل پنچ شیری اور شیلا تھے۔

تقریباً سبھی میزوں پر شراب نظر آ رہی تھی۔ آفیسرز میس کے بیروں نے ہم سے بھی پوچھا تھا۔ ہم نے منع کر دیا۔

میجر فواد میری طرف متوجہ ہوا۔ ”یار! یہ کمینہ ثوبا کن پھولوں کے ہاروں کا ذکر کر رہا تھا؟“

مجھے جلد یا بدیر اس سوال کی توقع تھی۔ میں نے کہا۔ ”یہ بڑبولا ہے۔ راجستھان میں اس سے ٹاکرا ہوا تھا۔ ایک مخبر کی بدولت میں ”را“ کے ہاتھ آ گیا۔ دو مقامی ایجنٹ ہلاک اور میرا ایک جاں نثار ماتحت شہید ہوئے تھے۔ میں را والوں کی نصف درجن سے زائد لاشیں گرا کر وہاں سے نکلنے میں کامیاب رہا تھا۔ یہ میرے ہاتھ سے بچ گیا تھا۔ ہاتھ آ جاتا تو آج اس کی زبان بھونکنے کے قابل نہ ہوتی۔“ میجر فواد نے ثوبا پر نظر ڈالی اور سر کو تفہیمی جنبش دی۔

کھانا بے حد پُرتکلف تھا۔ ہم نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ کھانے کے بعد جنرل خاشخیلی رخصت ہوا تو ہم لوگ بھی اپنے کمروں میں آ گئے۔

میرے ذہن پر شیلا کی دید اور راہول ثوبا سے ملاقات کا اثر باقی تھا۔ ثوبا کے ہاتھ کا لمس جیسے اب بھی باقی تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرا ہاتھ تیزاب سے جھلس گیا ہو۔ اسی ہاتھ سے اس درندے نے کیپٹن رضوان کی گردن کاٹی تھی۔

رضوان کا خیال آیا تو اس کی شبیہ آنکھوں میں اتر آئی۔ جوانی کی چمک سے دمکتا چہرہ، چمکتی آنکھیں، مضبوط کندھے، کسرتی جسم اور سب سے بڑھ کر ملک پر جان نچھاور کر دینے کا جذبہ... اور اس نے جان نچھاور کر کے دکھائی بھی تھی۔

رضوان کا خیال آیا تو شدید ترین پچھتاوے کا احساس بھی آری کی طرح کاٹنے لگا۔ کاش میں نے بازو زخمی ہونے کے باوجود خود ثوبا کا سامنا کیا ہوتا... رضوان کو ثوبا کی ”للکار“ کا جواب دینے کی اجازت نہ دی ہوتی۔

میں نے بستر پر لیٹ کر روزئی کمبل لے لیا۔ کانٹوں کی باڑھ جیسے گزرے لمحے یاد آئے تو پھر آتے چلے گئے۔ میں ان دنوں انٹیلی جنس بیورو کے افسران کا پسندیدہ فیلڈ ایجنٹ تھا۔ میرا کیریئر کامیابیوں سے معمور تھا۔

مجھے بھارتی سرحدی ریاست راجستھان کے لیے ایک مشن سونپا گیا۔ ایک دوست ملک کی نامور شخصیت کا پاکستان آنا جانا لگا رہتا تھا۔ وہ شخصیت سیاست دانوں اور بڑے بیوروکریٹس کی دعوتیں کرنے میں خاصی مشہور تھی۔

سندھ اور پنجاب میں اس کی محل نما رہائش گاہیں تھیں جہاں شکار کے سیزن کے علاوہ بھی سیاست دانوں اور بیوروکریٹس کی آمد و رفت رہتی تھی۔ اس کی ایسی ہی رہائش گاہیں بھارتی ریاست راجستھان میں بھی تھیں۔ انٹیلی جنس رپورٹس اس شخصیت کو مشکوک بتاتی تھیں۔ اس کا مبینہ تعلق ”را“ سے تھا۔ اسی شخصیت کی ”ریکی“ کے لیے مجھے راجستھان بھیجا گیا۔ کیپٹن رضوان بھی میرے ساتھ تھا۔ راجستھان میں کافی عرصے سے بڑی کامیابی سے کام کرتے دو مقامی ایجنٹوں کی مدد بھی ہمیں حاصل تھی۔

میں نے کسی طرح اس شخصیت کے محل میں جگہ بنالی۔ اسی دوران شیلا مجھ سے آ ٹکرائی۔ وہ مقامی کالج میں لیکچرار اور محل کے مقامی منتظم کی بیٹی تھی۔

شیلا کے حسن کے جادو نے مجھے اسیر کر لیا۔ میرے فرشتوں کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ”را“ کی ایجنٹ ہے۔

میں اس کے جال میں الجھتا چلا گیا۔ اس نے میرے قریب رہ کر میرے نیٹ ورک کا پتا چلا لیا اور ایک دن میں نے کیپٹن رضوان سمیت خود کو اسی محل کے تہ خانے میں ”را“ کی گرفت میں پایا۔

دونوں مقامی ایجنٹ جو ٹریول ایجنسی کی آڑ میں کامیابی سے خود کو چھپائے ہوئے تھے، ان دونوں کو بھی وہیں لایا گیا تھا۔ اسی تہ خانے میں، میں راہول ثوبا سے متعارف ہوا۔ دونوں مقامی ایجنٹ اس کی سفاکی کا چند منٹ بھی مقابلہ نہ کر سکے اور انہوں نے سب کچھ اگل دیا۔ ثوبا نے انہیں جانوروں کی طرح گرا کر ذبح کر دیا۔

پوچھ گچھ کے ایک سیشن کے دوران رضوان اور میں را والوں پر جھپٹ پڑے اور تین لاشیں گرا کر تقریباً وہاں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے مگر عین وقت پر ثوبا ٹپک پڑا اور اس نے تن تنہا ہمارے فرار کی کوشش ناکام بنا دی۔

تھوڑی دیر بعد ہم دوبارہ لاک اپ میں تھے۔ میرا بازو گھائل ہو چکا تھا اور خون اگلتی آنکھوں والا ثوبا ہمارے

سامنے تھا۔ تہ خانے میں ابھی اس کے ساتھیوں کی لاشیں موجود تھیں۔

باقی ماندہ ساتھیوں سے ہماری جاندار مزاحمت اور حیران کن پھرتی کی داستان سن کر اس نے ہمیں جسمانی مقابلے کے لیے چیلنج کر دیا۔ جیتنے والے کو اختیار تھا کہ وہ مفتوح کی گردن کاٹ سکے۔

رضوان نے اس کا چیلنج قبول کرنے کی اجازت چاہی تھی۔ میرا زخمی بازو آڑے آیا۔ پھر میں رضوان کی صلاحیتوں سے بھی بخوبی واقف تھا۔ کسی بھی لڑاکا کے لیے وہ بے حد سخت جان حریف ثابت ہو سکتا تھا۔

میں نے اس جواں رعنا کو ایک درندے کے مقابل جانے کی اجازت دے دی۔ پھر اگلے پندرہ بیس منٹ میں میں نے ثوبا کا اصلی روپ دیکھا۔ اس کے جسم میں کسی آسیب کی سی طاقت اور خون آشام شکاری درندے کی سی پھرتی تھی۔

لڑائی کے ابتدائی چند منٹ رضوان جارح رہا مگر پھر دفاعی پوزیشن پر چلا گیا۔ ثوبا نے اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ رضوان نے آخر دم تک مزاحمت جاری رکھی۔ ایک دفعہ تو ثوبا کی گردن رضوان کے بازو کے شکنجے میں آ گئی تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے خاصا اطمینان محسوس ہوا۔ میں جانتا تھا کہ یہ رضوان کا خاص داؤ ہے۔ کسی بھی لمحے ثوبا کی گردن ٹوٹنے کی آواز آئے گی مگر ثوبا حیرت انگیز پھرتی و طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہ صرف اپنی گردن چھڑانے میں کامیاب رہا بلکہ اس نے رضوان کو سر سے بلند کر کے نیچے پٹخ دیا۔ رضوان کی ریڑھ کی ہڈی متاثر ہوئی اور وہ پھر دوبارہ کھڑا نہ ہو سکا۔ ان لمحات میں، میں نے رضوان کی مکمل شکست اور اس کے ذبح ہونے کا دل خراش منظر دیکھا۔ ثوبا نے اس کی کٹی گردن سے بہتے خون میں انگوٹھا بھگو کر اپنے ماتھے پر قشقہ کھینچا تھا۔

میں چیخا، چلّایا... ثوبا کو گالیاں دیں۔ اسے چیلنج پر چیلنج کیا۔ اس نے لاک اپ کے قریب آ کر اپنے مخصوص لہجے میں کہا تھا۔

”دھیرج میرے لال! تیری باری بھی آ جائے گی۔ کاہے کو جلدی کرتا ہے۔ تیرے بتاشے بھی دیکھ لیں گے کتنے گول ہیں۔“ وہ ماتھے پر رضوان کا خون سجائے فاتحانہ انداز میں تہ خانے سے نکل گیا۔

میں وہاں سے کیسے نکل کر پاکستان آیا، یہ علیٰحدہ کہانی ہے۔ میرے ساتھ راہول ثوبا اور شیلا کا قرض بھی ساتھ آیا تھا۔

مجھے یقین تھا کہ جلد ہی میرا دوبارہ سے ثوبا سے ٹاکرا ہوگا اور میں، رضوان کے خون کا بدلہ لے سکوں گا مگر یہ شدید خواہش حسرت بن کر رہ گئی۔ میری ایک ناکامی نے میرے سارے کیریئر کی کامیابیوں پر پانی پھیر دیا۔ مجھے فیلڈ سے ہٹا کر دفتر میں بٹھا دیا گیا اور ثوبا کو بازوؤں کے زور پر زیر کرنے کی خواہش ناسور بن کر ہر پل تکلیف دینے لگی۔

دوبارہ فیلڈ ورک کے لیے میری درخواست پر درخواست کا کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ اب افغانستان میں قدرت کا اَن دیکھا ہاتھ ثوبا اور شیلا کو گھیر لایا تھا تو ضابطوں نے میرے اور ثوبا کے ہاتھ باندھ رکھے تھے۔

جیسے میرے سینے میں کیپٹن رضوان کی قبر ابھی تک تازہ تھی، ایسے ہی ثوبا کے سینے میں بھی اپنے ان ساتھیوں کی چتا ہنوز بھڑک رہی تھی جنہیں کاٹ کر میں راجستھان کے ایک محل کے تہ خانے سے بھاگ نکلا تھا۔

ثوبا کو دیکھ کر جہاں میرا لہو سنسنانے لگتا تھا، وہاں اس درندے کا حال بھی مجھ سے مختلف نہیں ہوتا ہوگا۔

”خیریت تو ہے سر؟ آتے ہی بستر میں گھس گئے ہیں اور اب کروٹ پر کروٹ بدلے جا رہے ہیں۔“ کیپٹن رسالت کی آواز مجھے واپس حال میں کھینچ لائی۔

میں نے کمبل کے اندر سے ہی جواب دیا۔ ”کچھ نہیں یار! بس ذرا حرارت سی محسوس ہو رہی ہے۔“

”بُرا نہ مانیں تو میں کہوں گا یہ حرارت ثوبا کی بدکلامی اور اس ناگن جیسی چوٹی والی لڑکی کی دید کے بعد ہوئی ہے۔“

میں بُری طرح سے چونکا۔ ثوبا سے تو تلخ کلامی ہوئی تھی مگر اس کم بخت نے شیلا والا اندازہ کیسے لگا لیا؟

میں نے چہرے سے کمبل ہٹایا تو وہ اپنے بستر پر آلتی پالتی مارے بیٹھا نظر آیا۔ تکیہ اس نے دونوں بازوؤں میں بھینچ کر سینے سے لگا رکھا تھا۔ چہرے پر کھلنڈرے پن کی جگہ مدبرانہ سنجیدگی نظر آ رہی تھی۔ بیٹھنے کا یہ انداز تو بالکل کیپٹن رضوان جیسا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے پہلے بھی رضوان کی یاد آتی تھی۔

”اس لڑکی کے بارے میں تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“ میں اٹھ بیٹھا۔

”میں نے اس لڑکی کو، غالباً شیلا نام ہے اس کا... آپ کو بڑی خاص نظروں سے دیکھتے ہوئے دیکھا ہے۔“

میرا سینہ چھلنی ہو گیا مگر میں نے لہجے کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”خاص نظروں سے تو وہ بھی کو دیکھ رہی تھی...

خاص طور پر کرنل پنچ شیری کو۔“

رسالت کے چہرے پر سنجیدگی برقرار رہی۔ ”نہیں سر! وہ بڑی خاص نظر تھی۔“ وہ بیٹھے بیٹھے کھو سا گیا۔ ”کیا نہیں تھا اس نظر میں۔ وہ اس داسی کی نظر تھی جو اپنے دیوتا کو پوج تو سکتی ہے مگر اس کا قرب حاصل نہیں کر سکتی... مجھے یقین ہے سر! وہ لڑکی ہزار جان سے آپ پر فدا ہے اور... اور شاید ماضی قریب میں آپ کا اس سے تعلق بھی رہا ہے... بہت گہرا تعلق۔“

میں نے اس کے مشاہدے کو مذاق میں اڑانے کی کوشش کی۔ ”اتنا شاعرانہ رنگ یار! شکل سے تو تم صرف فوجی ہی لگتے ہو۔ مجھے حیران کر دیا ہے تم نے۔“

وہ دھیرے سے ہنسا۔ ”میں خود حیران ہوں سر! شاید اس لڑکی کی نگاہوں کی بے بسی، تہی دامنی کے احساس اور مر مٹنے والی کیفیت نے ایک فوجی کے سنگلاخ سینے میں گداز جگا کر یہ الفاظ تراشے ہیں۔ مجھ سے ان نگاہوں کا دکھ برداشت نہیں ہو رہا... پلیز مجھے بتائیں کہ میرا مشاہدہ درست ہے نا؟ آپ دونوں کے درمیان کیسے تعلق بنا اور پھر لامتناہی فاصلے... پلیز مجھے بتا دیں سر۔“ اس نے بے حد ملتجی لہجے میں کہا۔

میرا دل یکلخت ہی موم کی طرح پگھل گیا۔ شیلا کا دیا زخم پھوڑا بن چکا تھا، یکایک ہی پھٹ گیا۔ دل کی بھڑاس پلکوں کا بندھن توڑ گئی۔ میں نے جیسے خود سے علیٰحدہ ہو کر چٹان جیسا دل رکھنے والے میجر عامر کو کیپٹن رسالت کے سامنے اس ملائم جلد، ناگن جیسی چوٹی والی لڑکی کا قصہ سناتے دیکھا۔ خاموشی کے ایک وقفے کے بعد جب میں خود کو سنبھال چکا تھا اور رسالت بھی یہ وعدہ کر چکا تھا کہ یہ ساری کہانی ہمیشہ اس کے دل کی مضبوط تجوری میں رہے گی تو وہ سوچ میں ڈوبے لہجے میں بولا۔

”سر! یہ بھی تو ممکن ہے کسی بہت بڑی مجبوری نے اسے آپ لوگوں کو را کے سامنے پھینکنے پر مجبور کر دیا ہو... نہ جانے کیوں وہ مجھے ایسی نہیں لگتی۔“

میں نے محاورتاً اپنا سر پیٹا۔ ”لگتا ہے مجھے واپسی پر اپنی رپورٹ میں لکھنا پڑے گا کہ بے شک کیپٹن رسالت ایک قابل آفیسر ہے مگر لڑکیوں کو سامنے دیکھ کر اس کی عقل گھاس چرنے چلی جاتی ہے۔“

وہ کھسیانے سے انداز میں ہنسنے لگا۔

”وہ ناگن ہے میرے بھولے گونگلو! کاش مجھے اس کا پھن کچلنے کا ایک موقع مل جائے۔ اس کے جسم پر بلیک کیٹ کی سیاہ وردی دیکھنے کے بعد بھی تم خوش فہمی کا شکار ہو؟“

وہ سر کھجانے لگا۔ ”آپ کی ایک بات تو بالکل ٹھیک لگتی ہے۔“

”کون سی؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”عقل کے گھاس چرنے والی۔“

میرا بے ساختہ قہقہہ بلند ہوا تو وہ بھی ہنسنے میں میرے ساتھ شامل ہو گیا۔

☆☆☆

میں اور رسالت سینٹر کے ٹریننگ ایریا میں تھے۔ ہمارے سامنے وہ چوبیس افغان فوجی تھے جنہیں ہم کو ٹریننگ دینی تھی۔

میرے اور رسالت کے ذمے دوبدو لڑائی کی تربیت دینی تھی۔ رسالت نے دوبدو لڑائی میں اکیڈمی میں اعزازی شمشیر حاصل کی تھی اور اس سلسلے میں میری صلاحیتوں سے بھی ایک زمانہ واقف تھا۔

یہ بات مزید دلچسپی کا باعث تھی کہ جس دوسرے دستے کو بھارتی ٹیم تربیت دے رہی تھی، انہیں دوبدو لڑائی کا ہنر سکھانے کی ذمے داری راہول ثوبا پر تھی۔

میں گزارے کے لائق پشتو بول لیتا تھا جبکہ رسالت تو تھا ہی پشتون، اس لیے زبان کا مسئلہ درپیش نہیں تھا۔

لڑکوں سے تعارف اور مختصر بات چیت سے پتا چلا کہ وہ سارے ایک ہی دیہقانی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے اور ڈالرز میں ملنے والی تنخواہ کے لالچ میں فوج میں شامل ہوئے تھے۔ میں نے سب سے پہلے انہیں گراؤنڈ کے چار چکر لگوائے۔ یہ دیکھ کر مجھے خاصی تسلی ہوئی کہ ان میں سے زیادہ تر بہترین اسٹیمنا کے مالک تھے۔

پھر میں نے لیکچر کا آغاز کیا۔ ”دوبدو لڑائی آرمی کی تربیت کا بنیادی جز ہے۔ امن ہو یا جنگ، کسی بھی وقت آپ کو بغیر ہتھیار کے لڑنا پڑ سکتا ہے۔ خالی ہاتھ بھی اور تیز دھار آلے سے بھی۔

”اس ہنر کی دو شاخیں ہیں۔ پہلی ”کتابی“ تربیت ہے۔ اس کا طریقہ کتابوں میں بھی لکھا ہے۔ یہ لڑائی قواعد اور ضوابط میں رہ کر لڑی جاتی ہے۔ مختلف یونٹوں کے جوانوں کے درمیان ہونے والے دوستانہ مقابلے انہی قواعد اور ضوابط والی لڑائی کے تحت ہوتے ہیں۔

”اس ”کتابی لڑائی“ کی تربیت تم لوگوں کو کیپٹن رسالت دیں گے۔ اس ہنر کی دوسری شاخ پہلی سے قطعی مختلف ہے۔ اس کی تربیت میں دوں گا تم لوگوں کو...“ میں

جان بوجھ کر خاموش ہوا تو چند لمحوں بعد حسب توقع ایک خشک جلد والے لڑکے نے ہاتھ بلند کیا۔ میں نے سر کی جنبش سے اسے اجازت دی۔

”میرا نام حلابت ہے سر۔“ وہ رنگروٹوں کے مخصوص انداز میں اونچی آواز میں بولا۔ ”میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ ہمیں کس قسم کی تربیت دیں گے؟“

”میں ہر قانون اور قاعدے سے آزاد لڑائی کی تربیت دوں گا تمہیں۔ ایک حقیقی لڑائی میں جہاں خون کا پیاسا دشمن تمہارے سامنے ہو... جو ذرا سی بھی بھول چوک معاف کرنے کا قائل نہ ہو۔ ایسے دشمن کو زیر کرنے کا طریقہ سکھاؤں گا تم لوگوں کو۔“

سبھی لڑکوں نے پسندیدگی کے اظہار کے طور پر تالیاں بجائیں۔

رسالت نے اپنے ”کام“ کا آغاز کر دیا۔ میری نظریں سبھی لڑکوں کو ٹٹول رہی تھیں۔ میں ان میں سے حقیقی فائٹر کھوج رہا تھا۔

ہمارے بعد ان لڑکوں کی نشانہ بازی کی کلاس میجر گل نواز کو لینی تھی۔

☆☆☆

ہمیں افغانستان میں آئے ہوئے سات دن ہو گئے تھے۔ آفیسرز میس میں آتے، جاتے کئی دفعہ ثوبا اور شیلا سے سامنا ہوا تھا۔

شیلا ہمیشہ نظریں چرا کر نکل گئی البتہ ثوبا کی آنکھیں مجھے دیکھ کر خون اگلنے لگتی تھیں۔ میجر گل نواز بھی اس کی شرربار نظروں کا ہدف تھا۔ جنرل خانخیلی کے عشائیے میں دیے ہوئے گل نواز کے جواب کا زخم بدستور تازہ تھا۔

میری کیفیت بھی مختلف نہیں تھی۔ ثوبا کا سامنا ہونے کے بعد میرا سینہ جلنے لگتا تھا اور بے بسی کا احساس بہت دیر تک کچوکے لگاتا رہتا تھا۔

کرنل پنج شیری کا رویہ پہلے دن سے ہی ہماری ٹیم کے ساتھ روکھا سا تھا، البتہ بھارتیوں کے ساتھ اس کی خوب بنتی تھی اور ان سے بات کرتے ہوئے اس کے سفید دانت نظر آنے لگتے تھے۔ خاص طور پر شیلا کے ساتھ۔ سینٹرل کمانڈر جنرل خانخیلی کا رویہ البتہ ہمارے ساتھ بہت اچھا تھا۔ آفیسرز میس میں اکثر ہی اس سے ملاقات ہو جاتی تھی۔

گداز جسم والی بھارتی ناری... جس کا نام کابتا تھا، جنرل کے گرد منڈلاتی نظر آتی تھی۔ را والے یہاں اپنے نیکڈ ونگ کے ذریعے قدم جمانے میں پوری طرح سے کامیاب نظر آتے تھے۔ اس روز شام سے ہی گھرے بادل گھر آئے تھے اور شمالی پہاڑوں کو چھو کر آنے والی ہوا میں غضب کی کاٹ تھی۔ پھر بارش شروع ہو گئی۔ سبھی اپنے کمروں میں محصور ہو کر رہ گئے تھے۔

ہمیں ایل پی جی سلنڈر سے منسلک ہیٹر مہیا کر دیے گئے۔ میں اور رسالت ہیٹر کے پاس بیٹھ کر افغانستان کی مشہور سوغات خشک میوے سے انصاف کرتے ہوئے باتیں کرتے رہے۔ رات کا کھانا بھی ہم نے کمرے میں کھایا۔

ہمارے قہقہے بلند ہوئے تو میجر گل نواز اور میجر فواد بھی ہمارے کمرے میں آ گئے۔ خوش گوار یادوں، باتوں کا سلسلہ خاصی دیر تک چلا۔ رسالت نے کیتلی وغیرہ کا انتظام کر کے ہیٹر پر ہی قہوہ بنا لیا تھا۔

کرنل محمود صاحب کو قہوے پر مدعو کیا گیا تو وہ بھی وہیں چلے آئے۔ تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد واپس چلے گئے۔

نصف رات کے قریب یہ محفل اختتام پذیر ہوئی تو ہیٹر بجھا کر میں اور رسالت اپنے بستروں میں گھس گئے۔ سردیوں کی دھیمی دھیمی بارش مسلسل چل رہی تھی اور کبھی کبھار کھڑکی کے شیشے پر کڑکتی بجلی کی چمک بھی نظر آ جاتی تھی۔

رات کا آخری پہر تھا جب میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے لگا جیسے دروازے کو دھیرے سے بجایا گیا ہو۔ میری تمام تر حسیات پوری قوت سے بیدار ہو چکی تھیں۔ تکیے کے نیچے رکھی ”گلوک“ فوراً ہی مٹھی میں سما گئی۔

کمرے میں زیرو پاور کا بلب روشن تھا جس کی نیلگوں روشنی میں ہر چیز صاف نظر آ رہی تھی۔ رسالت گٹھری بنا سو رہا تھا۔

شاید میری سماعت نے دھوکا دیا تھا۔ دروازے پر دستک نہیں ہوئی تھی مگر میری چھٹی حس دروازے کے دوسری طرف کسی کی موجودگی کا بار بار اعلان کر رہی تھی۔

میں گلوک سنبھالے بے آواز طریقے سے بستر سے نکلا اور دروازے کے بائیں پہلو میں دیوار کے ساتھ چپک گیا۔ کمرے کا دروازہ فولادی اور خاصا مضبوط تھا۔

اسی پل دوبارہ بے حد آہستگی سے دروازے کو بجایا گیا، محض ایک انگلی کی ضرب سے۔ اس دفعہ کسمسا کر رسالت بھی اٹھ بیٹھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی سیاہ گلوک چمکی اور مجھے پوزیشن لیتے دیکھ کر وہ شکار پر نکلے چیتے کی طرح چوکنا ہو گیا۔

”کون ہے؟“ میں نے آہستہ سے محتاط انداز میں پوچھا۔

”میں ہوں۔“ دروازے کے دوسری طرف سے ایک مدھم نسوانی آواز ابھری اور مجھے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔ میں اس آواز کو سیکڑوں آوازوں میں شناخت کر سکتا تھا۔ بلاشبہ وہ آواز شیلا کی تھی۔

بے یقینی کی کیفیت نے مجھے سن سا کر دیا۔ رسالت دروازے کے دوسرے پہلو میں پہنچ گیا تھا اور اب سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ہیجان ہی ہیجان تھا۔

”کیوں آئی ہو یہاں؟“ میری آواز میں اسی کا عطا کیا ہوا زہر تھا۔

”مجھے اندر آنے دو۔“ اس کی بچھڑی کونج جیسی آواز سنائی دی۔ ”میں کیول تمہارے دو منٹ لوں گی۔“

”واپس چلی جاؤ۔ تمہاری پٹاری میں دھوکے اور مکاری کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے... دفع ہو جاؤ۔“ میری دہاڑ بجلی کڑکنے کی آواز میں دب گئی۔

رسالت نے میرے جلتے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھا۔ شیلا کی سسکتی ہوئی آواز بلند ہوئی۔

”پلیز! صرف دو منٹ میری بات سن لو۔“ اس کی آواز میں جو کچھ تھا وہ پتھروں کا سینہ شق کر دینے والا تھا مگر میرے سامنے تو ایک ذبح ہوئے شہید کا لاشہ تھا۔ مجھ پر مطلق بھی اثر نہیں ہوا۔

میں دروازے سے ہٹ کر کمرے کے وسط میں آ گیا۔ ”رسالت! اسے کہو دفع ہو جائے۔ یہ نہ ہو میرے ہاتھوں...“

میرا فقرہ نامکمل ہی رہ گیا۔ شیلا کی درد بھری آواز کا رسالت پر اثر ہو گیا تھا۔ میں دروازہ کھلنے کی مدھم آواز سن کر پلٹا تو بارش میں بھیگی ہوئی شیلا میرے سامنے تھی۔

رسالت دروازہ دوبارہ بند کر رہا تھا۔ میری نظر اس پر پڑی تو اس نے سر جھکا لیا۔ میں نے اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”پھر کون سا نیا جال لے کر اس سرد رات میں آئی ہو؟“

میرے الفاظ نے اس پر آتشیں کوڑے کا سا اثر کیا تھا۔ وہ تڑپی۔ اس کی سیاہ کٹورا سی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں۔ آواز دبانے کے لیے اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔

”جو کہنا ہے جلدی کہو۔ تمہارے مگرمچھ کے آنسو اب مجھ پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔“

اس نے ہچکی روکنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنی آنکھیں بیدردی سے مسلیں۔ بظاہر اس کی حالت قابل رحم تھی۔ سرد ترین رات میں وہ بارش میں بھیگی ہوئی تھی اور کپکپا رہی تھی۔ گھنیری زلفیں بھیگ کر اس کی گردن اور چہرے پر چپکی ہوئی تھیں۔ رسالت نے جلدی سے ہیٹر جلا کر اس کے قریب کر دیا۔

وہ بمشکل ہچکی روک کر بیٹھی ہوئی آواز میں بولی۔ ”میں کوئی اپنی صفائی دینے نہیں آئی... میں کل بھی مجبور تھی اور آج بھی مجبور ہوں۔ میں تو صرف یہ درخواست لے کر آئی ہوں کہ بھگوان کے واسطے یہاں سے چلے جاؤ... چلے جاؤ عامر... ایک بہت مہیب خطرہ تمہارے سر پر منڈلا رہا ہے۔“

میرے ہونٹوں پر نہ چاہتے ہوئے بھی زخمی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ”را کی سیاہ وردی جسم پر سجائے یہ ”مجبوری“ کی کہانی بھی خوب ہے۔ رہی خطرے والی بات تو میں ہر خطرے کا منہ توڑ جواب دینے کی ہمت و طاقت رکھتا ہوں۔ میری فکر میں تمہیں دبلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“

اس کے سینے کی گہرائیوں سے ایک دل دوز سی آواز برآمد ہوئی۔ ”یہ وردی میرے جسم پر سجائی گئی ہے اور یہ واقعہ تمہیں عذاب میں مبتلا کرنے کے بعد پیش آیا تھا۔ میجر ثوبا، تمہارے مقامی ایجنٹوں کو پہلے ہی ٹریس کر چکا تھا۔ تمہارے حوالے سے میں بھی اس کی نظروں میں آ گئی تھی۔ میری چھوٹی بہن کو اپنے قبضے میں رکھ کر اس نے مجھے، تمہارے خلاف ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں کیا کرتی عامر... میں مجبور تھی۔ اس کے بعد میں، میجر ثوبا کے جال میں پھنستی چلی گئی۔“ وہ دوبارہ سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

مجھے خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں اس کے رونے کی آواز ساتھ والے کمرے تک نہ پہنچ جائے۔ میں نے اس کی طرف سے رخ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تمہاری کسی کہانی پر یقین نہیں ہے۔ تم محض ہمیں نفسیاتی دباؤ میں لینے کے ایجنڈے پر کام کر رہی ہو۔ جا کر اپنے بڑوں سے کہہ دو، ہم پر یہ حربہ کامیاب نہیں ہو گا۔ تم لوگوں کی گردنیں بہت جلد میرے شکنجے میں ہوں گی۔“

وہ کچھ دیر کھڑی ہونٹ کاٹتی رہی۔ کمال کی اداکارہ تھی۔ اس کے چہرے پر بڑی بے بسی کے تاثرات تھے۔ پھر وہ مڑی اور کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح دروازے

کی طرف بڑھی۔ دروازہ کھول کر اس نے دوبارہ سر گھمایا تو میں نے بھی رخ دوبارہ موڑ لیا۔ اس کی بکھری ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''میں بنتی کرتی ہوں عامر! اپنی ٹیم کے ساتھ جلد از جلد یہاں سے چلے جاؤ۔ میجر ٹوبا کا بڑا بھیانک منصوبہ ہے تم لوگوں کے لیے۔''

پھر وہ چلی گئی۔ ایک لمحے کے لیے، محض ایک لمحے کے لیے مجھے لگا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے مگر میرے ساتھ جو بیت چکی تھی اس کے بعد میں کیسے اس پر اعتبار کرتا؟

سر میں درد کی شدید لہر اٹھی اور میں بستر پر گر گیا۔ دروازہ بند کر کے رسالت پلٹا۔ کچھ دیر مجھے فکرمندی سے دیکھتا رہا پھر ہیٹر میرے قریب لے آیا۔

''کیا ہوا سر؟'' اس نے بڑی فکرمندی سے پوچھا۔

''کچھ نہیں، سر میں درد ہو رہا ہے۔''

''ڈسپرین لے آؤں؟''

میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کیا اور ہیٹر بند کر کے اسے سونے کے لیے کہا۔

اس نے میری ہدایت پر عمل کیا اور بستر میں گھستے ہوئے ندامت بھرے انداز میں بولا۔ ''آئی ایم سوری سر! میں نے آپ کی حکم عدولی کی۔ اس کی آواز کے درد نے...''

میں نے اس کی بات کاٹی۔ ''جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب سو جاؤ۔''

اسے میرے موڈ کا بخوبی اندازہ ہو چکا تھا۔ وہ مزید کچھ کہے بغیر اپنے بستر میں گھس گیا۔ میں نے آنکھیں بند کیں تو اس کا ملتجیانہ چہرہ سامنے آ گیا۔ ''چلے جاؤ یہاں سے عامر!'' اس نے پھر یہ نیا ڈراما کیوں رچایا تھا؟

اس سرد رات میں میرا جسم آگ کی طرح جلنے لگا تھا۔ کسی کروٹ چین نہیں آ رہا تھا۔ میری مسلسل بے چینی کو محسوس کر کے رسالت نے کہا۔ ''نیند نہیں آ رہی سر؟''

''آ جائے گی... تم سو جاؤ۔'' نہ چاہنے کے باوجود میری آواز میں تلخی در آئی تھی۔

رسالت چند لمحے خاموش رہا پھر اس کی گمبھیر آواز ابھری۔ ''ممکن ہے وہ سچ کہہ رہی ہو سر! ٹوبا وغیرہ واقعی ہمارے خلاف کوئی پلان بنا رہے ہوں۔ یہاں ان کی پوزیشن ہم سے زیادہ مضبوط ہے۔ جنرل خاقیلی تک ان کی لڑکیوں کے ہاتھ میں ہے۔'' پھر اس کے لہجے میں ہچکچاہٹ اتر آئی۔ ''مم... میرا خیال ہے یہ معاملہ ہمیں کرنل صاحب کے علم میں لے آنا چاہیے۔''

میں نے کوشش کر کے ذہن کو غیر جانب داری سے سوچنے کی طرف راغب کیا۔ یہاں میں اکیلا نہیں تھا۔ میرے ساتھ کچھ اور لوگ بھی تھے جو مجھ سے وابستہ تھے۔ شاید رسالت کا خیال درست تھا مگر دماغ کے ساتھ ساتھ اب دل بھی شیلا کی کسی بات پر اعتبار کرنے پر رضامند نہیں ہو رہا تھا۔

میں اٹھ بیٹھا۔ رسالت نے بھی میری تقلید کی۔

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، صبح یہ بات کرنل صاحب کے علم میں لے آتے ہیں مگر مجھے یقین ہے کہ یہ را والوں کی کوئی نئی سازش ہے... وہ ناگن ہے ناگن۔''

رسالت چند لمحے خلا میں گھورتا رہا پھر بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''سر! میرا تجربہ آپ کے مقابلے میں برائے نام ہے۔ میں نے ابھی زمانے کے سرد و گرم کا بھی زیادہ سامنا نہیں کیا اور نہ ہی ابھی تک کسی لڑکی سے محبت کی ہے مگر اس کے باوجود مجھے لگتا ہے کہ وہ لڑکی سچ کہتی ہے۔ اس نے جو کچھ بھی آپ کے ساتھ کیا، مجبوری کے عالم میں کیا۔ وہ آپ کے عشق میں بری طرح سے چوٹیں سہہ چکی ہے اور سہہ رہی ہے۔ اسے آپ کی ضرورت ہے سر! آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ اس کے حوالے سے آپ کے دل پر جو فولادی سختی چڑھ چکی ہے، اسے اتار کر سوچیں گے تو وہ آپ کو بھی سچی اور ہمدردی کے لائق نظر آئے گی۔''

میں نے گہرا سانس لیا۔ ''ٹھیک ہے مان لیتے ہیں کہ تمہارا قیاس صحیح ہے، اس نے جو کچھ بھی کیا مجبوری کے عالم میں کیا۔ اس کی چھوٹی بہن واقعی را کی چھری کے نیچے تھی مگر اس نے تو میری خاطر اپنا دھرم تک چھوڑنے کا عہد کیا تھا۔ اسے اپنی مجبوری مجھ سے شیئر کرنی چاہیے تھی۔'' میرا لہجہ تلخ تر ہوتا چلا گیا۔ ''میں کوئی مٹی کا گڈا نہیں تھا، وہ بتا دیتی... ذرا سا کوئی اشارہ بھی دے دیتی تو میں را والوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتا۔ اس کی بہن کو را کے جبڑے سے نکال لاتا۔ اس کی وجہ سے میں نے اپنا جاں نثار ساتھی کھویا ہے رسالت... اس کی وجہ سے میں نے کیپٹن رضوان کو ٹوبا کے ہاتھوں ذبح ہوتے دیکھا ہے۔ اس وقت کو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔'' بے اختیار ہو کر میں نے اپنا سر بیڈ کے پائے پر مارا۔ رسالت بستر چھوڑ کر میری طرف آیا۔

''خود کو سنبھالیں سر۔''

''کیسے سنبھالوں؟'' میری آواز شدتِ کرب سے بیٹھ گئی۔ ''رضوان کی بوڑھی ماں ہر مہینے میرے پاس آ جاتی

ہے۔ اسے اپنے شہید بیٹے کا آخری دیدار تک نصیب نہیں ہوا۔ اس کی آنکھوں میں ہنستے، مسکراتے گھر سے رخصت ہوتے بیٹے کا منظر جم گیا ہے۔ اس کی ویران آنکھیں مجھ سے پوچھتی ہیں کہ اگر میرا بیٹا شہید ہو گیا ہے تو کم از کم اس کی لاش ہی میرے سامنے لے آؤ... اس کی کوئی آخری نشانی۔ یہ سب اس ناگن کی وجہ سے ہوا ہے جس کی ہمدردی میں تمہیں کچھ اور سجھائی نہیں دے رہا۔ وہ بہت بڑی اداکارہ ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں کہاں اس سے دھوکا کھاتا۔''

رسالت خاموشی سے ہونٹ کاٹتا رہا اور وہ رات گزر گئی۔

☆☆☆

اگلے دن وہ معاملہ کرنل صاحب کے علم میں لایا گیا جس کے بعد شیلا اور میرے تعلق کے حوالے سے بہت سے سوالات اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

کرنل صاحب کو میں نے جیسے تیسے مطمئن کیا۔ محتاط رہنے کے حوالے سے یہ فیصلہ ہوا کہ کرنل صاحب کے علاوہ ہم چاروں رات کو دو دو گھنٹے اپنی رہائشی عمارت کے کوریڈور میں نگرانی پر رہیں گے۔ شیلا سب کی نظروں سے بچ کر وہاں تک آ سکتی تھی تو کوئی اور بھی آ سکتا تھا۔

بارش رک چکی تھی البتہ ہوا میں بڑی کاٹ تھی۔ بلندی پر ہونے کے سبب بارش کا سارا پانی نشیب میں بہہ گیا تھا۔

میں اور رسالت معمول کی ورزش کی غرض سے پریڈ گراؤنڈ میں آئے تو ٹوبا اور اس کا زیرِ تربیت افغان دستہ پہلے سے وہاں جاگنگ کر رہا تھا۔

ٹوبا، لڑکوں سے آگے اس حالت میں بھاگ رہا تھا کہ اس کی کمر سے منسلک رسے کے ساتھ ایک پرانا ٹائر بندھا ہوا تھا جو اس کے پیچھے گھسٹتا جا رہا تھا۔

ہمیں دیکھ کر ٹوبا کا جسم مزید تن گیا اور دوڑنے کی رفتار مزید بڑھ گئی۔ چست پتلون اور بنیان میں اس کا مضبوط گینڈے جیسا جسم دیکھنے والوں کو متاثر کر رہا تھا۔

''اچھا خاصا مضبوط بندہ ہے۔'' رسالت نے تبصرہ کیا۔

ہم ایک ہی جگہ کھڑے ہو کر جسم کو وارم اپ کرنے لگے۔ چکر مکمل کرتے ہوئے جب بھی ٹوبا ہمارے قریب سے گزرتا تو اس کی شعلہ بار نگاہیں میری نگاہوں سے ٹکراتیں اور چنگاریاں سی چھوٹ جاتیں۔ ٹوبا کے لڑکوں نے گراؤنڈ کے چار چکر لگائے۔ ٹوبا نے ٹائر کے ساتھ چھ چکر لگائے تھے۔ سخت سردی کے باوجود اس کا جسم پسینے میں بھیگ گیا تھا

مگر وہ ہانپا نہیں تھا۔ بے شک اس کا اسٹیمنا قابلِ رشک تھا۔

ٹوبا ٹائر وغیرہ کھول کر ہمارے قریب آ گیا۔ ''یاد ہے میجر! دم دبا کر بھاگنے سے پہلے تم نے مجھے لڑائی کا چیلنج دیا تھا؟''

''اگر را کے چھ بہترین ایجنٹوں کو کاٹ کر ان کی تحویل سے بھاگ نکلنے کو تم دم دبا کر بھاگنا کہتے ہو تو تمہاری ذہنی حالت پر شک کیا جا سکتا ہے... رہی چیلنج والی بات تو وہ آج بھی برقرار ہے۔ اہتمام تم کر لو، میں حاضر ہوں مگر شرط وہی ہو گی۔''

''کون سی؟'' اس نے بے ساختہ پوچھا۔

''دیکھ لو، تمہارا دماغ واقعی چل گیا ہے جو بھول گئے ہو۔''

اس کے پھولے ہوئے مضبوط جبڑے بھنچ گئے۔

''تمہاری زبان جلد ہی بند کرنی پڑے گی۔'' وہ پھنکارا۔

''کون سی شرط؟'' اس نے دوبارہ پوچھا۔

''وہی کہ ہارنے والے کی گردن کاٹنے کا جیتنے والے کو اختیار ہو گا۔'' میرے لہجے میں جو کچھ تھا، اس نے ایک لمحے کے لیے ٹوبا کو بھی دہلا دیا۔ اس نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر مجھے بغور دیکھا۔ رسالت نے بھی چونک کر مجھے دیکھا۔

ٹوبا کی آنکھیں خون اگلنے لگیں۔ اس نے پینٹ میں اڑسی اپنی بنیان باہر نکالی۔ بنیان کے نچلے حصے پر ایک شفاف پلاسٹک کی چھوٹی سی تھیلی چپکی ہوئی تھی۔ اس تھیلی میں خون آلود بال صاف نظر آ رہے تھے۔ ''جانتے ہو یہ کیا ہے؟'' اس کا لہجہ کسی قیامت کی خبر دے رہا تھا۔

میں خاموش رہا تو اس کے سیاہ ہونٹوں پر بڑی مکروہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''یہ تمغہ ہے تمغہ... جواں مردی، ہمت و طاقت کا۔ یہ تمہارے ساتھی کی باقیات ہیں اور بہت جلد تمہاری باقیات بھی یہیں چپکی ہوں گی...'' اس نے اشتعال انگیز انداز میں ناقابلِ بیان لفظ استعمال کیا۔

مجھے لگا جیسے میرے وجود میں کوئی آتش فشاں پھٹا ہے۔ نظروں کے سامنے سرخ سی دھند چھانے لگی۔ ٹوبا مجھے کسی چیونٹی سے بھی کمتر نظر آنے لگا۔

میری کیفیت دیکھتے ہوئے رسالت نے جلدی سے میرے سینے پر اپنے دونوں ہاتھوں کا دباؤ ڈالا۔ ''خود پر قابو رکھیں سر! کرنل صاحب نے ہمیں خود پر قابو رکھنے کی ہدایت کی ہے۔'' ان الفاظ نے میرے اندر پھٹ پڑنے والے آتش فشاں کو کچھ ٹھنڈا کیا۔ ٹوبا سینہ تانے خون اگلتی نظروں

سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کے اوپری جسم کا آگے کی طرف جھکاؤ، قدموں کا انداز اس بات کے غماز تھے کہ وہ میرے خود پر جھپٹنے کا منتظر ہے۔

”تُوبا! جس دن تو میرے ہاتھ آ گیا... میرا وعدہ ہے حلق میں ہاتھ ڈال کر تجھے چیر دوں گا۔“ مجھے اپنی آواز خود بھی اجنبی محسوس ہوئی۔

اس جگر پاش لہجے کو تُوبا نے آرام سے برداشت کیا اور حقارت آمیز انداز میں ہاتھ ہلا کر بولا۔ ”کم از کم کسی پاکستانی ماں نے تو ایسا سورما نہیں جنا جو تُوبا کا حلق چیر سکے۔“

”کوئی موقع پیدا کر کے دیکھ لے... تیری یہ غلط فہمی دور ہو جائے گی۔“

میں نے یخ بستہ ہوا میں گہرے گہرے سانس لیے۔ رضوان کے خون آلود بال تُوبا تمغے کے طور پر لیے پھر رہا تھا۔ میرے ذہن سے وہ بال چپک گئے تھے۔

رسالت بولا۔ ”سر! اس کمینے تُوبا کی دھمکی اور شیلا کی وارننگ میں کوئی مماثلت محسوس ہوئی آپ کو؟“

”ہاں، دونوں کا ایک ہی ایجنڈا ہے... ہمیں نفسیاتی دباؤ میں لینا۔ جب ہم لوگ اپنی فکر میں پڑ جائیں گے تو جس مقصد کے لیے یہاں آئے ہیں، اس پر خاک توجہ دے پائیں گے۔“ رسالت گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

تھوڑی دیر بعد رسالت اور میں اپنی کلاس لے رہے تھے۔ چوبیس لڑکوں میں سے میں نے دو لڑکے منتخب کیے تھے۔ یہ لڑکے مجھے اپنے مطلب کے لگے تھے۔ ان میں سے ایک صولت اور دوسرا اس کا چچازاد بھائی قدیم تھا۔

میں نے ان دونوں کو علیحدہ کیا تو کندھے سے کندھا ملائے وہ مجھے ایک ”ٹیم“ کی طرح نظر آئے۔ ان دونوں میں اچھی دوستی بھی تھی۔

میں نے کہا۔ ”اگر تم دونوں مل کر مجھ پر حملہ کرو تو کتنی دیر میں گرا لو گے مجھے؟“

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر قدیم بولا۔ ”سر! کس انداز میں؟ کتابی انداز میں یا آپ کے اسٹائل میں؟“

میں نے کہا۔ ”کتابی انداز میں۔“

”پھر تو شاید ہم ایسا نہ کر سکیں۔ ہمیں تو یہ اسٹائل سیکھتے ہوئے تھوڑے دن ہی ہوئے ہیں۔“

”اور میرے فری اسٹائل انداز میں؟“ میری نظریں انہیں خوب جانچ رہی تھیں۔

فری اسٹائل کا سنتے ہی دونوں پُرجوش ہو گئے۔ صولت بولا۔ ”اگر چوٹ کی پروا نہ کی جائے تو وقت کا تو پتا نہیں مگر گرا ضرور لیں گے۔“ آخری فقرہ اس نے بڑے پُراعتماد انداز میں کہا تھا۔

رسالت اور لڑکے دلچسپی سے یہ مکالمہ سن رہے تھے۔

میں نے کہا۔ ”چوٹیں لگتی رہتی ہیں۔ اس بارے میں نہ سوچو اور آ جاؤ۔“ میں نے تھوڑا دور ہٹ کر بازو پھیلائے۔

دونوں نے پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر متذبذب انداز میں میرے مقابل آ گئے۔ ان کے تذبذب کو محسوس کر کے میں نے کہا۔ ”دیکھو، اگر تم مجھے آفیسر اور اپنا ٹرینر ہی سمجھتے رہو گے تو تمہاری حقیقی صلاحیت پچاس گنا کم ہو جائے گی۔ تم دشمن سمجھو مجھے اپنا... بلکہ سمجھو میں نے تمہاری منگیتروں کو چھیڑا ہے۔“

سارے لڑکے ہنسنے لگے تو دونوں کے چہرے سرخ ہو گئے۔ دونوں ہی دائیں، بائیں سے مجھ پر جھپٹے۔ ان کی تکنیک اچھی تھی۔

میں نے پینترا بدل کر صولت کا وزنی گھونسا ہتھیلی پر روکا۔ قدیم نے یکلخت جھکائی دی اور میری ٹانگوں پر جھپٹا مارا۔

میں آرام سے اس کے سر کے اوپر سے کود گیا۔ صولت کے گھونسے والے ہاتھ کو میں نے جھٹکا دیا تو وہ توازن قائم نہ رکھ سکا اور قدیم پر گر گیا۔

کودنے کے برق رفتار عمل کے دوران میں چاہتا تو قدیم کو ایک زبردست ٹھوکر مار سکتا تھا اور صولت کو دیا جانے والا جھٹکا... اس کا کندھا جڑ سے اکھاڑ سکتا تھا۔

”کم آن بوائز۔“ میں نے مناسب فاصلہ رکھ کر انہیں سنبھلنے کا موقع دیا۔ میری برق رفتاری نے رسالت اور لڑکوں کو مبہوت کر دیا تھا۔ پھر جب رسالت نے تالیاں بجائیں تو لڑکوں نے بھی اس کی تقلید کی۔

صولت اور قدیم چہروں پر خجالت لیے دوبارہ مجھ پر جھپٹے۔ ایک ٹیم کی طرح انہوں نے اس دفعہ آگے، پیچھے رہ کر حملہ کیا تھا۔

قدیم نے میرے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کے سینے پر ہاتھ مار کر اسے پیچھے ہٹایا اور پاؤں کی ٹھوکر اس کے گھٹنے کے عقب میں ماری۔ وہ نیچے گرا تو صولت اس کے اوپر سے عقاب کی طرح اڑتا ہوا میری طرف آیا۔ کوشش کے باوجود میں اس کی ضرب سے مکمل طور پر نہیں بچ سکا۔ اس کے جڑے ہوئے پیروں کا ہدف میرا

سینہ تھا۔ اس میں تو وہ کامیاب نہیں ہوا البتہ اس کے پاؤں میرے کندھے سے ضرور ٹکرائے۔ میں لڑکھڑایا تو نیچے گرے قدیم نے میری ٹانگوں میں ٹانگیں پھنسا دیں۔ میں نے ہتھیلیاں زمین پر ٹکا کر خود کو گرنے سے بچایا۔

اچانک ہی شکست کا خطرہ میرے سر پر منڈلانے لگا۔ صولت سنبھل کر مجھ پر جھپٹ رہا تھا۔ اگر میں قدیم سے برق رفتاری سے ٹانگیں چھڑاتا تو اس کی ٹانگوں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ سکتا تھا اور میں یہ نہیں چاہتا تھا۔

صولت نے ہوا میں اچھل کر میری کمر تھامی، اسی پل قدیم نے میری ٹانگیں چھوڑ دیں۔ صولت نے دہقانی طاقت کے بل پر مجھے ہوا میں اچھال دیا۔ اگر وہ مجھے ساتھ لیے زمین پر گرتا تو یقیناً وہ دونوں فاتح ٹھہرتے۔

ان دونوں سمیت وہاں موجود سبھی افراد نے اپنی زندگی کا حیرت انگیز منظر دیکھا۔ میں فضا میں الٹی قلابازی کھا کر نیچے گرنے کے بجائے اپنے قدموں پر کھڑا تھا۔

لڑکوں کی زوردار تالیاں بلند ہوئیں اور دونوں چچازاد بھائیوں نے اپنے ہاتھ فضا میں بلند کر دیے۔ ”ہم آپ کو نہیں گرا سکتے سر!“ صولت نے قدیم کی بھی ترجمانی کی۔

”نہیں... اتنی جلدی نہیں۔“ میں نے انہیں خود پر جھپٹنے کا اشارہ کیا۔ ”بلکہ ایسا کرو ڈمی خنجر بھی لے لو۔“

دونوں نے آپس میں کچھ کھسر پھسر کی پھر صولت نے کہا۔ ”سر! ہمارے قبیلے کا ایک لڑکا چاقو چلانے میں بڑی مہارت رکھتا ہے... آپ، اسے آزمائیں۔“

”اسے بھی دیکھ لیتے ہیں مگر پہلے تمہیں چند باتیں بتا دوں۔“ میں دیکھ چکا تھا کہ دونوں ہی حملہ کرتے ہوئے اپنے دفاع سے قطعی غافل ہو جاتے تھے۔

میں نے اس بارے میں انہیں کچھ ٹپس دیں پھر خنجر زنی میں ماہر لڑکے کو بلا لیا۔ وہ ضرورت سے زیادہ دبلا پتلا تھا مگر اس کے ہاتھ اور کلائیاں خاصی مضبوط تھیں۔

لکڑی سے بنے ڈمی خنجر کو سنبھال کر وہ میرے سامنے آیا تو میں چونک گیا۔ اس کی زرد آنکھوں میں ایک قاتل سی چمک تھی۔ خنجر زنی یقیناً اس کا محبوب مشغلہ تھا۔

میں نے اپنے تجربے کی روشنی میں پوچھا۔ ”تم نے کبھی کسی انسان کی جان لی ہے؟“ اس کا مدقوق سینہ تن گیا۔ ”ہاں سر! میں نے اپنے بھائی کے دو قاتلوں کی آنتیں پتھروں پر بچھا دی تھیں۔“ اس نے بڑے فخر سے کہا۔

میں جانتا تھا کہ قبائلی دشمنیوں میں یہ چلتا رہتا ہے۔ اپنے اندازے کی درستگی میرے لیے تقویت کا باعث تھی۔

میں نے ایک حقیقی قاتل کو خود پر حملہ کرنے کے لیے کہا۔

اس نے ایک لحظے کے لیے ڈمی خنجر کو تولا اور برق رفتاری سے خنجر کو بائیں ہاتھ سے دائیں میں منتقل کیا تو مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ دونوں ہاتھوں سے یکساں مہارت سے خنجر استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اس نے بڑی وحشیانہ پھرتی سے یکے بعد دیگرے میرے سینے پر خنجر کے کئی وار کیے۔ میں نے وار تو بچائے مگر مجھے دانتوں پسینا ضرور آگیا تھا۔ ایک موقع پر میں نے اس کے خنجر والے ہاتھ پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تو اس نے جھکائی دے کر نہ صرف خنجر بچایا بلکہ اسی زور میں میرے پیٹ پر بھی وار کیا۔

میں نے بالکل آخری لمحے پر پہلو کاٹا مگر ڈمی خنجر میرے پہلو کو ضرور چھو گیا۔ میں خنجر سے بچنے میں تو تقریباً کامیاب رہا تھا مگر اس کوشش میں لڑکھڑایا تو اس ”چھپے رستم“ کی ٹانگ سے خود کو نہ بچا سکا۔ ناف پر لگنے والی لات نے مجھے پیچھے دھکیل دیا۔

اس دفعہ تالیاں اس کے لیے بجیں۔ میں نے سنبھل کر دیکھا تو اس کی زرد آنکھوں میں بڑا اشتعال انگیز نشہ تیرتا نظر آیا۔ کیچوا نظر آنے والا اژدہا ثابت ہو رہا تھا۔ اگلے دو منٹ اس نے بڑے وحشیانہ انداز میں مجھ پر حملے کیے۔ میں اسے سنگین ضرب لگانے سے خود کو روکتا رہا۔ ایک موقع پر درمیانی فاصلہ قدرے کم ہوا تو میں نے ڈمی خنجر والا اس کا ہاتھ بغل میں دبایا اور پاؤں کی مخصوص ٹھوکر اس کے گھٹنے کے عقب میں مار کر نیچے گرا دیا۔ ڈمی خنجر والا ہاتھ بدستور میری گرفت میں تھا۔

میں نے وہ ہاتھ اپنی دونوں ٹانگوں میں پھنسا کر ایک چکر دیا تو اس کے حلق سے کراہ نکلی۔ خنجر پر گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

میں نے بڑے آرام سے اس کے ہاتھ سے ڈمی خنجر لے لیا اور ہاتھ تھام کر کھڑا کیا۔ اس کے مدقوق چہرے پر خجالت آمیز طیش تھا۔

میں نے اس کے لیے تالی بجائی۔ ”بے شک تم پورے گروپ میں سب سے بہترین ہو۔“ میں نے اس کی پیٹھ تھپکی تو اس کا چہرہ بھی قدرے نارمل ہو گیا۔

اچانک ہی مجھے چھٹی حس نے احساس دلایا کہ کوئی اور بھی ہمیں دیکھ رہا ہے۔ میں نے سامنے موجود بلڈنگ کی طرف دیکھا۔ ایک سایہ سا لپک کر غائب ہو گیا۔ یہ عمارت بھارتیوں کے تصرف میں تھی، یقیناً انہی میں سے کوئی دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

یہ اس سے اگلی رات کا ذکر ہے۔ اپنی دو گھنٹے کی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر میں نے رسالت کو جگا دیا۔ وہ منہ، سر لپیٹ کر اور گلوک سنبھالے باہر کوریڈور میں نکل گیا۔

میں کچھ دیر کھڑکی کے سامنے کھڑا رہا۔ فضا میں کہر چھائی ہوئی تھی۔ شیلا والی کھڑکی اس کہر میں چھپی ہوئی تھی۔ پہلے دن کے بعد سے یہ کھڑکی مستقل ہی بند نظر آئی تھی۔

میں سونے کے لیے لیٹ گیا۔ نیند ابھی پوری طرح سے حاوی نہیں ہوئی تھی کہ زوردار چھناکے سے کوئی چیز کھڑکی کا شیشہ توڑ کر کمرے میں آگری۔

میری ناک سے آنسو گیس کی مخصوص بو ٹکرائی اور پل بھر میں، میں نے بستر چھوڑ دیا۔ گلوک اس سے پہلے میرے ہاتھ میں آچکی تھی۔

آنسو گیس نے فوراً ہی میری آنکھوں میں مرچیں بھر دیں۔ یہی وقت تھا جب فضا فائرنگ کی بھیانک تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی۔ یہ فائرنگ سینٹر کے مرکزی گیٹ کی طرف سے سنائی دی تھی۔

میں بجلی کی طرح دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ دروازے کے باہر پہلے سے کوئی میرا منتظر تھا۔ رائفل کا وزنی کندا میری کھوپڑی سے ٹکراتا ہوا شانے پر پڑا اور میں پختہ فرش پر گر گیا۔ یہ دیکھ کر میرا دل دھڑکنا بھول گیا کہ رسالت پہلے سے فرش پر بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا اور اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔

میجر فواد اور میجر گل نواز کے کمرے سے بھی دھینگا مشتی کی آوازیں آرہی تھیں۔ ان کے کمرے کا دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ شیلا نے شاید سچ ہی کہا تھا۔ ثوبا کے کھیل کا آغاز ہو گیا تھا۔

میں چکراتے سر کو سنبھالتے ہوئے فرش سے اٹھا۔ عقب سے میں نے رائفل کے کاک ہونے کی مخصوص آواز سنی۔ میں تیزی سے پلٹا تو خود کو خودکار رائفل کے نشانے پر پایا۔ رائفل جس کے ہاتھ میں تھی، اسے دیکھ کر میں حیرت سے گنگ رہ گیا۔ وہ ہمارے والے افغان دستے کا قدیم تھا جو اس پل قطعی بدلا ہوا نظر آرہا تھا۔

”ہتھیار پھینک کر ہاتھ اوپر اٹھا لو... نہیں تو بھون دوں گا، سر!“ اس نے رائفل کو خوفناک انداز میں حرکت دی۔

اس کا لہجہ اس کے ارادے کا گواہ تھا۔ میں نے گلوک

ہاتھ سے گرا دی۔ میجر فواد اور گل نواز کو تین فوجی دھکیلتے ہوئے ان کے کمروں سے باہر لائے۔ ان کے ہاتھ عقب میں باندھ دیے گئے تھے۔

اچانک ہی فائرنگ کی شدت میں اضافہ ہو گیا۔ تین چار دستی بموں کے دھماکے بھی گونجے تھے۔ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ ہم پر حملہ کرنے والے بھارتیوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے تھے یا پھر سینٹر میں کسی قسم کی بغاوت پھوٹ پڑی تھی۔

میں نے قدیم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ میرے حوالے سے وہ بے حد چوکس نظر آرہا تھا۔ ”کس کے لیے کام کر رہے ہو؟“

”بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔“ پھر وہ اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا۔ ”اسے بھی باندھ لو۔“

فواد اور گل نواز کو رائفلوں کے کندے مار کر نیچے فرش پر لیٹنے پر مجبور کر دیا گیا۔

رسالت کے سانس کا زیر و بم محسوس کر کے مجھے خاصا اطمینان محسوس ہوا۔ وہ صرف بے ہوش تھا۔ اچانک میں نے ایک ستون کے عقب میں سایہ سا دیکھا۔ وہ کرنل محمود تھے جو تاریکی میں تاریکی کا حصہ بنے ہوئے تھے۔ یقیناً مسلح بھی تھے مگر اپنے ساتھیوں کو رائفلوں کی زد پر دیکھ کر فی الحال کسی مناسب لمحے کی کھوج میں تھے۔ ان کی موجودگی سے مجھے خاصی تقویت محسوس ہوئی۔

قدیم کا ایک ساتھی رسی لے کر میری طرف آیا۔ مجھے حرکت میں آنے کے لیے محض غفلت کا ایک لمحہ درکار تھا۔ میں نے دائیں ہاتھ کی مٹھی غیر محسوس انداز میں بند کر کے کھولی، یہ مخصوص اشارہ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ کرنل صاحب نے اس اشارے کو بخوبی سمجھ لیا تھا۔

اچانک ہی فائرنگ اور دھماکوں کی آوازیں قریب سے آئیں۔ یہ آوازیں اسی بلڈنگ سے آئی تھیں جہاں بھارتی مقیم تھے۔ یہ بڑی حیرت انگیز بات تھی۔ یہ سارا کیا دھرا بھارتیوں کا تھا تو ان کے زیرِ استعمال بلڈنگ میں فائرنگ کی کیا ضرورت تھی یا پھر یہ بھی ان کی کوئی مکارانہ چال تھی؟ مجھے باندھنے کی غرض سے آنے والا میرے عقب میں پہنچ گیا تھا۔ اپنی رائفل اس نے کندھے سے لٹکالی تھی۔ باقی دو کی رائفلوں کا رخ فرش پر پڑے میرے دیگر ساتھیوں کی طرف تھا۔ میں نے ایک دفعہ پھر مخصوص اشارہ دے کر کرنل صاحب کو اپنی توجہ قدیم پر مرکوز رکھنے کے لیے کہا۔ افغان فوجی نے بیدردی سے میرے ہاتھ عقب میں کھینچے۔ اسے اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ وہ میرے اور اپنے دونوں ساتھیوں کے درمیان آگیا ہے۔ اس کے ساتھیوں کی رائفلوں کے رخ بے شک میرے ساتھیوں کی طرف تھے مگر زمین پر اوندھے پڑے میرے ساتھیوں کی جانب سے مزاحمت کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس لیے انہوں نے رائفلیں ڈھیلے ڈھالے انداز میں پکڑی ہوئی تھیں۔ باندھنے والے افغان فوجی کو ٹھیک سے پتا بھی نہیں چلا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ وہ ایک جھٹکے سے اپنے رائفل بردار ساتھیوں سے جا ٹکرایا۔

کوریڈور فائرنگ کی آواز سے گونجا۔ کرنل صاحب کی چلائی گولی قدیم کی کھوپڑی میں اتر گئی تھی۔ اس کی انگلی ٹریگر پر تھی، سو دب گئی تھی۔ اس کی رائفل کی گولی زناٹے کے ساتھ میری کھوپڑی کے قریب سے گزر گئی۔ باقی فوجیوں کی اضطراری کیفیت میں چلائی گئی گولیاں کوریڈور کے فرش پر لگی تھیں۔

کرنل صاحب کی گلوک تواتر سے گرجی اور دو مزید حواس باختہ فوجیوں کی کھوپڑیاں بھی اڑ گئیں۔ تیسرے کو میں نے چھاپ لیا۔ کرنل صاحب ستون کی آڑ سے نکل آئے۔ فواد اور گل نواز بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ کرنل صاحب پُرتشویش انداز میں رسالت کا جائزہ لیتے بیٹھ گئے۔ میں نے اپنے مدمقابل کی پسلیوں میں گھٹنے کی زوردار ضربیں لگائیں۔ اس کی مزاحمت خاصی کم ہو گئی۔ باقی کسر میجر فواد کی زوردار ضرب نے پوری کر دی۔ سر پر لگنے والی زوردار ٹھوکر کے بعد اس نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے تھے۔

میں نے فواد اور گل نواز کی بندشیں کھولیں۔ کرنل صاحب نے رسالت کو سیدھا کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کے سر پر ضرب لگا کر بے ہوش کیا گیا ہے۔“

سینٹر کے طول و عرض میں ہونے والی فائرنگ کا سلسلہ بدستور جاری تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے دو گروہ آپس میں ٹکرا گئے ہیں۔ بھارتیوں والی بلڈنگ میں ہونے والی فائرنگ البتہ دم توڑ چکی تھی۔

ہم رسالت کو اٹھا ہی رہے تھے کہ کوریڈور شدید فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھا۔ تربیت کے زیرِ اثر ہم فوراً ہی فرش پر گر گئے۔ شدید فائرنگ سیڑھیوں کی جانب سے کوریڈور کی چھت پر کی گئی تھی۔ چھت سے سیمنٹ اور اینٹوں کے ٹکڑے بارش کی طرح ہم پر برسے۔

کوریڈور درجن بھر افغان فوجیوں سے بھر گیا۔ ہمیں نہتا کرنے کے بعد انہوں نے ہمیں لاتوں اور گھونسوں پر رکھ

لیا۔ بے ہوش رسالت سے بھی کوئی رعایت نہیں کی گئی۔ وجہ صاف ظاہر تھی کہ ان کے تین ساتھی ہمارے ہاتھوں مارے گئے تھے۔

ان فوجیوں کی قیادت صولت کر رہا تھا۔ اس کا چاچا زاد بھائی اور دوست بھی ہمارے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ اس کے غضب کا میں بطورِ خاص نشانہ بن رہا تھا۔ اس کے دیگر ساتھیوں نے بمشکل اسے قابو کیا۔

ہماری مشکیں کس کر اور رائفلوں کے سائے میں وہ ہمیں نیچے لائے۔ احاطے میں ایک فوجی ٹرک پہلے سے موجود تھا۔ فائرنگ کے شور میں ہم اس کے انجن کی آواز نہیں سن پائے تھے۔ ہمیں اٹھا کر اناج کی بوریوں کی طرح ٹرک میں پٹخ دیا گیا۔

فائرنگ کا سلسلہ اب خاصا دھیما پڑ گیا تھا۔ ہم ٹرک میں پڑے بدلے حالات پر غور کر رہے تھے کہ چند اور ہاتھ پاؤں بندھے افراد کو ٹرک میں پھینکا گیا۔

میں ایک نرم و نازک نسوانی وجود کے نیچے دب گیا۔ لڑکیاں تو یہاں صرف بھارتی تھیں۔ دیگر جن افراد کو ٹرک میں پٹخا گیا تھا کیا وہ بھارتی تھے؟ یہ سوال بجلی کے کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپکا۔ کیا میرے اوپر بے حس و حرکت پڑا نسوانی وجود کسی بھارتی ناری کا تھا؟ اسی وقت ٹرک کے باہر فائرنگ کی آواز ابھری پھر دھکم پیل کی آواز سنائی دی اور میں نے ثوبا کی گرجتی ہوئی آواز سنی۔

”جس حرام کے بچے نے تم لوگوں کو ہم پر ہاتھ ڈالنے کا کہا ہے... اسے بول دینا اس کے سانس پورے ہوچکے۔“

گالیوں اور دھکم پیل کی آوازوں کے درمیان میں نے کسی انسانی کھوپڑی سے رائفل کے کندے کے ٹکرانے کی آواز سنی۔ ممکنہ طور پر یہ کھوپڑی ثوبا کی تھی کیونکہ اس کے بعد میں نے اس کی آواز نہیں سنی۔

دو اور ہاتھ پاؤں بندھے افراد کو اٹھا کر ٹرک میں پھینک دیا گیا۔ یہ بات اب یقینی ہوچکی تھی کہ یہ کارروائی ثوبا وغیرہ کی نہیں تھی۔ ممکنہ طور پر افغان حکومت کے کسی مخالف گروہ نے فوجی سینٹر پر حملہ کیا تھا اور اب ہمیں باندھ کر یہاں سے اغوا کر کے لے جا رہا تھا۔ اس مخالف گروہ کو بھرپور اندرونی مدد بھی حاصل تھی۔ مکمل طور پر اندھیرے کے سبب کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ حملہ آوروں نے غالباً بجلی کی سپلائی لائن اڑا دی تھی یا اندرونی مددگاروں نے یہ کام انجام دیا تھا۔

میں نے کسمسا کر نسوانی وجود کو خود پر سے ہٹایا۔ میرے ساتھی بھی پاس ہی پڑے تھے۔ رسالت ہوش میں آ رہا تھا اور دھیرے دھیرے کراہ رہا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے ٹرک میں کئی افراد داخل ہوئے۔ اس کا انجن اسٹارٹ ہوا اور بغیر کسی..... مزاحمت کے ٹرک سینٹر کی حدود سے نکل آیا۔

☆☆☆

منظر ایک قدیم پہاڑی قلعے کے زمین دوز تہ خانے کا تھا۔ ہم چار گھنٹے کے جسم کا جوڑ جوڑ ہلا دینے والے سفر کے بعد یہاں پہنچے تھے۔

ہمارا اغوا رات کے آخری پہر میں ہوا تھا اس لیے جلد ہی صبح کا دھندلکا ہر طرف پھیل گیا اور میں باہر کے کچھ نہ کچھ مناظر دیکھنے میں کامیاب رہا۔

اس ٹرک میں ہمارے ساتھ ثوبا، کاکا، شیلا، کرنل پردیپ کے علاوہ کرنل پنج شیری بھی تشریف لائے تھے۔ میرے اوپر ڈالا گیا وجود کاکا کا تھا۔

سیلن زدہ تہ خانے میں روشنی کا معقول انتظام تھا مگر سردی کی شدت زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ ہم پانچوں کو ایک ہی کوٹھری میں ٹھونس دیا گیا تھا۔ پٹ سن کے بدبودار کمبل ہمیں سردی کی شدت سے محفوظ رکھنے میں قطعی کامیاب ہوتے نظر نہیں آ رہے تھے۔ ایک چھوٹی سی دیوار کے عقب میں ٹوائلٹ کی سہولت میسر تھی۔ وہاں سے اٹھنے والی بدبو سے دماغ پھٹا جا رہا تھا۔

دشوار گزار پہاڑی راستوں پر اچھلتے ہوئے ٹرک نے ہمارے جوڑ ہلا دیے تھے، اس کے علاوہ ہماری خاطر تواضع بھی خوب ہوئی تھی۔ چوٹیں اب اپنا اثر دکھا رہی تھیں۔ کمبل میں لپٹے کرنل محمود متفکر سے بیٹھے تھے۔ میجر فواد اور گل نواز کی کیفیت بھی ان سے مختلف نہیں تھی۔

رسالت ہوش میں آچکا تھا مگر اس کا سر چکرا رہا تھا اور دو دفعہ اس نے قے کی تھی۔ بے خبری میں اس کے سر پر کندے کی ضرب نے گہرے اثرات مرتب کیے تھے۔ اسے طبی امداد کی سخت ضرورت تھی۔

ویسے تو میرے سر پر بھی رائفل کا کندا لگا تھا مگر یہ اچٹتی ہوئی ضرب تھی۔ میری کھوپڑی کو کوئی شدید نوعیت کا نقصان نہیں پہنچا تھا۔

ثوبا اور کرنل پنج شیری وغیرہ بھی اسی موٹی سلاخوں والے قدیم قید خانے کی کسی کال کوٹھری میں تھے۔ ان کی طرف مکمل خاموشی تھی۔

میں نے ثوبا کی جو آخری جھلک دیکھی تھی، اس کا رنگ لیموں کی طرح زرد نظر آ رہا تھا اور سر سے بہنے والا خون کنپٹیوں اور گردن کے اطراف جما ہوا تھا۔ شیلا بھی نظر آئی تھی، اس کی حالت بھی پتلی نظر آتی تھی۔

میجر گل نواز نے خاموشی کے سلسلے کو توڑتے ہوئے کہا۔ ”کون لوگ ہو سکتے ہیں یہ؟ سینٹر کے اندر بھی انہیں بھرپور مدد حاصل تھی اور مجھے تو لگتا ہے ہمیں اور بھارتیوں کو ٹارگٹ کر کے انہوں نے یہ کارروائی کی ہے۔ اس کارروائی کا کوئی نہ کوئی مقصد تو ضرور ہوگا۔“ آخری فقرے میں اس نے سبھی کو سوچنے کی دعوت دی تھی۔

کرنل محمود بولے۔ ”یہاں حکومت مخالف گروپ درجن بھر سے زیادہ ہیں اور سبھی بے حد طاقتور ہیں۔ انہی میں سے کسی کا کام لگتا ہے۔ اغوا کا مقصد ہماری حکومتوں سے تاوان سمیت دیگر مطالبات ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے یہ مطالبات مقامی حکومت سے کیے جائیں۔“ ہماری کوٹھری میں دوبارہ سے خاموشی اتر آئی۔ اس دفعہ خاموشی میں مایوسی کی پرچھائیاں بھی تھیں۔

کیپٹن رسالت کا سر میری گود میں تھا۔ میں دھیرے دھیرے اس کا سر سہلا رہا تھا۔ جلد ہی اس مایوسی بھری خاموشی سے میرا دل گھبرا گیا۔ میں نے دھیمی مگر پُرجوش آواز میں کہا۔ ”ہمیں اتنی جلدی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ ہماری بازیابی کی ذمے دار افغان حکومت ہے۔ کرنل پنج شیری کو تو میں خود قیدی کے روپ میں دیکھ چکا ہوں، ممکن ہے دیگر فوجی بھی یرغمال بنا کر یہاں لائے گئے ہوں۔ مقامی حکومت کچھ نہ کچھ ضرور کرے گی۔ ہم نے بھی چوڑیاں نہیں پہن رکھیں۔“ میرا سینہ خود بخود ہی پھول گیا۔ ”موقع ملتے ہی ہم ان اغواکاروں کی ایسی کی تیسی کر کے یہاں سے نکل جائیں گے۔“

میرے پُرجوش انداز نے جادو کا سا اثر دکھایا۔ مایوسی کا حملہ پسپا ہوگیا۔ سب سے پہلے رسالت نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر خود کے ہونے کا یقین دلایا، دیگر ساتھی بھی ہنسنے بولنے لگے۔ رسالت کی حالت قدرے بہتر ہوتے ہی ہم نے اسے جنگلے کے قریب بیٹھ کر باہر نظر رکھنے کے لیے کہا اور ہم چاروں پتھریلی دیواروں والی اس کوٹھری کو ٹٹولنے لگ گئے۔ کچھ ہی دیر میں میجر فواد نے امید کی کرن دریافت کرلی۔ ٹوائلٹ عقبی دیوار کے ساتھ تھا۔ وہاں دیوار کی جڑ میں دو اینٹوں کے سائز کے پتھریلے بلاک کو کونوں سے کھرچ کھرچ کر کمزور کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

کسی نامعلوم قیدی نے نامعلوم وقت میں یہ کوشش کی تھی۔ منزل ابھی خاصی دور تھی مگر ہم اس نامعلوم قیدی کے مشن کو آگے بڑھا سکتے تھے۔

نوک دار آلے کے نام پر ہمارے پاس ماچس کی تیلی بھی نہیں تھی۔ سو ہم سر کھپا کر دوبارہ کمبلوں میں آگھسے۔ ہماری کوٹھری قید خانے کے مضبوط چوبی دروازے کے بالکل پاس تھی۔ ہماری کوٹھری کے سامنے بھی کوٹھریاں تھیں مگر ان میں کوئی ذی روح نظر نہیں آیا تھا۔ قید خانے کے دروازے کے اوپر ایک بلب روشنی بکھیر رہا تھا۔

کوٹھریوں میں ڈالنے کے بعد ابھی تک کسی اغواکار کی شکل نظر نہیں آئی تھی۔ قید خانے کے دروازے کے دوسری جانب البتہ کوئی نہ کوئی پہرے دار ضرور موجود تھا۔ جب بھی وہ کسی گھٹیا برانڈ کا سگریٹ سلگاتا تھا، اس کی موجودگی محسوس ہوتی تھی۔

اچانک قید خانے کی بند فضا ثوبا کی گرج دار آواز سے گونج اٹھی۔ ”کوئی کمینہ ہے یہاں؟“ اس نے صاف پشتو میں گند اگلا۔

اس کی مخصوص آواز نے میرے تن بدن میں آگ بھڑکا دی تھی مگر اس کا مخاطب اغواکار تھے اس لیے میں نے خاموش رہنے میں ہی بہتری سمجھی۔

ثوبا کے حلق سے باقاعدہ گٹر ابل پڑا تھا۔ اس کا نتیجہ جلد ہی نکل آیا۔ قید خانے کا چوبی دروازہ پُرشور انداز میں کھلا اور قبائلی لباس میں ملبوس تین رائفل بردار اندر داخل ہوئے۔ ان کی قیادت وہی بچھو جیسا نظر آنے والا خنجر باز کر رہا تھا جو مجھ سے تربیت لیتا رہا تھا۔ اس پل وہ قطعی بدلی ہوئی شخصیت لگ رہا تھا۔ زرد آنکھوں میں بڑی خوفناک چمک تھی اور حرکات و سکنات میں غیر معمولی پھرتی۔ وہ میرے سامنے رکا اور آنکھ مارتے ہوئے طنزیہ انداز میں بولا۔

”کیا حال ہے سر؟“

”پہلے سے کچھ بہتر ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

اس نے نظریں نہیں چرائیں۔ ”تمہارا شاگرد صولت، تم لوگوں کے لیے دل میں بڑی آگ لیے پھر رہا ہے۔ ذرا بچ کے رہنا۔“

کسی کی موجودگی محسوس کر کے ثوبا کی بدکلامی آخری حدوں کو چھونے لگی۔ میں جانتا تھا، یہ بھی اس کی ایک نفسیاتی چال تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی بدکلامی کا مزہ چکھانے کے

لیے اسے کوٹھری سے نکالا جائے تو وہ اپنا کام دکھا سکے۔

میں نے کہا۔ ”لگتا ہے اسے بھی اپنے چاچا زاد کے پاس جانے کی جلدی ہے۔“

اس کے جبڑے بھنچ گئے۔

میں نے سلاخوں کے قریب ہوتے ہوئے خیال آرائی کی۔ ”تم سب سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہی آرمی میں بھرتی ہوئے تھے نا؟“

وہ ہنسا۔ ”بڑی چیز ہو تم۔“ اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ ثوبا کی کوٹھری کی طرف بڑھ گیا۔

اس کے بعد ثوبا اور ان لوگوں کے درمیان جیسے گالیوں کا مقابلہ شروع ہو گیا۔ ہم لوگ اس مقابلے سے خاصے محظوظ ہوئے۔ دونوں پارٹیوں نے ایک دوسرے کو سنگین نتائج کی دھمکیاں دیں مگر ثوبا کی اصل خواہش پوری نہیں ہو سکی۔ اسے کوٹھری سے باہر نہیں نکالا گیا۔

مگر مچھ نما خنجر باز کانوں سے دھواں نکالتے ہوئے واپس جانے لگا تو میں نے اس سے رسالت کے لیے طبی امداد کے لیے کہا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا مگر تھوڑی دیر بعد نہ صرف میڈیکل بکس مہیا کر دیا بلکہ ہم سمیت سبھی کو ناشتا بھی مہیا کر دیا گیا۔ ثوبا کی زبان خاموش تھی۔

کرنل محمود کو مہارت تھی، انہوں نے رسالت کو طبی امداد دی۔ میڈیکل بکس میں انجکشن بھی موجود تھے۔ انہوں نے یکے بعد دیگرے رسالت کو دو انجکشن لگائے اور ساتھ ہی ٹانکے لگانے میں استعمال ہونے والی نوک دار چمٹی بھی پار کر لی۔ میڈیکل بکس ہم سے واپس لے لیا گیا۔

ہماری دو دو گھنٹے کی ڈیوٹی دوبارہ شروع ہو چکی تھی۔ اس دفعہ کرنل بھی ہمارے ساتھ شامل تھے۔ پتھریلے بلاک کو چمٹی سے کھوکھلا کرنے کا عمل تیزی سے شروع ہو گیا۔ ہمیں تین دن سے زیادہ اس قید خانے میں ہو گئے تھے۔ نہ جانے مگر مچھ نے کیا منتر پھونکا تھا کہ ثوبا کی زبان کو مستقل چپ لگ گئی تھی۔

ہم دوپہر کے بے مزہ کھانے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ قید خانے کا دروازہ کھلا۔ مجھے صولت کی شکل نظر آئی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھوں میں بجلیاں سی کوندنے لگیں۔ اس کے ساتھ چار دیگر افراد بھی تھے۔ ان میں سے ایک کے پاس جدید ویڈیو کیمرا دیکھ کر میں چونک گیا۔

کیمرے والا ہماری کوٹھری کے ساتھ ہی ایک راہداری میں مڑ کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ صولت ہماری طرف آیا۔ ”قدیم کو گولی کس نے ماری تھی؟“ اس کے لہجے میں جو کچھ تھا، وہ کسی بھی کمزور اعصاب کے شخص کے اوسان خطا کر سکتا تھا۔

”میں نے۔“ کرنل کے بولنے سے پہلے میں بول پڑا۔

اس نے جبڑے بھینچتے ہوئے اپنے لباس سے ایک پرچہ نکال کر سلاخوں سے اندر پھینکتے ہوئے کہا۔ ”یہ دیکھ لو، کیمرے کے سامنے تمہیں یہ الفاظ دہرانے ہیں۔“

میں نے پرچہ کھولا۔ میرے ساتھی میرے عقب میں سمٹ آئے۔ پرچے پر انگریزی میں لکھا ہماری طرف سے اپنی حکومت کے لیے پیغام تھا۔ ہماری رہائی کے بدلے پندرہ ملین ڈالرز کی خطیر رقم کا مطالبہ!

میں نے پرچہ تہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس سے پہلے میں تمہارے لیڈر سے بات کرنا چاہوں گا۔“

اس کے چہرے سے اندازہ ہوا کہ اس کی برداشت آخری حدوں کو چھو رہی ہے۔ وہ بمشکل خود کو کنٹرول میں رکھتے ہوئے بولا۔ ”مجھے لیڈر شپ کی طرف سے مکمل اختیار دیا گیا ہے۔ فی الحال مجھے ہی لیڈر سمجھو اور جو کہنا ہے کہو۔“

”میں کیمرے کے سامنے نہیں آؤں گا۔“

اس کے کھردرے چہرے پر بڑی سفاک چمک ابھری۔ ”مجھے خوشی ہو گی اگر تم اپنے ارادے پر قائم رہے۔ اس صورت میں میں تمہارے گلے میں رسی ڈال کر اس قید خانے میں گھسیٹوں گا اور پھر تمہیں پیروں کی طرف سے کاٹنا شروع کر دوں گا۔“ اس کا لہجہ درشت ہوتا چلا گیا۔ ”یہ سارا منظر فلمایا جائے گا جو تمہارے گھر والوں کے لیے بھی یادگار ہو گا اور مجھے یقین ہے کہ یہ سب دیکھنے کے بعد تمہارے باقی ماندہ ساتھی کیمرے کا سامنا کرنے سے انکار نہیں کریں گے۔“

میں نے ایک زمانہ دیکھا تھا۔ مجھے لہجوں کی بخوبی پہچان تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ جو کہہ رہا ہے، اس پر من و عن عمل کرے گا۔

انکار کا مقصد اس کی لیڈر شپ کے متعلق جاننے کی ایک کوشش تھی جو ناکام ثابت ہوئی تھی۔ مزاحمت کا ابھی وقت نہیں آیا تھا۔ سو میں نے ہتھیار ڈال دیے۔

صولت کے چہرے پر مایوسی کا عنصر نمایاں ہوا۔ ”تم مجھے خوش ہوتا نہیں دیکھ سکتے۔“

میں نے کہا۔ ”بے فکر رہو۔ میں تمہیں خوش کر کے ہی افغانستان سے جاؤں گا۔“

اس کے چہرے کے تاثرات بگڑ گئے۔ میرا اندازہ

تھا کہ اس کی لیڈر شپ کی جانب سے یرغمالیوں سے غیر ضروری مار پیٹ نہ کرنے کے احکامات تھے ورنہ وہ میری ہڈیاں تک چبانے کی شدید خواہش رکھتا تھا۔ فی الوقت وہ دانت پیس سکتا تھا اور پیس رہا تھا۔

کوٹھری کے اندر ہی باری باری ہمارے بازو عقب میں کف لاک کیے گئے۔ اس کے بعد ہمیں کوٹھری سے باہر نکال کر عقبی راہداری کی طرف لایا گیا۔

میں نے محسوس کیا کہ عقب میں ہاتھ بندھے ہونے کے باوجود صولت اور اس کے حواری میری طرف سے خاصے محتاط تھے۔

راہداری آگے جا کر ایک ہال کی صورت میں اختتام پذیر ہو گئی تھی۔ سیلن کے سبب دیواروں سے تعمیراتی میٹریل اکھڑ اکھڑ کر دیواروں کی جڑوں میں گرا ہوا تھا۔ ہمارے لیے یہ خوش آئند بات تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ ہم جو پتھریلا بلاک نکال کر راستہ بنانے کی کوشش کر رہے تھے، وہ اسی راہداری میں کھلتا تھا۔

ہال کو اسٹور روم کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ وہاں پیاز، چاول اور گندم کی بوریاں نظر آ رہی تھیں جنہیں غالباً چوہوں یا ٹڈیوں وغیرہ نے کتر دیا تھا۔ فرش پر گندم اور چاول کے دانے بکھرے ہوئے تھے اور پیاز کی بو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔

بوریوں کے سامنے سفید چادر لگا کر اسٹیج تیار کیا گیا تھا۔ وہیں ہم نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر پیغام ریکارڈ کروایا۔

ہمیں واپس کوٹھری میں دھکیل دیا گیا۔ ہمارے بعد بھارتیوں کی باری آئی۔ ہماری کوٹھری کے سامنے سے گزرتے ہوئے ثوبا نے مجھ پر نظر ڈالی اور طنزیہ انداز میں کہا۔ ”سورما صاحب! آپ تو بڑی کنگ کمانڈو قسم کی چیز ہیں... اس قید خانے میں بھی اپنا ہنر دکھاؤ نا جی!“

میں نے کہا۔ ”تم بھی خود کو ”ساٹھ مار خان“ سمجھتے ہو۔ تمہیں گدھے کی طرح نہ صرف پیٹا گیا ہے بلکہ اب کھینچے بھی پھرتے ہیں۔ تم کیوں نہیں کچھ کرتے؟“ یہ کہتے ہوئے میں نے شیلا پر نظر ڈالی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور چہرے پر پژمردگی چھائی ہوئی تھی۔

ثوبا اچانک ہی سلاخوں کے قریب آ گیا۔ وہ اسی لہجے میں پنجابی میں بولا۔ ”اپنا مسئلہ بعد میں دیکھتے رہیں گے۔ یہاں سے نکلنے کے لیے مشترکہ جدوجہد کرنا ہو گی۔“

اسے واپس کھینچ لیا گیا۔ میری اور ثوبا کی چپقلش سے سبھی واقف تھے۔ کسی کو اندازہ نہیں ہو سکا کہ ثوبا نے مجھ سے کیا کہا ہے۔

ثوبا وغیرہ کو راہداری کی طرف لے جایا گیا تو ہم پانچوں نے ثوبا کی تجویز پر باہم مشورہ کیا۔ بات تو اس نے ٹھیک کی تھی۔ مشترکہ جدوجہد میں کوئی عار بھی نہیں تھی اور کامیابی کی امید بھی زیادہ تھی۔

واپسی پر ثوبا کی تو جیسے جون ہی بدلی ہوئی تھی۔ چہرے پر کامیابی کی چمک اور اعتماد میں جیسے اچانک ہی کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔

ہماری کوٹھری کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کے چہرے پر بڑی کمینی مسکراہٹ ابھری، وہ بولا۔ ”میں نے جو کہا تھا اسے بھول جاؤ۔ میری کسی اور سے بات ہو گئی ہے۔“

”عورتوں کے دلال سے اور امید ہی کیا ہے۔“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”تمہاری پیشکش پر میں پہلے ہی لعنت بھیج چکا ہوں۔“

اس کا سانولا چہرہ سیاہ ہو گیا۔ مزید کچھ بھونکنے سے پہلے صولت نے عقب سے اسے دھکا دیا اور اس کا منحوس تھوبڑا منظر سے غائب ہو گیا۔

کرنل محمود نے خیال آرائی کی۔ ”لگتا ہے یہ اغوا کاروں سے کوئی ڈیل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”اس شخص سے کچھ بھی بعید نہیں۔ مکاری اور عیاری میں اس کا شاید ہی کوئی ثانی ہو۔“

سب سے آخر میں کرنل پنج شیری کو باہر نکالا گیا۔ وہ زخمی تھا۔ اس کی دائیں ٹانگ خون سے بھیگی ہوئی تھی اور سرخ چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ دو اغوا کاروں نے اسے سہارا دیا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد کرنل کو بھی واپس اس کی کوٹھری میں پہنچا دیا گیا۔

قید خانے کا دروازہ دوبارہ بند ہو گیا۔ ابھی ایک گھنٹا بھی نہیں گزرا تھا کہ دروازہ پھر سے کھل گیا اور بھارتیوں کو ان کی کوٹھری سے باہر نکال لیا گیا۔ اس دفعہ انہیں الٹی ہتھکڑی بھی نہیں لگائی گئی تھی۔

ثوبا اکیلا ہی ہماری کوٹھری کے سامنے آ گیا۔ اس کے چہرے کی درندگی آمیز چمک پہلے سے سوا تھی۔ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اس نے کہا۔ ”وقت وہیں سے شروع ہو گیا ہے جہاں سے تو بھاگا تھا... راجستھان کے محل کا قید خانہ نہ سہی افغانستان کا ہی سہی اور یہاں تیری مدد کرنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔“

میں نے سلاخیں تھام کر جھکتے ہوئے کہا۔ ”میں اب

بھی بھاگ جاؤں گا ثوبے! فرق صرف اتنا ہو گا کہ اپنے دوست کی باقیات اور تیرا سر لے کر۔ رہی بات مدد کی تو راجستھان میں بھی میرا کوئی مددگار باقی نہیں بچا تھا۔"

"کوئی تھا۔" وہ زور دے کر بولا۔ "جس نے تیرے فرار کے سمے تہ خانے کا دروازہ باہر سے کھول دیا تھا۔ تُو ساری زندگی ٹکریں مارتا پھر بھی وہ دروازہ نہیں کھول سکتا تھا۔"

اچانک میرا وجود آندھیوں کی زد میں آگیا۔ یہ آندھیاں نفرت، بیگانگی اور شدید غلط فہمی کی ان دیواروں کو گرانے لگیں جو میں نے شیلا کے لیے اپنے دل کے گرد کھڑی کرلی تھیں۔

ثوبا کہہ رہا تھا۔ "میرا پہلا شک شیلا کی طرف گیا تھا مگر تیرے فرار کے سمے اس کے کہیں اور موجودگی کے شواہد تھے۔ ہم اب بھی تیرے اس مددگار کی کھوج میں ہیں۔ خیر، اب تُو خود ہی بتائے گا کہ وہ کون ہے۔" اس کے انداز سے سنگین عزائم کا صاف اظہار ہو رہا تھا۔ میں نے خود کو سنبھالا۔ دل پورے یقین سے گواہی دے رہا تھا کہ راجستھان میں میری مدد کرنے والا شیلا کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔

میری بے قرار نظروں نے اسے کھوجا۔ میرے سامنے سر جھکائے، پژمردہ چہرے کے ساتھ وہ گزر کر قید خانے سے باہر نکل گئی۔

ثوبا نے طنز بھرے انداز میں کہا۔ "لگتا ہے اپنا انجام سامنے دیکھ کر تیری بدھی چکرا گئی ہے۔"

میں نے اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "ثوبے! تجھے میرا چیلنج تو یاد ہی ہے یا اغوا کاروں کی رائفلوں کے کندے کھا کھا کر بھول گیا ہے؟"

اس دوران میں ثوبا کے اشارے پر اس کے تمام ساتھی اور صولت وغیرہ تہ خانے سے باہر چلے گئے تھے۔ نہ جانے کم بخت نے اغوا کاروں پر کیا منتر پھونکا تھا۔

ثوبا نے اپنے مخصوص حقارت آمیز انداز میں ہاتھ ہلایا جیسے چہرے پر بیٹھی مکھی اڑائی ہو۔ "اچھی طرح سے یاد ہے اور تیرے دماغ میں کنگ کمانڈو ہونے کا جو خناس بھرا ہوا ہے نا، یہ اچھی طرح سے جھاڑنے کے بعد ہی تیری گردن کاٹوں گا۔"

اس کے ساتھ ہی وہ تیز تیز چلتا ہوا قید خانے سے باہر نکل گیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی صولت اور دو دیگر اغوا کار اندر آگئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں میڈیکل بکس تھا۔

ثوبا کے جاتے ہی میں سر تھام کر بیٹھ گیا۔ شیلا کی ایک بات یاد آنے لگی۔ اس کا شدید سردی اور برستی بارش میں بری طرح سے بھیگ کر آنا اور خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے فوراً وہاں سے چلے جانے کی درخواست کرنا... اس کے ملتجیانہ انداز کو یاد کر کے میرا دل جیسے کٹنے لگا تھا۔ نہ جانے وہ خطرہ کیا تھا؟ یہ تو مختلف قسم کا خطرہ تھا جو دونوں پارٹیوں کو لپیٹ لایا تھا۔ میرے ساتھی میری کیفیت سے بے خبر تھے۔ نہیں... رسالت کو خبر تھی۔ اس نے چپکے سے میرا ہاتھ دبا کر جیسے بہ زبانِ خاموشی کہا۔ "میں نہ کہتا تھا سرا وہ ایسی نہیں لگتی۔ وہ کل بھی آپ کے عشق میں غرق تھی اور آج بھی ہے۔"

ہمیں سلاخوں والے دروازے سے دور ہٹا کر کرنل پنج شیری کو بھی ہماری کوٹھری میں دھکیل کر ہمیں اسے طبی امداد دینے کے لیے کہا گیا۔

کرنل محمود، فواد کی مدد سے اسے طبی امداد دینے میں لگ گئے۔ طبی امداد کے بعد نہ صرف کرنل پنج شیری کی حالت میں بہتری آئی بلکہ اس کے چہرے پر چھائی ہمارے لیے خشونت بھی خاصی کم ہوگئی۔ اس کی ٹانگ میں گولی لگی تھی جو پنڈلی کا گوشت پھاڑتے ہوئے نکل گئی تھی۔ اس کے زخم کو انفیکشن سے بچانے کے لیے کرنل محمود نے ایک انجکشن لگانے کے بعد کہا۔

"کرنل! آپ بہتر اندازہ لگا سکتے ہیں... اغوا کار کون ہیں؟ انہیں سینٹر میں بھی بھرپور اندرونی امداد ملی تھی... یہ کوئی اندرونی معاملہ تو نہیں ہے؟"

کرنل پنج شیری نے گہرا اور افسردہ سا سانس لیا۔ "یہ ایک بے حد لالچی اور حریص شخص کا کارنامہ ہے۔ ایسے ہی کسی موقع کے لیے وہ منحوس ہماری صفوں میں آگیا تھا۔"

"کون ہے وہ؟"

کرنل پنج شیری کو چپ سی لگ گئی۔ اس کا سر جھک گیا۔ وہ آہستہ سے بولا۔ "فی الحال اس کے بارے میں نہیں بتا سکتا۔ یقینی طور پر مجھے تو زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔ وہ پردے میں رہا تو تم لوگوں کے زندہ بچنے کی امید ہے۔ آشکار ہوگیا تو تمہارا بچنا بھی محال ہے۔ اس نے بڑی عیاری سے گیم کھیلا ہے۔"

کرنل محمود نے کہا۔ "لگتا ہے بھارتیوں کی اس سے کوئی بات بن گئی ہے۔"

کرنل پنج شیری کے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ ابھری۔ "جن لوگوں کا کوئی دین، ایمان اور اصول نہ ہو اور جن کی عورتیں ہراول دستے کے طور پر کام کر رہی ہوں، ان کی ہر جگہ بات بن ہی جاتی ہے۔"

میں خود کو بولنے سے نہ روک سکا۔ "آپ بھی تو آج سے پہلے انہی بے دین و بے ایمان بندوں بلکہ بندیوں کا دم بھرتے نظر آئے ہیں۔"

کرنل پنج شیری نے آنکھیں موند لیں۔ چہرے پر زردی اور نقاہت کے ساتھ وہ پہلے والے کرنل سے قطعی مختلف نظر آرہا تھا۔ وہ بولا۔ "بعض اوقات جو نظر آتا ہے، ویسا نہیں ہوتا۔ بھارتی اپنی عورتوں کے ذریعے مجھے قابو کرنے میں لگے تھے... درحقیقت میں ان پر اور ڈالروں کے بھوکے کتے پر نظر رکھ رہا تھا۔"

رسالت نے ہونٹ سکیڑ کر سیٹی بجائی۔

کرنل پنج شیری نے مزید کہا۔ "بھارتی کبھی بھی ہمارے لیے قابلِ اعتماد نہیں رہے۔"

میرے قریب بیٹھا گل نواز بڑبڑایا۔ "اسی لیے وہ افغانستان میں دندناتے پھر رہے ہیں۔" یہ بڑبڑاہٹ کرنل پنج شیری کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی۔

میرا ذہن شیلا سے ہٹ کر تیزی سے رواں ہوگیا۔ کرنل کا اشارہ کس کی طرف تھا۔ میرے تصور کے پردے پر جنرل خاتخیلی سمیت سینٹر کے تمام آفیسرز باری باری ابھرے مگر میں حتمی طور پر کسی پر نہ ٹک سکا۔

کرنل پنج شیری نے غنودگی کے زیرِ اثر آنکھیں موند لی تھیں۔

اگلے دن ناشتے کے فوراً بعد مگر مچھ جس کا نام غالباً شیر گل تھا، دو مسلح حواریوں کے ساتھ آدھمکا۔

"چلو، تمہاری پیشی ہے۔" اس کے دبلے پتلے چہرے پر خاص قسم کی چمک تھی۔

"کس کے پاس؟"

"خود ہی دیکھ لو گے ابھی۔"

کوٹھری کے اندر ہی مجھے الٹی ہتھکڑی لگائی گئی۔

کرنل نے متفکر انداز میں کہا۔ "اپنا خیال رکھنا عامر اور جذبات کو بھی کنٹرول میں رکھنا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

کرنل پنج شیری نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "خدا تمہارا حامی و ناصر ہو۔ ہڈی پھینک کر دیکھ لینا شاید کام بن جائے۔" ایک ہی رات میں وہ ہمارے خاصا قریب آگیا تھا۔

تینوں بے حد محتاط انداز میں مجھے تہ خانے سے باہر لائے۔ میری گردوپیش پر گہری نظر تھی اور میرے ذہن میں کرنل پنج شیری کا آخری فقرہ گونج رہا تھا۔

قید خانے کے باہر ایک رائفل بردار کھڑا ہوا تھا۔ قریب ہی اس کے بیٹھنے کے لیے لکڑی کا اسٹول پڑا ہوا تھا۔ تنگ ڈھلوانی چکر دار راستہ اوپر کی طرف جا رہا تھا۔ اس سرنگ نما راستے میں بلب روشن تھا۔

ایک چکر کاٹتے ہی اس راستے کا روشن دہانہ نظر آنے لگا تھا۔ ہم باہر نکلے تو دن کی روشنی میں میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ ہم ایک بلند قدیم چبوترے پر کھڑے تھے اور میرے سامنے ایک پرانے قلعے کے اندرونی مناظر بکھرے ہوئے تھے۔ میرے دائیں طرف قلعے کی خاصی بلند ڈیوڑھی تھی۔ داخلی دروازہ اسی ڈیوڑھی کے اندر تھا۔ ڈیوڑھی کے اوپر غالباً بعد میں دو منزلہ عمارت تعمیر کی گئی تھی۔ اس عمارت کے اوپر واچ ٹاور تھا جس سے دور دور تک نظر رکھی جاسکتی تھی۔

ڈیوڑھی سے منسلک ایک پتھریلا راستہ تھا جس کا اختتام ایک طویل برآمدے میں ہوتا تھا۔ اس برآمدے میں کبھی گھوڑے باندھے جاتے ہوں گے۔ اس وقت وہاں درجن بھر سے زائد جیپیں اور فوجی ٹرک نظر آرہے تھے۔

یہ سب کچھ بڑی تیزی سے میرے ذہن میں محفوظ ہو رہا تھا اور ساتھ ہی وہاں سے فرار کا ایک منصوبہ بھی تشکیل پا رہا تھا۔

دو راہداریوں اور ایک وسیع مربع شکل کے پتھریلے دالان سے گزر کر مجھے ایک وسیع ہال میں لایا گیا۔ کتنے وقتوں میں یقیناً اس ہال میں کوئی کج کلاہ اپنا دربار لگاتا ہوگا۔ یہ دربار اس وقت بھی لگا ہوا تھا۔ رنگین پایوں والی ایک اونچی کرسی پر گہرے رنگ کے قیمتی لبادے میں ایک وار لارڈ موجود تھا جس کے گلے میں سچے موتیوں کی مالا اور چغے کی آستینوں اور گلے پر سنہری مینا کاری نظر آرہی تھی۔ اس کے چہرے پر معصومیت آمیز سادگی تھی اور سفید دانت مسکراہٹ کے ساتھ اپنی جھلک دکھا رہے تھے۔

کرنل پنج شیری کی بات سن کر ذہن میں جو مبہم سی تصویر بنی تھی، وہ اب بے حد واضح ہو کر جنرل خاتخیلی کے روپ میں سامنے تھی۔

کانتا کا لباس بدل چکا تھا۔ کسی ملکہ کے سے حلیے میں وہ نام نہاد جنرل کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ دوسرے پہلو میں ثوبا مؤدبانہ انداز میں چہرے پر کمینی سی مسکراہٹ لیے بیٹھا تھا۔ شیلا کے علاوہ بھی بھارتی وہاں موجود تھے۔ مخصوص لباسوں والے دیگر کئی مقامی بھی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

خاشخیلی دلچسپی سے مجھے دیکھ رہا تھا، وہ بولا۔ ”تمہیں یہاں دیکھ کر تمہیں حیرت تو ضرور ہوئی ہوگی میجر؟“

”نہیں جناب۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے آپ جیسی کسی شخصیت کو ہی یہاں دیکھنے کی امید تھی۔“

میرے لہجے میں طنز ڈھونڈتے ہوئے اس کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ ”ہم سے شاید تمہاری ملاقات بھی نہ ہو پاتی۔ ہم تاوان لے کر تم لوگوں کو آزاد کر دیتے مگر کسی نے تاوان کی رقم سے زیادہ ادائیگی کر کے تم لوگوں کو خرید لیا ہے۔ اس نے تم لوگوں کو کاٹ دینا ہے۔ اس لیے ہماری ملاقات ہوگئی ہے۔“

میری نظر ٹوبا پر پڑی، اس کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی تھی۔

میں نے کرنل پنچ شیری کے الفاظ میں ہڈی ڈالتے ہوئے کہا۔ ”میرے پاس آپ کے لیے اس سے بہتر آفر ہے۔ میں ڈبل کی پیشکش کرتا ہوں۔“

ٹوبا کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

خاشخیلی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ہم زبان کے دھنی ہیں۔ جو طے ہو چکا، ہو چکا۔ تمہاری آفر پہلے آجاتی تو ٹوبا کی جگہ تم بیٹھے ہوتے۔“

ٹوبا نے ہاتھ باندھ کر اور سر جھکا کر اس کا شکریہ ادا کیا۔

”تو پھر مجھے ملاقات کا شرف بخشنے کی وجہ؟“

خاشخیلی چند لمحے مجھے گھورتا رہا۔ ”یہ ٹوبا کی خواہش پر ہوا ہے۔ تم نے اسے لڑائی کا چیلنج دے رکھا ہے نا؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

”یہ چیلنج ہمارے لیے بھی دلچسپی کا سامان لیے ہوئے ہے۔ ہم ریچھوں اور کتوں کو تو لڑاتے رہے ہیں، اس دفعہ انسان سہی۔“

میرے سینے میں جوش کی بلند لہر اٹھی۔ ٹوبا سے دو دو ہاتھ کرنے کی دیرینہ خواہش کہاں آکر پوری ہو رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ”میں اس کے لیے ابھی تیار ہوں۔“

خاشخیلی نے پسندیدگی کے اظہار کے طور پر سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں پوری طرح سے لطف اندوز تو ہونے دو۔ ہمارے ساتھیوں میں بھی تم دونوں کی لڑائی کے بارے میں بڑا جوش و خروش پایا جاتا ہے۔ تم دونوں کے ہاتھ وہ دیکھ چکے ہیں۔ شرطیں لگ رہی ہیں تم دونوں پر... یہ لڑائی کل دوپہر دو بجے ہوگی۔“

میں نے ٹوبا کی طرف دیکھا۔ اس نے گردن پر چھری پھیرنے کا اشارہ کیا۔

میں نے خاشخیلی سے کہا۔ ”میرا ارادہ اسے ذبح کرنے کا ہے۔ یہ لڑائی میں کسی اصول اور ضابطے میں رہ کر نہیں لڑوں گا۔“

”بالکل... بالکل۔“ خاشخیلی نے بھرپور جوش کا اظہار کیا۔ ”یہ ایک دفعہ شروع ہونے کے بعد کسی ایک کی موت تک چلے گی۔ تم فاتح رہے تو مفتوح کی گردن کاٹنے کا تمہیں حق حاصل ہوگا۔ بے شک بعد میں تمہیں ٹوبا کے ساتھیوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔“

اس موقع پر ٹوبا خود کو بولنے سے روک نہیں سکا۔ ”تیرے دماغ کے کیڑے جھاڑنے کے بعد پہلے تیرے ساتھیوں کی گردنیں تیرے سامنے کاٹوں گا پھر بعد میں تیری گردن کاٹ کر تیری باقیات سجا دوں گا۔“ اس کی آنکھوں سے قہر برسنے لگا تھا۔

میرے خون نے بھی زور مارا۔ ”یہ تجھے کل پتا چل جائے گا، کون کس کی باقیات کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔“

میں نے محسوس کیا کہ ہمارے ایک دوسرے پر جارحانہ زبانی حملے خاشخیلی اور اس کے حواریوں کے خون کو گرما رہے تھے۔ واقعی اس لڑائی میں ان کی بے پناہ دلچسپی تھی۔

مجھے واپس بھیج دیا گیا۔ واپسی پر میری نظریں شیلا کو ڈھونڈتی رہیں۔ نگاہوں کی زبان میں میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ مجھے یقین آگیا ہے کہ راجستھان میں اس نے جو کچھ بھی کیا تھا، مجبوری کے عالم میں کیا تھا۔

ٹوٹے تعلق کو دوبارہ جوڑنے کا اشارہ دینا چاہتا تھا میں... وہ نظر تو آئی مگر فاصلہ اتنا تھا کہ میری نگاہوں کا پیغام اس تک پہنچ نہیں پایا۔

شیلا قلعے کی ڈیوڑھی کے اوپر واچ ٹاور میں تھی۔ آنکھوں پر دوربین لگائے وہ اردگرد کے نظارے میں محو تھی۔ مگر مجھے بھی واچ ٹاور میں تھا۔ وہ بھی نظارے میں محو تھا... شیلا کے شاداب جسم کے۔

میرے دل میں درد کی لہر سی اٹھی اور میں واپس اپنی کوٹھری میں آگیا۔

میں نے ساتھیوں کو ساری صورتِ حال بتائی تو وہ فکرمند ہو گئے۔ کرنل پنچ شیری بولا۔

”جنرل نے بڑی عیارانہ منصوبہ بندی کی ہے۔ بظاہر وہ بھی اپنے چند خاص لوگوں کے ساتھ اغوا ہو کر یہاں پہنچا ہے۔ بھارتی ڈالرز سے اس کا منہ بھر چکے ہیں۔ وہ اپنا اور اپنے ساتھیوں کا تاوان افغان حکومت سے وصول کر کے بازیاب ہو جائے گا اور دوبارہ سے اپنا عہدہ سنبھال لے گا۔

میں بخوبی واقف ہوں اس درندے سے۔ کام مکمل ہوتے ہی وہ بھارتیوں کو بھی نہیں چھوڑے گا۔ انہیں شریکِ راز کرنے کا رسک وہ کبھی نہیں لے گا۔"

میں نے کہا۔ "اور میں بھارتیوں سے بخوبی واقف ہوں۔ ٹوبا جس ناگ کا نام ہے، وہ موقع ملتے ہی اسے ڈسنے سے باز نہیں آئے گا۔"

"خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔" کرنل پنج شیری نے صدقِ دل سے کہا۔ "خدا کرے وہ آپس میں بھڑ جائیں۔"

اس موقع پر کرنل محمود کچھ سوچتے ہوئے بولے۔ "خاشخیلی نے اتنا بڑا سیٹ اپ کیسے بنا لیا؟ اپنے جنگجوؤں سمیت اس نے تو آرمی میں شمولیت اختیار کی تھی؟"

کرنل پنج شیری نے کہا۔ "اس پر نظر رکھنے کے لیے میری بطورِ خاص تعیناتی کی وجہ بھی یہی تھی۔ انٹیلی جنس رپورٹ تھی کہ اس نے صرف نصف جنگجوؤں کے ساتھ آرمی جوائن کی تھی۔ اس کا بقیہ نیٹ ورک پرانی روش پر قائم تھا۔"

"تو پھر واپسی پر تو وہ خاصا مشکوک ٹھہرے گا۔ یقیناً انکوائری کی زد میں آئے گا؟"

کرنل پنج شیری نے مایوسی سے کہا۔ "اس کے عیار ذہن میں ضرور اس مسئلے کا کوئی حل پہلے سے موجود ہوگا۔" یہ کہہ کر اس نے لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔

پتھریلے بلاک کو کھوکھلا کرنے کا کام کرنل پنج شیری سے چھپا نہیں رہ سکا تھا۔ پتھریلا بلاک ابھی تک ٹس سے مس نہیں ہوا تھا۔

میں نے اپنا منصوبہ سب کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "کوٹھری سے نکل کر باہر موجود پہرے دار کو قابو کرنے کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اس کی رائفل بھی ہمیں حاصل ہو جائے گی۔ قید خانے سے نکل کر وہ جگہ قریب ہی ہے جہاں گاڑیاں وغیرہ کھڑی کی جاتی ہیں۔ ایک بندہ گاڑی اڑا لائے گا، باقی قلعے کی ڈیوڑھی پر دھاوا بول دیں گے۔ اس کے بعد وہاں سے نکلنا آسان ہے۔"

"مگر وہ کم بخت پتھر اپنی جگہ سے ہلے تب ہی کچھ کر سکیں گے نا۔" رسالت نے جھنجلا کر کہا۔ اس کے بعد ہم لوگ نئی ہمت و طاقت سے پتھریلے بلاک پر ٹوٹ پڑے۔

وقت تیزی سے گزرتا رہا مگر ہم اس مضبوط پتھر کو شکست دینے میں ناکام رہے۔

☆☆☆

منظر قلعے کے وسیع پتھریلے دالان کا تھا جس کے وسط میں نرم مٹی کی دبیز تہ بچھا کر اس کے گرد مضبوط رسی لگا کر اکھاڑے کی شکل دی گئی تھی۔ اس اکھاڑے کے گرد خاشخیلی کے جنگجو ترتیب سے لگی پلاسٹک کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

دالان کی بلندی پر ایک چبوترا تھا جس پر رنگین پایوں والی دو کرسیوں پر خاشخیلی اور کانتا شاہانہ تمکنت کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ کانتا مکمل طور پر خاشخیلی کے تصرف میں آچکی تھی۔ اسے اپنی ملکہ کا سا درجہ دینے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ خاشخیلی، اس پر ہزار جان سے فدا ہے۔ خاشخیلی اور کانتا کے عقب میں مگرمچھ اور ایک پھرتیلا سا نظر آنے والا نوجوان چھوٹی نال کی رائفلیں تھامے بے حد چوکس کھڑے تھے۔

شاہی چبوترے سے تھوڑا نیچے بھارتی بیٹھے ہوئے تھے۔ آج شیلا بھی نظر آرہی تھی۔ آنے والے سنگین لمحوں کو محسوس کر کے ابھی سے اس کے چہرے پر زردی کھنڈی نظر آرہی تھی۔ مجھے، میرے ساتھیوں اور کرنل پنج شیری کو ہتھکڑیوں اور زنجیروں میں جکڑ کر وہاں لایا گیا تھا۔ میں جلد سے جلد اپنا "پیغام" شیلا تک پہنچانا چاہتا تھا، سو میں نے اپنی نظریں اس پر جما دیں۔

جلد ہی اسے میری نگاہوں کی تپش محسوس ہوئی۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ یہ ایک یادگار لمحہ تھا۔ میری نگاہوں میں جو کچھ تھا، اس نے شیلا کو چونکا دیا۔ اگلے ہی لمحے اس کے چہرے کا رنگ بدلا اور ٹوٹے ہوئے سلسلے دوبارہ سے جڑنے لگے۔

ٹوبا بھی وہیں موجود تھا۔ وہ بے حد کائیاں شخص تھا۔ اسی وجہ سے شیلا نے دوبارہ میری طرف دیکھنے سے گریز کیا البتہ ہمارے دل ایک ہی لے پر دھڑکنے لگے تھے اور اس کی محبت میرے وجود میں اَن دیکھی طاقت بن کر دوڑنے لگی تھی۔

اچانک ہی تماشائیوں میں جوش و خروش کی لہر اٹھی۔ تالیوں کی آواز دالان میں گونج اٹھی تھی۔ اکھاڑے میں ایک جسیم بھورے ریچھ کو لایا گیا تھا۔ جانور کے انگ انگ سے پھرتی اور طاقت کا اظہار ہوتا تھا۔ ریچھ کی ناک میں نکیل تھی اور اس کا سرا اس کے ٹرینر کے ہاتھ میں تھا۔ سرخ پینٹ اور چمکیلی واسکٹ میں ملبوس یہ ٹرینر صولت تھا۔

صولت نے نکیل کو مخصوص انداز میں حرکت دی۔ ریچھ نے پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہو کر اور اگلا پنجہ ماتھے پر لے جا کر باقاعدہ خاشخیلی کو سلام کیا۔ اس کے اس انداز کو تماشائیوں نے خاصا پسند کیا۔ ڈھیروں تالیاں بجائی گئیں۔

خاشخیلی بے حد خوش ہوا۔ اس نے اپنے چغے کی جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر ریچھ کے سامنے پھینک دی۔ ریچھ نے کمال چابکدستی سے وہ گڈی منہ میں دبائی اور صولت کے حوالے کر دی۔

صولت نے دو افراد کی مدد سے عارضی اکھاڑے کے ایک کونے میں لکڑی کا کھونٹا گاڑ دیا اور ریچھ کے گلے میں خاصی لمبی رسی سے منسلک مضبوط چمڑے کا پٹا ڈال کر اس رسی کا ایک سرا کھونٹے سے باندھ دیا اور ریچھ کی ناک سے نکیل نکال کر اکھاڑے سے باہر نکل گیا۔

ریچھ رسے کی لمبائی تک اکھاڑے میں چکرانے لگا۔

تین مسلح افراد آئے اور کرنل پنج شیری کو مشترکہ زنجیر سے نکال کر اکھاڑے کی طرف لے گئے۔ کرنل کا چہرہ اتر گیا اور لمحوں میں ہی وہ برسوں کا بیمار نظر آنے لگا۔ اسے آنے والے وقت کا شاید ادراک ہو گیا تھا۔

ہم بے بسی کے عالم میں کرنل کو جاتا دیکھتے رہے۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ اب ہم دوبارہ اسے زندہ سلامت نہیں دیکھ پائیں گے۔

خاشخیلی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ مگرمچھ نے مؤدبانہ انداز میں اس کے ہاتھ میں ایک مختصر سا مائک دے دیا۔

خاشخیلی مائک میں بولا تو اس کی آواز ہر طرف گونجنے لگی۔ "موت کو سامنے دیکھ کر کیسا لگ رہا ہے کرنل؟"

کرنل پنج شیری نے سینہ تان کر کچھ کہا۔ تماشائیوں کے شور کے سبب ہم لوگ اس کا جواب سننے سے قاصر رہے۔

خاشخیلی نے کہا۔ "تم نے ہیڈ کوارٹر کو میرے بارے میں رپورٹ بھیجی تھی کہ میں ایک بھارتی لڑکی کا کھلونا بنا ہوا ہوں۔ اس نیک کام کی کم سے کم سزا بھی موت ہے مگر ہم ایک موقع دیتے ہیں تمہیں۔" اس نے ڈرامائی وقفہ دینے کے بعد کہا۔ "اگر تم، ہمارے اس عزیز از جان ریچھ کو ہاتھ لگا کر اکھاڑے سے سلامت نکلنے میں کامیاب ہو گئے تو تمہیں جان سے مارنے کے بجائے کچھ عرصے کے لیے قید کر دیا جائے گا۔"

خاشخیلی کی اس فراخ دلی پر اس کے جنگجو حواری تماشائیوں نے تالیاں بجا کر داد دی۔

زندگی سبھی کو پیاری ہوتی ہے، خواہ وہ کسی قید خانے میں ہی گزرے۔ کرنل پنج شیری کو بھی زندگی سے پیار تھا۔ ریچھ کے جبڑوں سے زندگی چھیننے کی غرض سے وہ اپنی زخمی ٹانگ گھسیٹتا ہوا ریچھ کے مقابل آ گیا۔ اس کی الٹی ہتھکڑی کھول دی گئی تھی۔

تربیت یافتہ ریچھ۔۔۔ اسے اکھاڑے میں اترتا دیکھ کر پچھلے پنجوں پر بیٹھ گیا اور اس کی سیاہ چمکدار آنکھیں کرنل پنج شیری پر جمی ہوئی تھیں۔

کرنل نے ریچھ کے گرد چکر لگایا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ ریچھ بھی اس کے ساتھ ساتھ گھوم رہا تھا۔ کرنل نے تھوڑا قریب ہو کر اپنا ہاتھ ریچھ کی طرف بڑھایا۔ ریچھ بے حرکت رہا۔ بلاشبہ وہ ایک عیار جانور تھا جسے تربیت نے اور بھی خطرناک بنا دیا تھا۔

کرنل کا حوصلہ بڑھا۔ اس نے دھیرے سے ایک قدم اور بڑھایا اور پھر ریچھ کی طرف دوڑ پڑا۔ ریچھ کا پنجہ برق کی طرح لہرایا۔ کرنل نے اس سے زیادہ پھرتی سے جھکائی دی اور ریچھ کے شانے کو دھکا دے کر بھاگ کھڑا ہوا۔

ریچھ اس کے پیچھے لپکا۔ تماشائیوں کے شور نے آسمان گویا سر پر اٹھا لیا۔ کرنل اکھاڑے کے کنارے تک آپہنچا۔ جان کے خوف نے اس کے جسم میں بجلی بھر دی تھی۔ مجھے لگا کہ وہ ریچھ سے بچ جائے گا۔ رسے کی لمبائی کسی بھی لمحے ختم ہونے والی تھی۔

آخری لمحے پر کرنل کا زخمی پاؤں ریچھ کی جکڑ میں

آ گیا۔ ریچھ اسے کھینچ کر اکھاڑے کے وسط میں لے گیا۔ کرنل کی چیخ و پکار تماشائیوں کے بے پناہ شور میں دب گئی۔ ریچھ نے اسے مکمل طور سے ڈھانپ لیا تھا۔

آخری منظر جو میں نے دیکھا، ریچھ کرنل کی کھوپڑی چبانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کرنل کی کھوپڑی کی دائیں طرف کی کھال اتر گئی تھی۔ اس کے بعد میں نے منہ پھیر لیا۔

تماشائیوں کا جوش و خروش اور ریچھ کے حق میں نعرے بازی نقطۂ عروج کو پہنچ کر ختم ہو گئی۔ کرنل پچ شیری کی بچی ہوئی لاش اکھاڑے سے اٹھالی گئی۔ بپھرے ہوئے جانور کو بمشکل قابو کر کے اکھاڑے سے باہر لے جایا گیا۔

اکھاڑے کے دونوں کونوں پر مٹی میں تیز دھار خنجر دفن کر کے پورے اکھاڑے میں پانی کا چھڑکاؤ کر دیا گیا۔

پھر وہ لمحہ آ گیا جس کا مجھے نہ جانے کب سے انتظار تھا۔ میری ہتھکڑیاں وغیرہ کھول دی گئیں اور میں اکھاڑے میں اتر آیا۔ دوسری طرف ٹوبا بھی آنکھوں سے بجلی گراتا میرے سامنے آ گیا۔

تماشائی واضح طور پر دو حصوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک حصہ میرا حامی تھا اور دوسرا ٹوبا کا۔ ٹوبا کے ہنر پر یقین رکھنے والوں کی تعداد کچھ زیادہ تھی۔

دونوں طرف سے شرطیں لگ رہی تھیں اور قلعے کے اس حصے پر مچھلی منڈی کا گماں ہو رہا تھا۔

ٹوبا نے اپنی قمیص اتار پھینکی۔ سورج کی کرنوں میں اس کے سانولے جسم کے رگ و پٹھے نمایاں ہو رہے تھے۔

میری نظریں خود بخود شیلا کی طرف گھوم گئیں۔ اسے دیکھتے ہی مجھے پتا چل گیا کہ وہ میرے لیے سراپا دعا ہے۔

سامنے آتے ہی ٹوبا نے زہر اگلا۔ ”تیرا دو کھڑا (رقم) بھر کر میں چاہتا تو اسی وقت ذبح کر سکتا تھا مگر پہلے میں، تیرے دماغ کے کیڑے جھاڑنا چاہتا ہوں... آ...“ اس نے مجھے حملے کی دعوت دی۔

میں نے دماغ کو ٹھنڈا رکھنے کی کوشش کی۔ ٹوبا مجھ سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں تھا۔ وہ ایک عیار فائٹر تھا اور مجھے اس کے ساتھ ساتھ اس کی عیاری سے بھی لڑنا تھا۔

میں نے زبان کے بجائے ٹانگ سے جواب دیا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس کا اوپری جسم آگے کی طرف جھکا ہوا ہے اور دونوں پاؤں پر وزن برابر ہے... یہ سو فیصد دفاعی پوزیشن تھی۔ میں نے جھکائی دی اور اسی زاویے سے گھومتے ہوئے ٹانگ اس کے سینے پر ماری۔ آخری لمحے پر اس نے بچنے کی کوشش کی مگر ٹانگ اچٹتی ہوئی سہی، لگ چکی تھی۔ وہ لڑکھڑایا۔

میرے حامیوں نے زوردار تالیاں بجائیں اور میرے حق میں نعرے بازی کی۔ خانخیلی کی بھرپور توجہ اس لڑائی پر تھی۔ وہ اپنی نشست پر آگے کی طرف جھکا بیٹھا تھا۔

میں نے ٹوبا کی لڑکھڑاہٹ سے فائدہ اٹھایا اور اپنے مخصوص انداز میں اس کے گھٹنے کے پیچھے پاؤں کی ضرب لگا کر گرانے کی کوشش کی۔

یہاں ٹوبا کا ہنر نظر آیا۔ اس نے نہ صرف ہوا میں اچھل کر میرا وار ضائع کیا بلکہ اس کا ہتھوڑے جیسا وزنی ہاتھ میرے کندھے پر بھی لگا۔ اس دفعہ ٹوبا کے حمایتیوں کا شور بلند ہوا۔ ہم ایک دفعہ پھر آمنے سامنے تھے اور تولتی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ اس دفعہ حملے میں پہل ٹوبا نے کی۔ اس نے پھرکی کی طرح گھوم کر میری ٹانگوں پر ضرب لگانے کی کوشش کی۔ میں نے پیچھے ہٹ کر وار بچایا تو اس کا پاؤں میرے چہرے پر لگا۔ میں لڑکھڑا کر دو، تین قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے حمایتیوں نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔

مجھے اپنے حلق میں خون کا ذائقہ محسوس ہوا۔ ٹوبا دوبارہ مجھ پر جھپٹ چکا تھا۔ اس کی وحشت آمیز ضربیں میں نے بازوؤں اور پنڈلیوں پر بلاک کیں۔ وہ مجھے دھکیلتا ہوا رسے کے قریب لے آیا تھا۔ میں اس کے دفاع میں کوئی رخنہ ڈھونڈ رہا تھا۔ جلد ہی مجھے موقع مل گیا۔ اس نے زوردار گھونسا رسید کرنے کے لیے اپنے چہرے کے آگے سے ہاتھ ہٹایا تو میں نے جھکائی دے کر پوری قوت سے دائیں ہاتھ کا گھونسا اس کی ٹھوڑی کے نیچے رسید کیا۔

یہ شاندار اور ناک آؤٹ کر دینے والا ہاتھ تھا۔ میں نے اچھے اچھوں کو یہ ضرب کھا کر چاروں شانے چت ہوتا دیکھا تھا مگر یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ ٹوبا نے پیچھے کی جانب لڑکھڑا کر سر جھٹکا۔ اس نے تھوکا تو اس میں خون کی آمیزش تھی۔

میرے حواری خوشی سے اچھل پڑے۔ شدید شور کے باوجود میرے کانوں میں رسالت کی آواز پہنچی اور میرا سیروں خون بڑھ گیا۔ وہ چلّا رہا تھا۔

”سر جی! اس کمینے کو چھوڑنا نہیں ہے۔ اس کا سر لے کر ہی واپس آنا ہے آپ کو۔“

اگلے بیس پچیس منٹ میرے اور ٹوبا کے درمیان بڑی وحشیانہ لڑائی ہوئی۔ اکھاڑے کی رسیاں ہماری وحشت کو سہار نہیں سکی تھیں۔ ہم اکھاڑے سے تماشائیوں کے

درمیان جا پہنچے تھے۔ انہوں نے بھی کائی کی طرح چھٹ کر ہمارے لیے جگہ خالی کر دی۔

ان بیس پچیس منٹوں میں میری قمیص تار تار ہو چکی تھی۔ دائیں جانب پسلیوں میں درد کی شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ یہاں ٹوبا کے گھٹنے کی ایک زوردار ضرب لگی تھی۔ اس کے علاوہ بھی کئی چوٹیں آئی تھیں۔ ٹوبا نے ایک کرسی میرے سر پر توڑی تھی جس کی وجہ سے خون بہہ کر پیشانی تک آ گیا تھا۔ ٹوبا کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی۔ اس کی بنیان سرے سے غائب تھی۔ ناک سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ یہ ایک شاندار ٹکر کا نتیجہ تھا۔ اس کے علاوہ اس کی ایک آنکھ بھی نیلی ہو رہی تھی۔ پوائنٹس کے حساب سے ہم تقریباً برابر ہی تھے۔

میں سینے پر ٹوبا کی ایک ضرب کھا کر کرسیوں پر گرا تو ٹوبا واپس اکھاڑے کی طرف دوڑا اور وہاں پہنچ کر ہاتھوں کی مدد سے وہ جگہ کھودنے لگا جہاں ایک خنجر چھپایا گیا تھا۔

مجھے ایک ایک لمحے کے قیمتی ہونے کا احساس تھا۔ میں اٹھ کر دوڑا۔ آخری چند گز میں نے جیسے ہوا میں تیرتے ہوئے طے کیے۔ ہوا ہی میں، میں نے ٹوبا کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور اسے دور اچھال دیا۔ خنجر ابھی تک اس کے ہاتھ میں نہیں آیا تھا۔

ہم دوبارہ اکھاڑے میں پہنچ گئے۔ دونوں ہی تھکن سے چور ہو رہے تھے۔ میرا سانس پھول رہا تھا۔ ٹوبا بھی ہانپ رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کا ارتکاز کچھ نہ کچھ متاثر ضرور ہوا ہے۔ ناک پر لگنے والی زوردار ٹکر نے اسے ہلا دیا تھا۔

اس موقع پر ٹوبا نے ایک نہایت گھٹیا حرکت کی۔ نیچے گرتے ہی اس نے اپنی مٹھیوں میں مٹی بھر لی تھی۔ میں اس بات سے بے خبر تھا۔ میں اس پر جھپٹا تو اس نے نیم گیلی مٹی میرے چہرے پر پھینکی۔ کچھ میری آنکھوں میں بھی گئی۔ اگلے ہی لمحے مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ٹوبا کے دونوں جڑے ہوئے پاؤں میرے سینے پر لگے اور میں الٹ کر پشت کے بل گرنے کے بعد لڑھکنی کھا گیا۔

میں نے شدید جلن کے احساس کے ساتھ بری طرح آنکھیں مسلیں، نگاہ کچھ بہتر ہوئی۔ ٹوبا برق رفتاری سے مٹی کھود رہا تھا۔ میں نے اس پر چھلانگ لگائی مگر اس دفعہ وہ تیار تھا۔ بڑے آرام سے اس نے اپنی جگہ چھوڑی اور میں اس کے پاس سے گزرتا ہوا دور جا گرا۔

میں نے ایک دفعہ پھر آنکھیں مسلیں۔ رسالت کی چیختی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ وہ خبردار کر رہا تھا کہ ٹوبا خنجر حاصل کر چکا ہے۔

میں سیدھا ہوا تو ٹوبا خنجر سنبھالے اور آنکھوں میں قاتل چمک لیے میرے سامنے تھا۔ میرے حامیوں اور ساتھیوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ ٹوبا کے حامی بھی خاموش ہو گئے تھے۔ انہیں اپنی فتح کا انتظار تھا جو اب زیادہ دور نظر نہیں آ رہی تھی۔

ٹوبا نے خنجر میری آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ ہتھیار ملتے ہی اس کے اعتماد میں خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔

”میں نے کہا تھا نا... تیری گردن میں کاٹوں گا۔“

میں نے جواب نہیں دیا۔ میری نظر اس کے خنجر والے ہاتھ پر جمی تھی۔ فرشتۂ اجل کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ مجھے بے حد قریب سنائی دے رہی تھی۔ ٹوبا یقیناً جان لیوا وار کرنے والا تھا۔

اچانک ہی دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ ایک دفعہ شیلا کی طرف دیکھ لوں۔ شاید زندگی کا اختتام ہونے جا رہا تھا۔

میں نے بمشکل اپنی اس شدید ہوتی خواہش پر قابو پایا۔ ایمان کی طاقت مجھے مایوس ہونے سے بچا رہی تھی۔ مجھے آخری دم تک مزاحمت کرنی تھی۔

میں قدم بہ قدم پیچھے ہٹا تو ٹوبا کے اعتماد میں اور اضافہ ہو گیا۔ میری طرف بڑھتے ہوئے اس نے برق رفتاری سے خنجر کو ایک سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرنا شروع کر دیا۔ اس کے حامی جلد سے جلد میرا خون گرانے کے لیے شور کر رہے تھے۔

اچانک ہی مجھے احساس ہوا کہ ٹوبا کی حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی نے مجھے ایک موقع میسر کر دیا ہے۔ ٹوبا جب خنجر کو ایک سے دوسرے ہاتھ کی طرف اچھالتا ہے تو سیکنڈ کے دسویں حصے کے لیے خنجر اس کے کسی ہاتھ میں نہیں ہوتا۔

مجھے جو کرنا تھا، اسی سیکنڈ کے دسویں حصے میں کرنا تھا۔ فاصلے اور ٹائمنگ کا تمام تر حساب ذہن کے برق رفتار کمپیوٹر نے سیکنڈ کے دسویں حصے میں کر لیا۔ میں نے ایڑی جمائی اور برق رفتاری سے ٹانگ کو حرکت دی۔

اگلا پل ٹوبا اور دو بدو لڑائی کی تکنیک کو سمجھنے والوں کے لیے بڑی حیرت لیے ہوئے تھا۔ ٹوبا کے ہاتھ سے خنجر صاف اڑ گیا تھا اور تماشائیوں کے درمیان جا گرا تھا۔

ٹوبا کی حیرت سے میں نے فائدہ اٹھایا۔ سینے پر سر کی زوردار ٹکر نے اسے زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ میرے

حمایتی جیسے دوبارہ زندہ ہو گئے۔ انہوں نے میرے حق میں اتنے نعرے لگائے کہ میرے کان سنسنانے لگے۔

میں نے اپنے ساتھیوں کو دیکھا۔ وہ بھی پُرجوش انداز میں چیخ رہے تھے۔ رسالت کے تو گلے کی رگیں پھٹنے کے قریب ہو رہی تھیں۔

پھر میں نے اسی لمحے میں شیلا کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ چند لمحے پہلے وہ جس کرب سے گزری تھی، اس کا مجھے بخوبی اندازہ تھا۔

اب میری باری تھی۔ میں اکھاڑے کے دوسرے کونے پر جھپٹا جہاں دوسرا خنجر چھپایا گیا تھا۔ میرے ہاتھ تیزی سے چلے مگر گوہرِ مقصود ہاتھ نہ آیا۔ میری توجہ ٹوبا پر بھی تھی۔ وہ اٹھ کر مجھ پر جھپٹ رہا تھا۔ طیش کے سبب اس کا چہرہ بگڑ گیا تھا۔

میں نے اپنی طرف آتا ہوا اس کا پاؤں اپنی کلائیوں کے سہارے روکا اور ہم دوبارہ گتھم گتھا ہو گئے۔ ہم دونوں ہی تھکن اور زخموں سے چور تھے۔ کسی ایک کی موت یا سنگین ترین چوٹ ہی اس لڑائی کو روک سکتی تھی۔

پھر بالکل اچانک ہی ٹوبا کا داؤ چل گیا۔ میں نے اسے اٹھا کر پٹخنے کی کوشش کی تو میری گردن اس کے بازو کے شکنجے میں پھنس گئی۔ اژدہے کی طرح اس نے گھیرا تنگ کیا تو مجھے اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے زور لگا کر مجھے نیچے گرا دیا۔

سانس کی آمد میں رکاوٹ پیدا ہوئی تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیلنے لگا۔ ٹوبا مجھے جکڑے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا تھا اور اب زہر اگلتے ہوئے میری گردن کو جھٹکے دے رہا تھا۔ تماشائیوں کی آوازیں جیسے رفتہ رفتہ مجھ سے دور ہوتی جا رہی تھیں۔ پھر اچانک ہی تاریک ہوتے ذہن میں جگنو سا چمکا۔ ٹوبا سمیت کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ میں جس جگہ گرا ہوں، خنجر وہیں پر دفن ہے۔

میں نے اپنی قوتِ مدافعت کو نچوڑا۔ میرا ہاتھ سرعت مگر خاموشی سے خنجر کو ڈھونڈنے میں لگ گیا۔ دوسری طرف میری گردن کسی بھی وقت ٹوٹ سکتی تھی۔

پھر میرا ہاتھ خنجر کے فولادی اور ٹھنڈے لمس سے آشنا ہوا تو میرے زخمی وجود میں زندگی کی لہر سی دوڑ گئی۔ میری گرفت مضبوط ہوئی اور اگلے ہی لمحے خنجر ”کچ“ کی آواز کے ساتھ ٹوبا کی پسلیوں میں اترتا چلا گیا۔ اس کے حلق سے اذیت میں ڈوبی ہوئی چیخ بلند ہوئی اور میری گردن اس کی گرفت سے چھوٹ گئی اور بپھری ہوئی ہوا تیزی سے میرے پھیپھڑوں میں داخل ہوئی۔

کئی دہانوں سے تحیر زدہ آوازیں بلند ہوئیں۔ اضطراری کیفیت میں خانخیلی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ قیامت کا ایک شور اچانک ہی برپا ہو گیا تھا۔

ٹوبا اپنا پہلو دبائے بھاگا۔ میں نے پل بھر میں ہی اسے جا لیا۔ ”سامنا کر اب اپنی موت کا۔“ میرے حلق سے چنگھاڑ سی نکلی اور خنجر ایک دفعہ پھر اس کی کمر کے نچلے حصے میں اتر گیا۔ وہ چیخا اور لڑکھڑا کر گر گیا۔

میں نے پاؤں کی ٹھوکر سے اسے سیدھا کیا۔ اس کے مکروہ چہرے پر موت کا خوف سنہری مائل زردی کی صورت میں ابھر آیا تھا۔ میری نگاہوں میں رضوان کا چہرہ اتر آیا۔ میں نے بے رحمی سے خنجر چلایا... ٹوبا نے بچنے کی فطری کوشش کے تحت ہاتھ آگے بڑھایا تو ہاتھ کی ایک انگلی کٹ کر دور جا گری اور دوسری نصف سے زیادہ کٹ کر لٹکنے لگی۔ وہ چیخ کر تڑپنے لگا۔ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر میرا جگر جیسے ٹھنڈا ہونے لگا۔

میں نے عقب سے اس کے بال جکڑ کر اس کا سر اوپر اٹھایا۔ خنجر نے اس کے اندرونی اعضا کو خاصا نقصان پہنچایا تھا۔ اس کے ہونٹوں کے گوشوں سے خون کے بلبلے نکل رہے تھے۔

میں نے خنجر اس کی گردن پر رکھ کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کے ساتھ بعد میں کیا سلوک ہوگا۔ وہ حال میں خوش تھے... رسالت زنجیر اور الٹی ہتھکڑی میں جکڑے ہونے کے باوجود خوشی سے ناچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

پھر میری نظر بھارتیوں پر گئی۔ ان کے چہرے سیاہ پڑ گئے تھے ماسوائے شیلا کے۔ اچانک ہی میں چونک گیا۔ اس وقت جب سب کی توجہ اکھاڑے کے وسط میں مرکوز تھی، وہ اس چبوترے کی طرف کھسک رہی تھی جہاں خانخیلی، کانتا اور اپنے دو محافظوں کے ساتھ موجود تھا۔

میری نگاہوں کے سامنے رضوان کا کٹا ہوا سر آیا اور میں نے ٹوبا کی گردن کاٹ دی۔ رضوان کے خون کا قرض آج ادا ہو گیا تھا۔

ٹوبا کا گرم خون میرا ہاتھ بھگو رہا تھا۔ اس کا بے سر کا لاشہ تڑپ رہا تھا۔ میں نے اس کا کٹا سر ٹرافی کی طرح بلند کیا تو میرے حمایتیوں نے پہلے سے بھی زیادہ نعرہ زنی شروع کر دی۔ بے شک میرا یہ فعل وحشیانہ تھا مگر اس وحشت کا کچھ سبب بھی تھا۔

خانخیلی زور زور سے تالیاں پیٹ رہا تھا جبکہ کانتا نے منہ دوسری طرف پھیر لیا تھا۔ اچانک ہی قیامت کے اس شور میں یکے بعد دیگرے دو گولیوں کے دھماکے ہوئے۔ میں نے خانخیلی کے دونوں محافظوں کو لہرا کر گرتے دیکھا۔ شیلا چبوترے پر چڑھ گئی تھی اور کانتا کے بھیجے میں تیسری گولی اتار کر ایک خطرناک نظر آنے والا... پسٹل خانخیلی کی کھوپڑی سے لگا چکی تھی۔ یکلخت سارے ہجوم کو سانپ سونگھ گیا۔ قیامت خیز شور ایسی خاموشی میں ڈھل گیا جیسے یہ بھرا پُرا دالان نہ ہو، شہرِ خاموشاں ہو۔

طمانیت کی ایک بلند لہر اٹھی اور مجھے سر سے پاؤں تک بھگو گئی۔ وہ پیکرِ وفا مشکل وقت میں ایک دفعہ پھر میری مدد کو آ گئی تھی۔

شیلا نے خانخیلی کو رنگین پایوں والی کرسی پر بیٹھنے پر مجبور کیا اور خود اس کے عقب میں ہو گئی۔ وہاں وہ نشانے باز سے محفوظ تھی۔

مائک وہاں پہلے سے موجود تھا۔ چند لمحوں بعد شیلا کی آواز ہر طرف گونجی۔ ”تم لوگوں کا لارڈ میرے نشانے پر ہے۔ میرے خلاف کسی مہم جوئی کا نتیجہ اس کی کھوپڑی اڑنے کی صورت میں نکلے گا۔ فوراً قیدیوں کی ہتھکڑیاں کھول کر انہیں یہاں چبوترے پر بھیج دیا جائے... میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“

بھارتی کرنل پردیپ نے چیخ کر کہا۔ ”کیا پاگل ہو گئی ہو شیلا؟“

”ہاں۔“ اس کے ساتھ ہی گولی چلنے کا دھماکا ہوا اور کرنل پردیپ پیشانی پر گولی کھا کر الٹ کر گرا۔ شیلا کی آواز ابھری۔ ”عامر! تم یہاں آ جاؤ۔“ اس کے انداز میں جو اپنائیت تھی، اس نے میرے قدموں میں بجلی بھر دی۔ مجھے اب بھلا کون روک سکتا تھا۔ چند ہی لمحوں میں، میں چبوترے پر تھا۔ کرنل کی لاش پھلانگ کر میں نے چھوٹی نال کی رائفل اٹھا کر خانخیلی کے سر سے لگا دی۔ شیلا کی والہانہ نظریں میرا طواف کر رہی تھیں۔

میں نے خانخیلی کے الفاظ دہراتے ہوئے کہا۔ ”موت کو سامنے دیکھ کر کیسا لگ رہا ہے؟“

خانخیلی کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ اس نے کمزور سے لہجے میں کہا۔ ”موت میری نہیں... تم لوگوں کی سامنے ہے۔“

میں نے کہا۔ ”فی الحال تو اپنے لوگوں کو میرے ساتھیوں کو آزاد کرنے کا حکم دو ورنہ مجھے تمہاری بھی گردن کاٹنی پڑے گی۔“ میں نے دوسرے ہاتھ میں تھاما ہوا خنجر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ اس خنجر پر ٹوبا کا خون ابھی تازہ تھا۔

رائفل سے زیادہ خنجر نے اثر دکھایا۔ خانخیلی کا چہرہ زرد ہو گیا۔ میں نے شیلا سے مائک لے کر اسے تھمایا تو اس نے من و عن میری ہدایت پر عمل کیا۔

میری نگاہیں گرد و پیش کا عقابی جائزہ لے رہی تھیں۔ ہمارے اردگرد بلاشبہ سیکڑوں مسلح افراد تھے۔ بے شک ان کی شہ رگ ہمارے نشانے پر تھی مگر خون کی گرمی کسی کو بھی مہم جوئی پر اکسا سکتی تھی۔

میں شیلا کے بالکل سامنے آ گیا۔ وہ کسی بھی نشانے باز کی براہِ راست زد سے محفوظ تھی۔ پھر میں نے شیلا سے کہا۔ ”کیا پلان ہے تمہارا؟“

”فی الحال تو یہاں سے نکلنے کا ہے... بعد میں...“ اس نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑا تو میرے دل میں شادیانے سے بج اٹھے۔

چند لمحوں بعد میرے دمکتے چہروں والے ساتھی میرے پاس تھے۔ رسالت نے میری دکھتی پسلیوں کے کڑاکے نکالتے ہوئے پُرمسرت سرگوشی کی۔ ”میں نہ کہتا تھا سر! وہ فدا ہے آپ پر۔“

”تم سچ کہتے تھے یار!“ میں بھی اس سے لپٹ گیا۔

خانخیلی ہمارے پاس تھا۔ ہمارا ہر مطالبہ مان لیا گیا۔ ان کی طرف سے صرف یہ شرط سامنے آئی کہ قلعے سے نکل کر ہم خانخیلی کو چھوڑ دیں گے۔ اس شرط پر خانخیلی اڑ گیا تھا۔

مجھے یہ شرط کسی صورت منظور نہیں تھی مگر شیلا کے آنکھ کے اشارے نے یہ شرط منظور کروا دی۔ طے پایا کہ ایک جیپ میں پہلے ہم لوگ خانخیلی سمیت باہر نکلیں گے۔ اس کے ٹھیک پانچ منٹ بعد دو گاڑیاں ہمارے پیچھے روانہ ہوں گی اور ہم سے کم از کم پانچ سو میٹر کے فاصلے پر رہیں گی۔ دو گھنٹے کے بے حد دشوار گزار راستے کے بعد جب ہم نیم پختہ سڑک پر پہنچیں گے تو خانخیلی کو رہا کر دیں گے۔

ہمارے سامنے خانخیلی نے اپنے سرکردہ لوگوں سے کہا۔ ”اگر یہ معاہدے کی پاسداری نہ کریں تو مجھ سمیت ان کی گاڑی اڑا دینا۔ یہ میرا حکم ہے۔“

تھوڑی دیر میں تینوں گاڑیاں تیار ہو گئیں۔ ایک کھلی جیپ تھی جس پر جدید ترین روسی ملٹی بیرل راکٹ لانچر فٹ کیا گیا تھا۔ چھ سیکنڈ میں یکے بعد دیگرے چار راکٹ فائر کرنے والا یہ ہلاکت خیز ہتھیار تھا۔

راکٹ لانچر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے حلابت نے دھمکی آمیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ وہ خانخیلی کا

خاص آدمی تھا۔

رسالت نے ہمارے لیے مختص جیپ کا اچھی طرح جائزہ لے کر او کے کی رپورٹ دی۔ ہمارے اور تعاقب میں آنے والے خاتخیلی کے لوگوں کے درمیان ہوا اصلاتی رابطہ بھی ہونا تھا تاکہ درمیانی فاصلہ کم ہونے کی صورت میں ہم انہیں خبردار کر سکیں۔

خاتخیلی کے پاس جدید ہتھیاروں کے علاوہ مواصلات کا بھی جدید نظام تھا۔ اسی کی مدد سے ثوبانے بھاری رقم اس کے کسی غیر ملکی اکاؤنٹ میں منتقل کروائی تھی۔

روانہ ہونے سے پہلے میں، ثوبا کے سر کے خون آلود بال اکھاڑنا نہیں بھولا تھا۔ خواہش تو اس کا سر ساتھ لے جانے کی تھی مگر اس طرح راستے میں کئی دشواریاں پیش آسکتی تھیں۔

اس کے علاوہ ثوبا کی بنیان کے چیتھڑے ڈھونڈ کر میں نے وہ شفاف تھیلی بھی علیحدہ کر لی تھی جس میں اس مردود نے رضوان کے خون آلود بال ٹرافی کے طور پر محفوظ کیے ہوئے تھے۔

ہماری جیپ قلعے کی ڈیوڑھی سے نکلی تو میں نے شیلا سے کہا۔ ”ان لوگوں کے پاس جدید ترین ہتھیار ہیں۔ خاتخیلی کو چھوڑ دیا تو یہ کسی صورت ہمیں نکلنے نہیں دیں گے۔“

شیلا کی نظر اپنی گھڑی پر تھی۔ وہ دھیرے سے بولی۔ ”دیکھتے جاؤ، کوئی ہماری گرد کو بھی نہیں پہنچ پائے گا۔“

ہم قلعے سے قدرے فاصلے پر پہنچ چکے تھے۔ تعاقب میں آنے والی گاڑیاں کسی بھی وقت قلعے سے نکل سکتی تھیں۔

شیلا کے چہرے پر ہیجان نظر آیا۔ اس نے تیزی سے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹا سا ریموٹ کنٹرول نکالا اور ایک بٹن دبا دیا۔

عقب میں دل دہلا دینے والا دھماکا ہوا اور میں نے قلعے کی ڈیوڑھی کو زمین بوس ہوتے دیکھا۔ شیلا نے ہاتھ جھاڑے اور اطمینان سے بولی۔ ”یہ لو، ہمارے تعاقب میں آنے کا راستہ ہی بند ہو گیا ہے۔“ خاتخیلی کو تو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔

مجھے یاد آرہا تھا کہ میں نے شیلا کو ڈیوڑھی پر بنے واچ ٹاور میں دیکھا تھا۔ یقیناً ڈیوڑھی کے اوپر بعد میں تعمیر کی جانے والی عمارت میں گولہ بارود کا ذخیرہ تھا۔ شیلا نے ضرور اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی تھی۔

یاد آنے پر میں نے شیلا سے پوچھا۔ ”ثوبا کا ہمارے متعلق خوفناک منصوبہ کیا تھا جس سے آگاہ کرنے کے لیے تم برستی بارش میں آگئی تھیں؟“

ان لمحوں کو یاد کر کے اس کے چہرے پر شرمگیں تاثر ابھرا، وہ بولی۔ ”اس وقت مجھے تفصیل معلوم نہیں تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ تمہارے کمروں میں ایل پی جی سلنڈروں کے دھماکے اور خوفناک آتشزدگی کا منصوبہ تشکیل دیا جارہا تھا جسے حادثاتی رنگ دے دیا جاتا۔“

”ثوبا کے منصوبے سے پہلے اس کا منصوبہ شروع ہو گیا۔“ یہ کہتے ہوئے رسالت نے عقب سے خاتخیلی کو زوردار تھپڑ مارا تو ہم بھی ہنسنے لگے۔

شیلا میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اور تم اچانک ہی مجھ پر مہربان کیسے ہو گئے؟“

”کچھ باتیں شادی کے بعد کے لیے بھی بچالو۔“

اس نے جھینپ کر چہرہ اپنے ہاتھوں میں چھپالیا۔

محفوظ فاصلے پر پہنچ کر میں نے جیپ رکوائی اور خاتخیلی کو باہر نکالا۔ سبھی لوگ باہر نکل آئے تھے۔ شاید میری آنکھوں میں اس نے اپنی موت کی تحریر پڑھ لی تھی۔ اس کے گھٹنے کپکپائے اور وہ گر پڑا۔

میں نے ریشمی چغے کے کالر سے کھینچ کر اسے کھڑا کیا۔ ”کرنل پنج شیری ایک دلیر اور محب وطن افغان تھا۔ اس کے قتل کے جرم میں، میں تمہاری گردن کاٹ رہا ہوں۔“

دغاباز خاتخیلی کے لب پھڑپھڑائے مگر آواز نہیں نکلی۔ میں نے یادگار خنجر سے اس کی گردن پر گہرا چرکا لگایا اور اسے ایک گہری کھائی میں دھکیل دیا۔ گلا کٹا ہونے کی وجہ سے اس کی چیخ بھیانک خرخراہٹ میں تبدیل ہو گئی تھی۔

چھ ہفتوں کا وقت تیزی سے گزر گیا۔ میں، رضوان کے بال لے کر اس کی ماں کے پاس گیا۔ بیٹے کی باقیات دیکھ کر اس کے آنسو تھمنے میں نہیں آرہے تھے۔

پھر میں نے دوسری تھیلی نکالی اور اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔ ”ماں! یہ اس قاتل کے بال ہیں جس نے رضوان کو شہید کیا تھا۔“

وہ بوڑھی ماں میرے گلے سے لگ گئی اور ہچکیاں لے کر رونے لگی۔ اس کا جلتا ہوا کلیجا آج مجھے ٹھنڈا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا قرض بھی آج میں نے اتار دیا تھا۔

ایک اور بات بھی بتا دوں آپ کو... شیلا کا نام اب فاطمہ ہے اور نماز میں بے قاعدگی پر وہ جھگڑتی ہے مجھ سے...